مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ ھود

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ ھود

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۂ ھود)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	جنوری 2017ء
مطبع	....	باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھراُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویزؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورہ هود
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ هود (آیات 1 تا 6)

قرآنی احکامات کی بنیادی خصوصیت، اپنی جگہ محکم، غیر متبدل اور پھر مکمل ہیں ______ 27
عربی لغت کے تحت لفظ مفصل کا مفہوم اُردو زبان کے مفہوم سے مختلف ہے ______ 28
وحی کی دو قسموں کا تصور تفصیل کے غلط مفہوم کا ہی پیدا کردہ ہے 28
صدیوں سے مذہبی فرقوں کا غیر قرآنی وجود دوسری قسم کی وحی کی بنیاد پر ہی پیدا ہوا ہے ______ 28
نبوت کے ختم ہونے پر وحی بھی ختم ہوگئی جب کہ اب روایات کی بنیاد پر اختلافات موجود ہیں ______ 29
مولانا عبداللہ چکڑالوی کی طرف سے قرآن حکیم سے جزئیات حاصل کرنے کی ناکام کوشش کا نتیجہ ______ 29
فرقہ اہل قرآن کی طرف گروہ بندی کی بنیادی وجہ اور قرآن حکیم کو پہنچنے والے نقصان کی وضاحت ______ 30
اہل قرآن کی متضاد خیالی کی کیفیت ______ 30
لفظ فصل کا لغوی مفہوم اور اس کا استعمال ______ 30
قرآن حکیم نے اپنے ہاں انسانی زندگی کے لیے اصولی احکام تو دیئے ہیں جزئیات متعین نہیں کیں ______ 31
غیر متبدل اصولوں کو عملی شکل دینے کے لیے جزیات کا تعین وقت کے تقاضوں کے مطابق انسان کو خود کرنا ہوگا ______ 32
دورِ رسالت میں حکومتِ وقت کے لیے مشاورت کا حکم وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر کیا جاتا تھا ______ 32
اصول ہمیشہ اٹل ہوتا ہے البتہ جزیات اس کی روشنی میں بدلتی رہتی ہیں ______ 33
ذاتِ خداوندی تو حکیم بھی ہے اور علیم بھی ہے اور قرآن حکیم وہ محور ہے کہ جس کے گرد عقل انسانی نے گھومنا ہے ______ 33
ہم نے خدا کی اس محکومیت کو، عبادت کو پرستش میں بدل دیا ______ 34
ایک خطرناک گھاٹی کا ذکر کہ جس نے انسانیت کی تاریخ کا رُخ ہی بدل دیا ______ 34
نبی اکرم ﷺ نے اپنے متعلق خدائے علیم کا فرمان ______ 35
خدائے علیم وخبیر کے اس فرمان کے باوجود ہماری حالت ______ 35
تیرہ سو سال سے دی جانے والی اذان کے انقلابی الفاظ کا انتخاب اور انسانیت کے مقام کا تعین ______ 36
کلمہ طیبہ کے علاوہ ان مذکورہ الفاظ میں خدا کی کبریائی کے ساتھ نبی اکرم کی ذات کا ذکر خیر ______ 36
دین کسی کی عقیدت سے نہیں بلکہ مبالغہ آمیزی کے عمل سے بگڑتا ہے ______ 36
خدا تو اپنی طرف سے عطا کردہ دین کے علاوہ کسی چیز کو قبول ہی نہیں کرتا ______ 37

ٹریننگ نکل چکی ہے۔
26-10-16
بدھ والے دن

(استغفروا ربکم) مغفرت کے معنی تو بخشش کی بجائے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے ہیں 37
قرآن حکیم کی عربی مبین کو سمجھنے کے لیے تصریفِ آیات کے طریق کو بنیاد بنانا ہوگا 37
قدرت کی طرف سے حسنِ عمل کا نتیجہ بڑے ہی خوشگوار طریق سے محسوس شکل میں ملتا ہے 38
نبی اکرم کی حدیث ہے کہ انسان کی مسکراہٹ بھی انسان کی نیکیوں میں شمار ہوگی 38
ہمارے ہاں اجلِ مسمّیٰ کا مروّجہ مفہوم جس کی قرآن حکیم تردید کرتا ہے 39
ہم نے تو فضل کے مفہوم کو ایک دوسری پڑی پہ ڈال رکھا ہے 39
خدا کا قانون یہ ہے کہ فضل کے حصول کی خاطر پہلے انسان کو اپنے اندر وہ قوت اور صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہوگا 40
انسانی زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں کہ جس کا حل قرآن حکیم نے تفصیل کے ساتھ پیش نہ کیا ہو 40
حضرت عمرؓ کے دور میں مدائن کی فتح، فضل محسوس شکل میں ایک زندہ شہادت ہے 41
قرآن حکیم نے تو عزت اور ذلت دونوں کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں 41
آج کا دور قرآن حکیم کے حقائق کو علم النفس کی بنیاد پر علی وجہ البصیرت سمجھنے کا دور ہے 41
لفظ شئون صدورھم کے لفظی ترجمہ کی نوعیت لیکن علم النفس کے تحت اس کا قرآنی مفہوم Dual Personality ہے Unconscious Mind ہے 42
تراجم کے اندر لفظ ثیاب کا ترجمہ کپڑوں کو لپیٹ لینے کا کیا جاتا ہے 43
کسی دور کا سمجھا ہوا قرآن دوسرے آنے والے دور کے لیے حرفِ آخر نہیں ہو سکتا 43
بات کپڑوں کو پاک رکھنے کی نہیں بلکہ اپنی شخصیت کو پاکیزہ رکھنے کی ہے 44
انسان کے Mind کا علاج اقدارِ خداوندی سے ہی ممکن ہے 44
رزق کی ذمہ داری کیونکر پوری کی جائے' اس کا حل 45
حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت مین فکرِ معاش کا حل 46
نبی اکرم ﷺ کے دور میں پورے مکے میں تعلیم کا معیار صرف 17 (سترہ) افراد پر مشتمل تھا 47
انسانی پیدائش سے بھی پہلے اس کے رزق کا انتظام کس قدر حیران کن اور مکمل ہے 47
ایک جرثومے سے انسانی پیدائش اور پھر اس کی ذہنی صلاحیتوں کی طویل کہانی اور اس کی پرورش کے لیے سامان زیست کے مختلف مراحل 48
انسانی جنین کی مختلف حالتیں (Stages) کے مطابق رزق کی فراوانی 48
رحمِ مادر میں بچے کے لیے سامانِ نشوونما کی ترسیل کا ذکر 48
ہر ہر سٹیج کے لیے رزق کی ذمہ داری خالق کائنات نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے 49
لفظ سئل تو محتاج کے لیے ہے جس کی ضرورت ہر دن ایک نیا انداز یا ایک نئی شان لیے ہوتی ہے 49
خدا تعالیٰ کی طرف سے رزق کی فراہمی کے لیے رب کریم نے کیا کچھ کر رکھا ہے سورۃ رحمٰن اپنی مثال آپ ہے 50
کائنات کا ذرہ ذرہ نظامِ ربوبیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے

کے لیے ہر آن مصروف کار ہے ___ 50
اس کائنات کی تخلیق کا مقصد تو رحمِ مادر میں پرورش پانے والے انسان
کی انسانیت کو بغیر کسی قسم کی رکاوٹ کے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے 51

دوسرا باب: سورۃ ھود (آیات 7 تا 12)

نظریہ ارتقا کے تحت انسان کا حسنِ عمل اسے موت کے بعد ایک
نئی زندگی عطا کرتا ہے ___ 52
نظریۂ ارتقا کے سلسلہ میں مستقر اور مستودع کی ان دو
اصطلاحات کا بنیادی مفہوم ___ 52
زندگی کے علاوہ اس کائنات کی یہ تخلیق بھی اسی ارتقائی پروگرام
کی رہین منت ہے ___ 53
تورات میں چھ مراحل کو چھ دن کہا گیا ہے ___ 53
ہزار سال سے ہمارے ہاں کی پیش کردہ تفسیروں کی علمی سطح ___ 54
کائنات کی وسعت پذیری کا یہ سلسلہ تو اب بھی مزید پھیل
رہا ہے ___ 54
ہمارے ہاں کی تفسیروں نے قرآن حکیم کے تعلیمی حقائق کو
چیستان بنا رکھا ہے، دیکھیے خدا کے عرش کی تفسیر ___ 55
تخت کا یہاں مفہوم لکڑی نہیں بلکہ اقتدار کا ہے ___ 56
6 مختلف مراحل کے بعد زندگی کی نمود پانی سے ہوئی جس پر
خدا کا کنٹرول ہے بالفاظ دیگر خدا کا عرش پانی پر ہے یعنی زندگی
پر خدا کا کنٹرول ہے ___ 56
پانی سے پیدا ہونے والی زندگی جو مختلف مراحل سے گذرتی
رہی، اس پر خدا کا ہی کنٹرول ہے ___ 57
زندگی کی ابتدائی شکل اپنی بوجھل کیفیت سے سنورتی ہوئی،
قدم بہ قدم آگے بڑھتی رہی ___ 57
آج کی یہ انسانی زندگی موت وحیات کے مراحل طے کرنے کے
بعد ارتقا کی نئی منازل میں اعمال حسنہ کی بنیاد پر داخل ہوگی ___ 58
حسنِ عمل کے سلسلہ میں علامہ پرویز کی دلی خواہش تھی کہ وہ
قرآنی حقائق کو نصاب کے طور پر اپنے دروس کے انداز میں
نوجوان نسل کے ذہن نشین کرائیں ___ 58
طبعی زندگی کے سلسلہ میں انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ___ 59
وحی کی صداقتوں پر ایمان نہ لانے والوں کے متعلق خدا کا ارشاد 60
انسان کے اعمالِ حسنہ کا ٹیسٹ تو میدان جنگ میں ہوتا ہے ___ 60
قدرت کی طرف سے جہانِ فردا کی خوشگواریوں کی نوید
انسانی سطح پر زندگی گزارنے والوں کے لیے ہے ___ 61
قرآن حکیم کے نزدیک جہنم کی تعریف یہ ہے کہ جہاں نہ زندگی
ہے نہ موت ___ 61
اگر طبعی زندگی کے لیے توازن بدوش ہونا ضروری ہے تو انسانی
زندگی کی نشوونما کے لیے اقدار سے باشرف ہونا لازم ہے ___ 61
قرآن حکیم نے حسنِ عمل کا معیار خدا کے اسماء الحسنٰی کو قرار دیا ہے 62
صفاتِ خداوندی میں سے کوئی صفت بھی Extreme تک
نکل جائے تو انسانی زندگی کے توازن کو برباد کر دیتی ہے ___ 63
نظامِ خداوندی کا ایک ایک ذرہ توازن کی عکاسی کرتا ہے ___ 63
دلی میں طبیبوں کے ہاں نسخہ لکھنے کا انداز ___ 64
حسنِ عمل میں توازن ہی معاشرے کی خوبصورتی کا ضامن ہے 64
دنیا میں سب سے زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہیں کہ جن کے
اعمال رائیگاں جائیں ___ 65
انسان کے وہ اعمال اور اس کی ایسی سعی وکوشش کہ جس کے
لیے کوئی ترازو بھی کھڑا نہیں کیا جائے گا ___ 65
حسنِ عمل کا معیار خود اپنا متعین کردہ قبول ہی نہیں ہوگا ___ 66
ابوالکلام آزاد کی طرف سے پیش کردہ عالمگیر سچائیوں کے

نسخے کی حقیقت اور تجربہ ____ 67
عالمگیر سچائیوں کو حسنِ عمل کی شکل میں استعمال کرنا ممکن ہی نہیں'
قرآن حکیم پوری نوع انسانی کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے _ 67
صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کا اپنے اپنے زعم کے تحت نیک کام
کرنے والوں کے عملی نتائج کا جائزہ ____ 68
عالم گیر سچائیوں کے مطابق ہندو دھرم کے متعلق یہ کہنا کہ عالم
گیر سچائیاں ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں چہ معنی ____ 68
حسنِ عمل کو پرکھنے کا ایک ہی فارمولا ہے' ایک ہی معیار ہے کہ
وہ خود کیا لیتا ہے اور دوسروں کو کیا دیتا ہے ____ 69
انسانی زندگی کا یہ قافلہ یہاں کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد اپنی
اگلی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے گا ____ 69
اس جہانِ افروز میں ٹھہر جانے کا مقصد حیات انسانی کی
صلاحیتوں کی نشوونما کرنا ہے ____ 70
قرآن حکیم کے نزدیک کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ____ 70
جہانِ فردا پر ایمان قرآنی اقدار پر ایمان لائے بغیر ممکن ہی نہیں 71
ظہورِ نتائج کے عمل کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی ____ 71
جنت کی زندگی ہو یا جہنم کی یہ تو ایک اجتماعی کیفیت لیے ہوئے
ہوتی ہے ____ 71
انسان اپنی غلط عملی کو تسلیم کرنے کی بجائے خدا پر اعتراض کرتا ہے 72
ہمارے ہاں لفظ ''اللہ نوں منظور'' ہی یہی تھا کا استعمال ____ 73
لفظ فخر کا مفہوم جانوروں کا ہوانہ جس میں دودھ تو بہت کم ہو
لیکن پھولا ہوا زیادہ ہو ____ 73
قانون کے مطابق معاملات پر غور وفکر کرنے والوں کی کیفیت 73
دوسروں کو غلط نتائج سے آگاہ کرنے والے کی ذمہ داری اور
پھر ان کی مشکلات ____ 74
صلیبی جنگوں کے اثرات کے اور پھر عیسائیت کی طرف سے
مسلمانوں کو مفلوج کرنے کے لیے جذبۂ جہاد کے خلاف ایک
مامور من اللہ کی طرف سے جہاد کی آیات کی منسوخی کا اعلان _ 75
قرآن حکیم نے اپنی کسی آیت کو منسوخ کرنے کا حکم نہیں دیا _ 76
کفار کی طرف سے نبوت کے متعلق کیے جانے والے مطالبے
اور قرآن کی وضاحت ____ 77
نبوت سے سرفراز ہونے والی ہستی ہمیشہ وسعت قلب کی
دولت سے مالا مال ہوتی ہے ____ 77
ہر چیز اور ہر عمل کا نتیجہ قوانین خداوندی کے مطابق ہی برآمد
ہوتا ہے اور ہوگا ____ 78

تیسرا باب: سورة ھود (آیات 13 تا 17)

وحی اور علم انسانی کے حصول کے بنیادی فرق کی وضاحت
نیز معجزوں کی حقیقت ____ 79
خدا کا رسول کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہوتا ____ 81
اگر وحی کے یہ احکام رسول کے اپنے بیان کردہ نہیں تو تم
سب کو یہ کھلا چیلنج ہے کہ تم مل کر اسی جیسی 10 سورتیں بنا لاؤ ___ 82
مخالفین رسالت جنہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ تقریباً
82 جنگیں تو لڑیں لیکن ایک سورت نہ بنا سکے ____ 82
دنیا کا کوئی فرد آج تک قرآن حکیم کے اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکا 83
علامہ پرویزؒ کی کب سے ملاقات جس کا کہنا تھا کہ قرآن حکیم
کا کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا ____ 84
ترجمے کی بجائے قرآن حکیم کا مفہوم تو بیان کیا جا سکتا لیکن
وہ بھی اپنی علمی حد تک ____ 84
غیر مسلموں کا لکھا ہوا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جس کا عربی
میں ترجمہ مصر میں ہوا اور پچیس سال سے پنجاب یونیورسٹی کے

تابع جس کا اردو میں ترجمہ ہو رہا ہے ____ 85

انسان کا کچھ لکھنا یا بولنا یہ اس کے اپنے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے جب کہ وحی کے لیے منزل من اللہ کا لفظ آیا ہے ____ 85

ایجوکیشن کے معنی Educate کرنے کے ہیں یعنی بچوں کے اندر کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا مقصود ہو نہ کہ صرف معلومات پہنچانا 86

قرآن حکیم کے ''منزل من اللہ'' کے الفاظ اپنے اندر ایک عظیم حقیقت لیے ہوئے ہیں ____ 86

قرآن حکیم پر غور وفکر کے دوران کئی باطل قسم کے نظریات کو خیر باد کہنا پڑا ____ 87

مذاہب کی دنیا میں وہ پائے جانے والے تصورات جو مسلمہ طور پر پائے جاتے ہیں ____ 88

مذہب کی اندھیری رات میں دین خداوندی کا روشن چراغ ____ 88

انسانی زندگی میں بھوک وافلاس اور خوف وحزن تو عذاب ہے 89

خالق کائنات کی طرف سے اس کا ذرّہ ذرّہ تمام انسانوں کے لیے مسخر کیا گیا ہے ____ 89

کائنات کی تمام اشیاء کو قانون کے دائرے میں پابندِ سلاسل کر رکھا ہے ____ 89

اقبال کی شاعری کا پہلا دور ____ 90

قرآن حکیم کی طرف سے دیا ہوا تصورِ حیات ____ 91

قرآن حکیم کی روشنی میں انسانی زندگی کے دوزخ ____ 91

قرآن حکیم کے قانونِ مشیت کی وضاحت ____ 92

قرآن حکیم کے اندر اگر رزق حاصل کرنے کا قانون متعین ہے تو پھر اس کو صرف کرنے کا طریق بھی ہے ____ 92

قدرت کی طرف سے کائنات کی ہر شے ہر فرد کے لیے بطور عطیہ ہے ____ 92

عقل انسانی جو ہمیشہ اپنا فائدہ سوچتی ہے' اس کے لیے خارج سے راہنمائی حاصل کرنا ضروری تھا ____ 93

وحی کی راہنمائی کے بغیر عقل انسانی کی پسماندگی کی ایک مثال اور پھر عملی طور پر جدوجہد کرنے والی قوم کی فضیلت ____ 93

خالصاً مادی تصورِ حیات سے ہٹ کر حقیقی کامیابی تو مقصودِ حیات میں فرق پیدا کرنے والوں کی ہے ____ 94

قوموں کی موت وحیات کا دائرہ تو قدرت کے غیر متبدل اصولوں کے مطابق ہی وجود میں آتا ہے ____ 94

غربت' فاقہ کشی' محتاجی یہ تو عذاب ہے جو انسانوں کی اپنی بدعملی کا نتیجہ ہے ____ 95

خدائے علیم نے خالصاً متاعِ دنیا کی طلب کو پورا کرنے کے لیے کہیں زیادہ وافر سامان فراہم کر رکھا ہے ____ 95

اقدارِ خداوندی کے برعکس انسان کی طرف سے اس کا مصنوعی عمل کبھی ثمر بار نہیں ہوتا ____ 96

خدا کے ہاں سے مغفرت پالینے کے خودساختہ تصورات کی نوعیت اور پھر اس کا نتیجہ ____ 96

خدا تعالیٰ کے ہاں جنت کے حصول کا غیر متبدل اصول اور ہمارے ہاں کی پھیلائی ہوئی گمراہی ____ 97

انسانی اعمال کے مطابق جہانِ امروز وفردا کی نوعیت ____ 97

الحق کے ساتھ کبریائی کی طلب یا صاحب اقتدار ہونے کی خواہش' یہ مومن کا شیوہ ہے ____ 98

بغیر الحق کبریائی انسان کو فرعون بنا دیتی ہے اور بڑی بڑی سلطنتیں صرف تاریخ کا حصہ بن کر رہ جاتی ہیں ____ 98

علی وجہ البصیرت قرآن حکیم کی صداقتوں کو سمجھنے کے تین مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ____ 99

عقلِ انسانیت تو ہر دور میں ہر آن ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے ________ 99
حصولِ پاکستان کا بنیادی مقصد ________ 100
لفظ تلاوت کا لغوی قرآنی مفہوم پیروی کرنے کا ہے ________ 101
عالم الغیب والشھادۃ کے مفہوم کو عملی طور پر محسوس شکل میں پیش کرنے والی عظیم ہستی ﷺ ________ 101
قرآن حکیم کی تعلیم تو سراپا دلیل و براہین پر مبنی ہے اور الحق ہے 102

چوتھا باب: سورۃ ھود (آیات 18 تا 27)

انسان کی اس طبعی زندگی کے ساتھ اس کی ذات کی قدر و قیمت کا موازنہ اور پھر حدود اللہ کی اہمیت ________ 103
تجدید یادداشت بسلسلہ قرآن فہمی ________ 103
قلب و دماغ سے غیر قرآنی تصورات کو نکالے بغیر قرآنی حقائق کی قدر و منزلت سامنے نہیں آ سکتی ________ 105
لفظ غیب اور شاہد کے مفہوم کی وضاحت ________ 105
بنی اسرائیل کا خدا تعالیٰ کی راہنمائی پر چلنے کا نتیجہ جو سطوتِ داؤدی اور شوکت سلیمانی کی شکل میں ظاہر ہوا ________ 106
وحی کی اقدار کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہی ذلت و رسوائی جس میں آج پوری امت مسلمہ گرفتار ہے ________ 106
افتراء علی اللہ کرنے والے یعنی نبوت کا دعویٰ الہام وغیرہ کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے ہیں ________ 107
شریعت خداوندی کے بارے افتراء علی اللہ کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا کردار ________ 107
قرآن حکیم کے متعلق ایران کے بہائی مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ آسمانی کتاب منسوخ ہو چکی ہے ________ 108
یبغونھا عوجاً کے مفہوم کی عملی مثال ________ 108
مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ پرستی کے باہمی گٹھ جوڑ کی تکنیک کا نتیجہ 109
مذہب ہمیشہ دین خداوندی کی پیش کردہ اصطلاحات کی بنیاد پر ہی مغالطہ آفرینی کرتا ہے ________ 110
قرآن حکیم مکافاتِ عمل کے نتائج کو سمجھانے کا ایک تمثیلی انداز اختیار کرتا ہے ________ 110
مکافاتِ عمل پر یقین رکھنے اور نہ رکھنے والوں کی کیفیت ________ 111
خدا کو عاجز کرنے کا مفہوم ________ 112
قوانین خداوندی کے اٹل ہونے والے غیر متبدل اصول کی ایک عملی مثال ________ 112
دہرے عذاب میں مبتلا ہونے والوں کی وجہ جواز اور ان کی غلط سوچ ________ 113
حمیتِ دینی اور غیرت اسلام پر گالیاں دینے کی بجائے دوسروں کی سننے کی تڑپ پیدا کرنی ہوگی ________ 113
قرآنی اقدار کو تسلیم کرنے والوں کا حسنِ کردار ________ 114
بغیر کسی محنت کیے دنیاوی متاع حاصل کرنے والوں کا ذکر ________ 114
دنیاوی مفاد کو انسانی ذات کی نشوونما کے ترازو میں نہیں تولا جاتا 115
قرآن حکیم کے نزدیک اس طبعی زندگی کے مقابلے میں جہاں فردا کی اہمیت ________ 115
حضرت انسان کی طبعی زندگی اور اس کی ذات کی باہمی قدر و منزلت کے فرق کی نوعیت ________ 116
انسانی اعمال کے پرکھنے کا معیار اور حدود اللہ کی قدر و قیمت ________ 116
قرآن حکیم کے نزدیک Human Personality کا معیار ________ 116
قدرت نے انسان کے اندر تعمیری اور تخریبی دونوں صلاحیتیں باہمی اصولوں کے تحت عطا کر رکھی ہیں ________ 117

قرآن حکیم نے انسانی ذات میں صحیح توازن پیدا کرنے والے اعمال کو اعمال حسنہ یا اعمالِ صالحہ سے تعبیر کیا ہے ______ 117
بوقت نماز رکوع اور سجود کی اہمیت کے پیش نظر اس کی حقیقی عملی شکل وصورت کی وضاحت ______ 118
صدیوں سے لاکھوں کی تعداد میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کے بعد ایاک نعبد کے اعلان کے برعکس ہماری متضاد عملی کا نتیجہ 119
عربی زبان میں لفظ لعنت کوئی گالی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے محرومی ہے ______ 119
قندیل آسمانی کے ہاں فکر قرآن کو سمجھانے کا انداز بڑا واضح ہے 120
قرآن حکیم نے اپنے حقائق کو سمجھانے کے لیے تین مختلف طریق اختیار کیے ہیں ______ 120
تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے کا حقیقی مفہوم فلاسفی آف ہسٹری ہے، وقائع نگاری نہیں ______ 121
قرآن حکیم میں تاریخی واقعات کو بیان کرنے کا مقصد اٹل حقائق کو سامنے لانا ہے اور اسی کو نذیر یعنی آگاہ کرنا کہتے ہیں ______ 122
حضرت نوح کا پیغام وحی کہ خدا کے سوا کسی کی محکومی اختیار نہ کرو 122
ہمارے ہاں قرآن حکیم کی پیش کردہ اصطلاحات کا مفہوم ہی بدل دیا گیا ہے ______ 123
ابوالکلام کی طرف سے پیش کردہ تصورات کا نتیجہ ______ 123
حضرت نوح کا مقصد اپنے دور میں نظام سرمایہ داری کی لعنت کو ختم کرنا تھا ______ 124
حضرت نوح کی طرف سے دی گئی دعوت کی سب سے زیادہ مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوئی تھی ______ 124
نوح کی قوم کا مطالبہ معجزہ طلبی کا تھا ______ 125
آج بھی انسانیت کے معیار کو دولت کے ترازو میں ہی تولا جاتا ہے ______ 126
پہلے نبی کی پہلی آواز طبقاتی تقسیم کو انسانیت کے خلاف قرار دینا تھا ______ 126
فرعون اپنے دربار میں حضرت موسیٰ اور ہارون سے مخاطب ہے 127
بنی اسرائیل کے ساتھ فرعون کا سلوک استبدادی حربوں کا ترجمان تھا ______ 127

پانچواں باب: **سورة ھود** (آیات 28 تا 37)

احترام انسانیت-قرآن حکیم کا من جانب اللہ ہونے کا ثبوت 129
وحی کی مکمل تعلیم کے احوال وکوائف میں تمام بنیادی خرابیوں کا ذکر مکمل طور پر کیا جا چکا ہے ______ 130
حضرت نوح کی سب سے زیادہ مخالفت کی وجہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد پر دوسروں کو ہیچ تصور کرنا تھا ______ 130
طبقاتی اونچ نیچ کا تصور تو وحی کے تصور کے ہی خلاف ہے ______ 131
قرآنِ حکیم کا مالی طبقات کی بنا پر نفرت کرنے والوں کو جواب 131
کیا قرآن حکیم نے مرتد کی سزا قتل تجویز کی ہے؟ ______ 132
اسلام بزور شمشیر پھیلائے جانے کے غلط پروپیگنڈہ کا نتیجہ ______ 132
اسلام کو قبول کرنے اور اس پر کاربند رہنے کے لیے قلب ودماغ کا یک رنگ ہونا شرط ہے ______ 132
نبی کی ذات تو ذاتی مفادات سے ہمیشہ بالاتر ہوتی ہے ______ 133
قوموں کی تعمیر کے لیے اس سنت رسول کو اپنائے بغیر دین مذہب کی شکل میں ایک پیشہ بن کر رہ جاتا ہے ______ 133
دیہات کے اندر امام مسجد کی حیثیت ______ 134
سنت رسول یہ ہے کہ وہ اپنی محنت کا صلہ انسان کی بجائے خدا سے حاصل کرنے کا طلب گار رہتا ہے ______ 135
مردے کے علاوہ جس کے سینے میں بھی دل ہوگا، اس میں

خواہش کا ہونالازم ہے ____________ 135
انسانوں کا اگر وزن کرنا ہو تو انہیں انسانیت کے ترازو میں
تولنا ہوگا ____________ 136
زندگی کو آسان اور کامیاب بنانے کا طریق وہ یہ خیال کہ
میں نے بھی خدا کو جواب دینا ہے ____________ 136
ہر قسم کے استبدادی نظام سے محفوظ اور بے خطر رہنے کا طریق _ 137
ہر آن پندارِ نفس کی زنجیروں میں گرفتار رہنے والا شخص کبھی
سکونِ قلب کی لذت سے آشنا ہو ہی نہیں سکتا ____________ 138
حضرت نوح کے بعد نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی ایک
محفل کا ایک ذکر ____________ 138
مخلص لوگوں کو اپنی محفل سے نکال دینے کے عمل کو بہت
بڑا ظلم کہا گیا ہے ____________ 138
کشف والہام اور پیش گوئیاں کرنے والوں کے متعلق
قرآن حکیم کا فیصلہ اور پھر آپ ﷺ کا فرمان ____________ 139
قرآن حکیم کی طرف سے بیان کردہ حقائق کے تحت
سابقہ تاریخی واقعات کو پیش کرنے کا مقصد ____________ 140
ایک امیر اور صاحب ثروت کے مقابلے میں کسی غریب کے
لیے جنت کا حصول کیونکر ممکن ہوگا؟ ____________ 141
خدا کے نزدیک عزت اور ذلت کا معیار مال و دولت کی
بجائے جوہر ذاتی پر ہے ____________ 142
حضرت نوعؑ کی طرف سے پیش کردہ دعوت کے جواب میں
قوم نوح کا تکرار ____________ 142
ظہورِ نتائج کے وقت کوئی نہیں ٹال سکے گا ____________ 143
ناصح لفظ کا لغوی مفہوم یعنی چاک گریبان کو سی دینے والا ____ 144
قرآن حکیم کا منجانب اللہ ہونے کا کیا ثبوت ہے ____________ 144
قرآن حکیم کی پیش کردہ تعلیم کا آن میرٹ ہونا ہی من جانب
اللہ ہونے کا ثبوت ہے ____________ 145
نزولِ قرآن سے پہلے عقل انسانی کے مختلف پہلو ____________ 145
حضرت نوح کے دور میں عقل انسانی کی راہنمائی کے لیے
ایک غیر متبدل سنہری اصول ____________ 146
تنہا عقل انسانی کا معیار دیکھنا ہو تو علامہ پرویز کی کتاب
انسان نے کیا سوچا قابل ذکر ہے ____________ 146
انسان نے کیا سوچا' کے دوسرے ایڈیشن کی کوشش ____________ 147
ہم خیال لوگوں کو ساتھ لے کر کسی دوسرے مقام کی طرف
نوعؑ کو ہجرت کا حکم ____________ 148
آخری حد تک انتھک کوشش کے باوجود پیغام حق پہنچانے
کی ترغیب اور شانِ رسالت ____________ 149
طوفان نوح سے محفوظ رہنے کی ترغیب اور قانون خداوندی
کی اہمیت ____________ 149
فرعون کے اقتدار اور ایک نبی کی سرپرستی میں نمایاں فرق
ہوتا ہے ____________ 151
نظام سرمایہ داری کو مستحکم کرنے کے سلسلہ میں ایک
مقدمہ کی روئداد ____________ 151
قانون کی حاکمیت کسی نبی کی حمایت کو بھی قبول نہیں کرتی ____ 152

چھٹا باب: سورۃ ھود (آیات 38 تا 46)

ہر نبی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا دین ہمیشہ ایک ہی
نوعیت کا ہوتا تھا ____________ 153
مذہبی سوچ ہمیشہ فرقے پیدا کرتی ہے جب کہ دین اجتماعیت
کا علمبردار ____________ 153
مذہبی پیشوائیت نے تو خدا کی اطاعت اور محکومیت کو پرستش

اور پوجا پاٹ میں بدل دیا ہے ______ 154
قوم حضرت نوحؑ کی طرف سے پیش کردہ دین پر کیا جانے
والا اعتراض ______ 154
عقل انسانی کے بیسیویں صدی کے سفر زندگی کا نتیجہ ______ 155
انسانی دنیا تو آج بھی طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کے پروگرام
میں عملی طور پر تیار نہیں ہوئی ______ 155
قرآن حکیم کے نزدیک انسان کے جوہر ذاتی اور کردار کی بلندی کا
راز مکافاتِ عمل اور زندگی کے تسلسل پر ایمان لانے پر ہے ___ 156
ہر انسانی بچہ روح خداوندی کا پیکر ہونے کی بنا پر
واجب التکریم ہے ______ 157
سوشلسٹ اور کمیونسٹ مما لک میں wages کے معیار کا
معاملہ جسے عقلِ انسانی آج تک حل نہیں کر سکی ______ 157
سیلاب کی تباہ کاریاں ہوں یا کوئی اور خرابی اس کی بنیادی وجہ
انسانوں کی اپنی کوتاہی اور بدنیتی ہوتی ہے ______ 157
لفظ متقی یا تقویٰ کا قرآنی مفہوم اور اس سے لاتعلقی کا نتیجہ ___ 158
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے یعنی تقویٰ باقی نہیں ہے
ہم متقی نہیں ہیں ______ 159
ہم نے تو خدا پر ایمان کو مسجد کی چار دیواری تک محدود کر رکھا ہے 159
قرآن حکیم کا فرمان یہ ہے کہ قوموں کی تباہی و بربادی ہمیشہ
با اختیار لوگوں کی بدکرداری کی وجہ سے ہوتی ہے ______ 160
اگر انتظامی مشنری مخلص ہو تقویٰ شعار ہو تو پھر سیلاب بھی
تباہ نہیں کر سکتا ______ 160
قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بدل جانے سے قرآن حکیم کی
پوری تعلیم اور تصورات ہی بدل گئے ہیں ______ 161
کسی نبی کا خدا کو پکارنے کا مفہوم ______ 162
حضرت نوح کی دعا پر انہیں کشتی بنانے کا حکم اور پھر اس
پر عملی طریق ______ 162
انسان کو دنیا کے حوادث کا علاج قوانین کے مطابق خود کرنا ہوگا 163
جاگیرداری سسٹم کا یہ خاصہ ہے کہ انسان میں وہ رعونت پیدا
کر دیتا ہے ______ 164
مخالفین کی طرف سے رعونت کا جواب اور حضرت نوح
کے پروگرام کی تکمیل ______ 165
غلط معاشرے میں صحیح نتائج کے حصول میں رکاوٹ کی بنیاد ___ 166
ہمارے ہاں طوفانِ نوح کے متعلق داستانوں کی نوعیت ___ 166
ہمارے ہاں قرآن حکیم کی بیان کردہ تفاسیر کی نوعیت اور ان
کا مقام ______ 167
حضرت نوحؑ کی کشتی کے متعلق تفسیر ابن کثیر کا بیان ______ 168
کشتی میں گدھے اور شیطان کے سوار ہونے کا قصہ ______ 169
کشتی میں شیر کی موجودگی میں دوسرے جانوروں کی پریشان
حالت اور پھر اس کا علاج ______ 169
افسوس کہ ہمارے ہاں کی یہ تفاسیر نبی اکرم ﷺ کی طرف
منسوب کی جاتی ہیں ______ 170
کشتی نوح کے متعلق حضرت ابن عباس سے ایک روایت ___ 170
سکھوں کے لیے ایک کالج کی تعمیر کا دلچسپ تاریخی واقعہ _ 170
سیلاب کے اتر جانے کے بعد جو دیکھا کہ کعبہ کا طواف کرنے
والی کشتی تو پہاڑ پہ ٹکی ہوئی ہے ______ 171
عقل انسانی تیرہ سو سال سے ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے ___ 171
کشتی میں اپنے اہل کو یعنی ایمان لانے والوں کو ساتھ لے لیں 171
لفظ بسم اللہ کے سطحی مفہوم کے برعکس اس کا حقیقی مفہوم جو
بڑا معنی خیز ہے ______ 172

لفظ اسماء الحسنٰی کی وضاحت _____ 172
بسم اللہ کے بعد الرحمٰن اور الرحیم خدا تعالیٰ کی وہ جامع
صفات ہیں جو انسان کے مقصد کو متعین کرتی ہیں _____ 173
سیلاب کے دوران حضرت نوحؑ کی طرف سے بیٹے کو محفوظ
رکھنے کی کوشش، خدا تعالیٰ سے التجا اور پھر اس التجا کا جواب ___ 174
بارش تھم گئی جو کشتی میں سوار نہ ہوئے وہ ڈوب گئے _____ 175
آب آخر پر حضرت نوحؑ کی اپنے دل کی ایک چبن کے
ساتھ خدا کے حضور حاضری _____ 175
ذاتِ خداوندی کے نزدیک اہل ہونے کا معیار تو وحی کی
روشنی میں متعین ہوتا ہے _____ 176
قرآن حکیم کی روشنی میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہوتا
ہے، خونی رشتہ کوئی رشتہ ہی نہیں ہوتا _____ 176
بدر کے میدان میں تو قرآن حکیم نے اپنے ہاں دو قومی
نظریہ کی وضاحت دوٹوک الفاظ میں کر دی تھی _____ 177
وحی کی روشنی میں قومیت کا حقیقی تصور سامنے آنے پر
حضرت نوح کی طرف سے خدا کے حضور توبہ قبول کرنے کی التجا 178

ساتواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 47 تا 49)

قرآن حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا مقصد
غیر متبدل ابدی حقائق کو پیش کرنا ہوتا ہے _____ 179
تمدنی زندگی کے رشتوں اور نظریاتی تعلقات میں ایک
بنیادی فرق ہوتا ہے _____ 179
نبی کی بشری حیثیت اور احکامِ خداوندی میں فرق _____ 181
سیلاب کی تباہ کاریوں سے ہونے والے نقصانات کا ذکر ___ 182
حضرت نوحؑ کے زمانے کا سیلاب کوئی عالمگیر سیلاب نہ تھا ___ 182
خدائے رحیم کی طرف سے سامانِ رزق کی دستیابی تو ہر کسی
کے لیے ہوتی ہے _____ 184
طبعی چیزوں کی فراہمی، طبعی قوانین کے ذریعے ہی ملتی ہیں ___ 184
کائنات کی ہر شے کو بنی آدم کے لیے تابع تسخیر کر دیا ہے ___ 185
قدرت نے کائنات کا ذرہ ذرہ پوری انسانیت کے لیے کھولا ہے 186
جو کوئی طبعی فوائد حاصل کرنا چاہے یا اُخروی اور یا پھر دونوں، یہ چیز ہر
انسان کے لیے برابر ہوگی _____ 186
طبعی قوانین کے ضابطے کے برعکس انسانیت کے اقدار کا
ضابطہ اور اس کی وضاحت _____ 186
مارکیٹ میں بھاؤ کے چڑھانے کا طریق اور اس کے اثرات _ 187
آج کے دور میں معاشرتی طور پر ضروریات زندگی کی ترسیل
کا طریقہ کار _____ 188
قانون خداوندی کے ہر دو پہلو اور ان کو اپنانے کا طریق
اور پھر ان کے ثمرات _____ 188
اُخروی زندگی میں اقدار خداوندی کو نظر انداز کرنے
والوں کا انجام _____ 189
قدرت کی طرف سے اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی
دونوں کے لیے واضح اصول موجود ہیں _____ 189
جہنمی معاشرے سے بچنے کے لیے زندگی کے ہر دو پہلوؤں
کو پیش نظر رکھنا ہوگا _____ 189
دنیا و آخرت کے عذاب سے محفوظ رہنے کا علاج _____ 190
اسلام تو دین و دنیا کے قوانین پر عمل کرنے کا نام ہے _____ 191
آج پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ جہنم کی زندگی بسر کر رہی ہے _ 191
وحی کے قوانین کے بغیر رزق کی فراوانی یا رزق کی فراوانی
کے بغیر قدم قدم پر محتاجی، دونوں جہنم کی زندگی ہے _____ 192
علمِ غیب یعنی خواہ آنے والے واقعات ہوں یا کوئی گذرے

ہوئے واقعات' اس کا علم صرف خدا کو ہی ہوتا ہے ______ 192
سائیں جی اپنے ارد گرد جھرمٹ میں بیٹھے' آنے والے
وقت کی نقاب کشائی کر رہے ہوتے ہیں __________ 193
حصول مقصد کی خاطر اس کے طریق کار پر یقین محکم
ہونا ضروری ہے ____________________ 194
دعا خواہ وہ کسی نبی کی طرف سے ہو اس کی قبولیت کا
دارومدار قوانین خداوندی کی بنا پر ہی ہوتا ہے ________ 194
قومیت کا ابدی معیار جو اپنے اور بیگانوں کے فرق کو واضح
کرتا ہے وہ صرف وحی کے غیر متبدل اصول ہی ہیں _____ 195
محمود غزنوی کے عہد میں ایک مردِ مجاہد کی کہانی اس کی
ماں کی زبانی ______________________ 196
حرام اور حلال کی تمیز حیوان اور انسان میں فرق پیدا کرتی ہے _ 196

آٹھواں باب: **سورة ھود** (آیات 50 تا 53)

سورۃ ھود میں انبیاء سابقہ اور اقوام گزشتہ کی باہمی کشمکش کی
داستانِ جلیلہ کو بیان کرنے کا انداز __________ 198
سورۃ ھود کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا فرمان کہ اس سورۃ
نے تو مجھے بوڑھا کر دیا ہے __________ 198
قرآن حکیم میں قوموں کے نشیب و فراز کو بیان کرنے کے
پیش نظر قوم عاد کے جرم کا ذکر __________ 199
انسانی ذات کو دوام بخشنے کا بہترین طریق انسانیت کی
منفعت سازی میں ہے __________ 200
ہر قسم کی وہ صنعت جو انسان کے ذاتی مفاد یا ذاتی شہرت کی
حامل ہو کبھی دوام حاصل نہیں کر سکتی __________ 201
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ حقائق کبھی پژمردہ
نہیں ہوتے ____________________ 202
قوانین خداوندی کی اطاعت کا واحد طریق وہ ایک مرکزی
اتھارٹی ہوگی جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی ________ 202
آج ہمارے دور کی مہذب اقوام جو سمع، بصر اور فواد کی نعمتوں
کی مالا مال ہیں ان کے ہاں Values کی کوئی اہمیت نہیں _ 203
قوم عاد سمع' بصر اور فواد کی نعمت سے مالا مال ہونے کے باوجود
آخر پھر کیوں تباہ ہوئی ________________ 204
قومِ عاد کا پہلا جرم جو ان کی تباہی اور بربادی کی سبب بنا ____ 204
آج کے سائنٹفک دور میں اقدار سماوی یا اخلاقی اقدار کو نظر
انداز کرنے کے نتیجہ میں کرہ ارض کی حالت زار اور
قرآن حکیم کا ارشاد ________________ 205
اپنی خواہشات کو ہی معبود بنا لینے والوں کا حشر ________ 206
یورپ کی قوموں کے مدبرین کی چیخ و پکار __________ 206
لفظ ھو د کا لغوی مفہوم ________________ 207
علم و آدب کے اس دور میں انسانی جذبات کی حکمرانی
اور پھر مصائب و آلام کی جہانگیری ____________ 207
جذبات کی حکمرانی انسانی سماعت و بصارت کو پامال کر دیتی
ہے' مفلوج کر دیتی ہے ________________ 208
قدرت کی طرف سے انسانی جذبات ایک بہت بڑا عطیہ
ہے بشرطیکہ انہیں وحی کی حدود میں رکھا جائے ________ 208
اہل جہنم کی پہچان کی وضاحت ____________ 208
قوم عاد کے فولادی پنجے کا نتیجہ اور پھر تصوف کے ہاں
قرآنی مفہوم کے برعکس لفظ تکبر کا مفہوم __________ 209
تصوف کے نزدیک سب سے بڑی عبادت' خودی کو مٹانا ہے جب
کہ کبریائی کی یہ صفت اپنے ہاں ایک اہم مفہوم لیے ہوئے ہے 210

الحق کو قبول کیے بغیر استکبار کے حصول کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوسکتی ___ 211
وحی کی تعلیم کے برعکس تصوف کی دنیا میں استکبار یا تکبر کو توفی ذاتہٖ برا جانا جاتا ہے ___ 211
قرآن کریم نے الحق کے ساتھ شمشیر بھی عطا کی تا کہ نظامِ عدل قائم کیا جاسکے ___ 211
نظامِ عدل کے ساتھ قوت کا حصول لازم وملزوم ہیں ___ 212
ساری کائنات قرآن اور تلوار یا تلوار اور قرآن کے گرد ہی گھومتی ہے ___ 212
ذہنی افترا کی بجائے قانون خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہونا کامیابی کی ضمانت ہے ___ 213
داعیٔ انقلاب کی دعوت کسی اجرت کا طلب گار نہیں ہوتی ___ 214
انسانی زندگی کے ایک نفسیاتی پہلو کی نشاندہی ___ 214
اپنی غلطی کا عملی طور پر اعتراف کرتے ہوئے صحیح راستے کو اختیار کرنا' اسے استغفار کہا گیا ہے' اسے توبہ کہا گیا ہے ___ 215
قوم عاد کا ذریعہ معاش اور خدا کے نظام ربوبیت کی وضاحت ___ 215
خدا کی اس قدر رحمانیت کے برعکس انسان کے حسنِ سلوک کی مجرمانہ کیفیت ___ 216
افسوس اور صد افسوس کہ اس قدر واضح اور کھلی نشانیوں کے باوجود عجوبہ پرستی کا مطالبہ ___ 216

نواں باب: سورۃ هود (آیات 54 تا 60)

قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی معاشرے کی تشکیل ہمیشہ اطمینان قلب عطا کرے گی ___ 218
صداقت کبھی فوق الفطرت امور کی محتاج نہیں ہوتی ___ 219
حضرت انبیاء کرام اپنی قوم کے اندر بلند صفات کے حامل ہوتے تھے ___ 220
قومِ عاد کی حضرت ھودؑ سے ناروا گفتگو ان کی جہالت اور پست سوچ کا عکس تھی ___ 220
بغیر کسی مفاہمت کے حضرت ھود کی طرف سے اپنے جذبہ ایمانی کا اظہار ___ 221
خدا کی ربوبیت کا سلسلہ تو بغیر کسی تفریق کے پوری نوع انسانی کے لیے یکساں ہے ___ 222
خدا کی طرف سے صحیح منزل کی نشاندہی صراطِ مستقیم کی شکل میں نہایت واضح طور پر پیش کر دی گئی ہے ___ 223
صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے کہ جس پر خدا خود اور اس کی یہ پوری کائنات چل رہی ہے ___ 223
خدا کی طرف سے صراطِ مستقیم کی وضاحت مکمل طور پر کتاب اللہ کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے ___ 224
قرآنی نظام حیات کے راستے کی پہلی کڑی نظامِ صلوٰۃ ہے ___ 224
اجتماع صلوٰۃ یا نماز کے اجتماعات دراصل یہ نظام صلوٰۃ کی ہی ایک سمٹی ہوئی شکل ہے ___ 225
قرآن حکیم نے صراطِ مستقیم کا ایک دوسرا نام الاسلام بھی کہا ہے 225
نبی اکرم سے کہا گیا کہ وحی سے قبل تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وحی کیا ہوتی ہے ___ 226
صراطِ مستقیم کی اہمیت کے پیش نظر قرآن حکیم کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ___ 226
القرآن کے بیان کردہ اس ایک راستہ پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ___ 227
اس شاہراہ پر یا اس صراطِ مستقیم پر چلنے والوں میں تفرقے کا کوئی نشان تک بھی نہیں ہوتا ___ 227
امت ہو نبی اکرم کی اور اس کے اندر تہتر فرقوں کا وجود سب

سے بڑا فریب ہے، سب سے بڑا دھوکہ ہے ______ 227
الدین پر کاربند نہ رہنے کا نتیجہ مختلف فرقے مختلف پارٹیاں
مختلف اقوام اور مختلف مملکتیں ______ 228
قرآن حکیم کے نزدیک کفر اور ایمان کی پہچان ______ 228
کیا خدا کے پیچھے پیچھے چلنے کا یہی طریق ہے کہ ہم صدیوں
سے صلوٰۃ کے نام پر، قدم قدم پر انتشار کا شکار ہیں ______ 229
رسالت کا فریضہ دوسروں کو حقائق سے آگاہ کرنا ہے، زبردستی
اپنی بات منوانا نہیں ______ 229
ہم نے اپنے اپنے طور پر عذاب کے لیے ایک خاص
تصور قائم کر رکھا ہے ______ 230
قوموں کے تمام تر زوال کی اصل وجہ اخلاقی طور پر
کمزور ہونے میں ہے ______ 231
قوموں کی سرفرازی کا راز لفظ انفاق کو عملی شکل دینے میں ہے _ 231
قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ساری بنیاد انفاق (کھلا رکھنے)
پر ہے خرچ کرنے پر نہیں ______ 231
دوسروں کو محروم کرنے والا شخص دراصل وہ خود محروم ہو جاتا ہے 232
انفاق کے نظام پر عمل نہ کرنے والی قوم کی جگہ ایک دوسری
قوم آجائے گی ______ 233
نظامِ صلوٰۃ کے لیے نظام نفاق کو محفوظ رکھنے کی خاطر
جہاد کی اہمیت ______ 233
زندگی میں قوموں کے لیے اذیت ناک عذاب کسی دوسری
قوم کا محکوم ہو جانا ہے ______ 233
ہندوستان میں انگریز کے خلاف جنگ مسلمانوں نے شروع کی۔
جہاد کی یہ سکیم شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کی تھی ____ 234
انگریز مسلمانوں کی طرف سے جہاد کے جذبے سے خائف تھا
چنانچہ ایک قادیانی نبی پیدا کیا گیا ______ 235
تعمیری صلاحیتوں سے محروم قوم اپنے اقتدار کی کبھی
حفاظت نہیں کر سکتی ______ 235
ہجرت کے دوران مکہ میں رہ جانے والے مسلمانوں کی
مشکلات کے حل کے لیے قرآن حکیم کی راہنمائی ______ 236
انسانی زندگی کے معاملات کا حل انسانوں کے ہی ذریعے
سرانجام پاتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا ایک تاریخی فقرہ _ 236
جب تم خدا کے ہاں دعا کرتے ہو تو یہ تو میری خدا کے
ہاں شکایت ہو جاتی ہے ______ 237
محمد بن قاسم کی شکل میں خدا کے نام پر حکومت کرنے
والوں کا کردار ______ 237
مملکت اسلامیہ کا فریضہ اور ہمارے اس دور میں جہاد
کے خلاف دو خود ساختہ نبیوں کا اعلان ______ 238
انبیائے کرام اپنے فریضہ نبوت کی ادائیگی میں شب و روز
مصروف کار رہتے تھے ______ 238
سرکش لوگوں کی اتباع کرنے والوں کا نتیجہ ______ 239
قرآن حکیم میں پیش کردہ واقعات زندگی کے حقائق کی
نشاندہی کرتے ہیں ______ 239
قرآن حکیم میں قوم عاد اور قوم ثمود کے پیش کردہ واقعات
اپنے اندر ابدی حقائق لیے ہوئے ہیں ______ 240

دسواں باب: **سورۃ هود** (آیات 61 تا 68)

ذات برادری کا معاملہ ہو یا رنگ و نسل کا امتیاز ہو یا خونی
رشتوں کی رفاقت کا یہ تو سب چیزیں اضافی ہیں ______ 242
قوم عاد کی مجرمانہ زندگی کے خدوخال کی وضاحت ______ 243
وحی خداوندی کی روشنی میں قوم ثمود کا طرزِ زندگی خدا کی

عبودیت اور ملوکیت کی وضاحت ____ 243
خدا کو پکارنے کا مفہوم اور اس کا طریق کار ____ 244
ذاتِ خداوندی تو اپنے بندوں کے درمیان کسی مقرب
کی شمولیت برداشت ہی نہیں کرتی ____ 245
مقام نبوت سے سرفراز ہونے والی شخصیت بلند ترین
صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے ____ 246
نبی کی سیرت، اس کا کردار بذاتِ خود ایک معجزہ ہوتا ہے ____ 246
نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ صبح نور کی طرح روشن
اور سپیدہ سحر کی طرح بے داغ تھا ____ 247
نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان کا بیان ____ 247
ہر قوم کے دل میں پیدا ہونے والی اضطرابی کیفیت ____ 248
طبقاتی معاشرے کی تباہی ہمیشہ عوام پر اثر انداز ہوتی ہے ____ 249
مستبد نظام کی پیدا کردہ وسوسہ اندازیوں کے اثرات ____ 249
قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں تیسرا جرم زمین پر ذاتی ملکیت
کے نظام کی حقیقت ____ 250
حضرت صالح کا اس وقت کے سرداروں کے ساتھ کیے گئے
ایک معاہدہ کی روئداد اور اس کا انجام ____ 251
خدا کے نام پر ایک آزاد اونٹنی کا قصہ ____ 252
خدا کا نظام ربوبیت خدا کی زمین خدا کی مخلوق کے لیے کھلی رکھو 252
دین خداوندی کے مقابلے میں وہ خود ساختہ مذہب، جس نے
قرآن حکیم کے تصورات کو ہی بدل دیا ____ 252
کرہ ارض پر عباد اللہ کی بجائے انسانوں کا عبد بننے کا نتیجہ ____ 253
حضرت صالحؑ کے ساتھ اونٹنی کے سلسلہ میں کیے گئے وعدے
سے پھر جانے کا فطری نتیجہ اور عذاب کی نوعیت ____ 254
اونٹنی کو مار دینے کی اصل وجہ طبقاتی تقسیم تھی ____ 255
انسانوں کی تمدنی زندگی میں تقسیم کار مقصد باہمی تعاون کہلاتا ہے
وہاں طبقاتی تقسیم نہیں ہوتی ____ 255
قرآنی معاشرے میں تقسیم کار کا اصل مقصد باہمی احترام کو
درجات میں تقسیم کرنا نہیں ہوتا ____ 256
معاشرتی تفاوت اور ناہمواریوں کو قائم رکھنے کا نتیجہ یہ کہ غلط نظام
پر روڈ رولر پھیر دیا گیا ____ 256
چار ہزار سال پیشتر سے رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کے
تباہ کن اثرات کو مٹانے کے لیے حق و باطل کی جنگ ____ 257
باطل کے نظام کو مٹانے کے لیے مذاہب پرست طبقہ سب
سے بڑی رکاوٹ رہا ہے ____ 257
یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ نہیں مل سکتا ____ 258
پوتے کو دادے کی وراثت سے حصہ دلانے والا پرویزؒ کافر ہے 258
حضرت موسیٰ کو فرعون کے دربار میں مذہبی پیشوائیت کا سامنا
اور پھر حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیاسی بھیڑوں کا قصہ ____ 259
ہمارے ہاں پیش کیے جانے والے وعظوں کی کیفیت اور ان حقائق
سے دوری جن کا ذکر قوم نوحؑ قوم عاد اور قوم ثمود میں کیا ہے؟ 260
قرآن حکیم کے نزدیک قوموں کے لیے سب سے بڑا عذاب
ذلت و مسکنت ہے، بھوک ہے، خوف و حزن ہے ____ 261
گیارہواں باب: سورۃ ھود (آیت 69)
قرآن حکیم میں پیش کردہ داستانوں کا مقصد قوموں کے
عروج و زوال کے اسباب کو واضح تر انداز میں بیان کرنا ہے ____ 262
قرآن حکیم کی سورۃ ھود میں قوم نوحؑ، عاد اور قوم ثمود کی داستانوں
میں زندگی کے حقائق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے ____ 263
رب العالمین کی طرف سے اس قدر رزق کی فراوانی کے
باوجود انسانوں کے خود ساختہ نظامِ معیشت کا نتیجہ ____ 264

خالق کائنات نے مخلوق خدا کی زندگی کو دوام بخشنے کے لیے
خاطر خواہ انتظام کر رکھا ہے ______ 264
جنسی معاملات کی سنگینی کو نظر انداز کرنے کا تصور قوموں کو
صدیوں تک موت کی نیند سلا دیتا ہے ______ 265
افزائش نسل کے عمل کو وجہ تعیش تک پھیلا دینے کا نتیجہ لواطت
تک پہنچ گیا ______ 265
قوم لوط کے سلسلہ میں صحبت ہم جنس کے الفاظ کی بجائے
لواطت کا لفظ زیادہ مناسب نہیں ہے ______ 266
تہذیب مغرب کے ہاں اتنی ترقی اور پھر اتنی پستی اور اس
پستی کے تحفظ کے لیے قانون کی بالادستی ______ 266
قرآن حکیم نے انسان کی اس حیوانی سطح کے لیے اسفل
سافلین کے الفاظ استعمال کیے ہیں ______ 267
جنسی بدنہادی کی تسکین کے لیے مختلف افعال کا ذکر ______ 267
وحی کی روشنی میں اس بدنہادی کی فضا سے محفوظ رہنے کا طریق ___ 268
سیکس اینڈ کلچر پر محققین یورپ کی تحقیق اور J.D.Unwin
کی سعی و کاوش ______ 268
ہمارے ہاں کے محققین کی حالت ______ 269
J.D.Unwin کی تحقیق یہ ہے کہ سیکس پر پابندی نہ کرنے والی
قومیں زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ رہتی ہے ______ 269
جنسیاتی بے راہ روی کی بنا پر کسی قوم کا سو سال تک زندہ رہنا
بھی مشکل ہو جائے گا ______ 269
لفظ معصیت عصیان اور زنا کا وہ حقیقی مفہوم جو بڑا ہی
غور طلب ہے ______ 270
سیکس کی بے راہ روی انسانوں کو اور قوم کو اعصابی بیماریوں
کے علاوہ نفسیاتی طور پر کمزور کر دیتی ہے ______ 270
عصمت اور عفت کے الفاظ عورت اور مرد دونوں کے لیے ہیں،
صرف عورت کے لیے نہیں ______ 271
اگر مرد باعصمت ہو تو عورت بے عصمت ہو ہی نہیں سکتی ____ 271
عصمت فروشی کے سلسلہ میں تحقیقی مرحلہ کے دوران
علامہ پرویزؒ سے کیے گئے سوال کا جواب ______ 272
J.D.Unwin کی کتاب کے آخری الفاظ ______ 272
قومِ لوط کا جرم جو بدترین شکل اختیار کر چکا تھا جس کا نتیجہ
وہ Dead Sea جہاں کوئی زندہ ہی نہیں رہتا ______ 273
انسانوں کی شکل میں فرشتوں کا تصور تو قرآن حکیم کے
ہی خلاف ہے ______ 273
وحی کی کنہ حقیقت کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا ______ 274
مقام نبوت ہو یا مقامِ وحی کوئی شخص بھی اس کی ماہیت کو
نہیں جان سکتا ______ 276
وحی کی صرف ایک ہی شکل تھی جو آج قرآن حکیم میں محفوظ ہے
اور اسی کا نام ختم نبوت ہے ______ 277
الہام اور کشف یہ سارے خودساختہ تصورات ہیں ______ 277
السلام علیکم کے الفاظ بڑے پُرمعنی مفہوم اپنے اندر لیے
ہوئے ہیں ______ 278
ملائکہ کے متعلق ہمارے ہاں پائے جانے والے
تصورات کی نوعیت ______ 278
باہمی میل جول کے دوران دوسروں کے اطوار کا اندازہ کرنا
مشکل نہیں ہوتا ______ 279
آواز جو سنائی نہ دے کے الفاظ اپنے اندر ایک گہرا مفہوم
لیے ہوئے ہیں ______ 280
حضرت اسماعیل کے بعد حضرت سائرہ کے ہاں حضرت اسحاقؑ

کی پیدائش کا ذکر جس میں کوئی مافوق الفطرت بات نہ تھی ___ 280
قوم لوطؑ کی بدنہادی پر حضرت ابراہیمؑ کی وساطت سے
وحی کا پیغام ___ 282
حضرت ابراہیمؑ کی حلیم الطبع شخصیت کی خصوصیات کی
حقیقی شکل وصورت ___ 282
عربی زبان میں حلیم کے لفظ کا استعمال اور مومن کی سیرت کا بیان 283
عیسائیت کے ہاں صفات خداوندی کا ذکر اور پھر
قرآن حکیم کا بیان ___ 284
مومن اپنے قلب ونظر میں ایک سرجن کی حیثیت سے
فرائض سرانجام دیتا ہے ___ 285
لفظ منیب کا قرآنی مفہوم اور اس کے استعمال کا طریق ___ 285
نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ___ 286
علامہ پرویزؒ کے نزدیک قرآن حکیم تو ایک ایسی کتاب ہدایت
ہے کہ جسے درساً درساً پڑھنا چاہیے ___ 286
عربوں کے ہاں لفظ منیب کا استعمال جو بڑا روح پرور ہے ___ 286
اقبال کے نزدیک مردِ مومن کی کیفیت تو میدان زندگی میں
یگانہ ہوتی ہے، اعلون ہوتی ہے، منیب ہوتی ہے ___ 287
قوم لوط کے دو بڑے جرائم کا ذکر ___ 288
پریشانی کے عالم میں حضرت لوط کے پاس کچھ مہمانوں کا آنا ___ 289
ہمارے ہاں بیان کردہ تفسیروں کی زبوں حالی ___ 289
ہمارے ہاں کی بھولی بسری باوقار یادوں کا تذکرہ ___ 289
لوط کی طرف سے جذبات کے اندھوں سے بات کرنے کے
لیے رجل رشید کے الفاظ کا استعمال ___ 290
قرآن حکیم نے خدا کو مرشد کے الفاظ سے بھی پکارا ہے ___ 291
حضرت لوط کو قوم کی طرف سے ملنے والا جواب ___ 291
آج کے دور میں دیانتدار انسان کے ساتھ ہونے والا سلوک ___ 292
حضرت لوط کو اپنے اہل کے ساتھ وہاں سے ہجرت
کر جانے کا مشورہ ___ 292
قرآن حکیم کے نزدیک اہل ہونے کا معیار صرف
ہم مسلک ہے ___ 292
تورات کے علاوہ حضرت لوط کی بیوی کے متعلق ہمارے
ہاں کی تفسیری داستان کی نوعیت ___ 293
قانونِ مکافات کے تحت قوموں کی تباہی کی نوعیت ___ 293
قوم لوط کی تباہ ہونے والی بستی Dead Sea کی نوعیت ___ 294
کوئی اگر جہنم کو نہ بھی سمجھے مگر جہنم تو اسے ہر آن دیکھ
رہی ہوتی ہے ___ 294
تورات کو یہودی کتاب مقدس سمجھتے ہیں جب کہ یہ اپنی
اصل شکل میں کہیں موجود نہیں ___ 295
تورات کے اندر حضرت لوط کے متعلق معاذ اللہ معاذ اللہ ان
کی بیٹوں کا بیان ___ 295

تیرہواں باب: سورۃ ھود (آیات 84 تا 95)

سورۃ ھود میں اقوام سابقہ کی داستانوں کو بیان کرنے
کا بنیادی مقصد ___ 297
انسانی زندگی کا پہلا غیر متبدل اصول صرف خدا کی محکومیت ہے 298
قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط کے بعد قوم شعیب کی
داستان یعنی ناپ تول کے اندر بدنظمی کا جرم ___ 299
نتیجتاً تباہ وبرباد ہونے کے خدشات کے باوجود غلط فہمی میں
مبتلا قوم کی سوچ ___ 300
شوشل جسٹس کے اندر معاشی عدل کو ملحوظ نہ رکھنا جرم ہے ___ 300
معاشی عدل کے معاملے میں ناہمواری سب سے بڑا فساد ہے 301

ہمارے ہاں قرآن حکیم کے تراجم کے تحت راستوں میں
ڈاکہ زنی سمجھا گیا ہے؟ ______ 302
نظام سرمایہ داری میں تو سوشل سسٹم کی اقدار کو ہی
بدل دیا جاتا ہے ______ 302
معاشرے کے اصل ڈاکوؤں کی پہچان؛ انکا خرید و فروخت
کا طریق ہے ______ 303
سوشل جسٹس کے بغیر کروڑوں روپے کا بزنس ______ 304
حضرت شعیب کی حق گوئی پر وہاں کے بڑے بڑے چوہدریوں
کی طرف سے حضرت شعیب کو بستی سے نکال دینے کی دھمکی _ 304
آج سرمایہ داری کی بنیاد پر ہی یہودیوں کی چابک دستی نے پورے
یورپ کو اپنے ہاتھ میں کیا ہوا ہے ______ 305
قوم شعیب کی داستان اور آج ہماری داستان میں کیا فرق ہے؟ 305
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ اصول جو ہر دور کے لیے
اور ہر قوم کے لیے ہیں وہ دعاؤں سے نہیں بدلا کرتے ______ 306
انسانی زندگی کے ابدی قوانین ہمیشہ ایک ہی نتیجہ مرتب کرتے ہیں 306
آیت نمبر 11:86 کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تراجم
کی نوعیت ______ 307
لغت کے تحت لفظ فنا اور تغیر کا مفہوم ______ 307
وحی کے غیر متبدل اصولوں کے تحت کیا گیا کاروبار کبھی
تغیر پذیر نہیں ہوتا ______ 307
بہترین تجارت کا بہترین اصول ______ 308
حضرت شعیبؑ کا اپنی قوم سے خطاب ______ 308
کسی نہ کسی شکل میں خدا کا تصور تو روزِ اول سے انسانی
ذہن میں موجود ہے ______ 309
حضرت شعیب کی مخالفت کی بنیادی وجہ مذہب کی جگہ
دین کو پیش کرنا تھا ______ 309
حضرت شعیب کی صلوٰۃ پر اعتراض اور پھر قرآن حکیم کی روشنی
میں تصورِ صلوٰۃ اور نماز میں فرق کی وضاحت ______ 310
نماز کے بعد کیے گئے سودے میں رپھڑ پا دینے کی یقین دہانی _ 311
حضرت شعیب کی صلوٰۃ تو کاروبار کی نگہ بان ہوتی ہے ______ 311
نماز کی حدود اور صلوٰۃ کی وسعت میں ایک بنیادی فرق ہے _ 312
دلیل و براہین پر مبنی بات کو جذبات کی نظر نہیں کیا جا سکتا ______ 313
خدا کے قانون کے مطابق حاصل کردہ رزق اور کسی دوسرے
طریق سے پیدا کیے جانے والے رزق کے نتائج میں فرق ___ 313
ہر رسول اپنی تمام زندگی قانون خداوندی کے مطابق ہی
بسر کرتا ہے ______ 313
قرآن حکیم کا لفظ توفیق کے معنی؛ حصول منزل کے لیے
ذرائع کا طلب گار ہونے کے ہیں ______ 314
خدا کے بتائے ہوئے راستے ذرائع کی کمی کو پورا کر دیتے ہیں _ 314
تباہی سے محفوظ رہنے کا طریق قانون خداوندی کی طرف
دل و جان سے رجوع کرنا ہوگا ______ 315
قوانین خداوندی کو عملی شکل دینے کے راستے میں کسی پارٹی
کی طاقت کوئی کام نہیں دیتی ______ 316
معاشرے کی درستگی میں اصل رکاوٹ افسانوں کا خود ساختہ
مذہب ہوتا ہے ______ 316
مذہب کی پیدا کردہ سوچ تو انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی
ہے حتیٰ کہ خدا کی یاد ایک سٹپنی کے طور پر رہ جاتی ہے ______ 317
خدا تعالیٰ کے صحیح تصور کے سلسلہ میں حضرت شعیب کا
اپنی قوم سے خطاب ______ 317
مذہبی تصورات کی جگہ دین خداوندی کی اہمیت اور اس

کے عملی نتائج ____ 318
قرآنی نظام کے عملی نتائج قیامت کا انتظار نہیں کرتے ____ 318
نظامِ خداوندی کو عملی طور پر رائج نہ کرنے کا نتیجہ کہ انسانوں
کی بستیاں کھنڈرات میں بدل گئیں ____ 319

چودھواں باب: سورۃ ھود (آیات 96 تا 109)

سورۃ ھود میں گزشتہ سے پیوستہ دروس میں سابقہ اقوام کی
کبائرالاثم خرابیوں کا ذکر ____ 321
سابقہ اقوام کی تمام وہ خباثتیں جو ہمارے اس دور میں
یک جا ہو چکی ہیں ____ 322
قوم عاد کی کیفیت جو سمع اور بصر کے باوجود لقمۂ اجل بنی ____ 323
فطرت کی قوتوں کو مسخر نہ کرنے والی قوم کو مقام انسانیت
تو کجا مقام آدم بھی حاصل نہیں ہوتا ____ 323
قوم ثمود کی مجرمانہ نوعیت کا تذکرہ ____ 324
قوم لوط کی انسانیت سوز حرکات جو آخر کار اس کی تباہی
کا باعث بنی ____ 324
انسانیت کے سینے پر قابوس بن کر سوار ہونے والی تین لعنتیں
تین شقوں میں تقسیم ہیں ____ 325
فرعون اور ہامان کی محتاجی کو بغیر سمجھے کامیابی نہیں ہو سکتی ____ 325
مذہبی پیشوائیت قوم کی سوچ کو دین کے پیش کردہ لازوال
نظام حیات کی طرف آنے ہی نہیں دیتی ____ 326
نظامِ سرمایہ داری کی چابک دستی کی ایک جھلک
اور اس کا طرزِ گفتگو ____ 326
فرعون کے ساتھ صاحب ضربِ کلیم کی کشمکش کے ٹکراؤ کے
سلسلہ میں حضرت موسیٰ کی طرف سے اپنے بھائی کا مطالبہ ____ 327
حضرت موسیٰ کو قانون کی حکمران کے لیے اتھارٹی کا ملکہ بھی
عطا کیا گیا تھا ____ 327
اس قدر وسیع کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہونے کے
ساتھ ساتھ عناد یا مخاصمت سے بالاتر ہستی ____ 328
حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کی مخالفت اس لیے تھی
کہ وہ رشید نہ تھا ____ 328
قرآن حکیم کے الفاظ کی اہمیت بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے
آنکھ کے تل کے اندر آسمان پوشیدہ ہو ____ 329
نعمائے خداوندی کی قدر و منزلت کو نظر انداز کرنے کا
نتیجہ زندگی کے ہر قدم پر ذلت و رسوائی کی شکل اختیار کرنا ہے ____ 329
ہماری طرف سے قرآن حکیم کے ساتھ سب سے بڑی تحریف
ہی یہ ہے کہ ہم نے ان الفاظ کے معنی بدل دیئے ہیں ____ 330
لفظ شکر کا لغوی مفہوم چھپی ہوئی چیز کا باہر آ جانا تا کہ ہر
ضرورت مند اسے اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کر سکے ____ 330
شکر کے عمل کو نظروں سے اوجھل کرنے کے باعث وہ قوم
ایسی جنس میں بدل گئی کہ جس کا تو خریدار ہی نہ تھا ____ 331
تجارت کی خاطر پانچ پانچ سو میل کا سفر کرنے والی قوم کے لیے
قرآن حکیم سمجھانے کی ایک موثر ترین مثال ____ 331
خدا کے مقابلے میں کسی دوسرے کو خدا بنا لینے کا نتیجہ ____ 332
لفظ لعنت کا مفہوم ہے خوشگواریوں سے محروم رہ جانا ____ 332
نعمائے خداوندی سے محروم رہنا قربِ خداوندی کی
نشانی نہیں ہوتی ____ 333
خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی ہر قوم کی طرف انبیائے کرام
کو بھیجا گیا تھا جو اب صفحہ ارض سے ہی مٹ چکی ہیں ____ 333
طبعی طور پر زندہ رہ جانے والی قوموں کی حالتِ زار کہ جو اپنی
لاشوں کو اٹھانے پھر رہی ہیں اور جن کی تقدیر میں امروز نہیں ہے 334

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں دو پژمردہ قوموں کا تعارف _____ 335
سوال یہ ہے کہ کیا قوموں کی تباہی و بربادی خدا کے
غیر متبدل اصولوں کونظر انداز ہونے کا نتیجہ نہیں _______ 336
قوموں کی تباہی کی بنیادی وجہ تعمیری سوچ کی اجتماعی
روش کو نظر انداز کرنا ہے ______________ 336
مکافاتِ عمل کے تحت ظہورِ نتائج کے وقت اہلِ جہنم کے
باہمی مکالمات بڑے سبق آموز ہیں__________ 337
حضرت نوح سے لے کر قوم عادٗ قوم ثمودٗ قوم مدینٗ اور قوم
شعیب کی بیان کردہ داستانیں قوموں کی موت و حیات کے
واضح تر اصول اپنے اندر لیے ہوئے ہیں__________ 338
عیسائیت کی پیش کردہ تعلیم کے برعکس خدا تعالیٰ کے نزدیک
مکافاتِ عمل کے نتیجے کی نوعیت ____________ 338
خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا لغوی مفہوم__________ 339
قرآن حکیم کے اندر قوموں کے حالات زندگی کی یادداشتیں پیش
کرنے کا مقصد عظیم اور مذہب کی بنیاد پر بنی اسرائیل کی
طرف سے سونے کا بچھڑا بنانے کا قصہ__________ 340
قرآن حکیم نے ان مذہبی پیشواؤں کو تو سامری کے لقب
سے پکارا ہے ________________ 340
انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے ایک
عالم گیر سطح پر ٹکراؤ کی ضرورت ہوگی __________ 341
قرآن کریم نے حق کی نمود کی خاطر تگ و تاز کو کھیتی سے
تشبیہ دی ہے ________________ 341
انسانی ذات کے بیج کو مادیت کے بوجھل ڈھیلے کے نیچے دبا
دینے کا نتیجہ ذات کی چنگاری کو پامال کرنا ہے________ 342
ظہورِ نتائج کی آخری حد سے پہلے مہلت کا وقفہ ایک نعمت ہے 343
ہزار سال سے ملت اسلامیہ کی حالت زار مکافات
عمل کا نتیجہ ہے ________________ 344

پندرھواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 110 تا 114)

سورۃ ھود میں اہم قوموں کا تذکرہ اور ان کی بربادی کے
اسباب اور اس تفصیلی ذکر کا اصل مقصد____________ 345
ابدی حقائق سے لاتعلقی کا نتیجہ ہمیشہ ذلت و رسوائی ہوتا ہے ___ 346
نبی اکرم ﷺ کی بعثتٗ قرآنی حکومت کا قیام اس کا عروج
اور پھر کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے کچھ ہی عرصہ کے
بعد امت کا زوال کیوں؟ ______________ 346
قوموں کی تباہی و بربادی کی حقیقی پہچان __________ 347
قوم بنی اسرائیل کے عروج و زوال کا مختصر سا ذکر _______ 347
قوم مسلم کی تباہی کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے
کتاب اللہ کے بارے میں اختلاف پیدا کر دیا ہے ______ 348
مہلت کے وقفہ سے اگر استفادہ نہ کیا جائے تو یہی چیز اس
کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے ______________ 349
سہل انگیزی اور غلامی قوموں کو نفسیاتی طور پر پژمردہ کر دیتی ہے 349
زندگی کے نشیب و فراز کے سلسلہ میں خدا کا قانون تو بڑا
باریک بین واقع ہوا ہے ______________ 350
نبی اکرم کا ارشاد ہے کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے ___ 350
اے خاندان نبوت کے آخری تاجدارٗ گوہر نایابٗ زندگی کے
ایک ایک لمحہ کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنے والی ہر دل عزیز ذاتِ
اقدسٗ قدم قدم پر ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدھی ہوئیٗ خلق
عظیم کے گوہر تاجدار سے مزین زندگیٗ اے نوع انسانی کی تاریک
راہوں کے روشن چراغٗ اے انسانیت کے توازن بدوش
امامٗ فہم و فراست کے میدان میں صراط مستقیم پر صبر و استقلال

کی صفات کے کوہ پیما، تجھ پہ لاکھوں درود و لاکھوں سلام۔ ___ 350

طاقت کے علاوہ توازن بدوش زندگی کی اہمیت کس قدر ضروری ہے، یہ تاریخ سے پوچھیں، ہٹلر سے، ہلاکو سے چنگیز سے پوچھیں ___ 351

قرآنی معاشرے کی تشکیل کے لیے عقل و شعور اور فہم و ادراک کے علاوہ اعتدال پسند رفقا کی اہمیت اشد ضروری ہوتی ہے ___ 352

مردِ مومن کے سلسلہ میں واجب الاحترام بیگم شرف النساء نے زندگی بھر اپنی قمر میں تلوار اور ہاتھ میں قرآن رکھا ___ 352

تلوار کا قرآن حکیم کے ساتھ رشتہ ___ 353

نبی اکرم ﷺ کی قوت نافذہ کے ساتھ عرب کے علاوہ ایران اور روما کی سلطنتوں کی طرف سے مخالفت کے مختلف طریق ___ 354

قرآنی ضابطہ حیات کی طرف سے پیش کردہ قوانین دو اور دو چار کی طرح اٹل ہوتے ہیں ___ 354

خدا تعالیٰ کی اس تصنیف میں تبدیلی کرنے کا میں مجاز ہی نہیں یہ تو خدا کے ہاں بہت بڑا جرم ہوگا ___ 355

مشرکین کی یہ کوشش ہے کہ تو اس راستے سے ذرا پھسل جائے ___ 355

پھسل جانے کے سلسلہ میں امام اعظم کے حوالے سے ایک سبق آموز مثال ___ 356

مستشرقین کے علاوہ خود ہمارے اپنے ہاں قرآن حکیم کے خلاف تراجم میں بہت کچھ موجود ہے ___ 357

قرآن حکیم کے حکم کے برعکس ہر مسجد کے ماتھے پر پتھر میں کندہ فرقہ بندی کا نشان کیوں؟ ___ 358

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن حکیم کی تعلیم واضح نہیں؟ لاریب نہیں؟ کیا اس میں جگہ جگہ تضاد ہے؟ ___ 359

ہمارے ہاں فرقہ بندی کی انتہا یہ ہے کہ ایک فرقے والا دوسرے فرقے کی مسجد میں جانا پسند نہیں کرتا ___ 360

قرآنی فکر کے متعلق قرآن حکیم کا اپنا دعویٰ ___ 360

وحی کی تعلیم میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے وحی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ___ 360

پہلی وحی کے مقابلے میں اس دوسری وحی کی اہمیت کی بنیاد پر کئی ایک فرقوں کا وجود اور پھر قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کا عمل ___ 361

شاہ ولی اللہ نے 500 منسوخ آیات کو کم کر کے 5 تک محدود کر دیا اور پھر مولانا سندھی کا تبصرہ ___ 362

قانونِ وصیت کے سلسلہ میں قرآن حکیم سے ٹکراؤ پیدا کرنے کی جرأت ___ 362

طباعت کی غلطیوں کی احتیاط کا معاملہ ___ 363

مذہبی فرقہ بندی کے اختلافات کے سلسلہ میں کتاب و سنت کی بنیاد پر عملی اختلافات کی نوعیت ___ 363

اللہ کی مسجد کہنے کی بجائے فرقے کی مسجد کا نام تجویز کرنے کا نتیجہ گلی گلی میں انتشار، اُمت واحدہ کے لفظ کی پامالی ہے ___ 364

قرآن حکیم کے حکم کے برعکس روایات کو قرآن حکیم پر قاضی بنانا ہے ___ 364

قرآن حکیم میں اختلافات پیدا کرنے کی سزا جہنم ہے ___ 364

درسِ قرآن کے دوران علامہ پرویزؒ کی سامعین کے لیے ایک حقیقت کا بیان ___ 365

اگر آج ملتِ اسلامیہ نے اُمت واحدہ بننا ہے تو اسے دینِ خداوندی میں قرآن حکیم کو آخری حجت تسلیم کرنا ہوگا ___ 365

نظامِ صلوٰۃ امت میں وحدت پیدا کرنے کا ایک موثر طریق ہے 366

نظامِ صلوٰۃ کے سلسلہ میں شہد کی مکھی کو استعارے کے طور پر پیش کرنا بڑی خوبصورت تشبیہ ہے ___ 366

شہد کی مکھی کو پھول سے ایک قطرہ شہد لانے کے لیے ستائیس

ہزار میل کا سفر کرنا پڑتا ہے ______ 366
فرقہ بندی کی بنیاد اپنوں سے چاہت اور دوسروں سے مخالفت 367
آج ہماری نماز فرقہ بندی کا سب سے بڑا اور واضح نشان ہے 367
صلوٰۃ جب تفرقوں کا شکار ہو جائے تو پھر وہ قرآنی صلوٰۃ باقی
کہاں رہتی ہے ______ 367
صلوٰۃ کے اوقات کے متعلق علامہ پرویزؒ کا مسلک اور ان کے
متعلق غلط پروپیگنڈے کی نوعیت کا جواب ______ 368
تین نمازوں کے متعلق اہل قرآن کا مسلک اور پھر ان
ناہمواریوں کو ختم کرنے کا طریق ______ 369
خرابیوں کو ختم کرنے کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا فرمان ______ 369
وحدت پیدا کرنے کا بہترین طریق نظام صلوٰۃ ہے۔
امام کا سہو ساری امت کا سہو ہوتا ہے ______ 369
لفظ ذکر کا لغوی مفہوم احکامات کو سامنے رکھنے کے ہیں ______ 370

سولھواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 115 تا اختتام)

ہر سورۃ کی آخری آیت کی اہمیت کے علاوہ ہر آیت کے آخری
میں خدا تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کا اظہار اپنے اندر ایک عظیم
حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے ______ 371
سورۃ ھود کی اس آخری آیات کی اہمیت اور حضرت صالحؑ
کی پکار اور اس کا حل ______ 372
قوموں کی اصلاح کا دارومدار حکمرانوں کی سوچ اور ان
کے کردار کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے ______ 372
قرآن حکیم کی روشنی میں برائی کو ختم کرنے کا ایک ابدی اصول
اور وہ یہ کہ برائی کو حسن کارانہ کام سے ختم کرنا ہوگا ______ 373
عملِ صالح کا عملی مفہوم کاشتکار کے سہاگا پھیرنے کے نتیجے
سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے ______ 373
زندگی کا سب سے بڑا سلوک ناہمواریاں کے مقابلے میں
حسنات زیادہ پیدا کرنی ہوں گی ______ 374
ہمارے ہاں لفظ ذکر کا وہ عملی مفہوم جس کا حقیقت سے
دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ______ 374
لفظ ذکر یعنی قرآن حکیم کی روشنی میں انسان کا ہر عمل
جو تخریبی کاموں کا ازالہ کر سکے ______ 375
عزم واستقلال کی قوت کے زیور سے آراستہ توازن بدوش ہستی
نبی اکرم ﷺ کا فرمان کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے _ 375
خدائے علیم کی طرف سے نبی اکرم ﷺ اور آپ کے
صحابہ کرامؓ کو حصول منزل کے لیے جم کر کھڑے رہنے کی تاکید 376
فکرِ قرآنی کا ایسا راستہ جو سیدھا بھی ہے اور پھر توازن بدوش بھی 376
مشکل سے مشکل زندگی کو زیرِ دام لانے کا قرآنی نسخہ حسنات
کے پروگرام کو پیش نظر رکھا ہوگا ______ 376
انسانی زندگی کا ایک اہم پہلو نبی اکرم ﷺ کی طرف سے
ایک حسین معصوم سی خواہش پر خدائے علیم کا جواب ______ 377
کسان کی تو ساری عملی زندگی سراپا 'واصبر' کی ترجمان ہے
اس ایمان کے ساتھ کہ خدا محسنین کے ساتھ ہے ______ 378
نبیؐ اکرم کی زندگی کا تو ایک ایک لمحہ کسان کی زندگی کی طرح
پرعزم اور امید سے روشن تھا ______ 378
سابقہ انبیاء کے زیر سایہ تربیت پانے والی اصلاح یافتہ
زندگیوں کے متعلق ایک اہم سوال کا بصیرت افروز جواب ___ 379
تمدن، تصوف، شریعت، اور کلام کی پیدا کردہ سوچ کا نتیجہ
صبح نور سے محرومی ______ 379
اگر الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے تو زندگی
کا تصور ہی بدل جاتا ہے ______ 380

انسان کا ہر سانس انسانی جسم کو ایک نئی زندگی کی نوید دیتا ہے _ 380
جسم انسانی کے ساتھ میں کا وہ رشتہ جو ناقابل فراموش ہے __ 381
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق کے مطابق انسانی زندگی کی کامیابی کا راز انسانی ذات یعنی ''میں'' کی نشوونما میں پنہاں ہے ________ 381
قرآن کی عظمت کے پیش نظر یہ کتاب تو سبقاً سبقاً درساً درساً سمجھے اور سمجھانے والی کتاب ہے ________ 382
جسم انسانی اور انسانی ذات کی نشوونما کے باہمی رشتے کی وضاحت ________ 382
ظلم کا ماحصل یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو بھی اپنی جگہ نہیں رہنے دیتا _ 383
خوشحالی جیسی نعمت کو احسن طریق سے بروئے کار لانے کا نتیجہ 383
نعمائے خداوندی کی قدر نہ کرنے پر تنگ دستی کے عذاب کے باعث دوسروں کی کمائی پر ہاتھ صاف کرنے کا عمل ____ 383
خدائے رحیم کسی کو تباہ نہیں کرتا بلکہ حسنِ عمل کے فقدان سے انسان نفسیاتی طور پر خود تباہ ہوتا ہے ________ 384
قوموں کی موت و حیات انسانی اختیار و ارادہ کے صحیح یا غلط استعمال کی بنیاد پر ہے ________ 384
اختیار و ارادہ ہی انسانی زندگی کا اصل زیور ہے ________ 385
جرم کے نقصان سے بچنے کے لیے قرآنی ضابطہ حیات سے آگہی کا عمل بڑا ضروری ہے ________ 385
مجبور کی زندگی غلامی، افسردگی اور بدمزگی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی 386
مذکورہ آیات قرآنی کے مروجہ ترجمے کا مفہوم ________ 386
عبادت کا لفظ جو قانون خداوندی کی اطاعت یا پیروی کرنے کے لیے تھا وہ صرف نماز تک محدود ہو کر رہ گیا ________ 387
انسانی پیدائش کا مقصد عظیم زندگی بھر انسانی اقدار کی صداقت پر یقین محکم کے ساتھ اطاعت کرنے کا ہے ____ 387
آیت نمبر 11:119 کا مروجہ ترجمہ جو حقیقت سے بعید ہے اس کے علاوہ اس کا حقیقی قرآنی مفہوم ________ 388
قندیل آسمانی سے لاتعلق جن وانس کی حالتِ زار ________ 388
سوچنے سمجھنے کے ذرائع سے استفادہ نہ کرنے کا نتیجہ جہنم کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ________ 389
اہل جہنم سے جہنم کے داروغے کا ایک اہم سوال اور پھر وہاں کے مکینوں کا جواب ________ 389
قرآن حکیم میں تاریخی حقائق کو بیان کرنے کا مقصد انسانوں کی راہنمائی ہے، انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو واضح کرنا ہے _ 390
انسانی عمل کا نتیجہ اس کی کامیابی اور ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے ________ 390
ہمارے ہاں صدیوں سے نیکی کا ایک عجیب و غریب تصور __ 391
انسانی اعمال کے تمام نتائج ساتھ کے ساتھ محسوس یا غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے رہتے ہیں ________ 391
ذات انسانی کی نشوونما کے بغیر یہ آدم خاکی سوائے اس کے کہ وہ اپنے کندھوں پر اپنی مردہ لاش کو اُٹھائے پھرے، اور کچھ نہیں _ 392
سورۃ ھود میں مقام نبوت کی وہ وضاحت کہ جس نے آپ ﷺ پر بڑھاپا طاری کر دیا تھا ________ 394

پہلا باب: **سورۃ ھود** (آیات 1 تا 6)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1973ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود سے ہوتا ہے۔ 11 ویں سورۃ۔ سابقہ اتوار کنونشن کی وجہ سے مسلسل درس نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے اتوار میں ہم سورۃ یونس کی آخری آیات سامنے لے آئے تھے۔ سورۃ ھود کی ابتداء ہوتی ہے۔

قرآنی احکامات کی بنیادی خصوصیت اپنی جگہ محکم، غیر متبدل اور مکمل ہیں

(الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ) (11:1) خدائے علیم ورحیم کا ارشاد ہے کہ یہ وہ ضابطۂ قوانین ہے، یہاں دو خصوصیات اس کی بتائیں: ایک تو یہ کہ اس کے قوانین محکم ہیں۔ یہی چیز ہے کہ جسے غیر متبدل بھی کہا ہے **لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64)، **لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ** (6:115) انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے لفظ صرف مستقل ہی نہیں کہا بلکہ محکم کہا، احکمت کہا، جس کی جڑیں مضبوط ہوں اپنے مقام سے جو ہل ہی نہ سکے۔ تو اس قسم کے قوانین جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہو، محکم ہوں، چٹان کی طرح اٹل ہوں، گڑے ہوئے ہوں، یہ ہے بنیادی صفت خدا کے قوانین کی۔ انسانی قوانین میں تغیر و تبدل کی ضرورت پڑتی ہے۔ قوانین بنانے

والے یا تو خود ہی اپنے اپنے تقاضوں کے مطابق ان میں تبدیلیاں کرتے ہیں یا خارجی تقاضوں سے وہ زور سے آ کے ہو جاتی ہیں۔ یہ جو اُحْكِمَتْ (11:1) ہے اس میں دونوں چیزیں آ گئی ہیں کہ نہ تو یہ خارجی تقاضوں سے اپنے مقام سے ہل سکیں گے اور نہ ہی انہیں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس کے بعد دوسری صفت ہے (فُصِّلَتْ) (11:1)۔

عربی لغت کے تحت لفظ مفصل کا مفہوم اُردو زبان کے مفہوم سے مختلف ہے

یہ لفظ جس کا مادہ ہے ف ص ل' ہمارے ہاں یہاں سے لفظ تفصیل اردو میں استعمال ہوتا ہے اور جن معنی میں یہ اردو میں استعمال ہوتا ہے' عربی زبان کے یہ معنی نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں ہوتا ہے تفصیل اس کی کیا ہے یعنی Details جسے ہم کہتے ہیں۔ ایک چیز تو یہ کہدی نا کہ بھئی تمہارے ذمہ اتنی رقم Due ہے' اس کے بعد وہ پوچھتا ہے جی اس کی ذرا تفصیل تو بتائیے تو پھر آپ کی ساری جزئیات بتاتے ہیں' اس کی Details بتاتے ہیں۔ یہی ہے وہ مغالطہ جس کی بناء پہ قرآنِ کریم کو جو کہا گیا ہے کہ یہ مفصل ہے' فصلت آیات ہیں۔

وحی کی دو قسموں کا تصور تفصیل کے غلط مفہوم کا ہی پیدا کردہ ہے

کہا یہ جاتا ہے کہ اس میں تمام تفاصیل اس کے اندر دی ہوئی ہیں۔ اس لفظ سے اردو زبان کی تفصیل کا لفظ لے کے تفاصیل اس میں دی ہیں۔ اور پھر وہ پوچھتے ہیں کہ صاحب کہیے کہ نماز کی رکعتوں کا کہاں ذکر ہے جی؟ زکوٰۃ کی شرح کا کہاں ذکر ہے جی اس میں؟ یہ کہتے ہو کہ کتاب ایسی ہے جس میں تفصیل دی ہوئی ہے تو یہ تو تفصیل ہمیں نہیں ملتی۔ بات بڑی اہم تھی یہ۔ تفصیل کے یہ معنی کیجئے تو پھر ڈھونڈنا پڑے گا آپ کو۔ تو قرآن میں تو یہ تفاصیل ملتی نہیں تھیں۔ یہ Details ہیں نہیں تھیں۔ تو ہمارے ہاں کے متقدمین نے وحی کی دو قسمیں کیں۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ایک لفظ کے متعلق اگر ذرا سا غلط مفہوم آ جائے سامنے تو پھر اس کے اوپر کتنی شاخ در شاخ اور چیزیں چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ Details اس کا ترجمہ کیا یا مفہوم لیا اب Details قرآن میں مل نہیں رہیں۔ تو انہوں نے تو وحی کی دو قسمیں بنا دیں ایک وحی قرآن کے اندر جس میں تفصیل نہیں ہے اور دوسری وحی احادیث کے اندر جن میں ان کی تفاصیل دی ہوئی ہیں۔ تو انہوں نے تو تفصیلات وہاں سے لیں۔ اب یہ وہی تفصیلات ہیں جن کی بناء پہ یہ بہتر فرقے بنے ہوئے ہیں۔

صدیوں سے مذہبی فرقوں کا غیر قرآنی وجود دوسری قسم کی وحی کی بنیاد پر ہی پیدا ہوا ہے

یہ قرآن کی کسی محکم آیت کی بناء پر فرقے نہیں بنے ہوئے۔ قرآن نے تو کہا تھا کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے اگر قرآن کی سند پہ یہ بہتّر فرقوں کے اختلافات مل جائیں تو قرآن کا تو دعویٰ ہی غلط ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کوئی قرآن کی صفت نہیں الگ بتائی' صفت بھی بتائی ہوتی' خصوصیت بھی بتائی ہوتی تو بڑی بات تھی۔ اس میں تو یہ چیز ہے کہ اس

کے خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔ اور اگر قرآن کی کیفیت یہ ہو یا خدا کی وحی کی کیفیت یہ ہو کہ بہتر فرقوں کو نماز جیسی بنیادی چیز میں بھی اتنے اختلافات ان کو مل جائیں اس کے اندر' اپنے وضع کردہ نہیں بلکہ وحی کے بتائے ہوئے اختلافات۔ تو سوچئے تو سہی کہ یہ دعویٰ کہاں چلا گیا۔ ایک لفظ کا غلط مفہوم لینے سے آپ دیکھئے کہ کتنی دقتیں پیش چلی آ رہی ہیں۔

نبوت کے ختم ہونے پر وحی بھی ختم ہوگئی جب کہ اب روایات کی بنیاد پر اختلافات موجود ہیں

جزئیات نہیں ملتیں۔ جزئیات کے لیے عقیدہ وضع کیا ایک اور قسم کی وحی آئی' وہ وحی قرآن میں نہیں ہے' قرآن سے باہر ہے اور وہ جو قرآن سے باہر ہے ان میں ہر قسم کی متضاد چیزیں آپ کو ملتی ہیں۔ یہ جتنی شکلیں آپ کے ہاں مختلف فرقوں میں مثلاً نماز ہی کی یا دوسرے مسائل جنہیں کہتے ہیں ان کی مختلف فیہ شکلیں' جتنی بھی اختلافی شکلیں' جتنی بھی ہیں وہ ساری اس وحی کی دوسری قسم کے اندر ہیں' وہاں سے سند لی جاتی ہے۔ ہر ایک اپنی اس تفصیل کے لیے سند لا رہا ہے ان روایات سے۔ ان کے متعلق ابتداً یہ عقیدہ وضع کیا کہ یہ بھی وحی ہے۔ اب وحی کے اندر اختلافات ہو گئے۔ نبوت ہوگئی ختم' وحی ہوگئی بند۔ اختلافات اس کے اندر موجود ہیں' اختلافات اب مٹیں کس طرح سے۔ وہ تفرقہ جسے قرآن شرک قرار دیتا ہے جس کے متعلق کہتا ہے کہ اے رسول تجھے واسطہ ہی ان لوگوں سے نہیں ہیں جو دین میں فرقہ بندی کر لیں' اس کی سند وحی کی بناء پہ قائم ہوگئی۔

مولانا عبداللہ چکڑالوی کی طرف سے قرآن حکیم سے جزئیات حاصل کرنے کی ناکام کوشش کا نتیجہ

ان اختلافات سے گھبراتے ہوئے ہمارے دور میں ایک صاحب پیدا ہوئے وہ بڑے قرآنی آدمی تھے مولانا عبداللہ چکڑالوی انہیں کہتے ہیں۔ یہ فرقہ اہلِ قرآن جن کا وضع کردہ ہے۔ انہوں نے اس چیز سے تنگ آ کر کہ واقعی اتنی اختلافی چیزیں ملتی ہیں احادیث میں روایات میں' انہوں نے اس سے تو انکار کر دیا۔ پھر آگے سوال ہوا کہ صاحب بتائیے پھر وہ تفصیلیں کہاں ہیں' کہاں سے لیں۔ نماز کی رکعتیں؟ کہاں سے لیں زکوٰۃ کی شرح ہم؟ اب وہ قرآن سے لگے یہ چیزیں نکالنے۔ جو چیز قرآن میں ہے نہیں وہ قرآن سے نکالنے لگے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ابھی وہ کل کی بات ہے وہ میرا خیال ہے کہ سارے دس بیس آدمی ہونگے ان کے متبعین میں سے یا کوئی دو سو چار سو آدمی ہونگے زیادہ سے زیادہ' بہت مختصر تعداد' نماز کی بنیادی چیز جس کے اوپر انہوں نے یہ کہا کہ یہاں جزئیات نکلتی ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے انہی کا ایک گروہ کہتا ہے کہ تین وقت کی نمازیں ہیں۔ ایک تو کہتا ہے پانچ وقت کی نمازیں ہیں قرآن سے' دوسرا گروہ کہتا ہے تین وقت کی نمازیں ہیں' ایک ہے ان میں سے وہ ایک ہی وقت کی نماز کہتا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ قرآن کے خلاف جو دشمنی عداوت اور نقصان پہنچانے والی چیز ہے' وہ اس فرقۂ اہلِ قرآن نے پہنچائی ہے۔

فرقہ اہل قرآن کی طرف گروہ بندی کی بنیادی وجہ اور قرآن حکیم کو پہنچنے والے نقصان کی وضاحت

یعنی اس سے پہلے وہ جو لوگ تھے انہوں نے تو ان اختلافی چیزوں کے لیے قرآن سے تو باہر چلے گئے نا وہ بہر حال روایات کا انہوں نے ماخذ لے لیا' احادیث کو لے لیا' قرآن سے نہیں انہوں نے یہ بات کہی۔ وہاں ہم اعتراض کر سکتے ہیں کہ حدیثیں تین سو سال بعد وضع ہوئی تھیں انسانوں کی جمع کردہ ہیں' اس میں غلطی ہو سکتی ہے' اختلاف ہو سکتا ہے۔ قرآن سے نہیں کسی نے بھی ثابت کیا تھا کہ وہاں سے تین نمازیں اور پانچ نمازیں اور ایک نماز ثابت ہوتی ہے۔ اور پھر آگے جو رکعتوں میں چلئے تو پوچھو ہی نہیں کہیں ایک ہی رکعت ہوتی ہے ایک ہی سجدہ اس میں ہوتا ہے۔ یہ جو آپ سنتے ہیں ہر منبر سے پرویز صاحب یہ کہتے ہیں' پرویز یہ کہتے ہیں۔ پرویز صاحب ان سب چیزوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ لوگ یہ چیز کہتے ہیں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس سے پہلے اختلاف کی بات تھی تو کہا جاتا تھا کہ روایات کی بنیادوں کے اوپر یہ اختلاف ہے۔ یہ ایک فرقہ اٹھا جو قرآن سے ان چیزوں کو متعین کرتا ہے اور ابھی چار دن بھی نہیں ہوئے اور بیس آدمی بھی ان کے اندر نہیں ہیں تو تین چار تو ان کے اندر گروہ بن گئے۔ اور وہ گروہ سند لاتے ہیں بزعمِ خویش قرآن سے۔

اہل قرآن کی متضاد خیالی کی کیفیت

تو گویا قرآن کے متعلق پہلی دفعہ یہ چیز انہوں نے ثابت کر دی اہلِ قرآن نے کہ اس میں اختلافی چیز ہے قرآن سے جو ہو گیا کہ پانچ بھی قرآن سے' تین بھی قرآن سے' ایک بھی قرآن سے۔ اور ابھی یہ نمازوں کے وقت کے متعلق ہے ان کے ہاں حرام و حلال کی تفصیلیں دیکھئے تو وہ ایک ایک ان میں سے الگ الگ تفصیل دے رہا ہے۔ اور زکوٰۃ کی شرحیں بھی قرآن سے نکال رہے ہیں کوئی کچھ نکال رہا ہے کوئی کچھ نکال رہا ہے۔ میں کہتا ہوں اس قدر ان لوگوں نے قرآن کے خلاف دشمنی کی ہے اس فرقہ نے' اس سے پیشتر قرآن کے خلاف ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ خارج از قرآن اپنی سند لاتے تھے۔ یہ اہلِ قرآن اپنے آپ کو کہتے ہیں' سند قرآن سے لاتے ہیں اور اختلاف کی کیفیت یہ ہے۔ کس چیز کی وجہ سے ہوا؟ ایک مفصل لفظ یا فصل لفظ جو ہے اس کے غلط مفہوم لینے سے' اردو کا مفہوم لینے سے' تفصیل کے معنی جزئیات لے لینے سے۔ عربی زبان میں ہی نہیں ہیں اس کے۔

لفظ فصل کا لغوی مفہوم اور اس کا استعمال

فــصــل کے معنی فاصلہ تو آپ جانتے ہیں نا: الگ الگ کرنا' اس کے معنی ہی ہیں الگ الگ کرنا Distinctly ایک چیز کو لینا نکھار کر بیان کرنا۔ الگ الگ کر کے بیان کرنا' ابہام نہ رہے' التباس نہ رہے' اختلاط نہ رہے' مخلوط نہ ہو جائے معنی جسے آپ کہتے ہیں۔ الگ الگ نکھار کر ابھار کر بیان کی ہوئی چیز' کوئی التباس نہیں' ایہام نہیں' ابہام نہیں' کسی قسم کی Confusion نہیں' Distinctly

بیان کی ہوئی چیز جو ہے۔ یہ ہے عربی زبان میں فصل کے معنی۔ یہ چار فصلیں تو آپ جانتے ہیں اب ہمارے ہاں بھی یہ ہے۔ میں نے کہا نا فاصلے کا لفظ تو ہمارے ہاں اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے: یہاں سے وہاں تک الگ الگ۔ وجع المفاصل آپ نے سنا ہوگا یہ جوڑوں کے درد کو کہتے ہیں جہاں چیزیں الگ جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ سمجھے نا۔ معنی اس کے یہ تھے قرآن نے کہا یہ تھا کہ نہایت محکم قوانین اور اس طرح بیان کیے گئے کہ کوئی کسی قسم کا ان میں Confusion نہیں ہوتا' Distinctly بیان کیا ہوا' نکھار کر الگ الگ کر کے یوں بیان کی ہوئی بات۔ یہ تھے جی اس کے معنی۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں انسانی زندگی کے لیے اصولی احکام تو دیئے ہیں جزئیات متعین نہیں کیں

جتنی چیزیں قرآن نے اصولی طور پر احکام دیے ہیں' ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اور یہی تو ایک ایسی کتاب کے لیے ہونا چاہئے تھا جسے قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطۂ ہدایت بننا تھا کہ وہ جزئیات خود متعین کر کے نہ دیدیتی۔ سورۃ مائدہ میں یہ ہے (5/101,102) کہ اے جماعتِ مؤمنین جن چیزوں کے متعلق ہم نے یوں ذکر نہیں کیا ان کے لیے سوال نہ کرنے بیٹھ جایا کرو۔ اگر وہ چیزیں بھی ہم نے متعین کر دیں تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ بنی اسرائیل نے یہی کچھ کیا تھا' قرآن کہتا ہے۔ بنی اسرائیل نے یہی کچھ کیا تھا' وہ تمام جزئیات متعین کرا بیٹھے اور اس کے بعد کیفیت یہ کہ زمانے کے حالات بدلے' وہ جزئیات جو تھیں پھر ان کے اوپر عمل ناممکن ہو گیا' مشکل ہو گیا تو وہ سرے سے دین ہی کو چھوڑ بیٹھے۔ قرآن کہتا ہے خود یہ کہ جو چیزیں ہم نے اس طرح جزئیاتی طور پر نہیں دیں تفصیل جسے ہم کہتے ہیں اس طرح سے نہیں دیں' In-details نہیں دیں' ان کے متعلق پوچھنے نہ بیٹھ جایا کرو۔ اگر وحی نے ان کو متعین کر دیا تو مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ بنی اسرائیل کی طرح کیفیت ہو جائے گی۔ عمل ان پہ نہیں ہوگا زمانے کے حالات کے اختلاف کی وجہ سے بدل جانے کی وجہ سے۔ وہ کپڑا چھوٹا ہو جائے گا قد تمہارا بڑھ جائے گا۔ اور اگر مستقل طور پہ فیصلہ ہوگا کہ نہیں یہی پہننا ہے تو تین سال والا پاجامہ جو سلا کے دیا تھا' پہننا ہے اگر آپ نے وہی بیس سال میں' کیا کرو گے پھر؟ پاجامہ پھاڑ دو گے اور کیا کرو گے۔ تو کہا بنی اسرائیل نے یہی کیا تھا۔ یہ غلطی کر گئے وہ اور اس کے بعد انہوں نے سرے سے دین ہی کو جواب دیدیا' ناممکن العمل ہے جی۔ اس زمانے میں یہ بات کیسے چل سکے گی یہ روز سوال ہم سنتے ہیں نا۔ آپ کو پتہ ہے کن چیزوں سے متعلق سوال ہوتا ہے؟ وہ جزئیات جن کو قرآن کی آیات کی طرح مستقل بنا دیا' غیر متبدل بنا دیا۔ جزئیات غیر متبدل نہیں ہیں اور یہ اسی لیے خدا تعالیٰ نے خود نہیں ان کو متعین کیا کہ یہ زمانے کے تقاضے کے ساتھ بدلے چلے جائیں گے۔

غیر متبدل اصولوں کو عملی شکل دینے کے لیے جزیات کا تعین وقت کے تقاضوں کے مطابق انسان کو خود کرنا ہوگا

(اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ) (11:1) یہ تو چٹان کی طرح مضبوط اپنے مقام پہ گڑی ہوئی رہیں' زمانے کے تقاضوں کی موجیں آئیں ان کے ساتھ ساتھ ٹکرائیں سر پھوڑ کے واپس چلی جائیں یہ اپنے مقام پہ گڑی ہوئی رہیں۔ Permanent Values یا احکام جو ہوتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے' غیر متبدل جو ہوئے۔ اور ان کی روشنی میں جو جزئیات' ان پر عمل کرنے کے طریقے' وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے جائیں گے۔ یہ تھا نظام۔ اور یہ بات جو تھی کوئی یہ نہیں کہ سو دو سو چار سو سال بعد ضرورت پیش آئی تھی' نبی اکرم ﷺ کی وفات کے چند ہی سال بعد تین سال بعد حضرتِ عمرؓ کا دور آتا ہے۔ آپ اس میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے اندر دیکھئے اس میں باب ہے یہ کہ کتنے فیصلے ایسے تھے جن میں تبدیلی کی حضرتِ عمرؓ نے اور یہ کہہ کر کی کہ صاحب حالات بدل گئے ہیں تین سال میں۔ اولیاتِ عمرؓ ایک متفق علیہ چیز ہے سب مانتے ہیں یعنی حضرتِ عمرؓ نے جن چیزوں کی ابتداء کی۔ یعنی جو اس زمانے میں پہلے دور میں واقعات سامنے نہیں آئے' پہلی دفعہ واقعات سامنے آئے انہوں نے ان کی جزئیات متعین کیں۔ اور جو جزئیات متعین ہوئی ہوئی تھیں' ان میں تبدیلی کی یہ کہہ کر تبدیلی کی کہ حالات کا تقاضا ہے' حالات بدل گئے ہیں۔ اور ہمارے ہاں جو فقہ کو بھی غیر متبدل قرار دیا گیا ہے۔ امامِ اعظمؒ کے یہ اقوال موجود ہیں ان کی فقہ میں۔ کہا گیا کہ صاحب یہ جو آپؒ فیصلہ دے رہے ہیں فلاں حدیث کے خلاف فیصلہ دے رہے ہیں' انہوں نے کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ آج ہوتے تو وہ یہی فیصلہ دیتے جو میں دے رہا ہوں۔ کہا گیا کہ یہ فیصلہ اس طرح سے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ بھئی یہ جو حضور ﷺ کو حکم تھا کہ مشاورت کیا کرو' اس کے کچھ معنی تھے ناکہ جو لوگ موجود تھے صحابہؓ ان کے مشورے سے جو رائے بہتر ہوتی تھی' اس پہ عمل کیا جاتا تھا۔

دورِ رسالت میں حکومتِ وقت کے لیے مشاورت کا حکم وقت کے تقاضوں کے پیش نظر کیا جاتا تھا

خطیبِ بغدادی نے اپنے ہاں لکھا ہے کہ ان کا یہ قول ہے کہ یہ میرا جرم ہے کہ میں اس زمانے میں نہیں تھا؟ میری رائے کو دیکھ لیجئے اور پھر پرکھ کے دیکھ لیجئے اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس دور میں ہوتا' حضور ﷺ کے سامنے یہ رائے پیش کرتا تو یہ قبول ہو جاتی۔ اور اگر حضور ﷺ میرے زمانے میں ہوتے تو پھر تو میں صاحب الرائے تھا ہی ان کے زمانے کا۔ امام اعظمؒ فرما رہے ہیں۔ کس قدر صحیح Vision تھی ان لوگوں کی دین کے متعلق۔ میں نے کہا ہے کہ یہ تو پھر بھی آپ کہیے سو سال ڈیڑھ سو سال بعد کی ہے بات۔ حضرتِ عمرؓ کا زمانہ تین ہی سال بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات کے اور زیادہ سے زیادہ آپ سمجھئے سن 23ھ کی بات ہے۔ دس سال تک کا دور ہے یہ سارا حضور ﷺ

کی وفات کے بعد کا۔اس دس سال کے اندر آپ دیکھئے گا فقۂ عمری ایک الگ مستند چیز ہے ہمارے ہاں۔اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ تفاصیل (Details) جزئیات یہ غیر متبدل نہیں ہوتیں۔قرآن نے اسی لیے نہیں دیا ان کو اپنے ہاں۔اور جو حضورﷺ نے متعین فرمائیں اپنے دور میں حضرتِ عمرؓ نے حضورﷺ کے چند ہی سال بعد ان میں تبدیلیاں کیں یہ کہہ کر تبدیلیاں کیں کہ حالات بدل گئے ہیں۔ان حالات کے اندر یہی فیصلہ ہونا چاہیے۔ان کا یہ مستقل قول ہے کہ لوگ اپنے زمانے کے احوال سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں بہ نسبت گذرے ہوئے زمانے کے۔

اصول ہمیشہ اٹل ہوتا ہے البتہ جزیات اس کی روشنی میں بدلتی رہتی ہیں

یہ تھی بنیادیں دین کی آپ کے ہاں جسے آپ کہتے ہیں کہ وہ ناممکن العمل ہو گیا ہے' ہزار سال پہلے تو یہ بات چل سکتی تھی' اس دور میں نہیں چل سکتی۔یہ ٹھیک ہے۔لیکن یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو بعد میں انسانوں کی بنائی ہوئی چیزیں جن کو دین بنا دیا ہے آپ نے۔قرآن کی کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جسے آپ یہ کہیں کہ زمانے کے بدلنے سے' حالات کے بدلنے سے' تقاضوں کے بدلنے سے' اب اس پر عمل ناممکن رہ گیا ہے۔ہے ہی نہیں کوئی بات ایسی۔اصول ناممکن العمل کیسے ہو سکتے ہیں صاحب؟۔حالانکہ دور اس وقت ہمارے ہاں ساری دنیا میں یہ کہیئے انتہائی بددیانتی کا' مکاری کا' جھوٹ کا' کذب کا آ گیا ہے۔اس کے باوجود کوئی یہ نہیں کہتا کہ بددیانتی بڑی اچھی چیز ہے' پہلے زمانے میں تو دیانتداری اچھی چیز تھی اور اس دور میں صاحب دیانتداری اچھی چیز نہیں ہے۔یہ اصول ہے۔تو قرآن کے جو اصول اور احکام اور اقدار جو قرآن نے دیے ہیں (اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ) (11:1) وہ غیر متبدل ہیں' محکم ہیں' اپنے مقام پہ چٹانوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں۔اور جو بیان کیے گئے ہیں (فُصِّلَتۡ) (11:1) پھر انہیں نکھار کر الگ الگ کر کے Distinctly بیان کیا گیا ہے صاحب۔یہ اس لیے کہ Confusion نہ ہو ان کے سمجھنے میں۔(مِنۡ لَّدُنۡ) (11:1) یہ دونوں چیزیں اس نے خود کی ہیں محکم آیات غیر متبدل' طریقِ بیان نکھار کر' ابھار کر الگ الگ کر کے۔ہمارے ہاں'' پنجابی اچ کیندے نیں ذرا نکھیڑ کے گل کرنا بھئی' اے نکھیڑ کے گل کرن دے معنی ہوندے ہیگے نیں'' کہ ذرا الگ الگ کر کے بات نکھار کر' ذرا بات Distinctly ذرا بیان کیجئے۔یہ چیز ہے۔اور پھر آپ دیکھئے (مِنۡ لَّدُنۡ) (11:1)

ذاتِ خداوندی تو حکیم بھی ہے اور علیم بھی ہے اور قرآن حکیم وہ محور ہے کہ جس کے گرد عقل انسانی نے گھومنا ہے

کیا بات ہے قرآن کے انداز کی!! (اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ) (11:1) کے لیے کہا حکیم۔دو صفتیں آئی ہیں یہاں خدا کی (حَكِيۡمٍ

خَبِیۡرٍ) (11:1) یہ حکیم تو آیا (اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ) (11:1) اس کے لیے آ گیا۔ اگلی چیز جو ہے کہ یہ اس طرح سے نکھار کر بیان کی ہیں' جزئیات تفصیلات نہیں دی ہیں (خَبِیۡرٍ) (11:1) وہ جانتا تھا کہ کس قسم کے قوانین دینے چاہئیں اور کیسے بیان کرنے چاہئیں۔ خبیر ہے وہ۔ حکیم ہے کہ (اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ) (11:1) اور خبیر ہے کہ (فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ) (11:1)۔ (حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ) (11:1) اور ایک بات اس کے بعد کہی کہ عمودی یا مرکزی بنیاد جو ہے' تعلیم جو ہے اس کی یہ بات اس نے کہی۔ (اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ) (11:2) کہ اس کے سوا کسی اور کے قوانین کی اطاعت مت کرو۔ یہ ہے احکمت آیات' اس کے گرد سارے قوانین قرآن کے گھومتے ہیں اس محور کے گرد (اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ) (11:2) خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ یہ تعبدوا' عبادت اس کے لیے اردو میں معنی پرستش' پرستش کے معنی ہوئی پوجا۔

ہم نے خدا کی اس محکومیت کو' عبادت کو پرستش میں بدل دیا

پرستش خدا کی کرو اور وہ انگریزوں کی حکومت کے اندر بھی صاحب رہ کے' مسلمان ہو جاؤ۔ بدلا نا ایک لفظ اور اس کے معنی۔ اطاعت محکومیت غیر مسلم کی بھی اختیار کرو' یعنی مسلمان ہی نہیں کہ وہ خلافِ قانون کچھ دیں' غیر مسلموں کی اطاعت اختیار کر سکتے ہو' محکومیت اختیار کر سکتے ہو' پرستش جو ہے وہ خدا کی ہوگی۔ اور ان کا احسان بتایا تھا کہ دیکھئے آپ کی پرستش عبادت کے طریقوں میں وہ تو دخل ہی نہیں دیتے انہوں نے تو منشور پہلے دن آ کے وہ ملکہ کا منشور جو ہے' وہ موجود ہے۔ وہ تو آج ہندو بھی وہاں اجازت دیتا ہے صاحب۔ اسی بناء پر یہ آپ کے سارے علماء نیشنلسٹ جو تھے پاکستان کی تحریک کی مخالفت کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ مذہب کے معاملے میں تو یہ دخیل ہی نہیں ہوتا ہندو۔ پہلے ضمانت دے رہا ہے تمہیں کہ آپ کے نماز روزوں میں ہم بالکل دخیل نہیں ہونگے۔

ایک خطرناک گھاٹی کا ذکر کہ جس نے انسانیت کی تاریخ کا رُخ ہی بدل دیا

خدا کی عبادت کرنے میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ خدا کی محکومیت' اس کے قوانین کی اطاعت' مرکزی خیال ہے جو بنیاد جو ہے قرآن کی (اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ) (11:2) آپ دیکھئے کہ یہ جو کہا ہے آیات کو محکم بنایا' فصلت نہایت نکھار کے بیان کیا تو بات آگے کیا کہی ہے۔ ایک مرکزی بات ہے (اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ) (11:2)۔ اب اس کے بعد ایک ہی مقام آتا ہے' ایک ہی خطرناک گھاٹی آتی ہے جہاں مذہب پرست انسانوں نے ٹھوکریں کھائیں۔ ہر مذہب نے اپنی اپنی جگہ ٹھوکر کھائی اور وہ یہ تھا کہ اس دین کو جو لانے والا تھا' اسے انہوں نے مقامِ الوہیت عطا کر دیا' اسے خدا بنایا۔ ابن اللہ بنا دیجئے اس کو' باپ بیٹا روح القدس کی تثلیث میں لے آئے' ہندوؤں کے ہاں اوتار بنا دیجئے اس کو' مجوسیوں کے حلول کا جو عقیدہ ہے کہ خدا ان کے اندر حلول کر کے آ جاتا ہے۔ کوئی عقیدہ

لیجئے، دنیا کی ہر مذہب پرست قوم نے اپنے مذہب کے بانی یعنی ہم تو کہیں گے کہ جو دین لائے تھے پیغمبران کے ہاں کے، ان کو انہوں نے بشریت کے مقام سے الوہیت کا مقام دیدیا۔ ہر مذہب نے یہ کیا۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق خدائے علیم کا فرمان

قرآن نے اسی معاملے میں اتنی بڑی احتیاط برتی ہے کہ یہ قوم بھی یہاں نہ پہنچ جائے۔ آپ دیکھئے کہ کہا کہ (اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ) (11:2) خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت نہیں۔ اسی سانس میں اسی آیت میں اگلا ٹکڑا یہ ہے (اِنَّـنِیۡ) (11:2) باقی رہا میں تو میں تمہیں آگاہ کرنے والا ہوں غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج، اچھی زندگی کے خوشگوار نتائج کی اطلاع دینے والا۔ میرا اتنا ہی کام ہے، میرا اتنا ہی مقام ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ جو کلمۂ طیبہ ہے اس کے دونوں جز وان دونوں چیزوں کو اکٹھا کر دیا (لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ) اسی سانس میں باقی رہا خدا کے بعد جو ایک ہستی ہو سکتی تھی جہاں پہلے اہلِ مذاہب نے ٹھوکر کھائی تھی وہ ہستی محمد ﷺ کی ہو سکتی تھی۔

خدائے علیم وخبیر کے اس فرمان کے باوجود ہماری حالت

(مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ) (49:29) خدا کی توحید کے اقرار کے ساتھ اسی سانس میں محمد ﷺ کا مقام متعین کر دیا کہ صاحب رسول اللہ، بس خدا کا پیغامبر ہے اس سے زیادہ ان کو آگے نہ لے جائیں۔ اور پھر آپ جب مذہب میں آئے ہیں تو اب آپ سوچئے کہ آپ نے پھر یہ کیا کچھ کیا؟ جو کچھ پہلوں نے کیا تھا وہی کچھ آپ کر رہے ہیں۔ وہ آپ کے ہاں پھر شاعری چلی، پھر شاعری کے اندر کہاں کہاں پہنچایا۔

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے
مگر حقیقت میں عین رب ہے

آہاہاہا جھومتے ہیں صاحب کیا بات ہے صاحب عرب کو عین اور رب کر کے۔ اور وہ احمد میں احد کے اندر تو م آتی ہے تو وہ م کا تو آپ کو پتہ ہے نا

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ م کو اٹھا کر

یہ کیا ہے یہ پردۂ م؟ وہ پردہ ہے درمیان میں اس کو الگ کیا احد ہی تو ہو گئے صاحب۔ اور یہاں تک چلے گئے ہوئے ہیں اس شاعری کے اندر۔

نجف میرا مدینہ ہے مدینہ میرا کعبہ ہے
میں بندہ اور کا ہوں امتِ شاہِ ولایت ہوں

بندہ رسول کا محمد ﷺ کا اور امت حضرت علیؓ کی۔

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو

مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہ جو پہلے اہلِ مذاہب نے بنایا تھا ان کو خدا اپنے بانیاں کو' انہوں نے نفرت اور عداوت کی بنا یا تھا؟ عقیدت اور محبت کی بنا پہ بنایا تھا نا۔ ان کا بنایا ہوا شرک اور محبت ہو تو جو کچھ تم کہو تو یہ عینِ اسلام' ارے عینِ اسلام' مغزِ اسلام۔ پھر جب مبالغے میں انسان آتا ہے تو پھر چلتا ہے چلا جاتا ہے چلا جاتا ہے۔ اسی مقام کے اوپر آپ نے بھی کھڑا کر دیا ہوا ہے۔

تیرہ سو سال سے دی جانے والی اذان کے انقلابی الفاظ کا انتخاب اور انسانیت کے مقام کا تعین

اور اب ہمارے دور میں تو اذان سے پہلے آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تیرہ سو سال سے اذان چلی آتی تھی۔ اذان کی ابتداء تھی اللہ اکبر اتنا انقلابی اعلان تھا عزیزانِ من! ہر قسم کی کبریائی کا اعلان کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کبریائی کے اندر وہ شریک ہو جائے' اکبر اسی کی ذات ہے اکبر اسی کی ذات ہے۔ ٹھیک ہے۔ اُس اذان کے اندر یہ چیز ہے (اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کے ساتھ۔

کلمہ طیبہ کے علاوہ ان مذکورہ الفاظ میں خدا کی کبریائی کے ساتھ نبی اکرم کی ذات کا ذکر خیر

(وَاَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ) صاحب قربان جایئے اس دین لانے والے پہ اس نے تو اتنی احتیاط برتی تھی کہ جہاں کہیں خدا کا نام آیا اس کے ساتھ جو حضور ﷺ نے اپنا نام کہیں دیا ہے' آنا چاہیے تھا' وہیں اس چیز کو نمایاں طور پہ واضح کر دیا کہ میرا مقام صرف اس کا عبد اس کا غلام اس کا محکوم اس کا مطیع' زیادہ سے زیادہ رسول اس کا پیغام لانے والا' اس سے زیادہ کوئی مقام نہیں۔ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ (3:144) قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ یہاں وہ جو اذان کے الفاظ ہیں ان میں بھی یہ چیزیں جو ہیں وہ لائے چلے جا رہے ہیں' کس کی جرآت ہے کوئی ٹوک سکے کسی کو۔ کہا نہیں تو یہ سیرت کے ساتھ محبتِ رسول اللہ ﷺ کا تقاضا یہ ہے کم بخت تیرے دل کے اندر پتھر ہے۔ ابولہب کا سینے میں تیرے دل ہے تو ہم کیا کہیں صاحب' یہ تو محبت کا تقاضا ہے۔

دین کسی کی عقیدت سے نہیں بلکہ مبالغہ آمیزی کے عمل سے بگڑتا ہے

عزیزانِ من! قرآن حکیم نے اہلِ کتاب سے یہ کہا تھا کہ دین میں مبالغہ نہ کرو (4/171,5/77) یاد رکھو' اس لیے کہ دین کے اندر اپنے یہ بانیانِ مذاہب یا بزرگان یا اسلاف جو ہیں ان سے عقیدت کی بناء پہ دین نہیں بگڑتا۔ لیکن انہیں جو آپ مبالغے میں ان کے مقام سے بلند کرتے ہیں' تو پھر دین وہاں بگڑتا ہے۔ کہا تھا کہ مبالغہ نہ کرنا اپنے دین میں۔ لیکن اس میں تو کسی کی شکایت نہیں' جب بھی

دین مذہب کی سطح پہ آئے گا یہ ساری چیزیں آئیں گی۔ جو ایک مذہب میں آیا ہے، ہر مذہب میں وہ آئے گا۔ جس طرح دین کی اپنی خصوصیات ہیں کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت نہیں کرانا چاہتا' مذہب کی بھی خصوصیات ہیں اور وہ ہر مذہب میں آئیں گی جہاں بھی دین' مذہب میں بدلے گا۔ ہوگا یہ کہ ایک مذہب والا دوسرے مذہب والے کی اس قسم کی چیزوں پہ تو تنقید کرے گا اور اپنے ہاں انہیں سینے سے لگائے لگائے پھرے گا۔

خدا تو اپنی طرف سے عطا کردہ دین کے علاوہ کسی چیز کو قبول ہی نہیں کرتا

کتنی عجیب چیز ہے کہ ایک ہی بات ہے کہنے کے لیے کہ (اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ) (11:2) اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ (اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡهُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ) (11:2) باقی رہا میں' میں ذاتی طور پہ کچھ بھی نہیں' یہ چیزیں بھی میں ذاتی طور پہ نہیں کہتا تم لوگوں سے' اس کی طرف سے یہ چیزیں کہنے کے لیے میں آیا ہوں کہ اس روش کا نتیجہ یہ نکلے' اس کا یہ نکلے گا۔ میرا تو اتنا ہی مقام ہے' میرا تو یہ منصب ہے' رسول ہوں صرف' بشیر ہوں میں اس کی طرف سے (مِّنۡهُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ) (11:2) کرنا کیا ہے تم نے؟ جس حالت میں میں نے یہ آواز تم تک پہنچائی ہے' دو چیزیں اس میں کرنے کی ہیں۔ ایک تو ہے آپ کو یاد ہے بیماریوں کے سلسلے میں دو Stages ہوتی ہیں ایک تو Preventive ہوتی ہے کہ بھئی جراثیم ہیضے کے پھیل گئے تو فوراً Directives آتے ہیں ہیلتھ والوں کی طرف سے' ڈاکٹروں کی طرف سے' کچے پھل نہ کھانا ادھر نہ جانا' اس طرح سے بچنا' جراثیم کش دوائیاں استعمال کرنا'۔ یہ ساری چیزیں ہیں۔ وہ جو امکان ہوسکتا ہے اس بیماری کے لگنے کا' اس سے حفاظتی تدابیر جو ہیں' یہ پہلی چیز ہوتی ہے۔ اور اگر پھر اس کے باوجود یا کسی کے تغافل اور تساہل کی وجہ سے وہ بیماری آ ہی لگے تو پھر آگے Curative ہوتا ہے کہ پھر اس سے Cure کیسے کیا جائے' علاج کیسے کیا جائے۔ دو ہی Stages ہوتی ہیں۔ بنیاد یہ دی دی (اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ) (11:2) اور اس کے بعد (وَّاَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ) (11:3) اپنے خدا سے احتیاطی تدابیر یا حفاظتی تدابیر چاہا کرو کہ وہ ملیں تمہیں' بیماری لگے ہی نہ۔

(استغفروا ربکم) مغفرت کے معنی تو بخشش کی بجائے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے ہیں

یہ کیا کرو۔ یہ (اَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا) (11:2) مغفرت' مغفرت کے معنی ہوئے بخشش اور پھر بخشش تو آپ پوچھو ہی نہیں' ہر چیز معاف۔ بخشش سے پھر آگے چلے بخشیش اور پھر جنت بھی بخشیش میں۔

قرآن حکیم کی عربی مبین کو سمجھنے کے لیے تصریفِ آیات کے طریق کو بنیاد بنانا ہوگا

عزیزانِ من! یہ حفاظتی تدابیر ہیں میں نے عرض کیا تھا نا کہ قرآن نے جو بار بار کہا ہے کہ عربی مبین میں ہم نے یہ نازل کیا ہے وہ

بڑی اہم چیز تھی۔ وہ تو خدائے خبیر ہے' اُسے پتہ تھا کہ انہوں نے کیا کیا معنی پہنا لینے ہیں۔ اس نے کہا کہ پوچھو ان عربوں سے جن کے زمانے میں جن کی زبان میں یہ قرآن نازل ہوا تھا کہ وہ ان کے معنی کیا لیتے تھے۔ ان کے ہاں مغفر' اب تک جو یہ ہیلمٹ ہوتی ہے فوج کی ٹوپی سر پہ پہنی ہوئی وہ خول لوہے کا' یہاں سے ہی ہے نا وہ لفظ مغفر۔ تو اس میں ہے کوئی بخشش کا تصور بھی اس ٹوپی میں؟۔ حفاظتی تدابیر بھی اس سے لو اور (ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ) (11:3) اور اگر کہیں غلطی کر بیٹھے ہو یا بہرحال آ ہی لگے مرض تو اس کے لیے اسی کی طرف رجوع کرو۔ اس نے اس کے لیے بھی علاج بتایا ہوا ہے' حفاظتی تدابیر بتائی ہوئی ہیں اور Curatives بھی اس کے اندر ہیں کہ اگر یہ ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لیے اس کیطرف رجوع کرو۔ نتیجہ ان دونوں چیزوں کا کیا ہوگا؟

قدرت کی طرف سے حسنِ عمل کا نتیجہ بڑے ہی خوشگوار طریق سے محسوس شکل میں ملتا ہے

مذہب میں تو صرف ایک مبہم لفظ ہے کہ ثواب ہوگا۔ وہ تو ایسے نتیجے بتاتا ہے کہ جن کو ماپ لیا جائے تول لیا جائے' دیکھ لیا جائے' محسوس کر لیا جائے کہ ہوا ہے یا نہیں ہوا۔ کہا (یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی) (11:3) وہ تمہیں ساز و سامانِ حیات دے گا اور نہایت خوشگوار طریقے سے دے گا۔ (یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا) (11:3) آپ دیکھئے کتنا جامع لفظ ہے۔ زندگی کی ہر سامانِ حیات' اس کو متاع کہا جاتا ہے۔ متاع دے گا۔ اور پھر اتنا ہی کافی تھا (یُمَتِّعۡکُمۡ) (11:3) لیکن وہ دینے والا ایسا ہے کہیں لینے والے کی شکستِ پندار نہ ہو جائے کہ یہ گداگری یا عطا یا بخشش کے طور پہ سمجھے کہ ملا ہے۔ (مَّتَاعًا حَسَنًا) (11:3) ساتھ کہا عزیزانِ من! کتنا محبت والا ہے یہ دینے والا' نہایت خوشگوار طریقے کے اوپر دینا جو ہے۔ دینے اور دینے میں بڑا فرق ہے۔

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
منہ موڑ کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

نبی اکرم کی حدیث ہے کہ انسان کی مسکراہٹ بھی انسان کی نیکیوں میں شمار ہوگی

وہ ساغرِ مے تو مل گیا اس کو بھی' کتنا فرق ہے اس میں اور اُس دینے کے اندر۔ مہمان کی تواضع کیجئے نہایت عمدہ خوشگوار چیزوں سے' اچھے اچھے کھانے سے' سب کچھ کر کے لیکن ماتھے پہ بل ڈال کر۔ زہر مار ہو جائے گا وہ کھانا اس کے لیے۔ کھانے میں تو کچھ نہیں ایسا پڑا۔ اور اسی لیے وہ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے' میں نے کہا ہے کہ صحیح حدیث تو ہیرے کی طرح چمک اٹھتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تمہاری مسکراہٹ بھی نیکیوں میں شامل ہو سکتی ہے۔ آہاہا۔ اپنے بھائی سے ملو تو تمہارا تبسم بھی نیکی میں شامل ہو سکتا ہے۔ بڑی

چیز ہے یہ صاحب۔دے رہا ہے

یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو

ہمارے ہاں اجلِ مسمیٰ کا مروّجہ مفہوم جس کی قرآن حکیم تردید کرتا ہے

(یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی) (11:3) تو کیا ایک دفعہ یہ کچھ کرنے سے پھر وہ ملتی چلی جائے گی۔ کہنے لگے نہیں۔اب یہاں آ کے وہی مغالطہ ہمارے ہاں (اَجَلٍ مُّسَمًّی) (11:3) ایک وقتِ مقررہ تک۔ چلا آیا تقدیر کا قصہ کہ جی وہ پہلے سے مقرر تھا وقت کہ اتنے وقت تک کے لیے ملے گا۔ یہ جو چیز ہے جسے آپ معیاد کہتے ہیں' یا اجل کہتے ہیں وقت کہتے ہیں قرآن نے یہ کہا ہے کہ تمہارے اعمال خود تمہاری اجل متعین کرتے ہیں۔کب تک ملے گا؟ جب تک یہ کرتے چلے جاؤ گے' جب اس طریق کو چھوڑ دو گے' ختم ہو جائے گا سلسلہ۔

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ

اجلِ مسمی یہ ہے' جس کی نشاندہی تم خود کرو۔ جب تک یہ کیے چلے جاؤ گے۔اور آگے جناب تفصیل اس کی آ گئی تشریح یا اس کے معنی آگے آ گئے۔

ہم نے تو فضل کے مفہوم کو ایک دوسری پڑی پہ ڈال رکھا ہے

(وَّ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ) (11:3) آپ کے ہاں معلوم ہے نا یہ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ (5/54) جو اللہ کا فضل ہے' جسے وہ چاہے دیدے صاحب۔چل بھئی۔ دیکھا نا آپ نے یہ ہر جگہ لکھتے ہیں اور ہر جگہ ہر شخص یہ کہنے والا۔اور یہ عام طور پہ وہ کہتے ہیں جو اپنی کمائی کو Account for نہیں کر سکتے' سب سمگلر۔شرمناک بات ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ اب مذاق میں یہ ایک Term آ گئی ہے کہ صاحب یہ کیا ہے کوٹھیوں پہ کوٹھی بن رہی ہے صاحب۔کہا بڑا فضلِ ربی ہے یہ۔حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ تنخواہ تو اتنی سی ہے لیکن بھئی فضل ربی کا کچھ ٹھکانہ نہیں۔اندازہ لگایئے۔لیکن یہ تو چیز موجود ہے نا (ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ) (5:54) کا ترجمہ یہ کہ بھئی یہ تو اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے وہ دیدیتا ہے۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ فضل کے حصول کی خاطر پہلے انسان کو اپنے اندر وہ قوت اور صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہوگا

ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں کس پٹڑی کے اوپر ڈالا ہوا ہے آپ لوگوں کو مذہب نے۔ پتہ ہے قرآن کیا کہتا ہے۔ میں پڑھ گیا ہوں آپ نے غور نہیں فرمایا۔(وَّ یُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ) (11:3) وہ اپنا فضل یا سہولتیں اسے دیتا ہے جو پہلے اس کی صلاحیت پیدا کرتا ہے(کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہ)(11:3) ذی فضل کو فضل دیتا ہے وہ۔(وَّ یُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ) (11:3) اب من یشآء کے معنی واضح ہو گئے' جو لینا چاہے' وہ جو میں ترجمہ کیا کرتا ہوں۔(ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ)(5:54) یہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے(مَنْ یَّشَآءُ)(5:54) اُنہوں نے کہا جسے وہ چاہتا ہے' میں نے کہا عربی قاعدے کے مطابق یہ ہے کہ جو لینا چاہتا ہے۔ میں نے یہ فرق کہاں سے پیدا کیے ہیں؟ خدا نکردہ قرآن کے اندر اپنی فکر سے اپنے ذہن سے یہ چیزیں کرنا تو شرک ہے۔ وہ کہتا ہے(وَّ یُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ) (11:3)اس میں یہ کہہ دیا کہ من یشآء کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ ذی فضل کہتا ہے وہ جتنا کوئی ذی فضل اپنے آپ کو بناتا چلا جائے گا ہم اس کو فضل دیتے چلے جائیں گے۔

انسانی زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں کہ جس کا حل قرآن حکیم نے تفصیل کے ساتھ پیش نہ کیا ہو

میں نے کہا ہے عزیزانِ من! ایک عمر تو لگتی ہے اس میں غور وفکر میں' کوئی بھی مقام قرآن کا ایسا نہیں ہے جو قرآن سے حل نہیں ہو جاتا۔ دو باتیں ہو گئیں(اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ) (11:2) اس کے علاوہ کسی کے قوانین کی اطاعت نہ کرو۔ بڑی سے بڑی ہستی بھی جو تمہارے سامنے آتی ہے اس کو اس کے مقام کے اوپر رکھو۔ رسول اللہ ﷺ جیسی ہستی کو بشیر اور نذیر اور رسول ہے۔ اس کے آگے یہ ہے کہ پہلے Preventive جتنی چیزیں ہیں' بچنے کی جتنی چیزیں ہیں' حفاظت کی جتنی چیزیں ہیں' ان کو اپنے ہاں طلب کرو مہیا کرو۔ پھر بھی اگر کسی جگہ لغزش ہو جائے' مرض آ جائے(تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ) (11:3) جو اس نے علاج تجویز کیا ہے اس کی طرف لوٹ آؤ۔ یہ کرو گے تو تمہیں وہ ساز وسامانِ حیات دے گا نہایت حسن کارانہ انداز سے۔ اور وہ دے گا اس طرح سے کہ (یُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ)(11:3) جتنی فضیلتیں اپنے اندر کوئی پیدا کرتا چلا جائے گا اس کے مطابق اس کی طرف سے فضل ملتا چلا جائے گا۔ وہ تو قانون کی اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے' یہی تو اس کے معنی ہو گئے۔ Possitive چیز آ گئی یہ۔(وَ اِنْ تَوَلَّوْا) (11:3) اور اگر تم نے پھر یہاں سے منہ موڑا تو یہ ساری چیزیں جتنی لفظی تم کہتے چلے آئے ہونا' کچھ کام نہیں دے گی۔(فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ کَبِیْرٍ)(11:3) تو پھر میں ڈرتا ہوں کہ تمہارے اوپر ایسی تباہی اور سزا آئے گی(یَوْمٍ کَبِیْرٍ)(11:3) بہت عظیم دن کی تباہی آئے گی'

اگراس طریق سے تم پھر گئے۔ پھرا ہوا ہے نا یہ سارا مسلمان جتنا دنیا میں اس وقت ہے۔ اپنی آنکھوں سے اس نے دیکھا تھا نا (یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا)(11:3) کس طرح سے ملتا تھا' (كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ)(11:3) کیسے ملا تھا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں مدائن کی فتح، فضل محسوس شکل میں ایک زندہ شہادت ہے

تاریخ ہے آپ کے سامنے اب تو اور دیکھیئے گا شاہکارِ رسالت کے اندر مدائن جب فتح ہوا ہے کیا کیفیت تھی' کیا کچھ نہیں ملا تھا اس کے ماتحت۔ اور سنئا' تولوا کی کیفیت جب بعد میں آئی ہے تو اس کے بعد (عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ)(11:3) اس سے زیادہ اور رسوا کن تباہی اور کیا ہوگی جو ہمارے اوپر مسلط ہے۔ عذاب کے متعلق اس نے کہا تھا نا کہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2/85) دنیاوی زندگی میں ذلت اور خواری۔ عاقبت کا جہنم تو بعد میں جا کے آئے گا (عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ)(11:3) کہا ہے اس نے۔ یہ تولوا کا نتیجہ ہے نا پھر گئے اگر یہاں سے' گریز کی راہیں نکالی تم نے۔ دونوں چیزیں ہوتی ہیں' ایک تو بالکل منہ موڑنا ہوتا ہے' ایک گریز کی راہیں نکالنی ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے قل العفو دے دو ضروریات سے زائد سارا' انہوں نے کہا اڑھائی پرسنٹ دے دو' یہ ہے گریز کی راہیں نکالنا۔ ہوگا یہ کیسا؟ (اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) (11:4)

قرآن حکیم نے تو عزت اور ذلت دونوں کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں

اس نے تو پیمانے مقرر کر دیے ہر شے کے' قوانین مقرر کر دیے اور تم اس کی مملکت سے نکل کے کہیں نہیں جا سکتے' اس کا قانون ہر جگہ لاگو ہوگا۔ کہیں بھی جاؤ قانون یہ ہے کہ ہوا سے سانس لو گے تو زندگی ہوگی۔ چلے جاؤ جناب آپ' سمندر کی تہ میں بھی جاؤ تو وہ سانس لینے والا پیچھے آپ کو وہ سلنڈر لگا کے جانا پڑتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی کے اوپر جاؤ تو وہاں بھی آپ کو یہی سانس لینا پڑتا ہے۔ کہتا ہے جا کہاں سکتے ہو (اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ) (11:4) تمہیں سانس لینے کے لیے اس کے قانون کی طرف لوٹنا ہے' کہیں اور جا ہی نہیں سکتا۔ اس لیے جو ہم نے اوپر کہا ہے وہ ہوگا۔

آج کا دور قرآن حکیم کے حقائق کو علم النفس کی بنیاد پر علی وجہ البصیرت سمجھنے کا دور ہے

میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ قرآن کے بہت سے حقائق' ان کے کھلنے کے لیے یہ دور آیا ہمارا جس میں یہ سائیکولوجی آئی ہے' علم النفس جو ہے یا نفسیات جسے آپ کہتے ہیں۔ قرآن بنیادی طور پر بات ہی نفسِ انسانی کی کرتا ہے۔ آج تک یہ چیز قیاسات میں تو تھی' ابھی تک یہ سائنس کے طریقے کے اوپر A branch of knowledge نہیں بنی تھی۔ اب بھی اس کی ابتداء ابھی ہوئی ہے' اِسے ابھی صحیح Scientific Basis پہ تو نہیں لائے لیکن بڑی حد تک اس میں یہ ترقی کرتے ہیں۔ یہ دور ہمارے ہاں کا اب علم النفس

کا دور آیا ہے اس میں قرآن کے حقائق آپ دیکھیں گے کیسے بے نقاب ہوتے ہیں۔ کہتا ہے یہ چیز تو ہے کھلے دلوں سے اندر اور باہر کی زندگی ایک ہوگی تو اس میں یہ چیز ہوگی تمہاری۔(اَلَآ اِنَّھُمۡ یَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَھُمۡ لِیَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡہُ) (11:5) اب یہ دیکھئے جو میں نے عرض کیا ہے نا کہ ہمارے ہی دور میں یہ چیزیں کھلتی ہیں، کم اس سے پیشتر کھلی ہونگی۔

لفظ یثنون صدورھم کے لفظی ترجمہ کی نوعیت لیکن علم النفس کے تحت اس کا قرآنی مفہوم Dual Personality ہے، Unconscious Mind ہے

(یَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَھُمۡ) (11:5) لفظی ترجمہ ہے اپنے سینوں کو دہرا کرتے ہیں۔ تو کیا بات اس میں سے سمجھ میں آسکتی تھی۔ اس دور میں یہ آیا۔ اس آیت کے آخر میں ہے (اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ) (11:5) وہ جانتا ہے۔ اب وہ صدور ترجمہ اس کا کیا جائے گا تو معنی تو یہ ہونگے کہ وہ جانتا ہے جو کچھ سینوں کے اندر ہے۔ وہ سینوں کے اندر، یہ تو ہر ڈاکٹر جانتا ہے، وہ جس نے بھی آپ کے ہاں اناٹومی پڑھی ہے، وہ جانتا ہے سینے کے اندر کیا ہے۔ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے قصائی کی دوکان پہ چلے جایئے، نظر آجاتا ہے پھٹا ہوا سینہ وہ موجود ہوتا ہے کھلا ہوا۔ وہ شاعری میں کہہ جاتا ہے کہ

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
کہہ دیا دو دو آنے میں لے لو جی

کیا شاعری ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ تو یہ کچھ ہوتا ہے نا سینے کے اندر۔ اب بات سمجھ میں آتی ہے جسے اس نے کہا تھا (شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57) سینے کے امراض میں شفاء، تو یہ نہیں تھا" کہ نمونیے دی شفا ایہد ے اچ لکھی ہیگی اے"۔ (الصُّدُوۡرِ)(11:5) ایک جامع اصطلاح ہے اس کی، آج کی سائیکولوجی اس کو بتا رہی ہے یہ جو Conscious اور Unconscious Mind جن کو آج انہوں نے کہا ہے۔ اب آیئے ان الفاظ کے بعد کہ کیا بات بنتی ہے۔(یَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَھُمۡ) (11:5) آج کی اصطلاح ہے Dual Personality ایک، دو قسم کی شخصیتیں رکھنا۔ اگر اس کو شعوری طور پہ کرے انسان تو وہ منافقت ہوتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر Dual Personality ہو جاتی ہے انسان کی۔ Conscious Mind کی الگ Personality، Unconscious Mind کی الگ Personality، نفسِ شعوری کی الگ ایک مملکت، نفسِ غیر شعوری کی الگ مملکت۔ یہ Dual Personality جو ہے یہ بتایا جا رہا ہے آج کہ جتنے عذاب اس وقت آ رہے ہیں افراد پہ اور ان کے مجموعوں پہ، وہ Dual

Personality کی وجہ سے آ رہے ہیں۔ Balanced Personality وہ ہے جن میں ان دونوں کے اندر توازن ہوتا ہے ان میں اختلاف نہیں ہوتا Contradiction نہیں ہوتی۔ان کو Complexes کہتے ہیں سائیکولوجی' Complex نہیں ہوتا۔ جہاں Complexes ہوتے ہیں وہاں وہ Dual Personality ہوتی ہے۔لفظ ہے برادرانِ عزیز! (یَثۡــــنُـــوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ) (11:5) Dualاسکا ترجمہ ہےاس یثنون کا۔ ورنہ آپ سوچئے کہ جو اپنے سینے کو دوہرا کرتے ہیں یعنی اس سے تو مفہوم نہیں سمجھ میں آتا۔ لیکن میں نے کہا ہے کہ یہ ان لوگوں کا کچھ قصور اس میں نہیں ہے کہ انہیں کو سنے لگیں' اس دور کی علمی سطح ہی اتنی تھی ابھی۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ ؕ اَنَّهُ الۡحَـقُّ ؕ(41:53) ہم اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تمہیں عالمِ آفاق میں بھی عالمِ انفس میں بھی' خارجی دنیا میں' تمہارے اپنے نفس کی دنیا میں بھی تا نکہ یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے لفظاً لفظاً حق ہے۔اس کا تو ایک طریقہ عالمِ انفس کے جتنے بھی رموز ہیں' وہ بھی بے نقاب جوں جوں ہوتے چلے جائیں گے ہر حقیقت جو سامنے آئے گی قرآن کے کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت ہوگی عزیزانِ من!۔(يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ) (11:5) کہتا ہے یہ Dual Personality' کا ہے کے لیے؟ (لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ) (11:5) تا کہ ان میں سے ایک چیز جو ہے' اس کو چھپا لیں۔ یہ Unconscoius Mind کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس سے چھپا لے۔ کہا کہ یہ Dual Personality میں سمجھتے ہیں کہ کچھ حصہ اس سے چھپا لیا۔(اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ) (11:5) یہ تو Dual کہتے ہو' وہ کہتا ہے اگر ساری کی ساری Personality بھی تم چھپا کے رکھ لو اس سے' پھر بھی نہیں چھپی ہوئی بات رہ سکتی صاحب۔

تراجم کے اندر لفظ ثیاب کا ترجمہ کپڑوں کو لپیٹ لینے کا کیا جاتا ہے

یہاں پھر وہ ترجمہ لے آیئے۔(يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ)(11:5) ثیاب کے معنی انہوں نے کیے کپڑے۔ آپ کو پتہ ہے ثیاب کا ترجمہ کیا ہے؟ کوئی ترجمہ اٹھا کے دیکھ لیجیے آپ کو یہ ملے گا' اگر یہ اپنے سینوں کو دوہرا بھی کر لیں تا کہ اس سے چھپا لیں کچھ یا اپنے کپڑوں کو بھی لپیٹ لیں پھر بھی خدا جانتا ہے کیا ہے'۔ ''یعنی گٹھڑی اچ کی بنھیا ہویا ہیگا''۔

کسی دور کا سمجھا ہوا قرآن دوسرے آنے والے دور کے لیے حرفِ آخر نہیں ہوسکتا

میں نے عرض کیا ہے نا کہ یہ اس لیے تنقیص نہیں ہے جو میں کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے یہ کیوں کیا' اُس دور کا علم ہی ابھی اتنا تھا۔ اس میں نقص یہ ہے کہ ہم کسی ایک دور کے سمجھے ہوئے قرآن کو ابدی طور پر سمجھا ہوا سمجھ لیتے ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ سلفِ صالحین نے یہ لکھ دیا۔ انہوں نے اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق یہ چیزیں لکھی ہیں۔ قرآن تو ابدیت در کنار ہے۔ کسی انسان کا فہم جو ہے وہ کس طرح سے

قیامت تک کے لیے غیر متبدل اور سند بن جائے گا۔ یہ ہیں نا ان کے فہم' سینے کو دہرا کرتے ہیں تا کہ خدا سے چھپا لیں' اگر یہ اپنے سارے کپڑے بھی لپیٹ لیں تو پھر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ آج بات سمجھ میں آتی ہے۔(ثِیَابَھُمْ ۙ)(11:5) اب دیکھئے نا یہ چیزیں۔ آپ میر الغت اٹھا کے دیکھئے گا۔ آپ کو معلوم ہے سورۃ مدثر میں وہ جو آتا ہے(وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ) رسول اللہ سے کہا گیا(یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ) اور(وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ) (74:4) ترجمہ کیا جاتا ہے اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

بات کپڑوں کو پاک رکھنے کی نہیں بلکہ اپنی شخصیت کو پاکیزہ رکھنے کی ہے

یعنی سوچئے عزیزانِ من! رسول جیسی شخصیت ان کے لیے یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی آنا چاہیے کہ کپڑے صاف رکھا کر۔ آرہا ہے تیرہ سو سال سے اب یہ چیز۔ انہی عربوں کے ہاں یہ چیز جو ہے ثوب جو ہے کپڑا' اس سے شخصیت مراد لیتے تھے۔ لباسِ آدمیت ہم بھی اپنے ہاں کہتے ہیں نا۔ اس سے شخصیت وہ مراد لیتے تھے' ان کے ہاں موجود تھی یہ چیز۔ انہوں نے کہا یہ ہے کہ پہلی چیز یہ ہے کہ اپنی شخصیت جو ہے اس کو پاکیزہ رکھنا قرآن پر عمل پیرا ہونے کے لیے۔ یہاں اس نے کہا ہے(یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَھُمْ ۙ) (11:5) کپڑے کی بات نہیں ہے Personality کی بات ہے شخصیت کی بات ہے۔(یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ) (11:5)اس نے کہا ہے کہ یہ Dual Personality رکھتے ہیں اس میں سے کچھ اس سے چھپاتے ہیں۔ وہ تو پھر بھی کچھ حصہ تو چھپاتے ہیں کچھ تو ظاہر ہوتا ہے نا جو شعور میں ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ تو ایک طرف رہا اگر ساری کی ساری اپنی جو Personality ہے اس کو بھی چھپا لیں(یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۚ)(11:5) وہ تو ان کے Unconscious اور Conscious دونوں سے واقف ہے۔(اِنَّهٗ عَلِیْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ) (11:5) یہاں آئی وہ بات۔ جو کچھ بھی نفسِ انسانی کے اندر ہے اس کے Unconscious میں ہو یا Conscious کے اندر ہو وہ جانتا ہے۔

انسان کے Mind کا علاج اقدارِ خداوندی سے ہی ممکن ہے

عزیزانِ من! یہ جو چیز ہے اس دور میں ہمارے ہاں آئی کہ Unconscious Mind کے اندر چھپی ہوئی جو چیزیں ہیں ان کو کسی طرح باہر لاتے ہیں۔ وہ خدا کے اسی دیے ہوئے علم کی بدولت ہے جو اس نے کہا ہے۔ وہ Unconscious Mind کی چیزوں کو بھی جانتا ہے۔ جو اس کے بتائے ہوئے اس طریقِ علم کے اوپر چلے گا Unconscious Mind کے رموز جو ہیں وہ بھی اس کے سامنے آجائیں گے۔ اور شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (10:57) جو اس نے کہا ہے۔ اب تو عزیزانِ من! وہ بتا یہ رہے ہیں کہ یہ 99% کے قریب بیماریاں جو ہیں خاص طور پہ یہ اعصابی وغیرہ' وہ ساری Psycholigical ہوتی ہیں(مَا فِی الصُّدُوْرِ) ہوتی

ہیں وہ بیماریاں۔ان کی شفاء دوائیوں سے نہیں ہو سکتی' ان کی شفاء اقدار سے ہوتی ہے' Values سے ہوتی ہے۔قرآن ان کی شفاء دیتا ہے' ان امراض کا بتاتا ہے کہ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (2:10) اس کے مقابل میں امراض جو ہیں وہ کہتا ہے یہ امراض جو ہیں' Mind کے امراض ہیں بدن کی بیماریاں نہیں ہیں۔علاج اس کا طریقہ اس کا کیا ہے؟ (عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ) (11:5) جتنا جتنا انسان اس علم میں آگے بڑھتا جائے گا خدا کی دی ہوئی استعداد کے مطابق' اتنا ہی ان بیماریوں کا بھی علاج کرتا چلا جائے گا' ایسے ہی دوہری Personality جو ہے' یکسوئیت اس میں پیدا ہوتی چلی جائے' Balance Personality ہوتی چلی جائے گی' اتنا ہی اس کا مرض کم ہوتا چلا جائے گا۔تیرہ سو سال پہلے یہ گفتگو ہو رہی ہے عزیزانِ من!۔یہ سارا کچھ کرنے کے بعد اب آیا وہ' یہ ساری تمہید تھی۔ایک خدا کے قوانین کی اطاعت' دین لانے والے کو اس مقام کے اوپر رکھنا' حفاظتی تدابیر اختیار کرنا' تساہل و تغافل یا لغزش کے اندر پھر اسی کے بتائے ہوئے طریقِ علاج کی طرف لوٹنا' اس سے متاعِ حیات ملنا' اس وقت تک ملتے چلے جانا جب تک تم اس روش پہ چلو' حسن کارانہ انداز سے ملنا' ملنا اُسے کہ جو جتنے اپنے اندر اس کی استعداد پیدا کرے گا اس کے مطابق ملتا ہوا چلا جائے گا۔ یہ سارا کچھ اس کے بعد بتایا۔ہوگا یہ اس صورت میں کہ نہایت خلوص سے کھلے دل سے خاص طور پہ ایک معتدل شخصیت کے ساتھ (Balanced Personality) والے افراد جو ہیں' وہ یہ سارا کچھ کریں گے۔یہ کچھ پورا نظام کاہے کے لیے ہوگا؟ (وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزۡقُهَا) (11:6)

رزق کی ذمہ داری کیونکر پوری کی جائے' اس کا حل

وہ جو متاعِ حسنا کہا تھا نا کہ یوں ملے گا رزق۔کہا اس کی صورت یہ ہوگی یہ سارا نظام ہوگا لیکن کوئی لینے والا یہ نہیں کہے گا کہ کسی فرد کی طرف سے ملے گا۔اعلان کیا جائے گا کہ جو بھی یہاں جاندار ہے اس صفحۂ ارض کے اوپر' اس کے رزق کی ذمہ داری خدا کے اوپر ہے۔ بہت بڑا انقلابی اعلان ہے عزیزانِ من!۔(وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ) (11:6) یہاں صرف انسان نہیں کہا' ہر ذی حیات جو ہے اس کی ذمہ داری خدا کے اوپر ہے۔اس پہ یہ اعتراض وارد ہوا کرتا ہے کہ صاحب خدا نے ذمہ داری لی ہے رزق کی' یہ باقی تو چھوڑ دیجیے دآبہ جو ہیں' یہ اشرف المخلوقات انسان ایک ایک قحط پڑتا ہے' لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مر جاتے ہیں۔اور قحط نہ بھی پڑے تو آج آپ کے ہاں United Nations کی طرف سے وہ جو اعداد و شمار شائع ہوتے ہیں' اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس وقت پوری دنیا کی آدھی آبادی کو ایک وقت کھانے کو مل رہا ہے۔اعتراض یہ پڑتا تھا کہ یہ خدا نے جو ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے' یہ کیسے پوری ہو رہی ہے' دنیا تو بھوکی مر رہی ہے' وہ کہتا ہے ہمارے ذمہ ہے۔یہ اعتراض آج ہی نہیں ہوا۔یہ جو چیز تھی کہ اگر اس کی ذمہ داری ہے تو پھر ہر ایک کو ملتا

کیوں نہیں ہے۔اس زمانے میں بھی یہ اعتراض ہوا ہوگا کہ ملتا کیوں نہیں ہے۔(وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ) (36:47) بتایا ہے کہ یہ اس کا نظام کیا ہوگا جس کے ماتحت یہ چیز پوری ہوگی۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہی اپنی زائد از ضرورت چیزیں جتنی بھی ہیں' ان کو کھلا رکھو دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے۔(قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا) (36:47) تو یہ مخالفین جو ہیں وہ ان لوگوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرو' ان سے یہ کہتے ہیں کہ بھئی تمہارے ہاں تو یہ بات ہے کہ خدا نے ذمہ لے رکھا ہے ہر ایک کے رزق کا۔(اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ) (36:47) تو اگر خدا نے ان کو کھلانا ہوتا ان کو رزق دینا ہوتا تو وہ ان کو دیتا کیوں نہ رزق۔ جو ان کو نہیں مل رہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان کو دینا نہیں چاہتا' تو ہم سے کہتے ہو کہ ان لوگوں کو ہم رزق دیں جن کو وہ رزق دینا نہیں چاہتا۔ نہ بابا ہم کیسے ان کو دیں' وہ نہیں دینا چاہتا ''خدا نال لڑائی لڑیئے''۔ وہی چیز کہ صاحب رزق تو پھر خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ امیری غریبی فارغ البالی' عسرت تنگی ساری خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ وہ کفار کہہ رہے ہیں یہ بات جو آج فخر سے ہر مسلمان کہتا پھر رہا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بات ہے تو وہ پھر خدا سے کہو نا دے جن کو یہ نہیں مل رہا' ہمیں آپ کیوں کہتے ہیں۔(اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ) (36:47) کس قدر گمراہی میں ہیں جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ خدا براہِ راست وہاں عرش پہ بیٹھا ہوا دیگیں پکا پکا کے نیچے اتارتا چلا جائے گا اور ان کو ملتا چلا جائے گا۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ سامانِ رزق جو ہے یہ تو انسان کے پیدا ہونے سے پہلے ہم نے پھیلا دیا تھا یہاں۔ ساری بات آگے تقسیمِ رزق کی ہے۔ تقسیمِ رزق نظام کی طرف سے ہوتا ہے جو انسان قائم کرتا ہے۔ اُس نظام کی ذمہ داری یہ ہے کہ رزق تقسیم اس طرح سے کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی ضرورت سے محروم نہ رہنے پائے۔ وہ چیز جو حضرتِ عمرؓ کا قول بار بار میں دہرایا کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں فکرِ معاش کا حل

جب ان سے یہ کہا گیا تھا کہ الحمدللہ آج اس مملکت میں کوئی فرد بھی بھوکا رات کو نہیں سوتا۔ اُنہوںؓ نے یہ کہا تھا کہ قرآن نے افرادِ انسانیہ نہیں کہا دآبۃ کہا ہے اس نے تو' اس نے تو ذی حیات کہا ہے۔ خدا کی قسم اگر عمرؓ کی مملکت میں فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی کیونکہ خدا نے دآبۃ کہا ہوا ہے۔ وہ تو مملکت میں پھرنے والے ان کتوں کے رزق کی بھی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے تھے۔ یہاں انسانوں کے بچے بلک بلک کے مر جاتے ہیں۔ کیوں یہ مرتے ہیں؟ یہاں بھی ملتا ہے کتوں کو رزق' بس وہ رزق کی تقسیم یہ ہے کہ بعض وہ ہیں کہ جن کے کتوں کو وہ ملتا ہے جو غریب کے بچے کو نہیں ملتا۔ بس تقسیم کا سارا سوال ہے۔ وہاں یہ بات نہیں تھی۔ جب پوچھا اس آنے والے سفیر نے حضرتِ عمرؓ سے جو کھانا سامنے آ گیا تھا' جَو کی روٹی کھا رہے تھے نمک کے ساتھ۔ اس

نے کہا تھا کہ آپؓ جو کی روٹی کھا رہے ہیں تو آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے ہماری مملکت میں تو گیہوں بہت ہوتا ہے اب۔ اس سے کہا آپؓ نے کہ عمرؓ کو اس بات کا تو یقین ہے کہ مملکت میں ہر فرد کو آج جو کی روٹی مل رہی ہے۔ تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں یہ بات تو ابھی نہیں ہوئی۔ تو آپؓ نے کہا کہ جس دن مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ تمام افرادِ مملکت کو گندم کی روٹی مل رہی ہے' اس دن میں گندم کی روٹی کھاؤنگا۔ ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری۔

نبی اکرم ﷺ کے دور میں پورے مکے میں تعلیم کا معیار صرف 17 (سترہ) افراد پر مشتمل تھا

اگلے دو لفظ دیکھئے صاحب اور جھوم جایئے قرآن پہ۔ اور یہ بھی میں عرض کرونگا کہ جس دور میں یہ بات کہی تھی اس دور میں عرب تو ایک طرف بیچارے یہ تو جاہل تھے۔ سارے مکے میں سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے کچھ تھوڑا بہت۔ تو علم کی یہ سطح کہاں سے آئے گی۔

انسانی پیدائش سے بھی پہلے اس کے رزق کا انتظام کس قدر حیران کن اور مکمل ہے

رزق کی ذمہ داری۔ بچہ پیدا ہوتا ہے گھر میں فراواں روٹی موجود ہو' آٹا موجود ہو' گیہوں موجود ہو' اس کو رزق نہیں اس میں سے مل سکتا۔ اسے دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ دودھ کا نظام جو ہے اس رازق نے کیا رکھا ہوا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو معدہ بڑا کمزور ہوتا ہے اس کے ماں کے دودھ میں کوئی نوے فیصد پانی ہوتا ہے' دس فیصد دودھ ہوتا ہے۔ یہ جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے عمر میں' معدہ اس کا زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے' ضرورت ہوتی ہے اس کو اور اجزاء کی زیادہ۔ از خود اس ماں کے دودھ کے اندر پانی کم ہوتا جاتا ہے اور یہ اجزائے رزق جو ہیں یہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ اتنے بڑھتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ دو اڑھائی سال کے بعد بچہ جب یہ باہر کی خوراک ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو یہ سرچشمے سوکھ جاتے ہیں۔ ہماری اگلی جنریشن نے تو ''نہ کدی میئں ویکھی ہونی اے' ایہناں نوں میں کی کہواں کھانگڑ کینوں کیندے ساں' اے پرانے بڈھے کچھ سمجھ لین گے کوئی چیز ہوندی سی۔ کھانگڑ میئں دا دودھ تہانوں پتہ ہیگا اے پئی او کیوں ایہو جیا' او کھوئے ورگا دودھ ہو گیا ہو یا ہوندا سی''۔ کھانگڑ کے معنی ہوتے تھے کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہوئے ہوئے کو عرصہ لمبا ہو گیا ہو سال بھر کا۔ تو وہ خود بخود دودھ وہ جو پہلے دن کا اتنا پانی لیے ہوئے ہوتا تھا از خود وقفے کے بعد وہ دودھ از خود اتنا گاڑھا ہو جاتا تھا وہ' کھویا بن جاتا تھا ''جنوں کھانگڑ میئں دا دودھ کیندے نیں''۔ ماؤں کے دودھ بھی۔ اور اب میں کہتا ہوں ''او مییاں تے رہیاں نئیں' اگلے بچیاں نے تے ماں دا دودھ وی نئیں ساڈے ویکھیا ہیگا۔ او اگلے دن کراچیوں ڈبے او نے بند ہو گئے تر تھلی پے گئی سارے لاہور اچ''۔ مائیں بچوں کو چھاتی سے لگائے لگائے ڈبے والوں کی دوکانوں پہ ڈھونڈ رہی تھیں دودھ۔ او کم بخت دودھ تو تیرے اپنے اندر موجود ہے' ان سرچشموں کو سکھا دیا تو نے اور اب ان ڈبوں کی تلاش میں پھر رہی ہے۔ پندرہ دن تک نہیں ملا تھا۔ آپ کو پتہ ہے

ان ڈبوں کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کچھ' اتنی عمر کا ہو تو اتنا چمچی یہ دودھ کی اور اتنا پانی۔ یہ جو مقرر کیا ہوا ہے ناپیانہ ڈبے کے اوپر' آپ حیران ہونگے کہ انہوں نے ماں کے دودھ کا تجزیہ کر کے پیانہ بنایا ہوا ہے۔ سوچیے تو سہی' یہ نظام جو تھا کہ ہر سٹیج کے اندر اس کے مطابق رزق ملتا چلا جائے اس نے جو پیدا کیا ہے۔

ایک جرثومے سے انسانی پیدائش اور پھر اس کی ذہنی صلاحیتوں کی طویل کہانی اور اس کی پرورش کے لیے سامان زیست کے مختلف مراحل

یہ مختلف Stages ہوتی ہیں ہر جاندار کے اندر۔ اور زندگی از خود' یہ تو سائنس کی تحقیق ہوگئی کہ وہ جرثومے سے لے کے وہ جو ذرا سا ایک ننھا سا جرثومہ سیل جس کو کہتے ہیں' وہاں سے لے کے زندگی یہ انسان کی شکل تک جو آئی ہے' یہ مختلف Stages میں سے گذرتی ہوئی آئی ہے۔ ہر سٹیج کے اندر زندگی کے لیے رزق کی نوعیت مختلف ہوتی ہے' مختلف قسم کا اس کو رزق چاہیے' سامانِ زندگی چاہیے۔ پھر اس کا طریق یہ رہا ہے کہ یہ زندگی کسی ایک سٹیج کے اندر کچھ وقت کے لیے آ کے ٹھہر جاتی ہے۔

انسانی جنین کی مختلف حالتیں (Stages) کے مطابق رزق کی فراوانی

یہ جو Evolution جسے کہتے ہیں۔ اس میں ٹھہر جاتی ہے پھر وہ اس سے اگلی سٹیج کے اوپر آ جاتی ہے۔ یوں آ رہی ہے زندگی' ٹھہرتے ہوئے اگلی سٹیج میں پہنچتے ہوئے' پھر وہاں ٹھہرتے ہوئے' اگلی سٹیج میں پہنچتے ہوئے۔ یہ Evolution یا ارتقاء کی تھیوری تو ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں۔ یہ جو جنین ہے' بچہ پیدا جیسے ہوتا ہے' اس کے متعلق تو کچھ کچھ علم اب عام ہو رہا ہے نا۔ پہلا ایک جرثومہ ہوتا ہے نا رحمِ مادر کے اندر جس کا وہ استقرار ہوتا ہے اور پھر وہاں سے وہ نشو ونما لینا شروع کرتا ہے۔ مختلف اندر اس کے Stages آتی ہیں' اس کی ہر سٹیج کے لیے رحمِ مادر کے اندر اس کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ رحم کہ وہ تین قسم کی جھلیوں کے اندر بچہ ہوتا ہے وہ' اتنی حفاظت میں ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا کے ساتھ تو سوال ہی نہیں کچھ تعلق پیدا ہو سکے اس کا۔

رحمِ مادر میں بچے کے لیے سامانِ نشو ونما کی ترسیل کا ذکر

آپ کو معلوم ہے کہ اس غذا کے اندر اس کو وہ کچھ بھی پہلے چاہیے ہوتا ہے جس سے یہ صرف گوشت کا بنتا ہے لوتھڑا۔ پھر وہ چیزیں چاہئیں کیلشیم وغیرہ جس سے پھر اس کی ہڈیاں بنتی ہیں۔ پھر اس میں فولاد چاہیے' پھر فاسفورس چاہیے' پھر گندھک چاہیے۔ جتنے بھی یہ اجزاء ہیں یہ اس کو مختلف Stages میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ اندر ہی اندر ماں کے جسم سے یہ ساری چیزیں جتنی جتنی ضرورت جس سٹیج میں ہوتی ہے' وہ ملتی چلی جاتی ہیں۔ تین تہوں کے اندر جو Sealed ہوتی ہیں جن میں کوئی کسی قسم کا بھی باہر سے منفس نہیں ہوتا

کوئی ایسا روشندان نہیں ہوتا کہ باہر سے کوئی چیز جائے۔ان تین جھلیوں کے اندر لپٹا ہوا' سیل کے اندر' خول کے اندر وہ بچہ سانس بھی لیتا ہے وہاں' دورانِ خون بھی ہوتا ہے اس کا دل دھڑکتا ہوا باہر سے بھی محسوس ہو جاتا ہے۔یہ اتنی سٹیج کا علم تو ہمیں ہر ایک کو ہو سکتا ہے ایک بچے کا۔یہ ساری زندگی پہلے جرثومے سے انسان کی سٹیج تک جو پہنچی ہے ان Stages کے اندر سے گذرتی ہوئی پہنچی ہے

ہر ہر سٹیج کے لیے رزق کی ذمہ داری خالق کائنات نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے

عزیزانِ من!۔یہ ہمارے اس دور نے آ کے یہ بتایا ہے کہ زندگی کا طریقہ یہ رہا ہے کہ ایک سٹیج میں وہ آتا ہے کچھ وقت کے لیے وہاں وہ ٹھہرتا ہے۔یعنی مسلسل نہیں چلا جاتا آگے' ٹھہرتا ہے' رکتا ہے۔وہاں اس کی اتنی Development ہوتی ہے جو اس سٹیج کے اندر ہو سکتی ہے' اس کے بعد وہ اگلی سٹیج کے اندر جا پہنچتا ہے۔عزیزانِ من! دو لفظ سنیے اور جھوم جایئے۔کہا کہ ہر دآبہ کے رزق کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔اور کیفیت یہ ہے زندگی کی (وَ یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ) (11:6) ہم جانتے ہیں کہ زندگی نے کسی سٹیج میں کتنے وقت کے لیے ٹھہرنا ہے اور اس نے اسے کسی دوسرے کے پاس امانت کے طور پر آگے کیسے دیدینا ہے۔(مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ) (11:6) یہ ھا دیکھئے' زندگی کا مستقر جہاں اس نے کچھ وقت کے لیے ٹھہرنا ہے۔کتنا حسین لفظ ہے مستودعھا۔اور پھر وہ جیسے اپنے ہاتھوں کو اٹھا کے دوسرے سے کہے کہ ''بہن میری امانت ہے ایہنوں لے لے''۔پچھلی سٹیج اگلی سٹیج یہ کہتی ہے کہ یہ میرے پاس ایک امانت ہے' اب تو لے لے اس کو۔الفاظ ہیں یہ عزیزانِ من!۔میں کیا عرض کروں کیا قرآن ہے مجھے تو پاگل کر دیا ہے اس قرآن نے۔ہر سٹیج کے اندر اس کے مطابق رزق بہم پہنچاتے چلے جانا' جنین کو اس طرح سے اندر۔جونہی وہ جنین اس باہر کی دنیا کے اندر آیا اس کے ساتھ ہی رزق کے سرچشموں کی ٹونٹیاں کھل گئیں جیسے کہتے ہیں۔اور پھر اس کی سٹیج جتنی بھی ہے اس کے مطابق وہ رزق ملتا چلا جاتا ہے۔آپ دیکھئے سورۃ الرحمٰن کی یہ آیت جس کے متعلق پھر پوچھو نہیں کیا کیا کہا جاتا ہے میں کیا عرض کروں۔(یَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ) (55:29) ترجمہ آپ کو عام طور پہ ملے گا کہ زمین اور آسمان میں جو کچھ بھی ہے اس سے (یَسۡـَٔلُهٗ)(55:29) سوال کرتے ہیں پوچھتے ہیں (کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ)(55:29) اور خدا ہر دن میں اپنی الگ شان میں ہوتا ہے۔کیا سمجھتے ہیں آپ' خود خدا کے متعلق کیا بات ذہن میں آتی ہے۔(یَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ) (55:29)

لفظ سئل تو محتاج کے لیے ہے جس کی ضرورت ہر دن ایک نیا انداز یا ایک نئی شان لیے ہوتی ہے

سئل کے معنی یہ محتاج ہونا ہوتا ہے۔سائل اس کو ہی کہتے ہیں جو محتاج ہوتا ہے وہ پوچھتا نہیں ہے کچھ۔وہ صرف ایک سٹیج ہوتی ہے جو علم کی سٹیج میں پوچھتا ہے شاگرد استاد سے' وہ بھی محتاج ہوتا ہے' بنیادی معنی اس کے احتیاج کے ہوتے ہیں عربی زبان میں۔(یَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ

فِـی السَّـمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط) (55:29) پوچھتے نہیں' کائنات کی پستیوں بلندیوں میں جو بھی ہے وہ محتاج ہے اس کے رزق کا۔اور اس کی احتیاج کا عالم یہ ہے(کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ) (55:29) ھو کے معنی ہیں جو کچھ ارض وسماء میں ہے۔ارض وسماء میں جو کچھ ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اپنے رزق کے لیے وہ محتاج ہے۔اور کیفیت اس کی یہ ہے کہ ہر سٹیج کے اندر وہ ایک جداگانہ شان میں وہ جداگانہ نوعیت میں شے ہوتی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ایک دفعہ کا رزق مہیا کر دیا' راشن لگا دیا اور وہ ہمیشہ تک وہی ملتا چلا آیا۔ ہر شے کائنات کی پہلے تو اشیاء کو دیکھئے کہ ان کی نوعیتیں کتنی ہو گئیں' ارب در ارب۔اور ہر شے کی کیفیت کہ ہر سٹیج میں اس کو الگ قسم کا رزق چاہیے۔کہا اس قسم کا رزق دینے والا خدا(فَبِـاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ) (55:30) جھٹلاؤ تو سہی جھٹلا سکتے ہو تو اس کو' ایسے خدا کے نظامِ رزق کو۔(یَسْئَلُهٗ مَنْ فِـی السَّـمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط) (55:29) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے محتاج ہے اپنی زندگی کے لیے اس کے رزق کی۔اور شے کی کیفیت یہ کہ(کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ) (55:29) ہر سٹیج میں اس کی ضرورت کے تقاضے مختلف ہیں۔اور اتنی اشیاء اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے تقاضے کے مطابق رزق کا مہیا کرنا۔یہ ہے خدا کا رزق(فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ) (55:30)

خدا تعالیٰ کی طرف سے رزق کی فراہمی کے لیے' رب کریم نے کیا کچھ کر رکھا ہے سورۃ رحمٰن اپنی مثال آپ ہے

خدا کبھی فرصت دے گا تو آئیں سورۃ رحمٰن کے اوپر پھر دیکھئے گا کس کس مقام کے اوپر وہ لاتا ہے(فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ) وہ کہا کہ(وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا) (11:6) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے۔(وَیَعْلَـمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَاط) (11:6) وہ جانتا ہے کہ کس مقام پہ کس شے نے کتنا وقت ٹھہرنا ہے وہاں اس کے رزق کی ضرورت کیا ہے۔پھر اگلی سٹیج کے اندر جہاں اس امانت کو آگے اس نے سونپ دینا ہے اس نے دوسرے کے ہاتھ میں' وہاں اسکی کیا کیفیت ہونی ہے' وہ جانتا ہے۔اور یہی وہ چیز ہے سائلین۔

کائنات کا ذرہ ذرہ نظامِ ربوبیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر آن مصروف کار ہے

عزیزانِ من!۔سوال پیدا یہاں ہو رہا ہے زمین پہ ذاتی ملکیت کے Question کا کہ کس قسم کے قوانین بنیں اور کس قسم کے انتظامات ہوں۔سوال تو کس قسم کا نہیں ہے' سوال تو مقصد کا ہے کہ مقصد اس کا کیا ہے' مقصد وہ یہاں آ گیا' وہ سائلین آ گیا۔(وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَآ اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ط) (41:10) زمین کے اندر ہم نے خزانے دبا کے رکھ دیے ہیں رزق کے' مختلف فصلوں میں مختلف موسموں میں تم دیکھو گے کہ کس طرح مختلف قسم کے اس میں سے رزق کی چیزیں باہر چلی

آتی ہیں' نمود ہوتی چلی جاتی ہے ان کی۔ یہ سب کچھ ہم نے کیا ہے' کاہے کے لیے یہ کیا ہے؟ (سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ) (41:10) ترجمہ یہاں بھی انہوں نے کر دیا' پوچھنے والوں کے لیے یکساں'۔ ارے کوئی تک بھی ہے اس چیز کی' اس کے معنی کیا ہوئے کہ زمین کے اندر یہ کچھ کر دیا مختلف فصلوں میں مختلف چیزیں اگتی ہیں' پیدا ہوتی ہیں' پوچھنے والوں کے لیے یکساں' سائلین کے معنی پوچھنے والے۔(سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ) (41:10) کاہے کے لیے یہ کہا؟ جتنے ضرورت مند ہیں ہر ایک ضرورت یکساں طور پہ پوری ہو۔آواز بلند ہو رہی ہے مساواتِ محمدی ﷺ۔(سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ) (41:10) جس کی جو ضرورت ہے' جتنی ضرورت ہے اتنا ہر ایک کو ملتا چلا جائے' اس لیے ہم نے یہ کچھ کیا۔ دیکھتے ہیں کہ یہ ملکیتِ ارض وغیرہ کے مسائل کیسے حل ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہر ضرورت مند کی یکساں ضرورت پوری ہو۔اور اس کی صورت یہ کہ (مُسْتَقَرَّھَا وَ مُسْتَوْدَعَھَا) (11:6) جس سٹیج میں بھی ہے وہاں ضرورت پوری ہو اس کی۔

اس کائنات کی تخلیق کا مقصد تو رحمِ مادر میں پرورش پانے والے انسان کی انسانیت کو بغیر کسی قسم کی رکاوٹ کے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے

رزق پیدا ہم نے کر دیا اب اس کا نظام یا انتظام جو ہے وہ انسانوں کے ہاتھوں سے ہوگا۔ اس کے لیے ضرورت ہوگی صرف خدا کے احکام کی اطاعت کرنے کی۔ یہ سارا قصہ جو کچھ بھی ہے وہ کہا یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ یونہی At Random ہمارے ہاں یہ چیز آتی ہے ذہن میں' ہم کچھ کر دیتے ہیں۔(کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ) (11:6) یہ سب کچھ ہمارے ہاں قانون کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے مطابق یہ ہوگا۔ یعنی خود اپنے اوپر اس کی پابندی خواہ آپ ہی وضع کی ہو وہ کتاب جو ہے اس نے لکھی ہو۔ لیکن یہ سارے نظام کے لیے خود ایک کتاب لکھی ہوئی ہے اور اس کتاب کے مطابق خدا کرتا چلا جا رہا ہے عزیزانِ من! سورۃ ھود کی آیت 6 تک ہم آ گئے ساتویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

دوسرا باب: **سورۃ ھود** (آیات 7 تا 12)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظریہ ارتقا کے تحت انسان کا حسنِ عمل اسے موت کے بعد ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے

عزیزانِ من! آج دسمبر 1973ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی ساتویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (11:7)

نظریۂ ارتقا کے سلسلہ میں مستقر اور مستودع کی ان دو اصطلاحات کا بنیادی مفہوم

آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلی آیت میں ایک عظیم والی بات آئی تھی۔(**وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا**) (11:6) کہ روئے زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں کہ جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ تشریح اس کی پچھلے درس میں گذر چکی تھی۔ اور اسی آیت کا اگلا حصہ تھا(**وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ**) (11:6) یہ زندگی جن وادیوں سے گذری ہے، جن مراحل سے گذری ہے، جس طرح اس نے اپنے ارتقائی منازل طے کر کے مختلف پیکروں میں سے گذر کر، یہ ہیئت انسانیہ اختیار کی ہے، اُسے قرآن نے مستقر اور مستودع کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آج اگر کوئی Evolution کے نظریہ کا ماہر قرآن کی ان دو اصطلاحوں

کو اگر لے اور اس کے اوپر ریسرچ کرے تو آپ دیکھیں کہ کتنے کتنے محیر العقول حقائق آپ کے سامنے آتے ہیں۔ مستقر اور مستودع سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے بتایا کہ زندگی کی کیفیت یہ رہی ہے کہ وہ ایک سٹیج میں پہنچ کے کچھ عرصے کے لیے ٹھہری ہے۔ قرار کہتے ہی اس وقفے کو ہیں جو حرکت کے بعد کچھ وقت ستانے کے لیے کہیں ٹھہر جائے۔ اور پھر اس کے بعد اس نے اس امانت کو آگے کسی کو سونپ دیا۔ کیا لفظ ہیں یہ!! یہ امانت تھی اس مرحلے میں زندگی' اس نے پھر اگلے مرحلے کو سونپ دی' وہ پھر اس کا مستقر بن گیا اور اس مستقر نے پھر آگے مستودع کو سونپ دی۔ اور زندگی اس طرح سے منزل بہ منزل' مرحلہ بہ مرحلہ مستقر اور مستودع میں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ اور یہ سب کچھ خدا کے ضابطۂ قانون کی رو سے ہوا۔ یہ سابقہ آیت تھی۔ یہاں زندگی کے متعلق کہا تھا کہ وہ مختلف وادیوں اور مرحلوں میں سے گذرتی ہوئی یہاں تک پہنچی۔ اور آگے ہے (وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ) (11:7)

زندگی کے علاوہ اس کائنات کی یہ تخلیق بھی اسی ارتقائی پروگرام کی رہین منت ہے

پوری کائنات کے متعلق پھر آگے چل کے کہا کہ یہ کائنات بھی یہ نہیں ہے کہ ایک دم عدم سے وجود میں اسی شکل میں آ گئی ہو جس میں تمہیں یہ دکھائی دیتی ہے۔ یہ خود بھی اپنے نقطۂ آغاز سے اس شکل میں جس میں یہ آج ہے یہ چھ مختلف مراحل اور درجات سے گذر کر اس شکل میں پہنچی تھی۔ یہ ایام عربی زبان میں یہ دن جو ہے اسے بھی کہتے ہیں' مرحلے کو بھی کہتے ہیں' ایک دور کو بھی کہتے ہیں مثلاً ایام العرب ان کے ہاں تاریخ کو کہا جاتا ہے۔ تو یہ مختلف مراحل مختلف Stages جسے انگریزی میں کہتے ہیں' ان Stages میں سے گذر کر خود یہ کائنات اس موجودہ ہیئت میں آئی ہے۔ یہ بھی سائنس دانوں کی تحقیق کی چیز ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ یہ مراحل جو تھے' یہ درجات جو تھے یہ منازل جو تھیں جس میں سے کائنات یہ گذری ہے۔ جہاں تک بھی ان کی تحقیق اور علم رسائی کرے' وہ یہ بتائیں کہ یہ چھ مراحل کیا تھے۔ لیکن یہ تو علمِ انسانی کی بات تھی۔ ہزار ہا سال کے Reaserches کے بعد کہیں جا کے انسانی ذہن یہاں تک پہنچا ہے۔

تورات میں چھ مراحل کو چھ دن کہا گیا ہے

تورات میں جیسے اس کی ابتداء کی' ایام کو یہ عبرانی زبان میں بھی یہ چیز جو تھی انہوں نے دن اس کا ترجمہ کیا یا مفہوم لیا' دن یہی چوبیس گھنٹے کا جسے کہتے ہیں۔ تو کہا کہ چھ دنوں میں خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا تو ایک ہفتے میں پھر ایک دن باقی بچ گیا تو انہوں نے کہا کہ چھ دن کی اس محنتِ شاقہ کے بعد (معاذ اللہ) خدا تھک گیا' ساتویں دن اس نے چھٹی منائی۔ اسے یومِ سبت کہتے ہیں' تعطیل کا دن جس میں کوئی کام نہ کیا جائے۔ ان کے ہاں یہ Saturday ہفتہ ہوتا تھا۔ اور یہ عیسائیوں نے پھر چونکہ وہ یہودیوں کا دن تھا' اس واسطے انہوں نے ان سے علی الرغم وہ دن چھوڑ کر' ساتواں دن اتوار کا انہوں نے منایا۔ وہ اتوار کو اپنا خدا کا یومِ تعطیل قرار دیتے ہیں' اسی لیے اسے

کہتے ہیں نا یہ Holiday ایک مقدس دن ہوتا ہے وہ' جس دن خدا بھی سو رہا ہے اور یہ بھی کاروبار بند کر کے بیٹھے ہیں۔ یہ وہی لفظ یوم جو تھا' اس یوم کو دن تصور کیا اور پھر دنوں سے یہ ہفتہ بنایا۔ اب یہ جو بات ہے اتنی سی آج تو ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہمارا یہ کہہ دے گا کہ صاحب دن تو یہ سورج اور زمین کی جو باہمی گردش ہے بلکہ خود زمین کی گردش جو ہے' یہ اس میں چوبیس گھنٹے میں جو یہ پورا دائرہ کرتی ہے یہ اس سے دن اور رات متعین ہوتے ہیں۔ اور پھر تو یہ زمین کے مختلف حصوں میں مختلف وقت میں کہیں دن ہوتا ہے کہیں رات ہوتی ہے کہیں دوپہر ہوتی ہے۔ تو جب یہ کائنات اس شکل میں ابھی وجود میں ہی نہیں آئی تھی تو یہ چوبیس گھنٹے کا دن رات کہاں سے بن گئے۔ لیکن یہ بات تو مذہب کا معاملہ ہے اس میں یہ کون پوچھ سکتا ہے ان سے صاحب۔ ٹھیک ہے ان سے تو ہمیں کچھ بحث نہیں ہے' مشکل یہ ہے کہ خود ہمارے ہاں کے بھی وہ جو مفسرین ہیں انہوں نے بھی اس سے چھ ہی دن مراد لیے' چھ دنوں میں خدا نے کائنات کی تخلیق کی'۔

ہزار سال سے ہمارے ہاں کی پیش کردہ تفسیروں کی علمی سطح

یہ ساری چیز' اسرائیلیات اسے کہتے ہیں' یہودیوں کے ہاں سے آئی ہوئی ہیں۔ ان پہ تو ہم تنقید کر سکتے ہیں' ان پہ تنقید نہیں کر سکتے کہ انہوں نے اپنی اس تفسیر کو منسوب کر دیا خود نبی اکرم ﷺ کی طرف۔ اب اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے کہ چھ دن نہیں تھے یہ ہفتے کے' تو وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب تم قرآن کو بہتر سمجھتے ہو یا رسول اللہ ﷺ قرآن کو بہتر سمجھتے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک بنیاد کی اینٹ غلط رکھ دینے سے' تا ثریا می رود دیوار کج' آسمان تک پھر وہ دیوار ٹیڑھی اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ چھ مختلف مراحل تھے۔ پہلے کہا کہ زندگی بھی اس شکل میں جو پیکرِ انسانی میں آئی ہے' وہ یکدم نہیں آ گئی تھی۔ اس لیے وہ جو افسانے ہمارے ہاں ہیں کہ وہ آدم ایک پتلا بنایا مٹی سے اور پھر وہ پہلا انسان بن گیا۔ اور اس کے بعد پھر وہ کمی رہ گئی کہ اکیلے مرد سے تو آگے سلسلہ نہیں چلتا تھا پھر اس کی پسلی میں سے حوا نکالی اور اس سے پھر آگے گاڑی چل پڑی۔ اس نے زندگی کے متعلق یہ بتایا کہ یہ تو مستقر اور مستودع میں سے ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی۔

کائنات کی وسعت پذیری کا یہ سلسلہ تو اب بھی مزید پھیل رہا ہے

کتنے حسین الفاظ ہیں عزیزانِ من! میں تو جب بھی ان الفاظ کو لاتا ہوں' وجد آ جاتا ہے۔ کائنات کے متعلق کہا کہ یہ Nothigness میں سے عدم میں سے یکلخت اس طرح سے وجود میں نہیں آ گئی' یہ بھی مختلف مراحل میں سے گذرتی ہوئی تکمیل تک پہنچی ہے۔ اور' ابھی تکمیل تک پہنچی ہے' بھی الفاظ غلط ہیں' وہ تو کہتا ہے (یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ) (35:1) وہ تو اپنی تخلیق میں اپنی مشیت کے مطابق اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں۔ کائنات کو اس طرح سے مختلف مراحل کے اندر یہاں تک اس نے پہنچایا اور اب بھی اس میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ حیران ہونگے اس اضافے کو (یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ) (35:1) جو

قرآن نے کہا ہے۔ یہ آج کے سائنٹسٹ بھی اس نتیجے پہ پہنچے ہیں اس Universe کے متعلق یہ خود ان کا قول ہے اس کو وہ Expanding Universe کہتے ہیں وہ Universe جو ابھی پھیل رہی ہے۔قرآن نے اتنا عرصہ پہلے کہا تھا کہ یہ تکمیل تک نہیں پہنچ گئی۔کائنات کا ذکر ابھی آ رہا تھا اس میں ابھی زندگی کا ذکر نہیں آیا تھا۔اور اس کے ساتھ ہے(وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ) (11:7)۔

ہمارے ہاں کی تفسیروں نے قرآن حکیم کے تعلیمی حقائق کو چیستان بنا رکھا ہے، دیکھیے خدا کے عرش کی تفسیر

اب یہاں پھر آ گئی تفسیر ہمارے ہاں۔ترجمہ اس کا کیا گیا کہ خدا کا عرش پانیوں پر ہے۔آپ کو شاید ہوگا میں ایک تفسیری روایت بیان کیا کرتا ہوں وہ اس آیت کی تفسیر میں ہمارے ہاں آیا ہے۔اب عرش سے مراد لے لی گئی وہ تخت تختہ یا تخت جسے آپ کہتے ہیں بنا ہوا کسی شے کا، لکڑی کا ہو یا وہ تختِ طاؤس ہی کیوں نہ بہرحال ایک محسوس تخت اس کے اوپر کوئی بیٹھتا ہے۔اب خدا کا تخت جو ہے اس کے اوپر خدا کو بٹھایا پھر اس کے ساتھ ایک کرسی بچھائی۔ یہ عرش پانیوں پر تھا۔تو اس کی تفسیر میں وہ ترمذی، ہمارے ہاں احادیث کا ایک مجموعہ ہے، صحاح ستہ میں اس کو گنا جاتا ہے۔ چھ حدیث کے جوان کے ہاں معتبر ترین مجموعے ہیں، کتابیں ہیں ان میں ایک وہ بھی ہے۔یا بعض اس کو الگ رکھتے ہیں موطہ کو لیتے ہیں بہرحال احادیثوں کا ایک مجموعہ ہے۔اس میں یہ تفسیر حضرت عباسؓ کی روایت سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔پھر وہی بات آ گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔اب دیکھئے نا یہ تفسیر جو ہوئی، اس تفسیر کے اوپر تنقید نہیں کی جا سکتی اگر یہ صحیح باتیں مان لی جائیں تو۔کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس زمین سے پہلے آسمان کا فاصلہ ستر یا بہتر سال کی مسافت ہے۔اور آسمان سات ہیں۔ ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے ستر یا بہتر سال کی مسافت۔اور ضمناً عرض کروں کہ وہی اسی ترمذی میں ایک اور روایت ہے اسی کے متعلق اور اس میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین سے پہلے آسمان کا اور پھر ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان فاصلہ پانچ سو سال کا ہے۔یعنی وہیں یہ روایت بھی ہے کہ پانچ سو سال کا فاصلہ ہے اور وہیں یہ روایت بھی ہے ستر بہتر یا تہتر سال کا فاصلہ بھی ہے۔یعنی اتنے سال میں جتنی منزل وہ طے کرتے تھے وہاں والے، اتنا فاصلہ ہے۔ بہرحال یہ فاصلہ جو ہے ایک آسمان اور دوسرے آسمان میں اور اس طرح سے فاصلہ در فاصلہ آخری آسمان پہ پہنچ گئے۔تو کہا کہ آخری آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے ستر اکہتر یا بہتر سال کے فاصلے کی گہرائی اس سمندر میں ہے۔اور اس سمندر کے اندر چھ پہاڑی بکرے کھڑے ہیں۔وہ اتنے بڑے ہیں کہ یہ سمندر جو ہے وہ ان کے گھٹنوں تک آتا ہے اتنی اتنی بڑی ان کی ٹانگیں ہیں۔اور ان بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ٹکا ہوا ہے۔اور اس عرش کے اوپر خدا مستوی ہے۔(كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ) کی یہ تفسیر ہوگئی جناب۔اب

آپ دیکھتے جایئے عزیزانِ من! کہ وہ جوزور دیا جاتا ہے کہ صاحب پہلی چیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی تفسیر بیان کردہ اس سے اختلاف۔ پھر یہ کہ سلفِ صالحین نے جو تفسیر بیان کی ہے اس سے کیسے اختلاف ہوگا۔ اب یہ جو تفسیریں ہیں یہ ساری آپ کے ہاں سلفِ صالحین کی کتابوں میں لکھی ہیں اور منسوب کی جاتی ہے آخر میں جا کے نبی اکرم ﷺ کی طرف۔ یہ ہیں جو اس کی تفسیریں بیان کی جارہی ہیں۔ دنیا میں یہ چیز پھیلائی جارہی ہے کہ آپ کے خدا نے یہ کہا اور آپ کے رسول ﷺ نے اس کی یوں وضاحت فرمائی۔ (کَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ) (11:7)

تخت کا یہاں مفہوم لکڑی نہیں بلکہ اقتدار کا ہے

یہ جسے آج بھی آپ Crown کہتے ہیں تو اس سے مراد تو سچ مچ کا کوئی تاج یا تخت نہیں ہوتا اس کے معنی اقتدار کے ہوتے ہیں سر برآرائے تخت ہوگیا کے معنی یہی ضرور نہیں ہوتا کہ وہ اٹھ کے جا کے اس کے اوپر بیٹھ گیا' اس کے معنی ہوتا ہے کہ مملکت کا اقتدار اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ اصطلاحیں Crown کی آج بھی اسی طرح سے ہیں جب آپ Crown V/S such & such کہتے ہیں انگریزی میں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ جو ملکہ یا بادشاہ سر کے اوپر کچھ پہنتا ہے' وہ مقدمے میں آ کے مستغیث کی حیثیت سے کھڑا ہوجاتا ہے۔ Crown کے معنی مملکت لی جاتی ہے' Crown کے معنی اقتدار لیا جاتا ہے۔ 'تختہ الٹ گیا' کے آج معنی یہ ہوتے ہیں کہ اقتدار چھن گیا۔ بالکل انہی معنی کے اندر عرب استعمال کرتے ہیں اس لفظ کو۔ اور انہی میں جب میں وہاں آ ؤنگا کہ ملکہ سبا کا وہ تخت اٹھا کے لے آئے تھے وہ جن حضرت سلیمانؑ کے پاس۔ تو وہ تخت اٹھانے کی بات نہیں ہے' وہ تو اقتدار کا خاتمہ کرنا ہے اس کا۔ مملکت کے متعلق باتیں ہورہی ہیں' خدا کا اقتدار اس کے معنی ہیں۔ کرسی عربی زبان کے اندر علم کو کہتے ہیں' یہ کراسی ان کا پیوں کو کہتے ہیں آج بھی۔ وہ علم کو کہتے ہیں' عرش اقتدار کو کہتے ہیں۔ کس چیز کو اقتدارِ خداوندی تھا؟ یہ کائنات جتنی پیدا کی اس کائنات میں تو ابھی لائف یا زندگی نہیں تھی۔

6 مختلف مراحل کے بعد زندگی کی نمود پانی سے ہوئی جس پر خدا کا کنٹرول ہے باالفاظ دیگر خدا کا عرش پانی پر ہے یعنی زندگی پر خدا کا کنٹرول ہے

ابتداً جو کائنات پیدا ہوئی ہے تو آخری Researches یہ ہیں کہ شروع میں اس میں زندگی نہیں تھی۔ زندگی کی نمود پانی کے ساتھ ہوئی ہے۔ آج بھی یہ جن Planets کا' جن اجرامِ فلکی کے اوپر پہنچ رہے ہیں یا آج بھی تحقیق جس کے متعلق کررہے ہیں وہاں کہتے یہ ہیں کہ اگر وہاں کی اس مٹی میں یا جو بھی وہاں Matter ہے' اس میں اگر نمی پائی جاتی ہے تو پھر وہاں زندگی کے امکانات ہیں۔

یعنی یہ دیکھنے کے لیے کہ کسی مقام پہ لائف یا زندگی ہے یا نہیں' دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہاں پانی ہے یا نہیں۔ پانی اگر ہے تو زندگی ہے اور اگر پانی نہیں ہے تو زندگی نہیں ہے۔ یہ کائنات جس طرح سے وجود میں پہلے ابتداء میں لائی گئی' اس میں لائف یا زندگی نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ بتاتے ہیں کہ جہاں جہاں جس Planet میں پانی کی نمود ہوئی ہے' پانی کا ظہور ہوا ہے' وہاں زندگی کی نمود ہوئی ہے۔ چنانچہ ہماری اس زمین پر پانی جب آیا ہے تو اس کے بعد یہ زندگی آئی۔ اور چودہ سو سال پیشتر قرآن نے کہا کہ (وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ) (21:30) زندگی کا مدار پانی پر ہے' ہم نے ہر زندہ شے کو پانی کی نمود سے بنایا۔ قرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ زندگی کا انحصار پانی پر ہے' پانی سے زندگی کو بنایا۔ اور کہا یہ کہ خدا کا کنٹرول زندگی کے اوپر تھا' کائنات کو چھ مراحل میں سے گذارا اور گذارنے کے بعد پانی سے زندگی کی نمود ہوئی اور پھر اس کے اوپر جو کنٹرول تھا وہ خدا کا کنٹرول تھا زندگی اور موت جسے آپ کہتے ہیں۔ یہ اس کے قانون کے مطابق زندگی عطا ہوتی ہے اور اسی کے قانون کے مطابق زندگی سلب ہو جاتی ہے۔ (كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ) (11:7) اب دیکھتے جایئے کس انداز سے قرآن بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

پانی سے پیدا ہونے والی زندگی جو مختلف مراحل سے گذرتی رہی' اس پر خدا کا ہی کنٹرول ہے

تخلیقِ ارض وسماء ہوئی' ایسی کائنات جس میں ابھی زندگی نہیں تھی (in-animate)۔ اس کے بعد پانی کی نمود سے زندگی کا ظہور ہوا' زندگی کے اوپر خدا نے اپنا کنٹرول رکھا۔ یہ پہلے مستقر اور مستودع جو کہا ہے' وہ ان مراحل میں سے زندگی گذرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی سنورتی چلی گئی بنتی چلی گئی۔ (الْبَارِئُ)(59:24) جتنی چیزیں ایک جگہ مستقر میں ایسی پیدا ہو گئی تھیں کہ آگے بڑھ کے اگلے مرحلے میں ان کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ بارِ دوش ہو جاتی تھیں وہ بوجھ بن جاتی تھیں وہ چیزیں' ان کو اس نے وہیں اتار دیا' چھلکے سے الگ کر دیا۔ الباری کے یہ معنی ہوتے ہیں' حشو و زوائد سے پاک کرنا۔ (الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ)(59:24) اور اس کے بعد اس کو ایک نئی فارم دیدینا۔

زندگی کی ابتدائی شکل اپنی بوجھل کیفیت سے سنورتی ہوئی' قدم بہ قدم آگے بڑھتی رہی

یہ طریقہ قرآن نے بتایا' زندگی مراحل میں سے گذری۔ یہ آپ تصویروں میں دیکھتے ہونگے۔ اب تو وہ سینما کی سلائیڈ میں سینما کی فلم میں بھی دکھاتے ہیں وہ 50000 Million Years B.C۔ ابتدائی زندگی کا تصور جو ان کے ذہنوں میں یا جو کچھ بھی ان کی تحقیقات نے بتایا ہے اس میں آپ دیکھئے گا کہ یہی آج موجود پرندے یا موجودہ Reptile یا یہ جانور جو اس سبک سی شکل میں آپ کو نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے گرانڈیل شکل میں آ رہے ہیں اور ہلا نہیں جاتا اور چلا نہیں جاتا ان سے' پتھروں کی طرح ہیں۔ وہ ابتدائی

شکل تھی۔قرآن کہتا ہے (اَلْبَارِئُ) پھر اس خدا نے ان میں سے جتنی چیزیں بوجھل تھیں، ان کو پچھلے مرحلے کے اندر چھانٹ کے رکھ دیا اور اس میں سے اگلے مرحلے کے اندر زندگی کو اور سبک تر، تیز تر، حسین تر، سنواری ہوئی شکل میں پہنچایا (اَلْمُصَوِّرُ) ایک فارم دیتے ہوئے تا آنکہ آہستہ آہستہ اس بوجھل حشو وزوائد کو یہ پیچھے چھوڑتے ہوئے انسانی شکل میں نمودار ہوگئی۔کیا انداز ہے قرآن کا ان چیزوں کے متعلق بات کرنے کا۔زندگی کے اوپر کنٹرول۔اب انسانی ہیئت میں جب آئی زندگی اب یہاں دیکھئے کہ اس نے زندگی کو بھی دو شکلوں میں تقسیم کر دیا۔اگلے لفظ ہیں اسی آیت کے (لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) (11:7)

آج کی یہ انسانی زندگی موت وحیات کے مراحل طے کرنے کے بعد ارتقا کی نئی منازل میں اعمال حسنہ کی بنیاد پر داخل ہوگی

پہلی چیز تو عام زندگی جو ان مراحل میں سے گذری، اس میں یہ بتایا گیا ہے ہمیں یہ Evolution کی تھیوری والے جو ہیں وہ بتاتے ہیں اور آج تو اس پہ تجربے ہو رہے ہیں کہ جس نوع یا Species نے جسے بقاء للاصلح یہ کہتے ہیں (Survival of the Fittest)۔جس نوع نے اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لی کہ وہ مقابلہ کر سکے ان تمام عناصر کا جو زندگی کو ختم کرنے والے یا تخریب کرنے والے تھے، جو Fittest ثابت ہوئی، وہ زندہ رہ کے آگے بڑھی اور جس میں یہ صلاحیت نہیں تھی، وہ وہیں ختم ہوگئی۔پہلی چیز تو قرآن نے یہ کہا (لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) (11:7) اگر یہاں صرف زندگی مراد ہے تو وہ اس لیے کہ یہ اس طرح سے کنٹرول قانون کا یوں رکھا کہ جو احسن عمل ہے، بہترین کام کرنے والی جو نوع ہے، وہ زندہ رہے اور جس کے عمل احسن نہ ہوں، وہ زندہ نہ رہے۔اور اگر انسانوں تک آئے ہیں ہم تو یہاں بات اس سے زیادہ اونچی ہوگئی۔ان کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا کہ (خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) (67:2) خدا کے کنٹرول نے موت اور حیات پیدا کر دی تا کہ اس بات کی نمود تم میں ہو جائے کہ تم میں سے کون ہے کہ جس کے اعمال احسن ہو سکتے ہیں۔

حسنِ عمل کے سلسلہ میں علامہ پرویز کی دلی خواہش تھی کہ وہ قرآنی حقائق کو نصاب کے طور پر اپنے دروس کے انداز میں نوجوان نسل کے ذہن نشین کرائیں

اب یہاں ایک بڑی عجیب چیز سامنے آتی ہے کہ جسے حسنِ عمل کہتے ہیں، جس کے لیے حسنات کا لفظ آتا ہے، جس کا ترجمہ ہمارے ہاں نیکیاں ہو جاتا ہے۔اور پھر نیکی کا تصور جو آپ کے ذہن میں ہے آپ خود سوچ لیجیے۔قرآن نے تو اسے حسنِ عمل کہا ہے وہ عمل جس میں پورا پورا توازن ہو۔اور اس میں پھر احسن ہو جائے توازن بھی اپنی بہترین، عمدہ ترین، مکمل ترین شکل کے اندر۔جس عمل کے اندر یہ ہو

وہ زندگی دیدیتا ہے اور جس عمل میں یہ چیز نہ رہے' وہ موت کی طرف لے جاتا ہے انسان کو۔ زندگی نتیجہ ہوتا ہے حسنِ عمل کا۔ میں نے کہا تھا عزیزانِ من! یہ وہ چیزیں تھیں جو میں چاہتا تھا کہ نصاب کے طور پہ' جو کلاسز میرے سامنے آئیں' میں ان کو یہ پڑھاؤں۔

میرے سامنے پورا میٹریل ہے جس میں بتا سکتا ہوں کہ جہاں تک فزیکل لائف کا بھی تعلق ہے' طبعی زندگی انسان کی جو ہے' جہاں تک اس کا بھی تعلق ہے' یہ بھی حسنِ عمل سے زندگی باقی رہتی ہے۔ جہاں Proportion (توازن) بگڑ جاتا ہے وہاں مرض آ جاتا ہے اور (Proportion) زیادہ بگڑ کر جب انتہا پہ چلا جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ جسے آپ صحت کہتے ہیں وہ Proportion کا نام ہے زندگی کے اندر۔ اور جتنا بہترین Proportion اندر ہوتا چلا جائے عناصر میں یا یہ جتنے بھی زندگی کو چلانے والے جسم کے اندر جو عناصر ہیں' ان کے اندر Proportion کا نام زندگی ہے۔ کہیں جب بھی آپ مریض ہو جاتے ہیں' کہیں کسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں' کسی طبیب سے پوچھئے تو وہ تو اپنی پوری Term یہی Use کرتا ہے کہ اس میں فلاں خلط کا اضافہ ہو گیا ہے اور فلاں کی کمی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں کے پاس بھی جائیے تو وہ بتائیں گے کہ اس میں تو فولاد کی کمی ہو گئی ہے۔ یہ کمی کس چیز سے' کمی کیا معنی؟ کوئی پہلے سٹینڈرڈ ہوگا نا جس سے یہ کمی ہوئی۔ اس کے اندر کیا ہو گیا ہے؟ کہ جی او ہو اس کے اندر تیزابیت بڑھ گئی ہے' Acidity بڑھ گئی ہے۔ کس چیز سے بڑھ گئی؟ کس چیز سے کمی ہو گئی؟ ایک معیار ہے نا وہ معیار ہے جسے توازن کہتے ہیں کہ جس توازن سے جس Proportion سے اس کے اندر مثلاً فولاد ہونا چاہیے یہ اس سے کم رہ گیا' جس توازن سے اس میں Acidity ہونی چاہیے اس میں سے یہ بڑھ گئی آ گے۔ اب یہ کرتے کیا ہیں؟ علاج کے معنی کیا ہیں؟ کہ وہ جس چیز کی کمی ہو گئی ہے وہ اس میں دیدیتے ہیں' پیدا کر دیتے ہیں یا وہ پیدا کرنے والی چیزیں کھلاتے ہیں اس سے وہ چیز پیدا ہو کے پھر وہ توازن پہ آ جاتی ہے۔ جو بڑھ جاتی ہے اس کو یہ کم کر دیتے ہیں۔ بس جس وقت وہ توازن پہ آتی ہے' صحت ہو جاتی ہے صاحب۔ اسے ہی تو حسنِ عمل کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ موت و حیات جو ہے' یہ تو وہ قانونِ خداوندی کیا ہے جس کا تعلق موت و حیات سے ہے؟ حسنِ عمل ہے۔ حسنِ عمل ہے تو زندگی ہے اور اس میں حسن نہیں رہا ہے تو موت ہے۔ یہ تو طبعی زندگی ہوئی۔ لیکن وہ انسان کی زندگی اس سے ذرا اونچی بھی بتاتا ہے۔

طبعی زندگی کے سلسلہ میں انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں

طبعی زندگی تو Animal میں بھی وہی ہوتی ہے' انسان میں بھی وہی ہوتی ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں حیوانات کا علم ہے Animal Husbandry والے کالج آپ کے ہاں کھلے ہوئے ہیں۔ وہ کالج اور آپ کے ہاں کا یہ جو میڈیسن کا King Edward کالج ہے اس کے اندر آپ دیکھئے۔ یہ ساری Anatomy (تشریح الابدان) یا تمام بنیادی چیزیں جتنی بھی ہیں صحت کی اور بیماری کی' وہ

ساری مشترک ہوتی ہیں ان کے اندر۔علاج بھی وہی ہوتا ہے بس Dozes کا ذرا فرق ہوتا ہے یہ انہیں گرامز میں دیتے ہیں انہیں شاید سیروں میں دیتے ہونگے لیکن بہر حال باقی اصول سارے وہی ہوتے ہیں صحت کے۔اس لیے انسان کی طبعی زندگی جو ہے وہ تو وہی ہے کہ جو حیوانات میں آئی ہے۔لیکن اس کی ایک اور زندگی بھی ہے جسے حیاتِ باشرف کہتے ہیں' جسے انسانی زندگی میں کہہ کے پکارا کرتا ہوں۔یہ وہ زندگی ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم میں یہ کہا ہے۔کس کس حسین انداز میں بات کرتا ہے قرآن عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ زندگی کی دو سطحیں۔(یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا) (8:24)

وحی کی صداقتوں پر ایمان نہ لانے والوں کے متعلق خدا کا ارشاد

اے وہ لوگو کہ جو ان صداقتوں پر ایمان رکھتے ہو۔اب یہ سیدھی سی بات ہے' زندہ انسانوں سے بات ہو رہی ہے وہ جو کہا ہے نا ایماندار' زندہ انسان ہیں نا جن سے بات ہو رہی ہے۔(یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ) (8:24) اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! خدا اور اس کے رسول کی دعوت اور پکار پر لبیک کہو جب وہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔زندہ انسانوں سے کہا جا رہا ہے اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔زندہ انسانوں کو یہ زندگی کیا ہے جو عطا ہو رہی ہے؟ وہ زندگی جو ہے پہلی وہ Animal کی لائف ہے حیوانی زندگی ہے' طبعی زندگی ہے۔قرآن نے اسی لیے کہا ہے کہ کفار جو ہیں جو ان صداقتوں سے انکار کرتے ہیں یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ (47:12) وہ اسی طرح سے کھاتے پیتے سوتے جاگتے' مرجاتے ہیں جیسے Animal جیسے حیوانات ہوتے ہیں اُن میں اور اِن میں فرق کوئی نہیں ہوتا۔وہ حیوانی سطحِ زندگی کے اوپر زندہ رہتے ہیں اور اسی طرح سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔یہاں وہ زندہ انسانوں سے کہہ رہا ہے کہ تم خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس شے کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی دینے والی ہے۔تو نظر آیا کہ زندگی اسی سانس لینے کا نام نہیں ہے اس میں تو حیوان اور انسان دونوں ایک سطح پہ ہوتے ہیں۔

انسان کے اعمالِ حسنہ کا ٹیسٹ تو میدان جنگ میں ہوتا ہے

انسانی سطحِ زندگی اس سے اونچی ہے۔اور معلوم ہے کہ یہ زندگی کہاں حاصل ہوتی تھی؟ کیسے حاصل ہونے کا طریقہ' کہاں یہ آیت آئی ہے؟ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں عام نگاہوں میں' جہاں طبعی زندگی آپ کہتے ہیں' جہاں یہ زندگی عام طور پہ ختم ہوتی ہے۔میدانِ جنگ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے صاحب۔ٹھیک ٹیسٹ ہوتا ہے وہاں پہنچ کے اعمالِ حسنہ کا۔بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ انسان کے پیکر میں آنے کے بعد زندگی حیوانی زندگی ہی نہیں رہتی' یہاں آ کے ایک زندگی انسانی زندگی بھی ہوتی ہے۔

قدرت کی طرف سے جہانِ فردا کی خوشگواریوں کی نوید انسانی سطح پر زندگی گزارنے والوں کے لیے ہے

جہاں اس نے (لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا) (36:70) کہا ہے 'قرآن کی دعوت اس کے لیے ہے جس میں زندگی کی رمق باقی ہے'۔ یہ ہے تو سارے انسانوں کے لیے لیکن جو حیوانی سطح پہ ہی جینا چاہتا ہے اس کے لیے یہ دعوت نہیں ہے۔(مَنۡ کَانَ حَیًّا) (36:70) جو انسانی زندگی کے اوپر انسانی سطح کے اوپر زندہ رہنا چاہتا ہے' یہ اس کے لیے دعوت ہے قرآن کی جو ہے۔ تو اب یہ دوسری زندگی یہاں آئی انسان کی' انسانی سطحِ زندگی کی۔ اقبالؒ کے ہاں دو Terms ہیں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ زندگی جو ہے 'حیات مرگِ باشرف' عزت کی موت جو ہے اس میں زندگی ہے 'مرگ حیاتِ بےشرف' اور بےشرف زندہ رہنا جو ہے یہ موت ہے۔ بڑی عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ یہ جو بےشرفِ انسانی زندہ رہنا ہے یہ Animal Life ہے اسے وہ مرگ کہتا ہے۔ اور مرگِ باشرف جو ہے اسے وہ حیات کہتا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ جو ہماری راہ کے اندر جان دینے والے ہیں۔ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ (2:154) انہیں مردہ مت کہو (بَلۡ اَحۡیَآءٌ) زندہ تو وہ ہیں تم زندہ نہیں ہو' زندہ تو وہ ہیں حقیقت میں۔

قرآن حکیم کے نزدیک جہنم کی تعریف یہ ہے کہ جہاں نہ زندگی ہے نہ موت

یہ ہے مرگِ باشرف جو ہے اُسے خود قرآن نے حیات کہہ کے بلایا ہے' ایسی حیات کہ جسے پھر موت نہیں آتی۔ ایک زندگی اس نے جہنم کی بھی بتائی ہے ثُمَّ لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَ لَا یَحۡیٰی (87:13) آپ احباب میں سے جو اس کنونشن میں تھے میرے خطاب میں یہ چیز بڑے حسین انداز میں آئی تھی۔ ایک مغربی علم النفس کا جو ماہر ہے ایرک فرام اس کی ایک فریز (Phrase) میں میں نے یہ بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ جس قدر آپ انسانوں میں تباہیاں دیکھتے ہیں نفسیاتی بیماریاں (Psycholigical Cases) اس کی وجہ ہوتی ہے ان کے اندر ایک شے اس نے کہی تھی (Unlived Life)۔ اور میں نے کہا تھا کہ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا' بڑی عجیب فریز اس نے Use کی ہے۔ لیکن میرے سامنے جب قرآن کی آیت آئی تو یقین مانئے میں تڑپ اٹھا اور جھوم اٹھا۔ قرآن نے جہنم کے متعلق کہا ہے (ثُمَّ لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَ لَا یَحۡیٰی)(87:13) اس میں نہ موت ہوگی نہ زندگی ہوگی۔ یہ ہے (Unlived Life) جسے کہا ہے اس شخص نے آ کر۔ اس دنیا کی جہنم کی زندگی' موت آتی ہے پر نہیں آتی'۔ یہ جو زندگی ہے یہ ہے حیوانی سطحِ زندگی جس میں انسانیت کی زندگی کی رمق نہیں ہے۔

اگر طبعی زندگی کے لیے توازن بدوش ہونا ضروری ہے تو انسانی زندگی کی نشوونما کے لیے اقدار سے باشرف ہونا لازم ہے

قرآنِ کریم نے یہ کہا (خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوةَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا) (67:2) یہ موت وحیات ٹیسٹ ہے اس چیز

کا کہ تمہارے اعمال کس قدر احسن واقع ہوئے ہیں۔ حسنِ عمل تو میں نے کہا ہے نا کہ وہ کام جس سے توازن برقرار رہے۔ Physical زندگی میں توازن برقرار رہے تو یہ صحت کہلائے گی' بگڑ جائے گا مرض ہوجائے گی۔ اور اس حد تک بگڑ جائے کہ پھر توازن برقرار نہ ہوسکے تو موت ہوجائے' یہ سب طبعی ہوگی۔ انسانی سطحِ زندگی کے اندر زندگی وہ کہلائے گی کہ جو با شرف ہوگی۔ جس میں احترام و مجد و شرفِ انسانیت باقی رہے گا اُسے آپ انسانی زندگی کہیں گے اور جس زندگی میں یہ چیز باقی نہیں رہے گی' اسے آپ حیوانی زندگی تو کہہ سکتے ہیں۔ انسان کی ٹرم میں اُسے (Unlived Life) اسے آپ کہیں گے (ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی)(87:13) وہ جہنم کی زندگی کہ جس میں نہ موت ہوگی نہ زندگی ہوگی صاحب۔ یہ زندگی جو ملے گی قرآن نے کہا ہے احسنِ عمل سے ملے گی۔ میں نے طبعی زندگی میں تو ابھی عرض کیا ہے کہ Proportion صحیح ہوجائے گا تو زندگی قائم رہے گی۔ یہ جو انسانی سطحِ زندگی ہے اس میں بھی اس نے یہی چیز کہی ہے۔

قرآن حکیم نے حسنِ عمل کا معیار خدا کے اسماء الحسنٰی کو قرار دیا ہے

یہاں گفتگو طبعی عناصر سے نہیں ہوگی Physical Elements سے گفتگو نہیں ہوگی یہاں Values سے گفتگو ہوگی اقدار کے متعلق گفتگو ہوگی۔

وہ اقدار جن کے مطابق انسان سے کہا گیا کہ زندگی بسر کرو' وہی کہ جنہیں اس نے اسمآء الحسنٰی خدا کے متعلق کہا صفاتِ خداوندی۔ صفاتِ خداوندی کو آپ نے دیکھا ہے اسمآء الحسنٰی کہا ہے اس نے' وہی حسن والی بات' وہی احسن والی بات' وہی حسنات والی بات۔ وہ Attributes وہ صفات وہ خواص وہ خاصیتیں کہ جس میں پورا توازن مکمل ترین توازن ہے (اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی)(59:24)۔ اور انہی صفاتِ خداوندی کا انسانی ذات کے اندر منعکس کیے جانا حدِ بشریت کے اندر یہ ہوگا حسنِ عمل اور ان میں توازن قائم رکھنا جو ہے وہ احسنِ عمل ہوجائے گا۔ اگر یہ احسنِ عمل ہے تو اس انسانی زندگی میں بھی انسانی زندگی آپ کو مل جائے گی۔ توازن نہایت ضروری ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ خدا غفور و رحیم بھی کہتا ہے اور شدید العقاب بھی کہتا ہے اپنے آپ کو۔ بظاہر یہ دو متضاد صفات ہیں لیکن ان دونوں میں متضاد صفات کا جو توازن ہے اس سے زندگی قائم ہے۔ Acid اور الکلی دونوں ضروری ہیں انسانی طبعی زندگی کے لیے بھی۔ پانی کی بھی اندر ضرورت ہے حرارت کی بھی اندر ضرورت ہے' زندگی تو نام ہی اس چیز کا ہے۔ دو متضاد چیزیں ہیں لیکن زندگی کے لیے متضاد Elements (عناصر) میں توازن ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس نے صفاتِ خداوندی کو بھی اسمآء الحسنٰی کہا ہے جن میں توازن ہے۔ اور انسانی اعمال بھی جب ان صفات کو اپنے اندر منعکس کرے گا تو اس میں توازن قائم رکھے گا تو پھر وہ حسنِ عمل بنے گا عزیزانِ من! اور

اس سے انسانی باشرف زندگی نصیب ہوگی۔

صفاتِ خداوندی میں سے کوئی صفت بھی Extreme تک نکل جائے تو انسانی زندگی کے توازن کو برباد کر دیتی ہے

قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے وَ ذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِہٖ (7:180) جو لوگ خدا کی صفات میں کسی کی طرف نکل جاتے ہیں ان کو چھوڑ دو؛ ان سے قطع تعلق کرلو۔ یعنی وہ صفتِ خداوندی خدا کی کسی صفت کو لے کے بہت Extreme بڑی حد تک بالافراط اپنے اندر اس کو منعکس کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے ان کو چھوڑ دو۔ ہمارے ہاں تو انہیں مقربینِ بارگاہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب ان کے اندر تو عجز اور انکسار ہے ''ہو جا ککھ مسیت دا' اوہدی کیفیت اے' کوئی دو گالیاں وی دے تے کہے اللہ تیرا بھلا کرے' کوئی چپیڑ وی مار جائے تو اوہنوں دعا دیندا پیا ہیگا''۔ کہاں سے یہ چیز آپ نے لی ہے؟ عیسائیت کا تصور ہے جن کے ہاں صرف God is mercy ہے۔ اس لیے کہ ان کے ہاں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ اپنے پشت پہ لے کے دنیا پہ پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ اگلا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی رو سے اس گناہ کو دھو ہی نہیں سکتا' ناممکن ہے۔ تو اب کیا کیا جائے پھر' سارے انسان گنہگار' ان گناہوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کے امکان میں نہیں تو گئے سارے جہنم کے اندر۔ تو اس کے بعد ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کو انسانوں کی اس حالت پر رحم آیا۔ یعنی آپ ہی اس نے پیدا کیے اس قسم کے اور اس کے بعد جب یہ گئے جہنم میں تو اس کے اوپر پھر رحم آیا۔

نظامِ خداوندی کا ایک ایک ذرہ توازن کی عکاسی کرتا ہے

بات بہرحال اور طرف نکل جائے گی۔ ان کا عقیدہ یہ ہوا کہ عمل کے ذریعے تو انسان پھر نجات حاصل نہیں کرسکتا' کیسے کرسکتا ہے؟ خدا کے رحم کے ذریعے سے۔ یعنی یہ قانونِ مکافاتِ عمل' یہ عدل' یہ ہر کام کا ایک نتیجہ' یہ سب ختم قصہ' بس رحم کے اوپر ہے سارا دارو مدار۔ تو خدا کو اُنہوں نے رحم قرار دیا۔ دیکھا نا خدا کی ایک صفت کے اندر وہ یُلۡحِدُوۡنَ (7:180)' الحاد اس کو کہتے ہیں ایک طرف کو نکل جانا۔ توازن نہیں رکھا۔ قرآن نے آ کے کہا کہ یہ نظامِ کائنات چل ہی نہیں سکتا اگر کوئی ایک صفتِ خداوندی جو ہے وہ اس Extreme تک تم پہنچا دو تو۔ سوال ہی نہیں ہے۔

یہاں قانونِ مکافاتِ عمل ہے' یہاں رحم کی بھی ضرورت ہے یہاں اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ (85:12) کی بھی ضرورت ہے۔ ظالم کو قوت کے زور سے روکنے کی بھی ضرورت ہے' نادم پر رحم کر کے معاف کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ کونسی صفتِ

خداوندی کا ظہور کس مقام پہ ہونا چاہیے اور کتنے حصے میں ہونا چاہیے' کتنی وہ خوراک دینی چاہیے۔ نسخے کے اندر جو آپ دیکھتے ہیں ڈاکٹر آ گے خاص طور پہ لکھتے ہیں اتنے گرام اور اتنے قطرے۔

دلی میں طبیبوں کے ہاں نسخہ لکھنے کا انداز

ہمارے اطباء میں تو خاص طور پہ اس پہ بڑا زور دیا جاتا ہے صاحب۔ وہ ہم نے دلی میں بڑے بڑے طبیبوں کو دیکھا ہے نسخہ بدلتے وقت۔ ہمارے دوست ہوتے تھے بڑے اعلیٰ درجے کے حکیم۔ نسخہ آتا تھا اس نے کہا کہ حکیم صاحب اس میں تو مجھے کچھ فائدہ تو ہے لیکن رات نیند نہیں آئی مجھے۔ تو وہ جو نسخہ لکھنے والا ہوتا ہے وہ نسخے کو دیکھ کے اس میں کہتا ہے کہ مقٰی جو ہے پانچ دانے کی بجائے تین دانے کر دو' بس' باقی نسخہ وہی ہے۔ وہ ذرا اس کا توازن جو تھوڑی سی مقدار اس میں جو بڑھ گئی تھی اس کو اس نے کہا ہے ذرا نیچے کر دیجیے۔ تو یہ زندگی کا توازن قائم اس چیز پہ ہوتا ہے کہ اس وقت کونسی صفتِ خداوندی کے ظہور کا وقت ہے' کونسی صفتِ خداوندی اس وقت Apply کرنی چاہیے اور کس حد تک Apply کرنی چاہیے۔ ان دو چیزوں کا علم اگر آپ کو ہوگا تو آپ کا معاشرہ توازن بدوش ہوگا' آپ کا عمل حسنِ عمل ہوگا اور یہی صحیح نتائج پیدا کرے گا۔ کہا اس نے یہ ہے کہ (خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) (67:2) یہ دیکھنے کے لیے کہ عمل حسین تر ہے یا نہیں' ٹیسٹ اس کا موت اور حیات ہے۔ طبعی زندگی کے اندر بھی میں نے بتا دیا کہ یہی فارمولا Apply ہوگا اور انسان کی زندگی جسے حیاتِ باشرف آپ کہتے ہیں اس میں بھی آپ دیکھیں گے تو یہی فارمولا Apply ہوگا۔ اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا' اس کا خاص توازن قائم رکھتے ہوئے۔ عفو بھی ہے' گرفت بھی ہے۔ یہ تھا جو اس نے کہا تھا (وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ) (11:7)

اس کا کنٹرول پھر زندگی دینے والی جو چیزیں اس پہ اس کا کنٹرول ہے اس کے قانون کا کنٹرول ہے۔ (لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) (11:7) اور یہ اس لیے ہے تمہیں مواقع بہم پہنچائے' اس چیز کہ دیکھے کہ تمہارا عمل حسین تریں عمل ہے یا نہیں۔ ابتدائی شکل تو اس کی مرض تک کی ہوگی' معاشرے میں تھوڑا تھوڑا فساد ہوگا' انتہائی شکل اس کی طبعی طور پہ موت ہوگی' معاشرے میں عالمگیر تباہی اور فساد ہوگا۔

حسنِ عمل میں توازن ہی معاشرے کی خوبصورتی کا ضامن ہے

آج اگر آپ اپنے معاشرے کے متعلق تجزیہ کر کے ایک لفظ کہنا چاہتے ہیں تو یہی کہتے ہیں نا کہ صاحب توازن بگڑ گیا معاشرے کا' Un-balanced ہو گیا ہے۔ افراد بھی Un-balanced ہو گئے ہیں معاشرہ بھی Un-balanced ہو گیا ہے۔ معاشرہ

افراد ہی کے تو مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ Un-balanced ہو گیا ہے اور ضرورت ہے Balanced معاشرے کی' Balanced Life کی۔ ہمارے ہاں نہ افراد میں توازن رہا ہوا ہے' نہ معاشرے میں توازن رہا ہوا ہے۔ یہ ٹیسٹ ہے حسنِ عمل کا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ہاں آج نہ افراد میں حسنِ عمل ہے' نہ معاشرے میں حسنِ عمل ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہیں کہ جن کے اعمال رائیگاں جائیں

باقی رہا یہ کہ یہ جو ہم خود ہی اپنے متعلق فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کرتے ہیں' بڑے اچھے کام کر رہے ہیں۔ تو اس کے متعلق تو قرآن نے ایک ایسی چیز کہی ہے کہ جب اس پہ نگاہ جاتی ہے عزیزانِ من! میں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ وہ کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں۔ (قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا) (18:103) الفاظ قابلِ غور ہیں عزیزانِ من! نسخہ ہے آپ کے پاس تو نکال لیجیے' الفاظ دیکھنے والے ہیں۔ کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون ہیں جن کے اعمال سب سے زیادہ ان کے لیے تباہی کا موجب بنتے ہیں۔

انسان کے وہ اعمال اور اس کی ایسی سعی و کوشش کہ جس کے لیے کوئی ترازو بھی کھڑا نہیں کیا جائے گا

ایک تو وہ ہے نا جو کچھ کرتا ہی نہیں ہے یہ ان کا ذکر نہیں ہے۔ یہ ان کا ذکر ہے جو بہت کچھ کرتے ہیں اعمال ہیں' ان کے۔ درمیان میں یہ کہا کہ (اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا) (18:104) یہ ہیں الفاظ۔ کہا کہ وہ اس روش کی زندگی سَعْيُهُمْ (18:104) کوششیں ان کی اس زندگی کے اندر' اعمال کہا' پھر سعی کہا' کوششیں کہا' کوششیں ان کی بالکل رائیگاں جاتی ہیں۔ عمل بھی کوشش بھی دو لفظ آئے' کیسے جاتی ہیں؟ کہا اس لیے (يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا) (18:104) یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے ہی ذہن میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ بڑا ہی اچھا کام کر رہے ہیں۔ عزیزانِ من! اس پہ غور کیجیے (يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا) (18:104) وہ بزعمِ خویش یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ بڑا ہی اچھا کام کر رہے ہیں۔ آگے ہیں وہ الفاظ۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہوا ہے کہ اعمال کے متعلق میزان کھڑی کی جائے گی۔ سمجھانے کے لیے ہے کہ اس کے اندر (فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ) (99:7-8) ایک ذرے کے برابر بھی جو نیکی ہے (نیکی میں ترجمہ کر رہا ہوں) وہ بھی سامنے آ جائے گی' ایک ذرے کے برابر شر جو تخریبی چیز ہے وہ بھی سامنے آ جائے گی۔ یہ ہے اس نے بتایا۔ لیکن یہ لوگ کہ جو نہایت نیک نیتی سے کچھ اعمال کر رہے ہیں' مساعی ہے ان کی' Efforts ہیں ان کی بڑی نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہوئے کہ بڑا ہی اچھا کام کر رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے (اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ) (18:105) اعمال ان کے رائیگاں گئے۔ اگلے لفظ ہیں (فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا) (18:105) ان کے لیے تو وہاں میزان بھی کھڑی کرنے کی

ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ یااللہ۔ بڑی نیک نیتی سے یہ کچھ وہ کرتے ہیں، مساعی، اعمال اور (**فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ**)(18:105)۔ اور میں نے عرض کیا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے ان کے رائیگاں جانے کی، ان کے بے نتیجہ ہونے کی (**فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا**) (18:105) ان کے لیے میزان بھی کھڑی نہیں کرنے کی ضرورت ہوگی۔ سوال ہی نہیں صاحب پیدا ہوتا۔ جو Complusory Subject میں فیل ہو جاتا ہے، اس کے باقی پرچے ہی کوئی نہیں دیکھتا۔

حسنِ عمل کا معیار خود اپنا متعین کردہ قبول ہی نہیں ہوگا

غور فرمایا آپ نے عزیزانِ من! حسنِ عمل کس کو کہا جائے گا۔ یہ فیصلے اپنے اپنے ذہن کے مطابق نہیں ہونگے، یہ وہ برہموسماج نہیں ہوگا جو مولانا آزاد نے پیش کر دیا تھا رام موہن رائے کے تتبع میں۔ وہ بھگتی کی جو موومنٹ نکلی تھی مسلمانوں کے الگ تشخص کو تباہ کرنے کے لیے، ان میں یہ چیز ہے نا جوانہوں نے کہدی مولانا صاحب نے کہ صاحب اس میں کسی مذہب کی تخصیص ہی نہیں ہے، خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی ہے اصل شے۔ اپنے اپنے مذہب میں رہتے ہوئے اپنے اپنے طریق کے اوپر جو کرتا چلا جائے، اسلام کہتا ہے کہ میرا اس نے مقصد پورا کر دیا، میرا کام کر دیا۔ یہ سنیے وہ کیا کہتا ہے قرآن کہ اپنے اپنے مذہب میں، اپنے اپنے مسلک میں، اپنے اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق، اپنے اپنے ذہن اور زعم کے مطابق، وہ قرآن کہتا ہے نا کہ اپنے زعم میں بزعمِ خویش وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑا ہی نیک کام کر رہے ہیں۔ ان کے لیے میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔ عزیزانِ من! کوئی معیار ہونا چاہیے نا پھر، عمل کے نیک ہونے کا، احسن ہونے کا۔ جسمانی صحت کے لیے تو معیار وہ ڈاکٹروں کا قانون ہے نا۔ کتنی میں نے کہا ہے کہ نیک نیتی سے یہ کچھ ہم کرتے ہیں، روز ہم غذائیں نیک نیتی سے کھاتے ہیں کہ صاحب ''اے بڑی طاقت دیندی اے جی، پروٹھا کھانا چھیدا ہیگا گھیؤ بڑی طاقت دین ڈیا ہونداا ے''۔ ڈاکٹر سے پوچھئے کہ صاحب بلڈ پریشر ہے، اس نے کہا کہ گھی کتنا عرصہ کھاتے رہے تم۔ یہ کتنی نیک نیتی سے کھار ہا تھا۔ یہی چیز، دین بھی تو زندگی کا ایک اسی طرح کا نظام ہے وہ انسانی سطحِ زندگی ہے۔ اپنے خیال کے مطابق اپنے فیصلے کے مطابق اپنی حسنِ نیت کے مطابق۔ وہ کہتا ہے میزان بھی نہیں کھڑی جائے گی۔ یہاں تو ایک خارجی معیار Objective Standard ہوگا اور وہ خارجی معیار خدا کی وحی ہے جو قرآن کے اندر ہے۔ جو اس کسوٹی پہ کسنے سے حسنِ عمل ہے، وہ حسنِ عمل ہے، وہی نیک عملی ہے۔ جو اس بارگاہ کے اندر مردود ہے، وہ ہماری ذہنیتوں، نیتوں کے مطابق کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ حسنِ عمل نہیں ہے۔ اور اس میں کوئی ضد کی بات، تعصب کی بات نہیں ہے۔ قانون تو ہوتا ہی وہ ہے Objectively وہ دیتا ہے ایک فارمولا، نسخہ دیتا ہے، اس کے وزن قائم کرتا ہے۔ یہ کہتا ہے اتنے اتنے گھنٹے کے بعد یہ دیجئے صاحب، یہاں تک احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض دوائیوں کو آپ ذرا فاصلہ جو ہے اس کو کم کر دیجیے یا

زیادہ کر دیجیے' آپ دیکھئے کیا نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں ضروری ہیں حیاتِ باشرف کے لیے۔ اور یہ چیزیں عزیزانِ من! جو خدا کی وحی دیتا ہے۔

ابوالکلام آزاد کی طرف سے پیش کردہ عالمگیر سچائیوں کے نسخے کی حقیقت اور تجربہ

یہ جو چیز ہے عالمگیر صداقتیں یا سچائیاں ابوالکلام آزاد نے جس کو کہا تھا' عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ چلئے صاحب۔ ٹھیک ہے یہ وہی دوائیاں ہیں جو آپ کے ہاں ڈاکٹر استعمال کرتا ہے جو آپ کے ہاں حکیم استعمال کرتا ہے' جو عطائی استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہیں نا عالمگیر سچائیاں۔ کہہ دیجیے کہ یہ اجزاء جو ہیں یہ مفردات جو ہیں یہ تو تمام جگہ اسی طرح بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ پھر وہ ڈاکٹر کی تخصیص کیا ہے اس میں جی وہ؟ کیا چیز وہ کرتا ہے؟ ان عالمگیر سچائیوں کے اندر توازن قائم کرتا ہے۔ کہ جی Universal Ethics جو ہیں ان کو لے لیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کون کہتا ہے کہ صاحب جھوٹ نہ بولو سچائی اختیار کرو' دیانتداری اختیار کرو۔ یہ ایک نظام کی رو سے ہونا ہے عزیزانِ من! ان میں ایک توازن قائم کرنا ہے' تشخیص کرنی ہے پہلے مرض کی' پھر اس کے مطابق توازن قائم کرنا ہے' پھر نتائج کو دیکھنا ہے' پھر ان اجزاء کے اندر کمی بیشی کرتے چلے جانا ہے' پھر حسنِ عمل بنتا ہے۔ اور یہ ہے وہ چیز کہ جو خدا کی آخری نسخے کی کتاب جو ہے (شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوۡرِ)(10:57) جسے کہا ہے یہ اس کے اندر یہ چیز ملے گی۔

عالمگیر سچائیوں کو حسنِ عمل کی شکل میں استعمال کرنا ممکن ہی نہیں' قرآن حکیم پوری نوع انسانی کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے

عالمگیر سچائیاں (Universal Ethics) جو ہیں ٹھیک ہے وہ تو اتنی پبلسٹی چرچا ہوا ہے قرآن کے ان اخلاق کا یا جتنے بھی انبیائے کرامؑ کی معرفت تعلیم ملتی رہی کہ وہ کم و بیش ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں چیزیں۔ پھر وہ کونسی اختصاص یا امتیازی خصوصیت ہے جس کے لیے ہم کہتے ہیں کہ نہیں صاحب اس کے لیے تو قرآن پر ایمان لانے کی بڑی ضرورت ہے اس کے سوا نہیں۔ وہ یہ چیز ہے یہ کہیں اور نہیں ملے گی کہ کس چیز کو یہ سچائی کہتا ہے۔ یعنی کس طرح سے یہ پھٹکار کے رکھ دیتا ہے کہ (لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ) (2:177) یہ چیز کہ صاحب منہ مشرق کی طرف ہونا چاہیے' مغرب کی طرف ہونا چاہیے' تم اس کو نیکی قرار دے رہے ہو' نہیں نیکی نہیں ہے یہ۔ جی نیکی کیا ہے؟ نیکی یہ ہے کہ تم اپنا مال دوسرے کی ہمدردی کے لیے کتنا دیتے ہو۔ دیکھا اپنی حسنِ نیت سے اعمال کرنے والے۔ دوسری جگہ ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ حاجیوں کے لیے سبیلیں لگا دینا' مسجدوں میں قندیلیں کھڑی کر دینا اور قالین بچھا دینا اور یہ سب کچھ کر دینا' بڑا نیکی کا کام کر رہے ہو صاحب۔ کیا ہے یہ نیکی کا کام؟ یتیم کو دھکے دے کے نکالتے ہو اور کہتے ہو

کہ نیکی کا کام کر رہا ہوں میں۔ تمہاری ان نیکیوں کے لیے ہم میزان بھی کھڑی نہیں کریں گے۔

صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کا اپنے اپنے زعم کے تحت نیک کام کرنے والوں کے عملی نتائج کا جائزہ

عزیزانِ من! کچھ تو یہ ہوا ہمارے ہاں کے سمجھئے کہ وہ طبقہ کہ جو ان چیزوں میں آتا ہی نہیں، کرتا ہی نہیں، یہ تو وہ ہوگئے جنہوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ ایک وہ طبقہ ہے آپ کے ہاں، صدیوں سے جو نہایت نیک نیتی سے اپنے زعم کے اندر نیک کام کر رہا ہے اور ان کے لیے بھی آپ دیکھتے ہیں، میزان کھڑی نہیں کی جائے گی۔ یہ امت دہرے عذاب میں گرفتار ہوئی ہوئی ہے۔

مذہب اور دین میں فرق یہ ہے عزیزانِ من! مذہب میں اپنے اپنے زعم اپنے اپنے خیال کے مطابق نیک کام کیا جاتا ہے، دین میں ایک متعین شدہ نسخے کے مطابق وہ دوائی استعمال کی جاتی ہے۔ بس یہ فرق۔ مفردات بھی وہی ہوتے ہیں، اجزاء بھی وہی ہوتے ہیں لیکن یہ چیز کہ اس مرض میں وہ کس توازن سے کس وقت پہ کیا چیز ہے جو دینی چاہیے۔ یہ ہے جو قانون ہے۔ دین اس نظام کا نام ہے جس میں یہ تمام چیزیں ایک قانون کی حیثیت سے آپ کو ملتی ہیں۔ مذہب اپنے اپنے زعم کے مطابق وہ ہے جس میں انہیں چیزوں کا استعمال اپنی اپنی نیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اِس سے تخریب پیدا ہوتی ہے، اُس سے تعمیر پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ حسنِ عمل کا ٹیسٹ یہ ہے کہ اس سطحِ زندگی میں تمہیں حیاتِ باشرف نصیب ہے یا نہیں۔

عالم گیر سچائیوں کے مطابق ہندو دھرم کے متعلق یہ کہنا کہ عالم گیر سچائیاں ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں چہ معنی

عزیزانِ من! جس زندگی میں احترامِ آدمیت نہیں ہے کسی ایک فردِ انسانیہ کی تذلیل ہوجاتی ہے، اس معاشرے کا کوئی عمل حسنِ عمل نہیں ہے اس کے لیے میزان نہیں کھڑی کی جائے گی۔ وہ کہتا ہے وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ ہے پہلی بنیادی شرط اس کے اندر۔ لہٰذا کوئی عقیدہ، کوئی تصور، کوئی نظریہ، کوئی قانون، کوئی نظام جس میں کسی ایک انسانی فرد کی تذلیل ہوجائے، اس معاشرے کا کوئی حسنِ عمل نہیں ہے۔ لاکھ بھی کیوں نہ حاجی آپ حج کرنے کے لیے بھیج دیں۔ ایک انسان کی تذلیل بھی جو ہے، خدا کے اس قانون کے خلاف چلی جاتی ہے۔ دیکھتے ہیں آپ۔ عالمگیر سچائیاں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے جی۔ جہاں کھڑے ہو کے انہوں نے یہ بات کہی تھی مجھے افسوس ہے، بار بار یہ کہنا پڑتا ہے اس قدر یہ لوگ نقصان پہنچا گئے ہیں اسلام کو، پوچھئے نہیں۔ ہندوستان کے اندر ہندو دھرم کے متعلق یہ شخص یہ کہتا ہے ''عالمگیر سچائیاں موجود ہیں اپنے طریقے کے مطابق ان پہ عمل کر دیجیے تو اسی طرح سے نجات وسعادت حاصل ہوجائے گی''۔ جس دھرم کے اندر انسان پیدائش کے اعتبار سے چار ورنوں میں تقسیم ہو رہے تھے۔ برہمن کھشتری ویش اور شودر۔ وہ شودر کو اس سڑک پہ چلنے کی اجازت نہیں تھی جس سڑک پہ سے برہمن چلتا ہے۔ اُسے وہ چاول کھانے کی

اجازت نہیں ہے آج بھی' جو چاول برہمن کھاتا ہے۔ اُسے اس کنویں سے پانی پینے کی اجازت نہیں ہے جس کنویں سے اونچی ورن والے پانی پیتے ہیں۔ جس دھرم میں یہ تذلیلِ انسانیت پیدائش کی رو سے ایسی ہو اس کے متعلق کہنا کہ تم اپنے خیال کے مطابق جسے سمجھتے ہو' کرتے چلے جاؤ اور یہی اسلام کا منشاء تھا۔ کس قدر اسلام کے خلاف یہ نقصان پہنچانے والی تحریکیں تھیں۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ ان چیزوں پہ کتنا کچھ کہتا جاؤں اور کیا کیا نہ کہتا جاؤں۔ (ھُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّھُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا) (18:104) نہایت نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ بڑا اہم کام کر رہے ہیں۔ سوال یہ نہیں ہے۔ ٹیسٹ ہے یہ عزیزانِ من! جو میں نے ابھی آپ سے عرض کیا ہے۔ (خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا) (67:2)

حسنِ عمل کو پرکھنے کا ایک ہی فارمولا ہے' ایک ہی معیار ہے کہ وہ خود کیا لیتا ہے اور دوسروں کو کیا دیتا ہے

حسنِ عمل کہنے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ انسانی سطحِ زندگی کے اوپر جسے قرآن زندگی کہتا ہے' شرفِ انسانیت کتنا ملتا ہے اس میں۔ انسان کو اپنی ذات میں کتنا حاصل ہوتا ہے اور دوسروں کو یہ کتنا دیتا ہے۔ یہ ہے حسنِ عمل عزیزانِ من! اور اس کا معیار قرآن کی رو سے۔ یہ ہے جو اس نے کہا کہ کائنات کو ہم نے اس طرح سے ان مراحل پہ پیدا کیا' پھر زندگی کا ظہور پانی کی نمود سے ہوا' پھر زندگی پہ ہم نے اپنے قانون کا کنٹرول رکھا۔ زندگی کو طبعی سطح پر قائم رہنے کے لیے حسنِ عمل کی ضرورت ہے' توازن قائم رکھنے کی ضرورت ہے' جہاں توازن بگڑتا ہے مرض آجاتا ہے' جہاں Extreme تک پہنچتا ہے عدمِ توازن' موت واقع ہوجاتی ہے۔ Disintigrate ہی کہتے ہیں نا اس کو ہونا' انتشار و خلفشار پیدا ہوجاتا ہے۔ اور اسی طرح سے انسانی سطحِ زندگی کے اندر یہاں بھی اگر شرفِ انسانیت جو ہے وہ قائم رہتا ہے تو یہ حیاتِ باشرف انسانی زندگی ہے' حسنِ عمل کا ٹیسٹ یہ ہے کہ شرفِ انسانیت کس حد تک قائم رہتا ہے۔

انسانی زندگی کا یہ قافلہ یہاں کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد اپنی اگلی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے گا

(لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا) (11:7) اور یہی حسنِ عمل جو ہے یہاں جو شرفِ انسانیت پیدا کرتا ہے' پھر مرنے کے بعد بھی زندگی کو آگے لے جاتا ہے' تسلسلِ حیات جسے کہتے ہیں' وہ زندہ رہتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز' مقصود یہاں حسنِ عمل کا بھی یہ ہے کہ اس زندگی میں بھی انسان باشرف زندگی بسر کرے اور اس طرح سے پھر وہ اس قابل ہوجائے کہ اس کے بعد زندگی کی اگلی ارتقائی منازل جو ہیں وہ بھی طے کرے۔ اس لیے کہ یہ زندگی بھی مستقر ہے۔ یہ ابھی آپ نے دیکھا نا (یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّھَا وَ مُسۡتَوۡدَعَھَا) (11:6) حیات کا کارواں ایک پڑاؤ میں آکے اترا ہے' کچھ عرصہ وہاں ٹھہرا ہے۔ اس میں سے جنہوں نے اپنے اندر آئندہ سفر کرنے کی توانائیاں پیدا کرلی ہیں وہ اگلے پڑاؤ کی طرف چل پڑا ہے۔ یہ ہے زندگی کا کارواں جو چل رہا ہے۔ یہ جو مستقر کہا ہے قرآن نے کہ زندگی کے راستے میں یہ

قرارگاہیں آتی رہیں' جنہیں پڑاؤ کہا کرتے تھے۔

اس جہانِ افروز میں ٹھہر جانے کا مقصد حیات انسانی کی صلاحیتوں کی نشو ونما کرنا ہے

قرآن نے انسان کے متعلق بھی کہا ہے' آدمی کے متعلق بھی کہا ہے کہ تمہیں پیدا کیا(وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ)(2:36) یہ ارض کی زندگی کو اس نے مستقر کہا ہے' کچھ وقت کے لیے قرارگاہ۔ یہاں رک جاؤ(مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ) ایک مدت تک کے لیے سامانِ حیات یہاں۔ کاہے کے لیے یہاں رک جاؤ؟ تاکہ انسانی سطحِ زندگی جو ہے اس کو تم حاصل کرلو یہاں۔ اور جب اس قابل ہوجاؤ گے تو پھر مستودع ہوگا' اس کے بعد اگلی منزل ہوگی جسے حیاتِ آخرت کہتے ہیں آپ۔ اس زندگی میں یہ صلاحیتیں جو آپ نے پیدا کی ہیں اپنے اندر جو آپ کو اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا سکتی ہیں اس سے اگلی زندگی کی بلند منزل میں تم پہنچ جاؤ' وہ اس کے لیے مستودع ہوگا۔ آیت کا اگلا حصہ ہے(وَ لَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ) (11:7)

کہا کہ یہ بات تو ان کی سمجھ میں آئے گی جو ان اقدار اور زندگی کے ان شرف اور امتیاز پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں' ان سے تم اگر کہو گے کہ بھئی مقصد یہ ہے کہ ایسی زندگی یہاں بسر کرو کہ آئندہ کی زندگی کے قابل ہوجاؤ تو وہ یہ لوگ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ یہ کہیں گے کہ او بھائی جھوٹ ہے جو کچھ تم کہتے ہو۔ یعنی اس لیے کہ وہ میں نے ابھی عرض کیا ہے نا کہ ان کے نزدیک کفار کے نزدیک(الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ) (47:12) کفر میں انسان حیوانی سطح کے اوپر زندگی بسر کرتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز

لیجیے بات اور آ گئی سامنے' کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز سامنے آ گیا نا۔ روز ہم فتوے مانگا کرتے ہیں' کافر ہوگیا ہے' یہ مومن ہوگیا ہے۔ قرآن نے کیا بتایا ہے معیار اس کا؟ جو زندگی کو صرف طبعی زندگی سمجھتا ہے' وہ کافر ہے' جو حیاتِ باشرف کا قائل ہے' وہ مومن ہے صاحب' بات ختم ہوگئی۔ آپ غور کرتے ہیں ان الفاظ پہ' عجیب چیزیں کہہ گیا ہے قرآن۔(الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ) (47:12) کفر یہ ہے کھاؤ پیؤ "Eat drink and be marry" یہی زندگی کے مفاد و لذائذ جتنے بھی ہیں۔ تو یہ اگر زیادہ سے زیادہ بھی آپ کو حاصل ہوجائیں تو وہ کفر کی زیادہ سے زیادہ زندگی حاصل ہوگئی نا۔ یہ بھی نہایت ضروری ہیں' یہ زندگی تو برقرار رکھنی چاہیے۔ لیکن اگر منتہا ہی یہ ہوجائے' نصب العین ہی یہ ہوجائے' ہر Animal کا ہر حیوان کا نصب العین یہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ چیز ہو کہ یہ چیزیں اس لیے ضروری ہیں کہ ہم وہ جو انسانی سطحِ زندگی ہے اس کے بسر کرنے کے قابل ہوجائیں تو اس سے پھر حیات

جو بعد کی ہے اس کے اوپر ایمان آتا ہے۔

جہانِ فرداپر ایمان قرآنی اقدار پر ایمان لائے بغیر ممکن ہی نہیں

تو اس نے کہا کہ یہ جو اس سے انکار کرتے ہیں ان سے اگر کہو یہ حیاتِ بعد کی بات جو ہے اس کے لیے یہاں اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا ضروری ہوگا تو وہ کہتے ہیں کہ (اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ) (11:7) اب یہاں دیکھئے میں نے بتایا تھا آپ کو کہ سحر کے معنی جادو ہی نہیں ہوتے' اس کے معنی جھوٹ ہوتے ہیں۔ یہاں جادو ترجمہ کیجیے اور ترجمہ کیا ہوتا ہے جادو' یہ صریح جادو ہے'۔ کہتے ہیں کہ صاحب مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا ہے انسان نے' وہ کہتا ہے نہیں جی جادو ہے۔ اس کے معنی جھوٹ ہیں کہ کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ کہتا ہے یہ تو وہاں کی بات ہے ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ تو ان سے کہتا ہے کہ یہ جو غلط تمہاری طرزِ زندگی ہے اس کا نتیجہ تباہی ہوگا تو وہ یہ کہتے ہیں کہ (مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ)(67:25) بتاؤ کب ہوگا یہ۔ کہتا ہے وہ کہ مرض میں اور موت میں ایک وقفہ ہوتا ہے' مرض موت تک آہستہ آہستہ لے جاتی ہے۔

ظہورِ نتائج کے عمل کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی

یاد رکھو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو مرض تپ دق تمہیں ہو گیا ہے' علاج نہ کرو گے تو مر جاؤ گے۔ تم کہتے ہو کہ ہم مرتے کیوں نہیں۔ بھئی ان Stages میں سے گذر کے مرجاؤ گے۔ (وَ لَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ) (11:8)

کہتا ہے اگر اس مرض کے بعد فوری موت نہیں آتی تو کہتے ہیں لو جھوٹ بولتے ہو' کس چیز نے موت کو روک رکھا ہے۔ ان سے کہو کہ کیوں جلدی مچاتے ہو' یہ کونسی خوشی کی بات ہے' کونسا عید کا چاند ہے جس کا انتظار کرتے ہو کم بختو۔ (اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ) (11:8) ان سے کہو کہ جب وہ آجاتی ہے پھر وہ موت یا تباہی' جب وہ آجاتی ہے تو یاد رکھو پھر وہ ٹلتی نہیں اور کوئی چیز اس کا رخ بھی دوسری طرف نہیں بدل سکتی اور اس دن پھر جس چیز کی ہنسی آج اڑا رہے' مذاق اڑا رہے ہیں وہ پھر چاروں طرف سے گھیر لیا کرتی ہے یاد رکھو' نکلنے کا راستہ کوئی نہیں ہوتا۔

جنت کی زندگی ہو یا جہنم کی یہ تو ایک اجتماعی کیفیت لیے ہوئے ہوتی ہے

عزیزانِ من! ۔ جہنم کی بدترین سزا قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہاں سے نکلنے کا ہزار ارادہ کریں گے' نکل بھی تو نہیں سکیں گے وہاں سے۔ اف' کتنی سخت سزا ہے یہ۔ تو وہ ہونگے کہ جو جہنم کی زندگی کے ساتھ ہی Adjust کرلیں گے کہ چلئے جہنم کی زندگی ہے مزے ہو رہے ہیں اپنے۔ ہو رہا ہے نا یہ Adjust۔ وہ بھی تو ہیں نا معاشرے کے اندر کہ جو اس جہنم کی زندگی کے اندر تڑپ رہے ہیں کہ کتنی غلط

زندگی اختیار کیے جارہے ہیں۔(وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ)(2:167) قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی اس میں سے نکل نہیں سکیں گے۔ اس لیے کہ یہ جہنم اور جنت تو اجتماعی زندگی کے نتائج ہوتے ہیں عزیزانِ من! انفرادی چیز نہیں ہے۔ بات اور تھی۔گھیر لے گی چاروں طرف سے پھر وہ چیز جس کی آج تم ہنسی اڑاتے ہو۔(وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ج اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ) (11:9) کہتا ہے کہ اگر یہ کیفیت ہو جائے انسان کو' بڑا خوشحال ہے سب کچھ اسے میسر ہے پھر اس کے بعد وہ چیزیں اس سے چھن جاتی ہیں۔ بڑا مایوس ہو جاتا ہے' کفور بھی ساتھ ہے۔ کہتا ہے کیا رکھا ہے صاحب یہ دیانتداری میں اور یہ سچائی میں اور صداقت میں اور امانتدار ہونے کے اندر کیا رکھا ہے صاحب' دیکھئے نا کیا حالت ہو گئی یہ کچھ ہو گیا۔ دونوں چیزیں ہو جاتی ہیں' مایوس بھی ہو جاتا ہے اور ان چیزوں سے انکار بھی کرنے لگ جاتا ہے۔(وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ط) (11:10)

انسان اپنی غلط عملی کو تسلیم کرنے کی بجائے خدا پر اعتراض کرتا ہے

دوسری جگہ ہے کہ جب ایسی صورت آتی ہے تو وہ کہتا ہے(رَبِّيْٓ اَهَانَنِ) (89:16) میرے خدا نے مجھے یوں ذلیل کر دیا۔ اور یہاں قرآن کہتا ہے کہ پھر جب اس کو یہ چیزیں مل جاتی ہیں تو پھر یہ نہیں کہتا کہ خدا نے دی ہے۔(ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ)(11:10) او ٹھیک ہے صاحب بلائیں دور ہو گئیں۔یعنی اُس وقت کہتا ہے خدا نے یہ کر دیا۔اور جب یہ چیزیں خوشحالیاں ملتی ہیں تو اس کے بعد کہتا ہے کہ صاحب وہ دور ہو گئیں۔ میں نے بھی صاحب اس زمانے میں پھر وہ کیا' وہاں سے یہ لیا' وہاں سے یہ کیا اور ایک پرمٹ بنوایا' اس کو رشوت دی اور یہ ایسا کیا اور یہ ہوا۔کہتا ہے وہاں اگر اس کے متعلق یہ کہتے تھے تو یہاں بھی تو یہ بات کہو نا۔ یہاں اپنی کاریگری دکھا رہے ہو۔ مایوسی آتی ہے تو وہ خدا کی طرف منسوب ہو رہی ہے' خوشحالی آتی ہے تو وہ تمہاری کاریگری ہوتی ہے۔ قارون کے متعلق جو اس نے کہا ہے' قارون تو سرمایہ داروں کے نظام کا ترجمان ہے نا' نمائندہ ہے بہت بڑا۔تو کہا کہ جب اس سے یہ کہا گیا کہ میاں اتنا کچھ یہ تم نے اکٹھا کر رکھا ہے' انسان اس قدر محتاج گردو پیش ہیں' ان کا بھی اس میں کچھ حصہ ہونا چاہیے۔تو اس نے کہا کہ (اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ) (28:78) یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے میں نے یہ سارا کچھ کیا ہوا ہے' دوسرے کا کیا حق حاصل ہے اس میں۔ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ کہتا ہے جب جاتا ہے تو پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ خدا نے چھین لیا ہے مجھ سے۔ دونوں جگہ یکساں رہو۔لیکن آپ دیکھتے ہیں ہمارے ہاں ہوتا یہی ہے جب کوئی کام ہماری منشاء کے مطابق نہیں ہوتا' ناکامی ہوتی ہے' مقصد حاصل نہیں ہوتا تو اس وقت وہ کہا کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا جی۔ بھئی وہ پھر وفات پا گئے میاں صاحب' ہاں جی علاج تو بہت کیا تھا' اپنی طرف سے دوڑ دھوپ تو بہت کی تھی لیکن بس خدا کو منظور ہی یہی تھا وہ مر گئے صاحب۔

ہمارے ہاں لفظ ''اللہ نوں منظور'' ہی یہی تھا کا استعمال

آپ دیکھتے ہیں نا یہاں یہ جو چیز آتی ہے' ہمیشہ جو کام بگڑتا ہے نا اس کے لیے خدا کو یہی منظور ہے' ٹھیک ہے جی مقدمہ ہار گئے اللہ کی مرضی ہے جی' ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور پھر وہ جو آخری بات میں کہا کرتا ہوں میری بہنیں بیٹیاں بھی ہیں۔ وہ جو ایک پہلی بیٹی تک تو برداشت کر لیتا ہے' خیر کوئی بات نہیں جی' لڑکیاں لڑکے سب خدا کے دیے ہوئے ہوتے ہیں' اولاد ہے جی ''کوئی گل نئیں ہیگی۔ اووی اُتوں اُتوں ای کہندیاں ہوندیاں ہیگیاں۔ تے جے دوسری آجائے' اوئے اچھا بہناں صبر کر اللہ نوں منظور ای ایویں ہیگا سی' کوئی نئیں او بیٹا وی دوے گا فیر۔ اللہ نوں منظور ای ایہوسی' یعنی او ایسے کم لئی بیٹھا ہویا ہیگا' ہر کم وگاڑنا جیہڑا ہیگا''۔ کم بختو کسی ایک چیز کے اوپر تو کفر پہ ہی قائم رہو ایمان پہ نہیں آتے ہو۔ لیکن نہیں۔

لفظ فخر کا مفہوم جانوروں کا ہوانہ جس میں دودھ تو بہت کم ہو لیکن پھولا ہوا زیادہ ہو

انسان کی کیفیت یہ ہے۔ کہتا ہے جب پھر یہ خوشحالیاں آتی ہیں' یہ کچھ آتی ہیں اس وقت یہ کہتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ دیکھا صاحب میں نے یہ کیا۔ (اِنَّـهٗ لَفَـرِحٌ فَخُوْرٌ) (11:10) او چھاپن اس میں دیکھئے' کس قدر فخر ہوتا ہے کس قدر پھولے ہوئے بیٹھے ہیں۔ عجیب لفظ ہیں یہ لَفَـرِحٌ فَـخُوْرٌ (11:10)' بن کے کیسے بیٹھا ہے' فخر کہتے ہیں عربی زبان میں یہ جو گائے بھینس کا ہوانا جسے کہتے ہیں' دودھ جس میں سے آتا ہے وہ جو تھن لگے ہوتے ہیں ''پنجابی اچ اوہنوں ہوانا کہندے ہیگے''۔ بعض ایسے امراض یا نفسیاتی چیز جانوروں میں ہوتی ہے کہ وہ تو بڑا پھولا ہوا ہوتا ہے ہوانا ''تے دودھ وچوں کوئی نئیں نکلدا ہیگا' جیہڑا ہوانہ ایس طراں دا پھلیا ہویا ہووے نا' اوہنوں فخر کہندے نے عرب''۔ عجیب قوم تھی یہ۔ ''ایویں ای پھلیا ہویا' دودھ نئیں اے اندر اوہدے''۔ آہاہاہا۔ عجیب قوم تھی یہ۔ ہمارے ہاں اردو میں اگر محاورہ ہوا تو 'تھوتھا چنا' ہوا ان کے ہاں ''او تے گل ای نئیں پتہ لگدی' ہوانے نال پتہ چلدا ہیگا اے''۔ وہ کہتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پھول کے بیٹھا ہوا ہوتا ہے (لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ) (11:10)۔ لیکن (اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) (11:11)

قانون کے مطابق معاملات پر غور و فکر کرنے والوں کی کیفیت

ان لوگوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی جو ایک چیز کے اوپر جب ان کو قانون پہ یقین ہوتا ہے تو پھر استقامت سے اس پہ جم کے بیٹھ جاتے ہیں۔ نتائج صحیح نہیں نکلتے تو پھر اس کے اوپر بار دیگر غور کرتے ہیں اسی کے اوپر' کہاں غلطی مجھ سے ہوئی تھی' کہاں سقم رہ گیا تھا۔ اس دوائی کے اندر کہاں یہ کیا چیز ہوئی' اجزائے صحیح نہیں ملے' دیے گئے نہیں صحیح' پرہیز نہیں صحیح ہوا۔ اندازہ لگائیے۔ (وَ عَـمِـلُـوا الصّٰلِحٰتِ) (11:11) یہ لوگ ہیں پھر جن کے عمل صلاحیتیں پیدا کرتے ہیں۔ تو اب ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ اگر کوئی چیز ملی ہے تو اس

کے متعلق بھی یہ کہیں گے کہ ہم نے قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کیا' اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ اور اگر کوئی چیز جاتی رہے گی تو یہ کہیں گے کہ ہم نے اس کی کہیں خلاف ورزی کی اور اس کی وجہ سے یہ ہوا۔ نہ اس ملنے کے اوپر ان کے اندر یہ بے معنی فخر پیدا ہوگا نہ اس چھننے کی وجہ سے ان میں مایوسی پیدا ہوگی۔ (عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) (11:11) کے ساتھ صَبَرُوْا (11:11) آپ نے دیکھا کیا لفظ کہا ہے کہ یہ یقین ہے اگر اس علاج پہ اس ڈاکٹر کی تشخیص پہ اس نسخے کے صحیح ہونے کے اوپر تو یہ چیز دیکھو اس کو محاسبہ کرو اس کا' کہاں غلطی ہوگئی تھی۔ یونہی نہ کرو کہ صبح کے وقت یہ آپ نے ڈاکٹر کا علاج کیا ایلوپیتھک اور دوپہر تک نہیں وہ بخار اترا ہے تو وہ طبیب کو بلا لیا ہے' شام تک نہیں اترا ہے تو ہومیوپیتھی آ گئی' رات آ گئی ''تے ملانوں سد لیا اے جی دم ای کر دیو ہور کجھ نئیں تے''۔ صَبَرُوْا (11:11) یقین کر لو اس بات کے اوپر کہ یہ نسخہ واقعی شفاء دینے والا ہے۔ اگر نتائج نہیں نکلتے تو یہ نہ کرو کہ نہیں صاحب ''اوہنوں چھڈ دیو گھنٹیاں وجا لو مندر اچ جا کے''۔ یہ بات نہیں ہے۔ کھڑے ہو کے سوچو کہاں غلطی ہوئی تھی۔ (صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) (11:11) پھر اس کے بعد وہی (بقآء للاصلح) جسے کہا تھا اس نے' یہ ہیں ناصالحات جو ہیں۔ آؤنگا کبھی عملِ صالح پہ تو میں عرض کرونگا کہ قرآن نے کس کس چیز کو عملِ صالح کہا ہے۔ صالحین کسے کہتے ہیں۔ (اُولٰٓئِکَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ) (11:11) یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کو کیا ملتی ہے؟ پہلی چیز تو وہ جو نقصان ہو گیا تھا' اس سے حفاظت ملتی ہے۔ پہلی چیز اس میں یہ ہوئی' وہ جو مرض سے کمزوری پیدا ہوئی تھی وہ روک دی گئی' حفاظت مل گئی اس سے۔ اور اس کے بعد (وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ) (11:11) یہ کہتے تھے توانائی بخشنے والی چیز جو ہوتی ہے۔ یہ بیمار اچھا ہو جائے تو اس کے بعد ڈاکٹر پھر وہ دیتا ہے دوائیں کہ جی کچھ Tonic دینے چاہئیں نا تا کہ وہ جو توانائی اس دوران میں زائل ہوگئی تھی اس کی Recoupment بھی ہو جائے نا۔ مغفرت کہا ہے کہ وہ جو اس کو حفاظت مل گئی اس تباہی سے جو آ رہی تھی' نقصان ہو رہا تھا اس سے تو روک ہوگئی Preventive چیز ہوگئی مرض چلا گیا۔ مریض بھی یہ کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ''ہن ذرا کجھ تھوڑی جئی طاقت والی چیز وی دو''۔ ڈاکٹر خود بھی جانتا ہے اس چیز کو۔ مرض کے دوران اگر ٹانک دیدیا جائے تو مرض زیادہ ہو جاتا ہے۔ پہلے مغفرۃ کہا ہے قرآن نے عزیزانِ من! پہلے مرض کو وہ روکتا ہے Prevent کرتا ہے۔ اور جب یہ ہو جاتا ہے کیا لفظ یہاں آیا ہے اَجْرٌ کَبِیْرٌ (11:11) کا' کبیر کے معنی ہوتا ہے توانائی جس کے اندر ہوتی ہے قوت جس کے اندر ہوتی ہے پھر اس کو وہ قوت والی چیز دی جاتی ہے۔ آگے ایک بات بڑی اہم ہے۔

دوسروں کو غلط نتائج سے آگاہ کرنے والے کی ذمہ داری اور پھر ان کی مشکلات

قرآن کے مبلغ کا کام یہ ہے' اچھے ڈاکٹر کا کام یہ ہے' ہیلتھ وزیٹر کا کام یہ ہے کہ وہ یہ کہتا چلا جائے کہ ان چیزوں سے نقصان ہوگا'

ان چیزوں سے تباہ ہو جاؤ گے' اس سے بیماری پھیل جائے گی' اس سے معاشرے میں فساد برپا ہو جائے گا' اور جس روش پہ جا رہے ہو تم اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ کہتا ہے کیفیت یہ ہوتی ہے جو اندھا دھند جا رہے ہوتے ہیں دولت اور قوت کے نشے میں بدمست کہ وہ یہ باتیں سننا بھی نہیں چاہتے۔ اور پھر اگر آپ اس پہ مصر رہتے ہیں تو پھر معلوم نہیں کہ ان کا ردِ عمل کتنا سخت ہوتا ہے انہی چیزوں کے اوپر۔ کبھی تو وہ راستے میں کھڑے ہو کے دھکا دے دیتے ہیں' تھپڑ مار دیتے ہیں' قید کر دیتے ہیں' پھانسی پہ لٹکا دیتے ہیں۔ یہ شخص جو آنے والے خطرے سے آگاہ کرنے والا تھا اس کے متعلق کہا یہ گیا ہے۔ اندازہ لگایئے ذمہ داریاں عزیزانِ من! فریضۂ رسالت کی۔ (**فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحٰى إِلَيْكَ**) (11:12)

تو کیا اس بات سے کہ یہ ان کو بڑی ناگوار بات گذر رہی ہے جو تو کہہ رہا ہے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی بربادی ہوگی۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اگر تو اس کے اوپر بضد رہا تو ہم یہ کریں گے' تو وہ کریں گے۔ تو کیا تمہارا خیال ہے کہ تم پھر اس قرآن میں سے یہ باتیں جو ہیں کہ تمہاری ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا تو پھر تم چاہو گے کہ یہ آیتیں قرآن میں سے نکال دی جائیں کہ یہ خوش ہو جائیں۔ ہمارے ہاں تو ہوتا ہی یہ نا۔ یہ جو صلحِ کل پالیسی ہوتی ہے کہ نہیں صاحب وہ ہر ایک سے بنا کے ہی رکھنی چاہیے "اوتوں اپنی نبیڑ تینوں ہور نال کی"۔ یہ تو انسانیت نہیں ہے عزیزانِ من! اپنی نبیڑ تو صرف حیوانوں کے اندر ہوتی ہے۔ ساتھ کھڑے ہوئے بیل کے پیٹ میں کتنا ہی درد ہو رہا ہو یہ بیل جو ہے اس کو اس کا خیال تک بھی نہیں ہوتا "اے اپنی نبیڑ دا پیا ہوندا اے"۔ یہاں تو اپنی نبیڑنی نہیں ہے۔ تو کہا کہ کیا تو اس خیال سے پھر یہ چاہے گا (**فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحٰى**) (11:12) چھوڑ دے گا ان چیزوں کو۔

صلیبی جنگوں کے اثرات کے اور پھر عیسائیت کی طرف سے مسلمانوں کو مفلوج کرنے کے لیے جذبۂ جہاد کے خلاف ایک مامور من اللہ کی طرف سے جہاد کی آیات کی منسوخی کا اعلان

ہماری تاریخ میں یہ کس طرح سے ہوتا آیا قرآن کی یہ اس قسم کی آیات جو تھیں قرآن سے نکالی تو نہیں جا سکتی تھیں لیکن ان آیات کو پہلے کس طرح سے منسوخ قرار دیا گیا' پھر ان کی تاویلیں کس طرح سے کی گئیں' پھر ان کو باطنی معنی کس طرح سے پہنائے گئے' پھر کس طرح سے مامور من اللہ بلائے گئے کہ جو آ کے پھر ان کو منسوخ کرتے چلے جائیں۔ یہ سب وہ آیتیں تھیں جو یہ سمجھتے تھے دوسروں کو یہ ذرا ناگوار گذرتی ہیں۔ اور ان آیات میں ان قوانین میں سب سے زیادہ ناگوار گذرنے والی بات پوری دنیائے عیسائیت کو 'جہاد' تھا نا۔ صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے جو آپ کے ہاں صلیبی جنگیں ہوئی ہیں' سارے یورپ کی پسلیوں کے اندر درد اس قسم کا آج تک ہے کہ مندمل نہیں ہو سکا وہ۔ تین سو سال تک ان کے ساتھ وہ جنگ رہی' Terror ان قوموں کے اندر پھیل گیا اس سے۔ وہ انتقام کی آگ ان کے

سینوں کے اندر آج تک نہیں بجھی ان قوموں کے اندر۔عیسائیت کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے لیکن مسلمانوں کے خلاف جذبۂ انتقام ان کے سینوں میں اسی طرح سے جاری ہے عزیزانِ من!۔اس کا علاج ان کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل سے جہاد کا خیال نکال دیا جائے۔لیکن کیا کیا جائے' قرآن میں تو آپ دیکھئے کہ کم وبیش کوئی آدھا قرآن بھرا ہوا ہے اسی سے' جہاد ہی سے۔نکالا کیسے جائے۔ بڑی تاویلیں پہلے کی گئیں کہ جی وہ دفاعی ہوتا ہے صاحب وہ' Defensive ہی ہوتا ہے صاحب' یہ اس زمانے کا تھا جی' مشرکین کے متعلق تھا۔بڑا کچھ اس کے متعلق آیا۔یہ قوم بھی سخت جان واقع ہوئی تھی۔اس سے کام نہیں چلتا تھا۔وہی جو قرآن پڑھتی تھی ہر چوتھی آیت تو جہاد کے متعلق آتی تھی اور پھر اس کا اجر کبیرا تنا بڑا دیا جاتا ہے' حیاتِ جاوید اس میں حاصل ہوتی تھی' زندہ جو ہے غازی کہلاتا ہے' جان دیدینے والا اس میں شہید ہوجاتا ہے۔اتنا بڑا اجر قرآن نے بتایا اس کے متعلق۔اس سے بات نہیں چلتی تھی تآنکہ پھر ان اقوام کو ایک مامور من اللہ بھیجنا پڑا۔بحثیں آپ کے ہاں چلتی ہیں کہ نبوت کا دعویٰ کیا تھا مرزا صاحب نے یا رسالت کا دعویٰ تھا۔کچھ بھی تھا' چھوڑیئے کیا دعویٰ تھا' قرآن کی یہ آیات میں نے کہا ہے نا آدھا قرآن بھرا ہوا ہے۔کھلے الفاظ میں اس نے یہ کہا کہ یہ ٹھیک ہے رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اندر قرآن میں یہ چیز تھی' جہاد کے احکام تھے۔مجھے بھیجا ہے خدا نے میں اس کے حکم سے جہاد کو منسوخ قرار دے رہا ہوں۔چل بھئی۔

قرآن حکیم نے اپنی کسی آیت کو منسوخ کرنے کا حکم نہیں دیا

فَلَعَلَّکَ تَارِکٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ (11:12) رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا تھا کہ کیا ان لوگوں کی وجہ سے کہ ان کو یہ ناگوار گذرتی ہیں' کچھ تو وحی کو چھوڑ دے گا۔کتنی سخت تنبیہ ہے۔رسول اللہ ﷺ تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔انہوں نے کہا کہ لیجئے صاحب کوئی بات نہیں ختمِ نبوت کہاں' جاری ہے۔وہ جن آیات کے تارک نہیں ہوسکتے تھے ہم ان کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ کسی کی خاطر اس قرآن میں سے کوئی چیز چھوڑی نہیں جاسکتی عزیزانِ من!۔آپ میں اتنی جرآت' ہمت' بے باکی نہیں ہے تو اعتراف کرلیجے کہ صاحب مجھ میں یہ ہمت نہیں میں نہیں یہ بات کہہ سکتا' وہ اور بات ہے۔یہ چیز کہ صاحب قرآن اس سے منع کرتا ہے' یہ اس میں نہیں ہے' آپ سوچئے تو سہی کتنی بڑی جرآت ہے یہ کہہ دینا۔پچاس ساٹھ برس سے بحثیں چل رہی ہیں کہ خاتم کی ت کے اوپر زبر ہے یا زیر ہے عزیزانِ من!۔ایک مسئلہ سارے مسئلہ کو حل کردیتا ہے یہ جو میں نے ابھی بیان کیا ہے آپ سے۔خدا نے جس قرآن کو کہا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (6:115) اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ایک شخص جرأت سے آ کے کہتا ہے کہ میں اس میں اتنی بڑی تبدیل کرتا ہوں کہ منسوخ قرار دیتا ہوں ان کو۔اس کے متعلق بحث کیا پھر کہ دعویٰ کیا تھا اور کیا نہیں۔فَلَعَلَّکَ تَارِکٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰٓی

اِلَیۡکَ (11:12)

کفار کی طرف سے نبوت کے متعلق کیے جانے والے مطالبے اور قرآن کی وضاحت

ایک چیز تو یہ ہوئی۔ چلیے صاحب۔ وَ ضَآئِقٌۢ بِہٖ صَدۡرُکَ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ کَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ (11:12) کہتا ہے پھر ان کے روز کے یہ مطالبے کہ صاحب یہ نبی کیسا ہے' رسول کیسا ہے' ہمارے جیسا ایک انسان' کھاتا ہے پیتا ہے بیوی بچے ہیں' گھربار میں رہتا ہے' بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ یہ کیسا رسول ہے۔ بھئی کیسا ہونا چاہیے؟ معجزات دکھانے چاہئیں اس کو تو' یہ اگر آیا ہے تو اس کے پاس ایک تو بہت بڑا خزانہ ہونا چاہیے۔ بالکل ٹھیک ہے' ہر جھوٹے نبی کے پاس خزانہ ہونا چاہیے' اس کے بغیر اس کی بات ہی نہیں بنتی۔ خزانہ ہونا چاہیے صاحب اس کے پاس۔ اور کیا ہونا چاہیے بھئی؟ اس کے جلو میں فرشتے ہونے چاہئیں صاحب' یہ کچھ ہونا چاہیے۔ کہا یہ اس قسم کے مطالبے روز کرتے ہیں اور تو ان کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ سیدھی سی بات ہے تیرا تو اعلان ہے کہ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (18:110) میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ تو کہتا ہے کہ پھر جب یہ روز مطالبہ کرتے ہیں تو پورا نہیں کرسکتا تو کیا اس سے پھر تو زچ پڑ جائے گا کہ یا اللہ ان کی خاطر ہی سہی کچھ ایسا کر دے اب میں کیا کروں روز تنگ کرتے ہیں آ کے مجھے۔ کیا تیرے سینے میں اس سے گھٹن پیدا ہو جائے گی کہ میرا یہ مطالبہ کیوں نہیں پورا ہوتا۔ اندازہ لگائیے۔ یعنی یہ نہیں کہ حضورﷺ میں یہ پیدا ہوگئی (معاذ اللہ)۔ یہ جو کوئی قرآن کی آواز لے کے اٹھتا ہے اس کے متعلق تو ہے کہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ (94:1) سینے کی کشاد پیدا کر۔ یہ بڑی چیز ہے۔

نبوت سے سرفراز ہونے والی ہستی ہمیشہ وسعت قلب کی دولت سے مالا مال ہوتی ہے

عزیزانِ من! وسعتِ قلب' سینے کی کشاد پیدا ہونا۔ حضرتِ موسیٰؑ کو جب فرعون کی طرف جانے کے لیے حکم دیا ہے کہ جو دعا آپؑ نے مانگی تھی خدا سے اس میں یہ چیز بھی تھی کہ یا اللہ میرے سینے میں اتنی کشاد پیدا کر دے کہ وہ جس قسم کی سامنے سے باتیں بکے' نہ تو میں جذبات کو چھوڑوں نہ میں مایوس ہو کے اس کے دربار کو چھوڑ کے آؤں۔ اتنی بڑی وسعتِ قلب مجھے دیدے کہ نہ تو غصہ آئے نہ میں ناامید ہو کے اس کو چھوڑ کے چلا آؤں۔ بڑی چیز ہے شرح صدر عزیزانِ من!۔ خدا کی بات کو آگے پہنچانے والا جو ہے اس میں اگر گھٹن پیدا ہو جائے مایوسی پیدا ہو جائے یا اس کو خوامخوہ کے لیے اشتعال پیدا ہو جائے' غلط ہے۔ یہ بات کہی تھی کہ خدا کی بات کا جو پہنچانے والا ہے ضآئق نفس نہیں وہ ہوسکتا۔ لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ کَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ ؕ (11:12) کہا سیدھی سی بات ہے اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِیۡرٌ ؕ (11:12) بات سن لے تو بھی' تیری پوزیشن صرف یہ ہے کہ جو اندھا ہے اور کنویں میں گر رہا ہے آواز دیدے کہ کنواں ہے۔

سیدھی سی بات ہے۔اب اگر وہ یہ کہتا ہے کہ بتائیے سرکار آپ کے ساتھ کچھ فرشتے بھی کھڑے ہیں۔اس سے کہو کہ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ آگے کنواں ہے' یہ کھڑے ہوں یا نہ ہوں اس سے تجھے کیا واسطہ۔(اِنَّمَآ اَنۡتَ نَذِیۡرٌ ؕ (11:12) تیری صرف یہ پوزیشن ہے۔

ہر چیز اور ہر عمل کا نتیجہ قوانین خداوندی کے مطابق ہی برآمد ہوتا ہے اور ہو گا

وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ (11:12) باقی رہا یہ کہ یہ جو کچھ تو کہہ رہا ہے اس کے نتائج کیسے پیدا ہوں' یہ نہ معجزات کے ذریعے سے ہوتے ہیں نہ کوئی خزانے تیرے پاس اس کے لیے ہونے چاہئیں نہ کوئی فرشتے ساتھ آنے چاہئیں۔ یہ تو اس کو خدا کو اپنے قوانین کے اوپر اتنا Confidence ہے' اتنا اعتماد ہے کہ اس کو یہ خزانے دینے کی اور ملائکہ بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ تو جو سنکھیا کھائے گا مر جائے گا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ فرشتے آئے ہوئے ہوں یا خزانہ ہو تو پھر تو وہ نہ مرے اور اگر وہ یہ چیزیں نہ ہوں تو وہ مر جائے۔ کہنے لگے ان دونوں کا تعلق ہی آپس میں نہیں ہے۔ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ (11:12) اس کو Confidence ہے اپنی ان تمام چیزوں کے اوپر' اس کی رو سے یہ سب کچھ ہو گا۔ عزیزانِ من! وقت ہو گیا سورۃ ھود کی آیت 12 تک ہم آ گئے 13 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

تیسرا باب: **سورۃ ھود** (آیات 13 تا 17)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1973ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی تیرھویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (11:13)

وحی اور علم انسانی کے حصول کے بنیادی فرق کی وضاحت نیز معجزوں کی حقیقت

پچھلے اتوار بارش کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا تھا اس سے پہلے آیات میں وہی ٹکراؤ جو حق اور باطل کی قوتوں کے درمیان ہوتا ہے' اسی کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ قرآنِ کریم پر ان کے اعتراضات تھے۔ ان کے جوابات دینے کے بعد پھر وہ چیلنج جو قرآنِ کریم دیے چلا آ رہا ہے' اس زمانے کے اپنے مخاطبین کو بھی اس نے وہ چیلنج دیا اور اس کے بعد وہ چیلنج قیامت تک کے لیے اس کا قائم اور دائم ہے۔ اور وہ یہ کہ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ (11:13) یہ کہتے ہیں کہ یہ کسی انسانی فکر کی تخلیق ہے' خود بنا لیا ہے اس نے۔ میں یہ عرض کر دوں وحی کے متعلق اور یہ دین کا بڑا بنیادی ایک اصل اور اصول ہے' جس کے سمجھنے سے بات آگے چلتی ہے۔ انسانی علم' انسانی فکر کی تخلیق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ پھر مطالعہ' تجربہ' مشاہدہ' دوسروں سے بات چیت' تعلیم تدریس' یہ سارے ذریعے انسانی علم کے ہیں۔ اور یہ جتنے طریقے بھی ہوں ان سے معلومات انسان اخذ کرتا ہے پھر اپنی فکر سے کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یہی ایک ذریعۂ علم ہے جو انسان کو دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک ذریعۂ علم اور تھا جس میں انسانی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ انسان کی اپنی سوچ' اپنے خیالات بلکہ یہ تجربہ مشاہدہ وغیرہ' اس کا کوئی دخل

نہیں ہوتا تھا۔ وہ خدا کی طرف سے براہِ راست ایک انسان کو کچھ علم دیا جاتا تھا۔ یہ جو علم اس طرح خدا کی طرف سے ملتا تھا' جس میں انسانی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا' اسے وحی کہا جاتا تھا۔ یہ مختص تھا انبیاء تک۔ کسی غیرِ نبی کو اس قسم کا کوئی علم نہیں دیا جاتا تھا۔ اسے وحی کہا جاتا تھا۔ مخصوص تھا انبیائے کرامؑ تک اور پھر آخری مرتبہ یہ وحی' یہ علم نبی اکرم ﷺ کو دیا گیا۔ اس علم کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو تعلیم بھی خدا نے دینی تھی' وہ آخری مرتبہ مکمل شکل میں' غیر متبدل شکل میں دیدی گئی۔ وہ قرآن میں محفوظ ہوگئی اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ اور جب ظاہر ہے کہ مقصد تو اس وحی کا' اس علم کا یہ تھا کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کی تعلیم کیا ہو' جب وہ آخری مرتبہ مکمل شکل میں' غیر متبدل شکل میں' محفوظ صورت میں' تمام انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے دیدی گئی تو وحی کی اس کے بعد ضرورت ہی نہیں باقی رہتی۔ قرآن کا یہ دعویٰ خود ختمِ نبوت کی دلیل ہے کہ اس کے بعد اس ذریعۂ علم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اب یہ جو دعویٰ ہے کہ یہ جو کچھ رسول وحی کے ذریعے دیتا ہے' ظاہر ہے کہ محسوس تو اس کا ثبوت کوئی نہیں تھا۔ وہ اس کا محسوس ثبوت یوں مانگتے تھے کہ نبی کے ساتھ کوئی مافوق الفطرت' فوق البشر (Super Natural , Supra Rational) کوئی چیزیں ہونی چاہئیں جنہیں معجزات کہا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ کچھ فرشتوں کا جلو ہونا چاہیے' آسمان سے لکھی لکھائی ہوئی کتاب اترنی چاہیے۔ اس کے بعد مٹی کو ہاتھ لگائے' سونا بن جانا چاہیے۔ یوں ہاتھ کرے' ایک باغ اگ آنا چاہیے۔ وہ اس قسم کی چیزیں' اس قسم کے مطالبے وہ کرتے تھے کہ یہ جو کہتا ہے کہ یہ جو مجھے مل رہا ہے' میری اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے تو پھر اس کے ثبوت میں اسے یہ بتانا چاہیے کہ یہ دیکھیے وہ چیزیں جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہیں' دیکھئے مجھے وہ حاصل ہیں۔ یعنی یہ تمام معجزات اور مافوق الفطرت چیزیں۔ ان کا انکار کیے جاتا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ ہم بات اس وحی کی' اس علم کی کر رہے ہیں۔ یہ شخص جو تمہیں یہ پیش کر رہا ہے' یہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ لہٰذا یہ سوال ہی نہیں ہے کہ اس انسان کو کوئی فوق البشر چیزیں ملی ہوئی ہیں اور ان سے تم پھر اندازہ لگاؤ کہ جو کچھ یہ کہتا ہے وہ واقعی خدا کی طرف سے ہے۔ کہا گویا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ اگر یہ کوئی چیزیں ایسی دکھا دیں جو تمہارے نزدیک واقعی عام انسان نہیں دکھا سکتے اور اس کے بعد پھر یہ جو کچھ کہے تم مان لو گے کہ یہ خدا کی طرف سے وحی ہے۔ یعنی وہ کچھ ہی کہہ دے پھر۔ یہ ہمارے ہاں والے' یہ بھنگڑ خانے کے فقیر جن کے گرد صبح ہی آپ دیکھیں تو ایک دائرہ بندھا ہوا ہوتا ہے لوگوں کا۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کچھ کرامات دکھاتا ہے' دلیل ہی اس کی یہ ہوتی ہے اس کے ولی اللہ ہونے کی' اللہ کا مقرب ہونے کی' کہ صاحب وہ بیٹھے تھے اور انہوں نے یوں کیا' اور ایسے ہوگیا۔ چلیے یہ باتیں تو اس نے دکھا دیں۔ اس کے بعد جو کچھ وہ بکواس کر رہا ہوتا ہے' ذرا اسے بھی تو سنیے۔ وہ بالکل مخبوط الحواس پاگل ہوتا ہے' مجذوب جسے کہہ دیتے ہیں۔ وہ ایسی ایسی وہ باتیں کہتا ہے جن کا نہ سر نہ پیر۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی شے مافوق الفطرت دکھا

دے تو پھر کیا اس کے بعد اس کی ہر بات کو تم یہ مانو گے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے خواہ وہ بات کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ پھر اس قسم کے حضرت صاحب ہوتے ہیں' مجذوب ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں میں تاویل نکالتے ہیں کہ اچھا انہوں نے جو تین مرتبہ کہا تھا کہ وہ وہ وہ تو اس کے معنی ہیں کہ بھئی تمہاری مراد تین دن میں پوری ہو جائے گی۔ یعنی وہ پھر اپنی طرف سے اسے معنی پہناتے ہیں' وہ بالکل بے معنی باتیں' لغو باتیں ہوتی ہیں۔

خدا کا رسول کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہوتا

قرآن نے اس کے مقابلے میں بات ایسی کہی ہے جس کا رد نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ رسول تمہارے جیسا انسان ہے' کوئی مافوق الفطرت چیز نہیں ہے' کوئی اس قسم کی بات نہیں ہے جس سے تمہاری عقل کو یہ ماؤف کر دے۔ جو کچھ یہ کہتا ہے' وہ عقل و فکر سے سمجھنے کی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کچھ یہ کہتا ہے اس پہ غور کرو کہ وہ کیا ہے۔ وہ کوئی کرامت دکھا کے کہتا ہے یا نہیں کہتا' سوال یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کتنی بڑی چیز ہے جو قرآن یہ کہہ گیا ہے۔ مذاہب کی دنیا میں' ان فقیری کی دنیا کے اندر بنیاد چلتی ہے کرامات سے' وہ کوئی نہ کوئی کرامات دکھائے' کوئی نہ کوئی کرامت دکھائے اور انبیاءؑ کے متعلق یہ چیز تھی کہ وہ کوئی معجزہ دکھاتے تھے۔ یہاں سے بات شروع ہوتی ہے مذہب کی دنیا میں۔ دین کی دنیا میں بات یہاں سے شروع یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ یہ کہتا ہے' اُسے دیکھو کہ وہ کیسا ہے۔ یہ تو تمہارے جیسا ایک انسان ہے۔ کتنا بنیادی فرق ہے عزیزانِ من! ۔ مذہب کی دنیا میں اگر کسی نے کچھ ایسا دکھا بھی دیا' زیادہ سے زیادہ وہ جو اس کے سامنے دیکھنے والے تھے انہوں نے اس کو دیکھا' معاملہ ختم ہو گیا۔ اور اس کے بعد تو رہ جاتی ہے اس کی بات اور باتیں جس قسم کی ہوتی ہیں' وہ آپ کو معلوم ہی ہیں۔ یہاں یہ صورت ہے کہ جو بات اس رسول نے کہی ہے وہ کہتا یہ ہے کہ اس بات کو آن میرٹ پر کھ کے دیکھو کہ وہ کیسی ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ اس رسول نے تو اپنی طبعی زندگی کے بعد اس دنیا سے چلے جانا ہے' یہ بات قیامت تک کے لیے رہنی ہے۔ تو لہٰذا اگر بات کو معیارِ صدق قرار دیدیا جائے' اس کی سچائی کے دعوے کی دلیل اس کی بات کو قرار دیا جائے تو یہ دلیل قیامت تک کے لیے واضح رہے گی۔ جس دور میں کوئی چاہے اس بات کو پرکھ کے دیکھے۔ جو کہی گئی ہے بات' اس بات کے متعلق کہا یہ کہ تم کہتے ہو نا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہے۔ کہا کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) یہ اپنے خیالات سے کچھ نہیں کہتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (53:4) خدا کی طرف سے دی گئی یہ وحی ہے۔ اب یہ بات کہ صاحب یہ اس کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں یہ خدا کی طرف سے دی گئی وحی ہے۔ اب اس کے اوپر اعتراض ہوا کہ معجزہ بھی نہیں تم دکھاتے۔ پہلی آیت میں یہی ہے اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (11:12) کہ خزانوں کے خزانے اس کے پاس کیوں نہیں' فرشتے کیوں نہیں ہمارے سامنے اس کے ساتھ صف بستہ

ہمارے سامنے آتے۔ کہا یہ باتیں تو کوئی نہیں ہیں۔

اگر وحی کے یہ احکام رسول کے اپنے بیان کردہ نہیں تو تم سب کو یہ کھلا چیلنج ہے کہ تم مل کر اسی جیسی 10 سورتیں بنالاؤ

اب سوال یہ ہوا کہ پھر دلیل کیا ہے اس بات کی کہ جو کچھ یہ کہتا ہے یہ اس کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہے یہ مافوق البشر ہے۔ انسان جو ہے وہ یہ چیز نہیں پیدا کرسکتا۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا دلیل یہ ہے قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ (11:13) تم کہتے ہو کہ یہ انسانوں کی فکر کی تخلیق ہے، وہ کہتا ہے سارے کا سارا قرآن نہیں، اس جیسی دس سورتیں بنا کے لے آ ؤ۔ کتنا عجیب چیلنج ہے یہ، کتنی صاف بات ہے یہ کہ اگر یہ انسانی فکر کی تخلیق ہے، میں بھی اسے اپنی فکر سے پیدا کررہا ہوں، دوسرا انسان بھی پیدا کرسکتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر یہ کہا کہ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (11:13) اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ یہ شخص اپنی طرف سے ہی یہ چیزیں اپنے دماغ سے گھڑ لیتا ہے اور پھر ہمیں کہتا ہے کہ یہ خدا کی وحی ہے۔ تم اگر اس کہنے میں سچے ہو تو اس قرآن کی دس سورتیں جیسی سورتوں لے آ ؤ اور جتنے چاہے دنیا میں تم اپنے ساتھ صاحبانِ فکر و عقل وار باب ودانش وبینش ہیں، سب کو دعوت دیدو بس ایک خدا کو چھوڑ دو۔ پھر جب تمام انسانوں کو ملا لو اور خدا کو چھوڑ دو اور اگر وہ سارے مل کے بھی نہ اس جیسی کوئی چیزیں بنا سکیں تو پھر تو ظاہر ہے نا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ ورنہ انسانی فکر کی تو یہ صورت ہے کہ ایک انسان جو کچھ یہ کہہ سکتا ہے، دنیا میں کتنے انسان اور ہیں جو اس جیسی باتیں کرسکتے ہیں۔ اور یہاں یہ کہا ہے کہ تم ہی نہیں اپنے ساتھ جتنے اور لوگ چاہتے ہو، ان کو ملا لو اور پھر یہ پورا قرآن نہیں کہا اس کے لیے کچھ آیتیں کہیں۔ ایک سورۃ کہا کہیں دس سورتیں کہا۔ یہ چیلنج ہے کہ جاؤ اور اس جیسی بنا کے لے آ ؤ اگر تم سچے ہو تو۔

مخالفین رسالت جنہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ تقریباً 82 جنگیں تو لڑیں لیکن ایک سورت نہ بنا سکے

بہت بڑی چیز ہے یہ، جسے دیکھ کر ہم یونہی آگے گذر جاتے ہیں۔ آج بھی یہی چیلنج ہے قرآن کا، قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل آج بھی یہی ہے جو اس وقت کے مخاطبین کے لیے تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس زمانے میں ان مخاطبین نے، مخالفین نے اپنی ساری عمر جنگوں میں گذار دی اس جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں۔ بڑی بڑی جنگیں ہوئیں، چھوٹی چھوٹی جھڑپیں وہ بھی ہوئیں، عام طور پہ اگر تاریخ میں گنا جائے تو اسی بیاسی کے قریب اس قسم کے باہمی تصادمات میدانِ جنگ میں ہوئے ہیں وہاں چھوٹے اور بڑے۔ ساری عمر گذر گئی اس میں ان کی۔ آٹھ ھجری میں جا کے رسول اللہ ﷺ کی وفات سے کچھ دو برس پہلے مکہ فتح ہوا تو پھر یہ سلسلہ وہاں ختم ہوا، پھر بھی یہ سلسلہ وہاں ختم نہیں ہوا اس کے بعد بھی یہ بہت سے قبائل تھے جنہوں نے اس کے بعد بھی لڑائیاں لڑیں، جنگیں لڑیں۔

یہ سارا کچھ ان قریش نے کہ جن کے متعلق جن کے علم اور زباں دانی کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے سوا دنیا کی ہر قوم کو گونگا یعنی عجمی کہتے تھے۔ایسی بڑی قوم جس کا دعویٰ یہ تھا۔قرآن نے یہ کہا کہ تمہاری زبان میں ہی میں یہ کتاب لے کے آیا ہوں۔اس نے کہا کہ یہ بھی نہیں ہے کہ لاطینی زبان میں ہوتا وہ کہتے کہ صاحب ہم لا کیسے سکتے ہیں ہماری زبان تو عربی ہے' یہ تو لاطینی ہے۔خود کہا قرآن نے کہ تمہاری زبان میں یہ قرآن آیا ہوا ہے اور تم زبان دانی کے معاملے میں تو کم از کم اتنا بڑا تمہیں فخر حاصل ہے اور غرور ہے اور چیلنج ہے کہ ساری دنیا گونگی ہے تم ہی بولنے والے ہو۔خود لفظِ عرب کے معنی بھی فصیح البیان ہوتا ہے' عربی کے معنی ہی فصاحت ہیں۔تو اتنا بڑا تمہارا دعویٰ ہے اور تم سب کے سب مکے میں چنے ہوئے نچوڑ ہوا پنی قوموں کے' اپنے قبائل کے۔تو ٹھیک ہے تمہاری زبان کی ایک کتاب ہے' ہم چیلنج پہ چیلنج کیے چلے جا رہے ہیں کہ اس جیسی دس سورتیں بنا کے لے آؤ' دس آیتیں بنا کے لے آؤ۔یہ اگر ان کے بس کی بات ہوتی تو آپ سوچئے تو سہی کہ کتنی جلدی وہ اس کو قبول کر لیتے اس دعوے کو۔تو اس سے آسان اور سستا کوئی شکست دینے کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بہت اچھا صاحب یہی سہی آ جایئے۔اور وہیں عرب کے زبان دان عرب کے اربابِ فکر موجود تھے انہی کو وہاں بلا کے بتا دیا جاتا کہ صاحب ذرا فیصلہ کیجئے دیکھئے صاحب ہم کرتے ہیں۔وہ جو اتنے اتنے بڑے ان کے شعراء اپنے قصائد کو لکھ کے کعبے کی دیواروں پہ لٹکا دیا کرتے تھے ان میں سے کسی نے بھی اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔یہ عجیب چیز ہے' کسی نے قبول نہیں کیا۔یہ بھی نہیں ہوا کہ کوئی میدان اس قسم کا لگا ہو اس میں انہوں نے کچھ پیش کیا ہو۔وہ منصف جو تھے ان کے کسی verdict کے اوپر ان کو اعتراض ہو گیا ہو کہ صاحب انہوں نے صحیح فیصلہ نہیں دیا۔بالکل نہیں۔انہوں نے قبول ہی نہیں کیا کوئی آیا ہی نہیں میدان میں۔اور یہ ایک مرتبہ نہیں قرآن میں کتنے مقامات پر یہ چیز ہے یعنی تئیس سال کے عرصے میں کتنے ہی مقامات پہ کتنی ہی جگہ قرآنِ کریم نے کتنے ہی اوقات میں نبی اکرم ﷺ نے کتنے ہی مواقع پر انہیں یہ چیز کہی کہ یہ بڑا آسان سا ایک طریق ہے جو میں پیش کر رہا ہوں' اس چیلنج کو قبول کیوں نہیں کرتے تم۔کسی نے قبول نہیں کیا۔اور اس چودہ سو سال میں کسی نے قبول نہیں کیا۔

دنیا کا کوئی فرد آج تک قرآن حکیم کے اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکا

یہ عربی زبان جاننے والے دنیا میں غیر مسلم جو ہیں وہ تو پوچھئے نہیں کہ کتنے بڑے بڑے فاضل عربی زبان کے ان کے اندر موجود ہیں۔پہلی تو چیز یہ ہے کہ خود عرب میں بسنے والے غیر مسلم اس زمانے میں بھی غیر مسلم تھے عرب کے اندر اور اس کے بعد آج تک تو پوچھئے ہی نہیں یہ خود عربوں کے اندر یہ غیر مسلم عیسائی یہودی یہ سارے۔اور عیسائی تو عرب میں بسنے والے ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بسنے والے عیسائی فاضل جو ہیں عربی زبان کے اتنے بڑے عالم ہیں۔ان کی مرتب کی ہوئی عربی کی لغات جو ڈکشنریاں ہیں' وہ سند مانی

جاتی ہیں ۔ اندازہ لگائیے آپ ۔ لینز لیکسکن آج بھی مستند تریں لغت سمجھا جاتا ہے' دائرۃ المعارف آپ کے ہاں پطرس باسیلکا (St.Peter`s Bosilica) اوراس کے بیٹے کا لکھا ہوا ہے ۔ اب بھی یہ؟؟ اور یہ گِب وغیرہ اتنے اتنے بڑے فاضل ہیں عربی زبان کے ۔ گِب سے میں ملا تو واقعی حیرت ہوئی اس بات کوسن کے کہ میں لغت مرتب کرر ہا ہوں قرآن کی ۔ وہ آیا تھا تو بہر حال میں اس سے ملا بھی ۔ میں عرض یہ کرر ہا تھا کہ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ واقعی عربی زبان کے یہ بڑے بڑے فاضل یہاں موجود ہیں ۔ وہ سب موجود ہیں' قرآن کا یہ چیلنج بھی موجود ہے ۔

علامہ پرویزؒ کی گِب سے ملاقات جس کا کہنا تھا کہ قرآن حکیم کا کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوسکتا

یہ قرآن کی آیات جیسی آیات بنا دینا تو ایک طرف' اس گب نے کتاب لکھی ہے محمڈن ازم' اس نے مجھے خود اس وقت ذکر کیا اور میں نے کتاب لی اس سے ۔ اس کتاب میں اُس شخص نے یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں' اپنے ہاں کے وہ جو انگریز ترجمہ کرنے والے ہیں' قرآن کا یہ سیل وغیرہ جو ہیں' ان کا ترجمہ بڑا ہی مشہور ہے وہاں انگریزی زبان میں ۔ اس نے کہا ہے کہ ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ قرآن کیا ہے جو اس کا ترجمہ کرنے کے لیے بیٹھ گئے ۔ گِب نے کہا ہے کہ قرآن کا دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوسکتا ۔ گِب کی لکھی ہوئی یہ کتاب میرے اندر گھر میں موجود ہے ۔

ترجمے کی بجائے قرآن حکیم کا مفہوم تو بیان کیا جاسکتا ہے لیکن وہ بھی اپنی علمی حد تک

میرے ساتھ Discussion ہوئی اس قصے کے اوپر ۔ میں نے اسے کہا کہ یہ قرآن کی یہ آیات جو ہیں' ہم تو سمجھ لیجئے کہ از روئے ایمان مانتے ہیں ان کو' آپ لوگ تو اس پہ ایمان نہیں رکھتے ۔ کہنے لگے ٹھیک ہے ۔ لیکن اس نے جو بات کہی تھی وہ بڑی عجیب تھی ۔ کہنے لگا ہمارا ایمان آپ لوگوں کے ایمان سے کہیں آگے جاتا ہے ۔ ہماری بھی ساری عمر گذر گئی ہے ان چیلنج کو دیکھتے ہوئے کہ ذرا دیکھیں تو سہی میٹ کر کے' کہنے لگے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' فکر تھر تھرا اٹھتی ہے ۔ اور اس نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا ۔ میں نے جب اس سے یہ چیز Discuss کی تھی تو اس نے کہا کہ پہلی دفعہ میں نے تم سے یہ سنا ہے اور یہی چیز ہے کرنے کی قرآن کا ترجمہ نہیں' میں نے کہا قرآن کا مفہوم میں چاہتا ہوں کہ بیان کروں' کہنے لگے یہی چیز ہے کرنے کی جو تم کرر ہے ہو ۔ اس کا مفہوم تو بیان کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی انسان اپنے علم کی حد تک' اپنے زمانے کے علم کی حد تک مفہوم بیان کرسکتا ہے' کبھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آخری لفظ ہے ۔ میں نے کہا بالکل صحیح ہے میں تو اپنی ہر کتاب میں لکھتا ہوں ۔ کہنے لگا میں اسی لیے تمہیں ملنے آیا تھا ۔

غیر مسلموں کا لکھا ہوا انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جس کا عربی میں ترجمہ مصر میں ہوا اور پچیس سال سے پنجاب یونیورسٹی کے تابع جس کا اردو میں ترجمہ ہو رہا ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ آج بھی یہ لوگ موجود ہیں' انسائیکلوپیڈیا انہوں نے لکھ دیا ہے اسلام کا' یہ جو انسائیکلوپیڈیا ہے یہ انہی لوگوں کا لکھا ہوا۔ اب بھی جو آپ کے ہاں انسائیکلوپیڈیا لکھے جا رہے ہیں وہ ان لوگوں کا غیر مسلموں کا لکھا ہوا ہے' انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اس کا عربی میں ترجمہ مصر میں ہوا۔ اس کا اردو میں ترجمہ یہاں بیٹھے ہوئے پتہ نہیں ان کو پچیس برس ہو گئے ہوئے ہیں بیٹھے ہوئے' آپ کے ہاں پنجاب یونیورسٹی کے تابع یہاں یہ ہو رہا تھا۔ یعنی ان غیر مسلموں کا لکھا ہوا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ان غیر مسلموں میں یہ جرأت نہیں ہوئی کبھی بھی وہ یہ کہیں کہ ہم قرآن کی ایک آیت کے مطابق ایک آیت بنا دیتے ہیں۔ یعنی یہ محض ہماری عقیدت کی چیز نہیں ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں' یہ ان سے پوچھئے کہ جو یہ کہتا ہے کہ صاحب یہ اس جیسی بنا دینی تو ایک طرف رہا اس کا ترجمہ ہی نہیں ہو سکتا' اس کتاب کا تو' یہ تو صرف سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہے چیلنج۔ انسانی فکر کی کوئی اس میں صورت نہیں۔ کہا کہ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (11:14) کہا کہ جب پھر یہ اس چیلنج کو کوئی قبول نہ کرے ان میں سے کوئی لبیک کہہ کے آگے نہ بڑھے کوئی' یہ چیز نہ کہے کہ ہاں ہم تیار ہیں۔ نہ یہ مخاطب اور نہ جنہیں یہ بلا رہے ہیں یا جنہیں ہم نے کہا ہے کہ بلا لو اپنے ساتھ' اگر وہ بھی ان کی اس دعوت کے اوپر لبیک کہنے کو تیار نہ ہوں' وہ کہیں کہ نہ بابا ہم تو نہیں ایسی جرأت کر سکتے تو پھر ان سے کہو کہ پھر تو تم اس بات کو جان لو گے نا کہ یہ جو ہے اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (11:14)

انسان کا کچھ لکھنا یا بولنا یہ اس کے اپنے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے جب کہ وحی کے لیے منزل من اللہ کا لفظ آیا ہے

علمِ انسانی کی تخلیق نہیں' علمِ خداوندی کی رو سے یہ نازل ہوا ہے۔ یہ تو ایک لفظِ نازل نے ساری بات اس میں واضح کر دی ہوئی ہے۔ انسان جو کچھ لکھتا ہے' جو کچھ کہتا ہے' جو سوچتا ہے وہ اس کے اپنے اندرونی جذبات وخیالات وفکر وعلم ودانش اور عقل کی چیز ہوتی ہے' اندر سے باہر آتی ہے Subjective اسے کہتے ہیں۔ یہ جو یہ انزال قرآن نے کہا ہے انزل تنزل کہا ہے اسے' اس لفظ کے معنی ہوتا ہے اوپر سے کسی چیز کا نیچے آنا اسے اصطلاح میں Objectively کہتے ہیں' خارج سے کسی چیز کا آنا۔ قرآن کے لیے لفظ جو استعمال ہوا ہے اس نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ یہ فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں ہے کہ جو اندر سے باہر آتی ہے۔ اور ضمناً بات آ گئی آپ کے ہاں یہ جو ایجوکیشن کہتے ہیں' یہ ایجوکیشن کے بھی معنی ہی پتہ نہیں ہیں ان لوگوں کہ ایجوکیشن کہتے کسے ہیں۔ ایجوکیشن کا لفظ اتنا بولا جاتا ہے اور معنی

اس کے یہ ہوتے ہیں کہ وہ استاد یا پروفیسر' وہ کوئی معلومات جو ہیں وہ لڑکوں کو دیتا چلا جاتا ہے۔ باہر سے ایک چیز ان تک پہنچاتا ہے معلومات دیتا ہے ان کو۔

ایجوکیشن کے معنی Educate کرنے کے ہیں یعنی بچوں کے اندر کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا مقصود ہو نہ کہ صرف معلومات پہنچانا

یہ ایجوکیشن کے لفظ کے معنی کے خلاف ہے۔ ایجوکیشن کا لفظ جو ہے Educate کے معنی ہوتا ہے کسی کے اندر کی صلاحیتوں کو نمودار کر کے باہر لانا اور یہی تعلیم ہونی چاہیے عزیزانِ من! ۔ یہ تو انفرمیشن ہوتی ہے جو دی جاتی ہے' معلومات ہوتی ہیں جو دی جاتی ہیں بچوں کو' یہ تعلیم نہیں ہے' یہ ایجوکیشن نہیں ہے۔ ایجوکیشن کے معنی یہ ہیں کہ بچوں کے اندر جتنی صلاحیتیں ہیں ان کی نشوونما کر کے ان کو باہر لایا جائے۔ قرآن نے یہ چیز کہی ہے کہ یہ جو ہے منزل من اللہ کے معنی یہ ہیں کہ یہ خارج سے کوئی چیز جو ہے یہ آ رہی ہے' اندر سے کوئی چیز باہر نہیں آ رہی۔ تو اگر پھر یہ اس چیلنج کو قبول نہ کریں اور کبھی نہیں کر سکتے۔ وہ جو پہلے ہی پارے کے اندر شروع میں ہی ہے فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُھَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَۃُ (2:24) کہ اگر پھر یہ نہ کریں اور کبھی نہیں کر سکیں گے۔ کہا کہ پھر ان سے کہو کہ ڈرو اس تباہی سے جو اس قسم کی صداقتوں کے انکار سے انسانوں کے اوپر آیا کرتی ہیں۔ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰہِ (11:14) اللہ کے علم سے نازل ہوا۔

قرآن حکیم کے ''منزل من اللہ'' کے الفاظ اپنے اندر ایک عظیم حقیقت لیے ہوئے ہیں

اب اگلی بات یہ ہوگئی کہ صاحب اگر خدا ہی ہم بتیس کروڑ مان لیں ہندوؤں کی طرح تو ٹھیک ہے نا کسی ایک خدا نے یہ دیدیا قرآن' کوئی دوسرا خدا کوئی دوسری قسم کا قرآن دیدے گا۔ خدا ہی کی طرف سے کہتے ہونا۔ تو اب یہ کیا چیز ہوئی پھر کہ خدا کی طرف سے یہی قرآن منزل من اللہ ہے۔ عزیزانِ من! غور کیا کیجیے قرآن کے الفاظ کے اوپر میں جو آپ سے کہتا ہوں یوں نہ آگے گذر جایا کریں۔ بِعِلۡمِ اللّٰہِ (11:14) ایک بات وَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰـہَ (11:14) اور دوسری بات یہ کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا ہی ہے نہیں۔ اللہ اکبر۔ اس میں شبہ نہیں۔ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ(59:21) اس قرآن کو تو اگر ہم پہاڑ کے دل میں اتار دیتے اور وہ کہیں ذی احساس ہوتا تو تم دیکھتے کہ اس سے وہ کانپ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ یہ واقعی ایسی ہے۔ آؤ کرو قبول چیلنج' نہیں کر سکتے۔ بِعِلۡمِ اللّٰہِ (11:14) یہ تو خدا کی طرف سے علم دیا گیا ہے۔ اور وَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ (11:14) اور دوسرا خدا کوئی نہیں ہے لہٰذا یہ بے مثل و بے نظیر ہو گیا۔ کیا دلائل لا رہا ہے قرآن۔ فَھَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (11:14)

کہا کہ کہو اس کے بعد بھی اس صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو یا نہیں۔ یعنی گنجائش ہی کوئی نہیں باقی رہ جاتی اس کے بعد عزیزانِ من! ۔ خود کوئی جبر نہیں کسی قسم کا کوئی اور دعویٰ نہیں' ان کے گھر میں وہ جو کہتے ہیں نا "The ball is in their court" ان کے گھر میں یہ بات دیدی گئی ہے کہ بابا سیدھی سی بات ہے' یہ ہے قرآن' لیجیے دس سورتیں اس جیسی بنا لیجیے' ساری دنیا کو اپنے ساتھ ملا لیجیے۔ اور اس کے بعد پھر اگر نہ کر سکو تو پھر سمجھ لو گے نا یہ بات کہ انسانی فکر کی چیز نہیں ہے' خدا کی طرف سے یہ علم دیا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ اس کا ثانی کوئی دوسرا خدا بنا دے گا' خدا تو ایک ہی خدا ہے صاحب' تو ہو گیا نا یہ بے مثل و بے نظیر۔ کہا تم نے خود تسلیم کر لیا ہے اب اس چیلنج کو قبول نہ کرنے سے' تم نے خود قبول کر لیا ہے اس چیز کو کہ واقعی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ تو کہا کہ بتاؤ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (11:14) اب بھی اسے تسلیم کرتے ہو یا نہیں۔

قرآن حکیم پر غور و فکر کے دوران کئی باطل قسم کے نظریات کو خیر باد کہنا پڑا

اس کے بعد ایک دو آیتیں وہ آتی ہیں کئی دفعہ میں کہا کرتا ہوں کہ جس زمانے میں قرآن پہ وہ منزل شروع ہوئی میری' شکوک کی دنیا سے نکل کر' کفر بالطاغوت سے آگے بڑھ کر' تمام پہلے کے معتقدات کو دماغ سے نکال کر غور و فکر سے پھر قرآن کی طرف آیا اس بارگاہ میں تو بعض ایسے مقامات تھے جنہوں نے شروع میں ہی بات میرے سامنے وہ لے آیا کہ واقعی یہ مذہب نہیں لے کے آیا' یہ دین لے کے آیا ہے قرآن۔ یہ بڑی پرانی بات تھی جو میرے ذہن میں آئی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بہت سی چیزیں ایسی تھی جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی تھیں اور قرآن میں میں نے دیکھا کہ یہ بالکل ان کے خلاف کہتا ہے۔ اور اس کے بعد جب غور کیا تو یہ نظر آیا کہ وہ چیزیں سارے مذاہب میں مسلمہ طور پہ یکساں طور پہ پائی جاتی ہیں' وہ واقعی غلط ہیں اور جو یہ ان کے خلاف کہتا ہے علی الرغم' یہی صداقت ہے۔ تو میں نے عرض کیا کہ جب قرآن سمجھنے کا یہ مرحلہ شروع میں آیا ہے تو یہ مقامات تھے پہلے جو میرے ذہن میں آئے کہ ان مسلمات کے خلاف یہ ایک چیز کہتا ہے الگ ہٹ کر ان سے۔ تو یہی نہیں کہ عام انسانی فکر جو کچھ کہہ رہی ہے یہ ان سے الگ ہٹ کے کچھ کہتا ہے بلکہ مذاہب کی دنیا میں جن چیزوں کو مسلمات مانا جاتا ہے اور وہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں' یہ ان سے بھی ہٹ کے کچھ کہتا ہے اور علی الرغم ان سے کچھ کہتا ہے۔ لہٰذا انسان کی فکری دنیا یا مذاہب میں جو انسانی فکر نے آمیزشیں کر دی ہیں' مذہب کے معنی ہوتے ہیں کہ خدا کی طرف سے دیے ہوئے دین میں انسانی فکر نے آمیزشیں کر دی ہیں' یہ ان کے بھی خلاف جاتا ہے۔ انہی مقامات میں سے ایک یہ مقام ہے جو سامنے آ رہا ہے۔

مذاہب کی دنیا میں وہ پائے جانے والے تصورات جو مسلمہ طور پر پائے جاتے ہیں

مذاہب کی دنیا میں ایک مسلمہ یہ بھی ہے کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب آپ دیکھئے نا یہ لوگ بڑے نیک ہیں' پرہیزگار ہیں' عبادت گذار ہیں' اللہ والے ہیں اور اس کے بعد حالت بیچاروں کی یہ ہے' مفلوک الحال ہیں' کھانے کو روٹی نہیں' پہننے کو کپڑا نہیں' دنیا میں ساری مصیبتیں ان کے اوپر آ رہی ہیں' تکالیف ان کے اوپر آ رہی ہیں' یہ کیوں ہے؟ یہ عام اعتراض ہوتا ہے۔ اور مذہب کی دنیا کی طرف سے ہر مذہب سے مسلمہ طور پر جواب یہ ملتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ یہ خدا کے مقرب ہوتے ہیں جتنا کوئی شخص اللہ والا ہوگا اتنا ہی وہ ان چیزوں سے محروم ہوگا۔ وہ آزمائشیں کرتا ہے' وہ امتحان میں ڈالتا ہے۔ اور اگلا مسلمہ تمام مذاہب میں یہ کہ یہ دنیا اور اس کی ساری چیزیں یہ تو ساری ہڈیاں ہیں جن کے پیچھے کتے پھر رہے ہیں' لاشیں ہیں جن کے اوپر کتے پھر رہے ہیں' یہ قابلِ نفرت چیزیں ہیں۔ دوسری دلیل یہ کہ کیونکہ یہ قابلِ نفرت چیزیں ہیں اس لیے یہ جو اللہ والے ہیں' یہ ٹھیک ہے ان کو تو یہ ملنی نہیں چاہئیں۔ تمام دنیا کے مذاہب میں مسلمات ہیں یہ کہ دنیا داری' دنیا داری کا تو لفظ ہی آپ دیکھتے ہیں نا کہ وہ اللہ والوں کے خلاف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب بڑا دنیا دار واقع ہوا ہے' کہا یہ دنیا کے دھندوں میں جی کھپا رہا ہے آدمی یہ سب کچھ ہے' ساری عمر یہ دنیا داری کے دھندے کرنے کے بعد آخری وقت میں پھر یہ ہوتا ہے کہ بھئی ساری عمر یہ کرتے رہے اور زندگی کے آخری وقت کے کچھ دن ہیں ہم نے چاہا کہ اچھا جی کچھ عاقبت کے لیے بھی کرلیں۔ ساری عمر ایسے اس کو افسوس آ رہا ہوتا ہے کہ دنیا کے دھندوں میں گذار دی' یہ سب کچھ ہوگیا۔ یہ مسلمات میں سے ہے مذاہب کے کہ دنیا اس کے دھندے' اس کی متاع' اس میں سے جو کچھ ملتا ہے' یہ تو سارے ان لوگوں کی باتیں ہیں جو خدا سے منحرف ہوتے ہیں۔ اللہ کے نیکوکار بندے جو ہیں ان کو ان چیزوں سے تعلق نہیں ہوتا۔ آپ سوچ لیجیے ذہن میں ہے نا یہ مسلمات میں سے۔ دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے ان کے متعلق۔ اور میں نے عرض کیا ہے نا کہ آج تک ذہنوں میں میرے یہ چیز ہے کہ یہ وہ منزلیں تھیں جہاں سے نظر آیا کہ یہ واقعی نہ یہ انسانی فکر کی دلیل ہے اور نہ ہی یہ مذاہب کے مسلمات میں تقلیداً پیچھے چلنے والا یہ ہے کہ جیسے وہ کہتے چلے آ رہے تھے یہ بھی اسی طرح سے کہتا چلا جائے۔ بالکل نہیں۔ ان سے ہٹ کے کہا۔ قرآن نے کیا کہا' چودہ سو سال پہلے کہا۔

مذہب کی اندھیری رات میں دین خداوندی کا روشن چراغ

پہلی چیز تو اس نے یہ کہی کہ یہ دنیا اور اس کی قوتیں اور اس کے تمام جتنے اشیاء اور نعماء جتنی بھی ہیں یہ سب اس لیے ہیں کہ جتنے انسان یہاں بھیجے گئے ہیں وہ ان سے تمتع کریں۔ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (2:36) وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13) کتنی بڑی چیزیں ہیں۔ اس پوری کائنات میں زمین پہ ہی نہیں بلکہ ان اجرامِ فلکی

میں' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے تمہارے لیے ہم نے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ آپ دیکھئے تو سہی اسلام کو مذہب کی دنیا میں شامل کیا جاتا ہے نا' مذہب کی سٹیج سے یہ بول رہا ہے اور کہہ یہ رہا ہے کہ زمین کی چیزیں ہی نہیں ان آسمانی اجرام کی چیزیں بھی تمہارے لیے تابع تسخیر کر دی ہیں۔ تو چودہ سو سال پہلے۔

انسانی زندگی میں بھوک وافلاس اور خوف وحزن تو عذاب ہے

چاند پر جانے والوں کو یہ کہہ رہا ہے وہ کہ یہ کُرّے بھی تابع تسخیر ہیں تمہارے۔ آپ غور کیجیے کہ یہ چیز کتنی بڑی ہے جو اس نے کہا ہے۔ اس نے کہا کہ اس دنیا کے اندر جسے آپ غریبی اور فقر اور بھوک یہ کہتے ہیں' عذاب ہے خدا کا۔ بڑی چیز ہے۔ بات پھر وہی آگے آئی۔ وہ جو شکایت پیدا ہوتی ہے ایک طرف تو یہ ہوتا ہے نا کہ صاحب یہ مسلمان یا اللہ والے' وہ اتنی غریبی کی زندگی بسر کرتے ہیں اس کے مقابل میں کہ صاحب یہ ان کافروں کو دیکھئے۔ اس نے اتنی بڑی سلطنتیں اتنے اتنے بڑے خزانے' دولت قوت مال غنیمت' عیش وعشرت کی زندگی یہ ساری بھرپور چیزیں یہ کفار کو یہ کیوں مل رہی ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے۔ جواب تو وہی ہے جو میں نے پہلے کہا ہے کہ صاحب پہلے جو کہہ دیا کہ اللہ اپنے بندوں کی آزمائشیں کرتا ہے' یہ تو کافر ہیں اس کو مانتے ہی نہیں ہیں اس واسطے ان کو چھٹی دے رکھی ہوئی ہے۔

خالق کائنات کی طرف سے اس کا ذرّہ ذرّہ تمام انسانوں کے لیے مسخر کیا گیا ہے

جب اس نے کہا تھا کہ سَخَّرَ لَکُمْ اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ کفار کے لیے ہم نے یہ زمین وآسمان کی چیزیں مسخر کر دی ہیں اور تم جو ہمارے ماننے والو ہو' اس میں سے الگ ہو گئے ہو۔ وہ تو لکم کہتا ہے۔ جب اس نے کہا تھا کہ اس زمین میں تمہارے لیے' رہنا ہے اور متاع حیات ہے' اس کے لیے تمتع ہے' فائدہ حاصل کرو' یہ سب تمہارے لیے بنایا ہے۔ تو وہ تو اس نے بنی آدم سے کہا تھا' الگ کفار سے نہیں کہا تھا' الگ مسلمانوں سے نہیں کہا تھا' مومنوں سے نہیں کہا تھا۔ تو گویا ایک مقام وہ ہے کہ جس میں صرف انسانوں کے متعلق یہ بات کہی گئی ہے' بنی آدم کے متعلق یہ بات کہی گئی ہے۔ اب اگلی چیز آتی ہے یہاں۔ کہا اس نے یہ کہ یہ جتنے طبعی زندگی کے سامان ہیں' یہ فزیکل لائف جسے کہتے ہیں یہ زمین' زمین کی متاع' یہ اشیاء' یہ اجرامِ فلکی' فطرت کی قوتیں Forces of Nature جنہیں آپ کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یاد رکھو ان کے لیے قوانین ہم نے بنائے ہوئے ہیں۔

کائنات کی تمام اشیاء کو قانون کے دائرے میں پابندِ سلاسل کر رکھا ہے

قانون ہمارا یہ ہے کہ زمین کو دیکھ لیجیے ٹیسٹ کر کے کہ اچھی ہے' اس میں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ پھر اس زمین میں ہل چلایئے' سنواریئے پھر اس میں کھاد ملایئے پھر اچھا سا بیج لیجیے وہ اس میں ڈالئے وقت پہ پانی دیجئے' اس کی حفاظت کیجئے جو قوانین زراعت کے

متعلق ہیں ان تمام کوملحوظ خاطر رکھ کے محنت کرتے چلے جایئے اس کے لیے۔ اوراس کے بعد ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے ملیں گے۔ اس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ سارا کچھ کرنے والا اگر کہیں گُر بخش سنگھ ہے تو اس کے تو نہیں یہ نکلیں گے اور اگر کوئی محمد بخش ہے تو اس کے ہل سے یہ نکلیں گے۔ وہ زمین، وہ ہل، وہ دانے وہ کونپلیں وہ تو دیکھتی نہیں کہ پیچھے کون چلا آ رہا ہے، گُر بخش سنگھ چلا آ رہا ہے یا محمد بخش چلا آ رہا ہے۔ وہ تو ایک انسان ہے جو بھی ان قوانین کو Follow کرے گا، ان کے مطابق کام کرے گا، اسے یہ چیزیں جو طبعی قوانین کا نتیجہ ہیں، یہ ساری چیزیں مل جائیں گی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ خدا ہونا چہتا ہی اسے ہے کہ جو یہ تجویز اس وقت نہ کرنے بیٹھ جائے کہ ''اچھا اے ساہنوں گالیاں دیندا سی، وہائے جتاں تو ہل وہنا اے، پالے جناں کوئی بیج پاؤنا ہیگا، اگے لے کئیں گا ٹھینگا۔ اے کون آیا جی، اے جی محمد بخش آیا ہیگا، اچھا اچھا مسلمان ہے نا جی، ہاں جی مسلمان ہے رجسٹر ناں ایہد الکھیا اے، اچھا کوئی گل نئیں ایہنوں کہو بے شک زمین اچ دانے نہ وی پایا کرے، کوئی گل نئیں اسی آپ ای کر کرالاں گے، آ کے گھر لے جائے اپنے دانے، کوئی گل نئیں ہیگی''۔ دنیا میں ہر بادشاہ یہی کرے گا عزیزانِ من! ہر صاحبِ اقتدار یہی کرے گا اور وہ جو اقتدارِ کلی کا مالک ہے اگر وہ بھی یہ کرے خدا ہونا چہتا نہیں ہے اس کو۔ خدا وہ ہے جو رب العٰلمین ہے ''جنوں کیندے نیں نا ایہڈا وڈا جگرا ہونا چھیدا اے، پتہ نئیں کڈا وڈا جگرا ہونا چھیدا اے رب ہون واسطے''۔ بڑا جگرا ہونا چاہیے۔ گالیاں دے رہے ہیں اس کو اعلانیہ اس کے خلاف، علی الرغم اس کے متعلق کر رہے ہیں ''ہل وہاندا جاندا وی گالیاں دیندا چلیا جاندا اے۔ اوہدے متھے تے وٹ نئیں پیندا''۔ آ ہا ہا کس کس انداز سے بات کہی۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور

یاد آ گیا یہ تو وہ شکوہ تھا جو ہمارے ہاں کے حکیم الامت نے بھی اپنے کسی دور میں، وہ پہلا دور تھا جس میں انہوں نے کیا تھا۔ بات ذرا شوخی ہے اس میں، وہ فلسفہ نہیں ہے۔ وہ جو شکوہ ہے ان کے ہاں کا

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملے حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

''ٹھیک ہے بندہ بشر سی نا چھوٹا جیا ای جگرا سی'' اس واسطے یہ چیز آتی تھی کہ اغیار کے کاشانوں کے اوپر رحمتیں کیوں ہیں یہ مسلمانوں کے اوپر برق کیوں گرے۔

قرآن حکیم کی طرف سے دیا ہوا تصورِ حیات

لیکن خدا یہ کہتا ہے کہ یہ جتنے تم دیکھتے ہو یہ خزانے بھرے ہوئے دولتیں' یہ زمین کی برکتیں' یہ قوتیں' یہ حشمتیں یہ کیا ہیں؟ طبعی قوانین ہمارے قوانین ہیں وہ کہا اس نے' یہ بھی کسی منے گجر کے بنائے ہوئے نہیں ہیں' یہ بھی ہمارے ہی قوانین ہیں۔ جو ان قوانین کو Follow کرتا ہے **مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ** (17:18) جو فوری فائدے لینا چاہتا ہے **عَجَّلْنَالَهُ فِيهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيدُ** (17:18) ٹھیک ہے ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق کہ جن کو تم قوانینِ فطرت کہتے ہو' ہمارے قوانینِ مشیت کے مطابق جو محنت کر کے کہتا ہے کہ یہ میں نے فصل بوئی اس کا مجھے فوراً صلہ سامنے مل جائے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے ہم دیتے ہیں اس کو۔ **وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** (17:19)۔

قرآن حکیم کی روشنی میں انسانی زندگی کے دوزخ

اب آگے بات فرق کی آتی ہے' فرق کہاں آتا ہے؟ کہنے لگے یہ ساری چیزیں قانونِ طبعی کے مطابق حاصل کی' دولت حاصل کی' فصلیں حاصل کیں' قوتیں حاصل کیں۔ سوال ہوا کہ ان کو استعمال میں کیسے لایا جائے؟ کہنے لگے یہاں فرق پڑتا ہے۔ ایک وہ حاصل کرنے والے ہیں جو حاصل کرنے کے بعد ان کے بل بوتے پہ دوسرے انسانوں کا گلا گھونٹتے ہیں' انہیں کفار کہتے ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو اتنی محنت کر کے جان مار کے یہ حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کس کس انسان کو ضرورت ہے' یہ ان کی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ کہنے لگے یہاں فرق پیدا ہو گیا' انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ ان کی یہ جو روش ہے کہ نوعِ انسانی کی ربوبیت ہمارا نصب العین ہے جس کے لیے خدا نے یہ سب کچھ پیدا کیا تھا' جو ضرورت مند ہے' اس کی ضرورت پوری کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جو صورت ہے' یہاں تو ان کو بھی اسی طرح سے ملا جس طرح سے انہیں ملا تھا۔ فرق یہ ہوگا کہ انہوں نے یہ جو کچھ کیا ہے کچھ عرصے تک یہ چیز جو ہے ان کو واقعی بڑی چمکتی ہوئی نظر آئے گی اس کا انجام تباہی ہوگا۔ اور یہ جو روش اختیار کر رہے ہیں اس کا انجام خوشحالی اور فارغ البالی ہوگا۔ یہ جسے انجام کہتے ہیں' اسے آخرت کہتا ہے وہ۔ مستقبل درخشندہ ہوتا ہے اس سے۔ اور وہ مستقبل اسی دنیا کا نہیں ہے' یہ زندگی مسلسل چلتی ہے مرنے کے بعد جسے آخرت کہتے ہیں' وہ بھی سنورتی ہے اس سے۔ کہتا ہے یہاں آ کے فرق پڑتا ہے۔ یہ جو پہلا حصہ ہے نا کہ جو محنت کر کے ہل چلائے گا اس میں فصل اُگے گی اور وہ ہماری زمین اس کو اتنا ہی دے گی جتنا اس دوسرے کو دے رہی ہے' کچھ نہیں فرق ہم کریں گے۔

قرآن حکیم کے قانونِ مشیت کی وضاحت

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَۃَ عَجَّلۡنَا لَہٗ فِیۡہَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِیۡدُ (17:18) ہم نے قانونِ مشیت بنایا ہوا ہے اپنے ارادے کے مطابق آپ کے جذبات کے مطابق نہیں یا نہیں صاحب وہ جو خدا کو گالیاں دیتا ہے اس کی زمین میں سے یہ کیسے اگیں۔ مَنۡ یُرِیۡدُ (17:18) یہ ہم نے خود بنایا تھا' تم سے پوچھ کے بناتے تو تم واقعی ہمیں یہ کہتے کہ ''جی کچھ فرق تے کرلو اپنی پارٹی وچ تے دوئے دی پارٹی وچ''۔ ''ایتھے تے منڈا داخل ہون جاوے کالج تے اوہنوں پہلاں پچھدے ہیگے نیں کہ پیؤ ایہدا کیہڑی پارٹی دا اے''۔ چند الفاظ ہیں نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِیۡدُ (17:18) کہ قانون جو تھا نا وہ ہم نے خود اپنے ارادے سے' اپنی مشیت کے مطابق بنایا تھا۔ تم سے نہیں پوچھا تھا۔ تم سے پوچھتے تو تم نہ ایسا بنانے دیتے۔ تم کہتے کہ جی یہ سب کچھ جو ہے یہ خدا کا ہے۔ اس نے بھی تو حزب اللہ اور حزب الشیطٰن کہا ہے نا۔ پارٹی تو اپنی بھی اس نے بتائی ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ نہیں تم سے پوچھتے تو تم ضرور یہ کہتے۔ ہم نے اس وقت کسی سے پوچھا نہیں۔

قرآن حکیم کے اندر اگر رزق حاصل کرنے کا قانون متعین ہے تو پھر اس کو صرف کرنے کا طریق بھی ہے

ہمارے سامنے ربوبیتِ عالمینی تھی' ہم تمام انسانوں کے رب ہیں۔ اس لیے ہم نے یہ قانون بنایا ہے کہ جو کوئی بھی اس کے قاعدے کے مطابق یہ کچھ کرے گا' ہم اس کو یہ دیں گے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی بات کی کہ ہم نے دوسرے قوانین یہ بنائے تھے کہ ان چیزوں کو پھر استعمال کس طرح سے کرنا ہے' ان کی تقسیم کیسے کرنی ہے' یہ بھی قوانین تھے۔ تو یہاں سے آ کے اب مومن اور کافر کا فرق شروع ہوگا اور یہ فرق آگے کی طرف چلے گا۔ فصل حاصل ہونے تک' یہ کوئی فرق نہیں ہے۔ اتنی ہی بات نہیں اگلی چیز ہے عزیزانِ من! کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ (17:20) اس کھیت میں اگر وہ ہندو یا سکھ ہل چلا رہا ہے' ساتھ والے میں وہ کوئی مسلمان ہل چلا رہا ہے' قانون کے مطابق اگر زراعت کے مطابق یہ دونوں چل رہے ہیں' ہم اسے بھی مدد دیتے ہیں' ہم اِسے بھی مدد دیتے ہیں۔ کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ (17:20) آہاہاہا۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ طبعی قوانین کے مطابق یہ صورت ہو کہ اس کا نتیجہ جو ہے وہ کرنے والا کافر ہو تو اس کا نتیجہ کچھ اور نکلے' کرنے والا مسلمان ہو تو اس کا نتیجہ کچھ اور نکلے۔ یہاں تک یہ چیز بالکل نہیں ہے۔

قدرت کی طرف سے کائنات کی ہر شے ہر فرد کے لیے بطور عطیہ ہے

کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ (17:20) یہ یہاں تک کی جو چیزیں ہیں نا کہ اس کے مطابق یہ زمین اگلتی چلی آ رہی ہے یہ کچھ ملتا جا رہا ہے۔ یہ ہماری طرف سے عطیہ ہے۔ عطیہ دیتے وقت نہیں پھر یہ دیکھا کرتے۔ اور کس کی طرف سے ہے؟ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ (17:20) جس نے پرورش کا ذمہ لے لیا ہوا ہے یہ اس کی طرف سے بطور عطیہ چیزیں ملتی ہیں۔ رب دیکھتے ہیں کہاں یہ

آیا ہے۔ اگر وہ یہ فرق کر دیتا ان دونوں کے اندر تو پھر وہ دونوں کا رب نہ رہتا' رب العٰلمین نہ رہتا' رب المسلمین ہو جاتا۔ یہ عطاء ہے۔ وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) جو چیز عطیہ کے طور پر تیرے رب نے دی ہے اس میں کسی جگہ پھاٹک نہیں ہم نے لگا دیا' کہیں پھاٹک نہیں لگا دیا۔ پھاٹک لگا دیا ہوتا تو یہ زمین سے اٹھ کے چاند تک نہ پہنچ جاتے' کہیں پھاٹک نہیں لگایا۔

عقل انسانی جو ہمیشہ اپنا فائدہ سوچتی ہے' اس کے لیے خارج سے راہنمائی حاصل کرنا ضروری تھا

عزیزانِ من! وہ تو بات چیلنج کی اور تھی میں کہتا ہوں یہ آیتیں اور یہ تصور جو ہے زندگی کا' کوئی انسانی فکر دے سکتا تھا؟ انسانی فکر کم بخت تو آج بھی قوم اور قوم میں' نسل اور نسل میں' ملک اور ملک میں' پارٹی اور پارٹی کے اندر اتنا فرق کرتا ہے کہ قدم قدم پہ پھاٹک لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسانی فکر تو اس طرح سے محدود ہو جاتا ہے۔ یہ چیز انسانی فکر دے سکتا تھا؟ انسانی فکر تو اچھوت کو وہ چاول نہیں کھانے دیتی جو برہمن چاول کھاتا ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ وہ اس کے کھیت میں وہ اگتے نہیں ہیں' سب کچھ ہوتا ہے ملتے بھی ہیں خرید سکتا ہے۔

وحی کی راہنمائی کے بغیر عقل انسانی کی پسماندگی کی ایک مثال اور پھر عملی طور پر جدوجہد کرنے والی قوم کی فضیلت

لیکن آج بھی تو وہاں وہ جو ہے جگ جیون رام وزیر بھی ہے لیکن چونکہ شودر گھر میں پیدا ہوا ہے اس لیے مدراس میں وہ اس سڑک پہ نہیں چل سکتا جس سڑک پہ برہمن چلتا ہے' وہ چاول نہیں کھا سکتا' جو برہمن کھاتا ہے۔ خاص چاول ہیں وہاں جن کے متعلق یہ کہہ رکھا ہے کہ یہ برہمن کھا سکتا ہے ''اگدے رہن جنے اگدے ہیگے''۔ میں کہہ رہا ہوں آج بھی اس بیسویں صدی میں دعویٰ جب ان کا یہ ہے کہ ہمارے ہاں ساری انسانی مساوات ہے جمہوریت ہے' سیکولرازم ہے۔ فکرِ انسانی تو آج بھی یہاں تک نہیں پہنچ پایا۔ فکرِ انسانی یہ کہہ رہا ہے کُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ ؕ وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20)۔ کہا کہ یہ ہم یونہی دعویٰ ہی نہیں کر رہے زبان سے۔ اُنۡظُرۡ (17:21) اٹھو دیکھو نگاہ مار کے' جس قوم نے جس محنت سے ہل چلایا ہے' دیکھو تو سہی اس کے کھیت میں اسی طرح سے دانے اگتے ہیں یا نہیں۔ اُنۡظُرۡ اٹھو اور دیکھو۔ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (17:21) دیکھو تو سہی' اقوامِ عالم پر نگاہ ڈالو' افراد پر پہلے نگاہ ڈالو' اپنے گاؤں کے زمینداروں پہ' کاشتکاروں پہ نگاہ ڈالو۔ پھر اقوام پہ نگاہ ڈالو کہ جس جس قوم نے' جس جس فرد نے ان طبعی قوانین کے مطابق محنت کی ہے' انہیں اس کا صلہ اس محنت کا ماحصل اسی محنت کے مطابق' قاعدے کے مطابق ملا ہے یا نہیں۔ اور کس طرح سے یہ جو ایک کو دوسرے پہ فضیلت حاصل ہوئی ہے' کس بناء پہ حاصل ہوئی ہے؟ اس بناء پہ حاصل ہوئی ہے کہ یہ مسلمان ہے اور وہ ہندو ہیں؟ اس بناء پہ حاصل ہوئی ہے اس نے محنت کتنی تھی' اُس نے محنت کتنی کی تھی' اِس نے وہ قوانین طبعی جو ہیں ان کے

مطابق کتنا چلا' یہ کتنا چلا۔لیکن پھراس فرق کو وہ نظرانداز نہیں ہونے دیتا۔

خالصاً مادی تصورحیات سے ہٹ کر حقیقی کامیابی تو مقصودِ حیات میں فرق پیدا کرنے والوں کی ہے

کہتا ہے یہاں تک تو تم دیکھ سکتے ہو کہ خالص طبعی قوانین اوران کے مطابق محنت اور کام اس کے نتائج جو ہیں یکساں طور پہ۔آ گے جو چیز ہے کہ ان قوتوں کو اس متاع کو' اس دولت کو صرف کس طرح کیا گیا' وہی جو فرق اس نے کہا ہے یہ عاجلہ اور عادلہ کا' اپنے ہی تک ان مفاد کو رکھا یا اس میں انسانیت کی بہبود کے لیے ہمارے قوانین اور اقدار کے مطابق خرچ کیا۔یہ جو لوگ ہیں اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (17:21) دیکھو کہ دنیا میں ان اقوام میں ایک دوسرے پر جو ان کو فضیلت برتری حاصل ہے ان قوانین کی رو سے صرف طبعی قوانین کی رو سے۔لیکن لَلۡاٰخِرَۃُ اَکۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَکۡبَرُ تَفۡضِیۡلًا (17:21) مستقبل کی جہاں تک زندگی ہے اس میں یہ فیصلے پھر اس کے مطابق ہونگے کہ اقدارِ خداوندی کے مطابق کس نے ان قوتوں کو صرف کیا۔جس نے اس کے مطابق کیا ہے وہ جو ہے آخرت کا کہ درجات وہ نہایت بلند' اکبر بھی ہیں' تفضیلی بھی۔افضلیت بھی اس کے اندر ہیں وہ بڑے زیادہ ہیں وہ اِن کے حصے میں ہیں۔لیکن جہاں تک اس دنیا کے اندر کے مفاد کا تعلق ہے اگر کفار خدا کے ان قوانینِ طبعی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تو اس کا جواب ملتا ہے کہ

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر

کیوں نہ ہوں۔اور یہ بات کہ

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

کیوں نہ گرے۔او جس نے بھی اپنی چھت نہیں ڈالی کوٹھے پہ' بارش برسے گی اس کے بال بچے بھیگیں گے۔

قوموں کی موت وحیات کا دائرہ تو قدرت کے غیر متبدل اصولوں کے مطابق ہی وجود میں آتا ہے

سیدھی سی بات ہے جس نے چھت ڈال دی ہے' اس کے بال بچے محفوظ رہیں گے۔یہ تھوڑا ہے کہ وہ مسلمان کا گھر ہے بے چھت کا' اس لیے وہ بچے محفوظ رہیں گے۔عجیب چیز ہے عزیزانِ من! کہا دیکھ لیا تم نے' خدا کے یہ قوانینِ طبعی' اس میں تم دیکھتے ہو کسی دوسرے کا دخل نہیں' تمہارے اپنے رجحانات وجذبات وخواہشات کا دخل نہیں۔تم یہی چاہو گے کہ صاحب یہ جو ہماری پارٹی ہے جسے ہم مسلمان کہتے ہیں' انہیں تو یہ سب کچھ ملنا چاہیے''اسی اللہ دی پارٹی جو ہوئی''اور یہ جو جتنے بھی ہیں دوسرے' یہ تو دوسری پارٹی کے لوگ ہیں ان کو وہ ملنا چاہیے۔اس نے کہا کہ تم نے اپنی فکر کو الٰہ بنالیا۔اس نے یہ فرق کہا لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ (17:22) اور یہ جو میں نے کہا ہے

کہ تم نے اپنی ہی فکر کو خیالات کو الٰہ بنالیا' قرآن کی یہ آیت ہے اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ (25:43) کیا تو نے اس کو بھی دیکھا ہے کہ جس نے اپنی ہی فکر اور خیالات کو اپنا الٰہ بنالیا تھا۔ یہاں وہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو الٰہ نہ بناؤ۔ یہ الٰہ بنالو گے تو وہاں پھر یہ تفریق شروع ہوجائے گی۔ اور جب یہ تفریق شروع ہوگئی فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا (17:22) تو انجام اس کا یہ ہوگا اس طرح سے دھتکارے ہوئے دنیا کے اندر رہ جاؤ گے کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ اُنہوں نے یہ الٰہ بنایا خدا کے سوا دوسرے کو کہ اس کی تقسیم بھی اپنی ہی فکر کے مطابق کرنے لگ گئے۔ طبعی قوانین سے جو حاصل کیا' وہاں خدا کے دیے ہوئے قوانین کے مطابق تقسیم نہ کیا اپنے فکر کو اپنا الٰہ بنایا' اپنے خیالات کو' اپنے مفادات کو' اپنے جذبات کو' خواہشات اور آرزوؤں کو اپنا الٰہ بنایا اس کے مطابق یہ کچھ کیا' دنیا جہنم بن گئی ۔ یہ دوسری طرف یہ تھے اِنہوں نے خدا کے طبعی قوانین جو تھے ان میں خدا کو نہ خدا رکھا اپنے آپ کو خدا رکھا کہ نہیں صاحب وہ اللہ والے جو ہوتے ہیں نا' ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بھوکے رہتے ہیں' ننگے رہتے ہیں۔ یہ بھی باطل کا خدا' اُن کا بھی باطل کا خدا۔ ارے ان کے باطل کے خدا نے آخرت نہ دی۔ دنیا میں تو یہ کچھ دیا اور ان کا یہ جو خدا کو چھوڑ کے باطل خدا انہوں نے اپنے لیے بنایا خَسِرَ الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ (22:11) اس دنیا میں بھی ذلت اور خواری۔ اور اس نے تو کہا ہے مَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى (17:72) جو اس دنیا کے اندر اندھا ہوتا ہے' آخرت میں بھی اندھا ہی رہتا ہے۔ یہ چیز کہ صاحب یہاں اللہ والوں کی نشانیاں یہ ہیں کہ وہ غریبی فقر فاقہ محتاجی' ذلت خواری یہ اللہ والوں کی نشانیاں ہیں' وہ کہتا ہے خدا کا عذاب ہے۔ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا (17:22) آہاہاہا۔ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ (17:23) فیصلہ تمہارے رب کا' پروردگار کا' اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اس ایک کے سوا کسی اور کے قوانین کی اطاعت نہ کرو' کسی اور کو اپنا معبود نہ بناؤ' یہ حالت ہوجائے گی تمہاری۔

غربت' فاقہ کشی' محتاجی یہ تو عذاب ہے جو انسانوں کی اپنی بدعملی کا نتیجہ ہے

پھر آ گئے ہم سورۃ ھود کی پندرہویں آیت پہ۔ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَ زِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَ هُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ (11:15)

خدائے علیم نے تو خالصاً متاعِ دنیا کی طلب کو پورا کرنے کے لیے کہیں زیادہ وافر سامان فراہم کر رکھا ہے

جو اس دنیا کی متاع چاہتا ہے' یہاں کی زینتیں چاہتا ہے' یہاں کا مال چاہتا ہے نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ (11:15) ہم اس کے کاموں کا پورا پورا بدلا دیتے ہیں۔ نُوَفِّ (11:15) ہی صرف نہیں کہا خود اس کے اندر بھی بدلا دینا اور اس میں ایفاء کا لفظ پورا آ جاتا ہے وَ هُمۡ فِيۡهَا لَا

یُبْخَسُوْنَ (11:15) ساتھ کہد یا کہ ذرا سی بھی تنگ نظری ہم میں نہیں ہے' ذرا کمی نہیں کی جاتی۔ لیکن اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (11:16) لیکن یہ یاد رکھئے کہ مستقبل میں پھران لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ وہاں تباہی ہوتی ہے ان کے لیے۔ اس دنیا میں بھی جہنم کی تباہی' آخرت میں بھی جہنم کی تباہی۔

اقدارِ خداوندی کے برعکس انسان کی طرف سے اس کا مصنوعی عمل کبھی ثمر بار نہیں ہوتا

مَا صَنَعُوْا فِیْهَا یہ الفاظ قرآن میں عجیب آتے ہیں جو کچھ خدا کے قوانین کے مطابق انسان کرتا ہے' اس کی اقدار کے مطابق کرتا ہے' وہ اعمالِ صالح ہوتے ہیں' اُن کو چھوڑ کے جو کچھ اپنی فکر' اپنا ہی اپنے آپ کو خدا بنا کے' یہ کچھ کرتا ہے' صنع کا لفظ اس میں آتا ہے۔ یہ 'مصنوعی' لفظ ہوتا ہے نا یہ وہاں سے آیا ہوتا ہے کہ یہ سارا کچھ مصنوعی ہوتا ہے خود بنایا ہوا تمہارا۔ یہ برباد ہوتا ہے حقیقت میں' ہمارے قانون کے مطابق جو کچھ تم کرتے ہو' وہ کبھی برباد نہیں ہوتا۔ برباد وہ ہوتا ہے جو تم خود صنعت کاریاں اپنے ذہن کی کارگہ فکر میں جو تم ڈھالتے ہو' وہ برباد ہوتے ہیں' وہ تباہ ہوتے ہیں' رائیگاں چلے جاتے ہیں پھر وہ' جو کچھ کرتے ہو رائیگاں چلی جاتی ہیں وہ چیزیں۔ ایک دوسرے مقام پہ بھی قرآن نے یہ کہا ہے یہ جن کی یہ آخرت میں جا کے رائیگاں جاتی ہیں (7:147)۔ یعنی دنیا میں تو اس نے کہا ہے کہ

خدا کے ہاں سے مغفرت پالینے کے خود ساختہ تصورات کی نوعیت اور پھر اس کا نتیجہ

نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَ هُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ (11:16) دونوں میں فیھا ہے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ کوئی بات نہیں اقدارِ خداوندی سے اگر ہم نے اعراض بھی برتا ہے' سرکشی بھی برتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ قرآن میں ایک دوسرے مقام پہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بھئی اتنا کچھ جو حاصل کیا ہے اس کو خدا کے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق تقسیم کرو' استعمال کرو' ورنہ یاد رکھو وہ آخرت میں تباہ ہو جاؤ گے۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب جس نے ہمیں یہاں اتنا مالا مال کیا ہے وہاں بھی وہ بخش دے گا۔ یہ تو آپ نے سنا ہوگا 'وہ بخش دے گا' یہ کیسے سوال پیدا ہوا۔ یہاں جو بخشوانے کے ٹھیکیدار بیٹھے ہیں نا' وہ یہاں سے ٹکٹ دیدیتے ہیں نا ان کو' جو جی میں آئے کرو جس طرح سے جی میں آئے کروڑ پتی بنتے چلے جاؤ' جائز ناجائز طریقے سے' جس نے یہاں مسجد بنا دی جنت میں موتیوں کا گھر بن گیا۔ مسجد میں قالین بچھوا رہے ہیں خواجہ صاحب' فانوس جی اُنہوں نے میاں صاحب نے لٹکوا دیا ہے صاحب' دیکھنا اللہ کی دین تھی نا ایسے ایسے بھگوان ہونے چاہئیں۔ اسی محلے میں رہتے تھے جی یہ' ہم نے دیکھا ہے ان کا باپ خوانچہ فروش تھا یہ بھی چھوٹے ہوتے تھے اس کے ساتھ جایا کرتے تھے بس اللہ کی دین ہے اس نے دی۔ لیکن آپ دیکھ لیجیے نا پھر اللہ والے تھے نا' دل میں تھا نا وہ' دیا ہے نا اس نے تو' پہلے آ کے مسجد میں امام صاحب کی خدمت کرتے ہیں۔ اور امام صاحب ان کے لیے منبر میں کھڑے ہو کے دعائیں مانگتے ہیں' یہ خوانچے

سے صاحب یہ محلات بنے کیسے ہیں اس سے کسی کو غرض نہیں ہے۔ یہ کیا ہے؟ ھٰذا من فضل ربی۔ یہ قرآنِ کریم میں ہے' اس وقت میرے ذہن میں آئی' وہ کہتے ہیں کہ جس نے ہمیں اس قدر یہاں دے رکھا ہے نا مجھے توقع ہے یہ' یہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے اس کی توقع ہے کہ جس خدا نے مجھے یہاں دیا ہے تو اس نے مجھے کچھ اس قابل سمجھا ہے نا کہ ایسا ہوں میں اس کی نظروں میں' تو یہاں دیا ہے نا تو وہاں بھی مجھے جنت دیدے گا۔ (18:36)

خدا تعالیٰ کے ہاں جنت کے حصول کا غیر متبدل اصول اور ہمارے ہاں کی پھیلائی ہوئی گمراہی

میں نے عرض کیا ہے نا کہ غیر شعوری طور پہ وہ یہ باتیں ہیں' کیسے دیدیگا جنت یہ تو قدم قدم پہ بتاتے ہیں' جس طرح سے جی چاہے مال جمع کرتے چلے جاؤ' سال کے بعد اڑھائی فیصد اس میں سے نکال کے ہمیں دیدیجئے' یہ لیجئے ٹکٹ جناب۔ یہ ہے تصور کہ وہاں بھی ہمیں وہ بخش دے گا۔ یہ غریب بیچارے یہاں بھی ساری عمر اسی طرح سے ان غریبوں کی گذر گئی مار کھاتے کھاتے۔ اب جنہیں یہ نیک کام کہتے ہیں مسجد بنوانا' مسجد میں قالین بچھوا دینا' وہاں قندیل لٹکوا دینا' امام صاحب کی خدمت کر دینا' زکوۃ دیدینا' صدقے دیدینا' خیرات کرنا' حج کرنا جاکے اتنا روپیہ خرچ کر کے' تو غریب کے پاس تو بچے کے لیے روٹی نہیں ہوتی' وہ تو ان کاموں میں سے کوئی نہیں کر سکتا نا۔ تو نیکیاں تو ہوئیں تو یہ' تو انہیں کے لیے نیکیاں آ گئیں نا جن کو یہ کچھ ملا ہوا ہے۔ 'مرے کو مارے شاہ مدار' یہاں ان غریبوں کی یہ حالت وہاں بھی ان غریبوں کی یہ حالت۔ لیکن ان کے لیے تسلی دیدی کہ نہیں نہیں نہیں تم بڑے مقرب ہو خدا کے۔ ارے تم بھی مقرب ہو خدا کے اور یہ جنہوں نے اتنا کچھ اکٹھا کر لیا ہوا ہے' یہ مقرب اس صورت میں ہیں جب یہ ہماری خدمت کریں گے۔

انسانی اعمال کے مطابق جہانِ امروز و فردا کی نوعیت

قرآنِ کریم میں ہے یہ وہ لوگ آ گئے کہ جنہوں نے اس دنیا میں طبعی قوانین کے مطابق یہ سب کچھ حاصل کیا اور وہ سب کچھ ہم نے دیا لَا یُبۡخَسُوۡنَ (11:15) ذرا کمی نہیں کی ان کی محنت کے ماحصل میں۔ یہ ذہن میں لے کے گئے کہ صاحب یہاں بھی اس نے یہ کہا ہے تو پھر راوی وہاں بھی عیش لکھتا ہے' جس خدا نے یہاں دیا ہے وہ خدا تو وہاں بھی دے گا جنت میں بھیجے گا۔ کہا ہے کہ وَیَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ (46:20) انہیں جب پکڑ کے جہنم لایا جائے گا تو اس کے کنارے کھڑے ہو کے یہ کہیں گے کہ یہ کیا معنی ہیں' وہاں تو اس کے فضل سے اتنا کچھ ہمیں ملا ہوا تھا' یہ سب کچھ تھا او یہاں ہمیں یہ جہنم میں۔ ہمیں یہاں وہ نعمتیں کیوں نہیں دی جا رہیں جو وہاں اتنی نعمتیں دی جا رہی تھیں۔ عجیب الفاظ ہیں کہا جائے گا اَذۡهَبۡتُمۡ طَیِّبٰتِکُمۡ فِیۡ حَیَاتِکُمُ الدُّنۡیَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا (46:20) تم نے اپنے حصے کی خوشگواریاں وہاں مانگی تھیں' وہاں تمہیں مل گئیں۔ ہم تو بخل نہیں کرتے' تم نے وہاں کے لیے مانگی تھیں طَیِّبٰتِکُمۡ

وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ج نہایت خوشگوار تھیں متاعِ حیات تم نے سب کچھ وہاں کے لیے مانگی تھیں' دی تھیں نا ''ایمان نال دسو'' دی تھیں' لے لی تھیں تم نے' اَذْهَبْتُمْ (46:20) کے معنی ہیں ختم کر دیا تھا اپنا حصہ تم نے وہاں لے کے۔ اس لیے فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (46:20) حاصل ہوئیں اتنی بڑی قوتیں تمہیں' دیا' ہم کہتے ہیں نا کہ ہم نے دیا تھا' دولت حاصل کی' قوت حاصل کی' اقتدار حاصل کیا' حکومت کی کرسیوں پہ تم بیٹھے' یہ سب کچھ حاصل کیا۔ تو پھر کیفیت تمہاری یہ ہوگئی تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (46:20) تم نے دنیا کے اندر استکبار چاہا' کبریائی چاہی' حکومت چاہی' اقتدار چاہا' بِغَيْرِ الْحَقِّ (46:20)۔

الحق کے ساتھ کبریائی کی طلب یا صاحب اقتدار ہونے کی خواہش' یہ مومن کا شیوہ ہے

یہاں سے ایک اور بات ہوئی کہ دنیا کے اندر بڑا ہونا' صاحبِ اقتدار ہونا' یہ کوئی برائی کی بات نہیں ہے' گناہ کی بات نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ بغیر الحق ہے یا حق کے ساتھ ہے۔ الحق کو لیے ہوئے دنیا کے اندر قوت اور اقتدار حاصل کرنا یہ ہے مومن کا شیوہ' قرآن یہ چاہتا ہے' قرآن ذلت و مسکنت نہیں چاہتا ان کے لیے' اقتدار چاہتا ہے' کبریائی ان کے لیے چاہتا ہے لیکن حق کے ساتھ۔ تمہیں حاصل ہوئی کبریائی یا تم نے حاصل کی کبریائی۔

بغیر الحق کبریائی انسان کو فرعون بنا دیتی ہے اور بڑی بڑی سلطنتیں صرف تاریخ کا حصہ بن کر رہ جاتی ہیں

بِغَيْرِ الْحَقِّ اقتدارِ خداوندی کو چھوڑ کے تم نے کبریائی حاصل کی یہ تکبر ہوگیا۔ اس استکبار کا نتیجہ جو ہے یہ دیکھئے مقابل میں ایک چیز کو واضح کرنا' ضد کے ذریعے واضح کرنا' یہ بڑا انداز ہوتا ہے۔ تم نے اس قدر اپنے آپ کو وہاں فرعون سمجھا بغیر الحق استکبار' آج تمہیں فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (46:20) آج یہ ذلت کا عذاب تمہارے حصے میں آیا۔ وہاں بڑے بنتے تھے نا تم' بغیر الحق' ہمارا ہر قاعدہ اور قانون اور قدر اصول توڑ کے تم دنیا کے اندر استکبار حاصل کرتے تھے۔ چونکہ وہ طبعی قانون کی رو سے تھا' اس لیے ہم وہاں چھینتے نہیں تھے تم سے' مل رہا تھا ہمارا وعدہ تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہم نے اسی وقت بتا دیا کہ اس انداز سے یہ کرو گے تو یاد رکھو مستقبل تمہارا جو ہے وہ بڑا تاریک ہوگا۔ یہاں اس دنیا کے اندر جب نتائج نکلیں گے تو قوموں کے نتائج آپ کے سامنے آتے ہیں' اس میں وقت لگتا ہے عزیزانِ من!۔ اسی لیے قرآن نے عاجلہ کہا ہے ان نتائج کو جو فوری نکلتے ہیں اور یہ جو غلط روش اور خدا کے اصول اور اقتدار چھوڑ کے جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ دیر میں جا کر نکلتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے اقوامِ حاضرہ سے کہ گذشتہ اقوام کے انجام پہ نگاہ ڈالو' ذرا دیکھو تو سہی یہ قومیں جو گذری ہیں مصر کے فراعنہ اور بابل کے نماریدا اور ایران کے کسریٰ اور بازنطینی اور رومن امپائر کے قیصر۔ انداز ہ لگایئے ہسٹری کے

اندر سب آج بھی وہ اتنے بڑے ان کے سٹیچو نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ان قوموں کا انجام جا کے دیکھو کہ کیا ہوا تھا۔ تو کہا کہ اس کے بعد مستقبل اس زندگی میں بھی اور اس کے اگلی زندگی کے اندر تو پھر؟؟؟ مستقبل کا سوال ہی نہیں۔ تو کہا کہ تم نے اپنی تمام خوشگوار چیزیں وہاں کے لیے مانگی تھیں، وہاں تمہیں مل گئی تھیں' اس کے بعد وہاں تم نے استکبار کیا بغیر الحق' نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ عذاب الھون ہے' ذلت آمیز عذاب ہے۔ اور قرآن نے یہ بتایا ہے کہ غلط روشِ زندگی کا نتیجہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ہوتا ہے اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت ہوتی ہے خواری ہوتی ہے دنیا کی زندگی کے اندر۔ پھر آ گئے ہم اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (11:16) ۔

کہا کہ ایک تو یہ جنہوں نے اسی دنیا کے لیے یہ کچھ مانگا' ہمارے طبعی قوانین کے مطابق کام کیے' اسکے نتائج ان کے سامنے آ گئے۔ مستقبل ان کا اسی قسم کا تاریک ذلت آمیز' وہ چیز آ گئی' یہ ہمارا قانون ہے۔

علی وجہ البصیرت قرآن حکیم کی صداقتوں کو سمجھنے کے تین مختلف پہلوؤں کی نشاندہی

قرآن کی صداقتوں کے متعلق اس سے پہلے سورۃ یونس میں ایک چیز آ چکی ہے کہ قرآن نے جو دعاوی کیے ہیں' جو وہ صداقتیں پیش کرتا ہے' ان کو سمجھا کیسے جائے گا' اس کے طریقے کیا ہیں۔ کس طرح سے انسان ان کو سمجھے تو معلوم ہو کہ واقعی یہ حقیقت ہے جو قرآن کہتا ہے۔ سورۃ یونس کی آیات پھر سامنے لے آیئے۔ قرآنِ کریم نے تین طریقے بتائے ہیں قرآن کے دعاوی کو پرکھنے کے اور اسکے بعد ماننے کے۔ وہ پرکھنے سوچنے کے بغیر ماننے کو ایمان قرار نہیں دیتا یا درکھئے۔ تین طریقے بتائے اس نے۔ پہلی چیز تو یہ کہا کہ یہ لوگ ان کے سامنے قرآن کے حقائق پیش کیجئے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ (10:39) پہلی چیز تو یہ کہ یہ علم کی بارگاہ سے نہیں پوچھتے جا کے کہ اس کے متعلق تم کیا کہتے ہو' تکذیب کر دیتے ہیں ان چیزوں کی جس تک ان کا علم احاطہ ہی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان کے اپنے علم کے احاطے سے باہر کی چیز ہے' اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ جھوٹ ہے۔

عقلِ انسانیت تو ہر دور میں ہر آن ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے

ارے بھئی علم کے احاطے کو ذرا وسیع کر لو نا۔ یہ تو ہے نہیں کہ جس مقام پہ کوئی ایک فرد کھڑا ہو' وہ یہ کہہ دے کہ علم کا آخری مقام یہ آ گیا ہے۔ اسی لیے میں یہ کہا کرتا ہوں اور قرآن کی رو سے یہ حقیقت ہے کہ قرآن کے حقائق جس دور میں کوئی فرد یا گروہ سمجھنا چاہے' اس دور میں انسانی علم جہاں تک پہنچ گیا ہوا ہے' اس تک اس کی رسائی ہونی بڑی ضروری ہے۔ ہر دور کا علم جہاں تک پہنچتا ہے' وہ قرآن کے حقائق کی شہادت اور گواہی بنتا چلا جاتا ہے۔ جب آخری سٹیج تک انسانی علم پہنچ جائے گا کسی ایک بات کے متعلق تو وہ دیکھیں گے کہ قرآن کی

حقیقت کی وہ آخری شہادت ہوجائے گی۔ اس نے خود کہا ہے کہ سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ (41:53) کہ ہم عالم انفس اور آفاق کی دنیا میں، باہر کی دنیا میں، خود ان کی اپنی اندر کی دنیا کے اندر، اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت ان کے سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا تھا حق تھا۔ یہ اس کا طریقہ ہے۔ کہا پہلی چیز وہ یہ کہ جھٹلا دیتے ہیں، کیوں صاحب؟ کہ جی وہ جوان کا سا ابھی ''ناریل'' ہے نا اس میں بات یہ سمائی نہیں ہے۔ ارے بھائی اب ساری دنیا کا مدار جو ہے حقیقت کا اور کذب اور صداقت کا یہ اتنا تمہاری کھوپڑی تو نہیں ہے۔ آگے چلئے علم انسانی تو ابھی بہت آگے ہے، کم از کم اپنے دور کے علم کی سطح تک تو پہنچئے کہ کیا وہ کہتے ہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے تین طریقے بتائے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر یہ نہیں وَ لَمَّا یَاۡتِهِمۡ تَاۡوِیۡلُهٗ (10:39) پھر یہ ہے کہ اگر کوئی گروہ ایسا ہے جو قرآن کے پروگرام پر عمل کر رہا ہے تو اس کے پروگرام کے نتیجے تک تو انتظار کرلو۔ اور یہ چیز قرآنِ کریم میں بار بار نبی اکرم ﷺ کی زبان سے کہلائی گئی کہ ان سے کہدو کہ تم اپنی جگہ انتظار کرو۔ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ؕ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ (11:93) میں اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرتا ہوں تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کیے جاؤ، عنقریب نتیجہ بتادے گا کون سچا ہے کون جھوٹا ہے۔ کہتا ہے اس کا بھی انتظار نہیں کرتے، علم کی بارگاہ سے نہیں پوچھتے، تم کہتے ہو کہ ذرا انتظار کرو میں اس نظام کو قائم کر کے اس کے مطابق کام کر رہا ہوں، اس کے نتائج دیکھ لو کہ وہ ٹھیک ہے کہ نہیں جو میں کہہ رہا ہوں، اس پہ بھی نہیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیۡنَ (10:39) تیسری چیز یہ ہے کہ پہلی قوموں نے جو کچھ کیا تھا، ان کا انجام دیکھ لو کہ کیا ہوا۔ میں جو تمہیں کہتا ہوں کہ تم اگر ایسا کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے، تو اس کے لیے کم از کم یہی دیکھ لو کہ تمہارے ہاں عاد اور ثمود اور ان کی قوموں کے کھنڈرات پڑے ہوئے ہیں۔ یہی کچھ ان سے کہا گیا تھا کہ اگر ایسا کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ دیکھ لو ان کے کھنڈرات۔ تو تین طریقے قرآن نے بتائے ہیں اور بڑے ہی سائنٹفک طریقے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ اپنے دور کی علم کی سطح سے پوچھو کہ وہ کہاں تک اس کی صداقتوں کی شہادت بنتے چلے جاتے ہیں۔ یا کسی جگہ خدا کرے کوئی ایسی مملکت، کوئی ایسا خطۂ زمین ہو جہاں اس پروگرام پر عمل کر کے دکھایا جائے پھر اس کے نتائج دیکھ لو۔

حصولِ پاکستان کا بنیادی مقصد

یہ خطۂ زمین اسی لیے حاصل کیا گیا تھا عزیزانِ من! کہ قرآن کے ان دعاوی کی صداقت کی شہادت بن جائے، ہمارا نظام یہاں کا جو اس کے نتائج ہیں۔ چھوڑیئے بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ اور یہ بھی نہیں تم چاہتے تو تاریخ سے پوچھ لو کہ جن قوموں نے یہ کیا تھا اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ بڑی چیز ہے۔ مذہب یہ کبھی نہیں کہہ سکتا، دین یہ چیز کہہ سکتا ہے، نظام یہ چیز کہہ سکتا ہے۔ اب آجایئے سورۃ ھود کی طرف۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَ يَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَ مِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحۡمَةً‌ ط اُولٰۤئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ‌ ط (11:17)

کہتا ہے آپ دیکھئے کون ہے جو ایمان لاتے ہیں قرآن کی صداقتوں کے اوپر۔ پہلی چیز تو یہ آپ ترجموں میں اور عام تفسیروں میں بھی دیکھیں گے عجیب عجیب یہاں بھی الجھاؤ پیدا کیے گئے ہیں ان باتوں میں' میں ان الجھاؤ میں نہیں جانا چاہتا' بات صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ (11:17) پہلے تو وہ شخص جو ہے کہ خدا کی طرف سے اس کو علم عقل دلائل براہین' بصیرت دانش' یہ عطا ہوئی' انسان ہر ایک کو وہ عطا ہوئی ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بینات سے کام لے۔ وہ شخص جو عقل وفکر سے کام لیتا ہے ایک چیز' وہی جو اس نے کہا تھا کہ علم کی بارگاہ سے پوچھو' عقل وفکر سے کام لینے والا۔

لفظ تلاوت کا لغوی قرآنی مفہوم پیروی کرنے کا ہے

دوسری چیز ہے وَ يَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ (11:17) ترجمہ اس کا عام طور پہ آپ دیکھیں گے کہا جائے گا کہ ان میں سے ایک گواہ اس کی تلاوت کرتا ہے۔ بات نہیں سمجھ میں آ سکتی ترجمے سے۔ یہ تلاوت کے معنی ہی اب ہمارے ہاں ہو گئے نا تلاوت' جلسے کی ابتداء تلاوتِ قرآنِ کریم سے ہوتی ہے۔ تلاوت کے معنی ہوتے ہیں پیروی کرنا اس کے مطابق عمل کرنا اس کے پیچھے پیچھے چلنا' اس کے لفظی معنی تلاوتِ قرآن کے ہیں قرآن کے پیچھے پیچھے چلنا اس کا اتباع کرنا' اس کی پیروی کرنا' اس کے مطابق عمل کرنا۔ يَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ (11:17) ایسا لفظ قرآن عزیزانِ من! لایا ہے وجد آ جاتا ہے۔

عالم الغیب والشہادۃ کے مفہوم کو عملی طور پر محسوس شکل میں پیش کرنے والی عظیم ہستی ﷺ

غیب اور شہادت کے دو لفظ آتے ہیں نا قرآن میں' عالم الغیب والشہادۃ' غیب تو وہ چیز ہوتی ہے کہ ایک دعویٰ کیا گیا ہے اور اس کے لیے دلیل کوئی نہ ملے' محسوس نتائج سامنے نہ آئیں۔ شہادت وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں اس غیب کے محسوس نتائج آپ کے سامنے آ جائیں' محسوس پیکر میں جو چیز آ جائے' اسے شہادت کہتے ہیں۔ عالم الغیب خدا' وہ کہ جو چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے نہیں آئی ہوئیں وہ اس کا بھی علم جانتا ہے' شہادت جو چیزیں محسوس طور پر تمہارے سامنے آ گئی ہیں۔ شاہد وہ ہے کہ جو قرآن کے ان دعاوی کو محسوس پیکروں میں سامنے لے آئے۔ يَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ (11:17) پھر اس کے اوپر عمل کر رہا ہے تمہارے سامنے ایک ایسا شخص جو ان نظری دلائل کو محسوس پیکروں میں ڈھال کے تمہارے سامنے لا رہا ہے۔ آہاہاہا۔ یہ ہے مقام رسالت ﷺ۔ ورنہ وہ دعاوی تو الفاظ کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہو گئے نا ہزار بارہ سو سال' نظری دلائل تو قرآن کے اندر موجود ہیں' شاہد منہ جو ہے وہ نہیں آیا۔ يَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ (11:17) دو باتیں ہو گئیں کہ علم کی بارگاہ سے اس کو بَيِّنَةٍ ملی ہوئی ہو' فراست ہو' بصیرت ہو علم ہو' پھر دوسری بات یہ ہو کہ کوئی ان

نظریات کو محسوسات میں ڈھالنے کے لیے ایک پروگرام کے اوپر عمل کرے اور یوں اس کا اتباع کرے قرآن کا' وہ ہو سامنے۔ اور تیسری چیز وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً (11:17) یا اس سے پہلے تم کم از کم بنی اسرائیل کی داستان تو دیکھ لو۔ عربوں کے سامنے یہی قوم تھی بنی اسرائیل جن کی اُس وقت پہلی داستان بھی ان کے سامنے تھی اور ان کا انجام بھی ان کے سامنے تھا' The Wandering Jews خانما برباد یہودی' دنیا میں کہیں ٹھکانہ مسکن نہیں ملتا تھا جس کو۔ کہا کہ اس کو دیکھو کتاب موسیٰ آئی ان کے پاس' امام تھی' اس کے پیچھے پیچھے انہوں نے چلنا تھا' رحمت تھی۔ جب چلے ہیں تو تمہیں معلوم ہے ان کا انجام کیا ہوا تھا' جب اس کو چھوڑا ہے تو تم اس قوم کو دیکھ لو کہ کیا ہے۔ تو تیسری چیز وہی آ گئی کہ تاریخ سے پوچھو۔

قرآن حکیم کی تعلیم تو سراپا دلیل و براہین پر مبنی ہے اور الحق ہے

وہی تین چیزیں جو سورۃ یونس میں تھیں: علم و عقل کی بناء پہ وہ کھڑا ہوا' کوئی ایک شاہد کوئی فرد کوئی گواہ' کوئی فرقہ' کوئی خطہ' کوئی مملکت اس کی اتباع کرتے ہوئے اس کے نظری دلائل کو محسوس پیکروں کے اندر ڈھالتا ہوا چلا جائے اسے دیکھو۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر جو پچھلی قومیں گذری ہیں ان کے انجام کو دیکھو۔ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ (11:17) یہ لوگ ہیں جو اس پہ ایمان لائیں گے۔ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُہٗ (11:17) اور پھر جو ان لوگوں میں سے' ان پارٹیوں میں سے' جو بھی اس کا انکار کرتا ہے اس کے باوجود پھر اس کا نتیجہ وہی ہے' وہی تباہی کا جہنم جس کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے۔ کہا فَلَا تَکُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡہُ (11:17) اے مخاطب وہ جو ایمان لانے والا کہ اس کے متعلق کسی شک و شبہ میں مت رہو۔ کسوٹیاں تمہیں دیدی ہیں' میزان ہم نے کھڑی کر دی ہے اس کے اوپر خود پرکھ کے اس کو دیکھ لو کہ یہ ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں' شک و شبہ کی بات ہی نہیں ہے۔ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ (11:17) یہ الحق ہے The Truth, The Only Truth یہ ال جو عربی میں آتا ہے یہ وہی جو انگریزی میں The آ جاتا ہے۔ یہی ہے The Truth خدا کی طرف سے' الحق ہے خدا کی طرف سے۔ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (11:17) لیکن تم دیکھو گے یہ خلقت یا اکثریت ان کی یونہی آنکھیں بند کر کے چلے جانے والے' وہ اس پہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان تو اس طرح سے لایا جائے گا جو یہ کہا ہے اور یہ تو مرحلہ تھوڑی سی محنت چاہتا ہے' تھوڑی سی مشقت چاہتا ہے' اس کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ سورۃ ھود کی آیت 17 تک ہم آ گئے برادرانِ عزیز! 18 ویں آیت سے ہم آئندہ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

چوتھا باب: **سورۃ هود** (آیات 18 تا 27)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان کی اس طبعی زندگی کے ساتھ اس کی ذات کی قدر و قیمت کا موازنہ اور پھر حدود اللہ کی اہمیت

عزیزانِ من! آج جنوری 1974ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ هود کی 18 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

(11:18)

تجدید یادداشت بسلسلہ قرآن فہمی

سابقہ اتوار عید کی وجہ سے درس میں ناغہ رہا تھا اس سے پہلے کے اتوار میں درس کا موضوع خصوصی تھا' حج کے متعلق وہ درس تھا۔ تو مسلسل درس اس سے پہلے اتوار میں ہوا تھا۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ 17 ویں آیت میں ایک اہم بات کہی گئی تھی۔ سورۃ

یونس میں قرآنِ کریم کے سمجھنے کے یا دین کے سمجھنے کے تین طریقے بتائے گئے تھے۔اس میں کہا یہ گیا تھا کہ دین کے سمجھنے کے لیے ایک چیز تو یہ ہے کہ کم ازکم اپنے زمانے کی علمی سطح جو ہے اس تک نگاہ ہونی چاہیے۔اس کی روشنی میں اس کے حقائق سمجھ میں آئیں گے۔اور یہ تو اس نے دوسرے مقام پہ یہ کہہ دیا ہے کہ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا چلا جائیگا انفس اور آفاق میں' یہ پوشیدہ نشانیاں جسے قرآن کہتا ہے آیت جسے کہتا ہے' آیت کے معنی وہ علامت ہوتی ہے جس سے کوئی چیز سمجھ میں آئے۔تو جوں جوں انفس اور آفاق کے اندر یہ علامات منکشف ہوتی چلی جائیں گی' قرآن کے دعوے کی صداقتیں ثابت ہوتی چلی جائیں گی۔یعنی ہر حقیقت جو منکشف ہوکر انسانوں کے سامنے آئے انفس اور آفاق میں' انسان کی اپنی ذات کے اندر یا اس باہر کی کائنات کے اندر' جب بھی وہ حقیقت تک پہنچ جائے گی تو وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی ثبوت کی شہادت بن جائے گی (41:53)۔لہٰذا ایک طریق تو اس نے یہ کہا کہ اپنے دور کے انسان کی علم کی سطح جہاں تک پہنچ چکی ہے نگاہ وہاں تک ہونی چاہیے تو قرآن کے حقائق اس طرح سے سمجھ میں آئیں گے' پہلی چیز۔اور دوسری چیز یہ کہ قرآن کے نظام پر عمل ہو رہا ہو تو اس کے نتائج یہ بتا دیں کہ واقعی اس نے جو دعویٰ کیا تھا وہ صداقت پر مبنی ہے۔یہ نظام یا دین جو ہے یہ محض نظری اور اعتقادی چیز نہیں یہ ایک عملی چیز ہے۔یہ جتنی چیزیں آپ کو نظری طور پہ دی ہوئی نظر آتی ہیں' قرآن میں یہ عمل کرنے کا پروگرام ہے جو دیا گیا ہے۔تو پروگرام کی صداقت کی شہادت تو اس کے نتائج ہی دے سکتے ہیں اسی لیے نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن میں بار بار کہلایا گیا کہ قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ج فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لا (6:135) کہ اس میں جھگڑنے کی بات کوئی نہیں ہے' میں جو نظام پیش کر رہا ہوں مجھے اس پر عمل کرنے دو' تم اس کے برعکس جو نظام پیش کرتے ہو کہ یہ سچا ہے' تم اس کے اوپر عمل پیرا ہو اور نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کونسا نظام سچا ہے' کونسا جھوٹا ہے۔تو یہ جو Pragmatic Test ہے کہ نتائج سے کسی دعوے کی صداقت کی دلیل بہم پہنچانا۔قرآنِ کریم نے یہ دوسری بات کہی کہ انتظار کرو اور پھر یہ دلیل تمہارے سامنے آجائے گی۔ اور تیسری چیز یہ کہی کہ اگر یہ بھی نہیں تو پھر کم ازکم اقوامِ سابقہ کی تاریخ کو دیکھو کہ قرآن نے جو مثلاً یہ کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135,12:23,28:37) کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' اس میں وقت تو لگتا ہے لیکن انجام کار اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے' خواہ اس کے لیے وہ نظام یا وہ شخص یا وہ مملکت کتنی ہی حفاظتی تدابیر کیوں نہ اختیار کرلے' وہ تباہ ہوکر رہتا ہے۔تو اس نے کہا کہ اس کی شہادت اگر لینا چاہو تو تاریخ کی ورق گردانی کرو' وہاں تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ اقوامِ سابقہ نے قرآنِ کریم کے دیے ہوئے اصولوں کے خلاف جہاں عمل کیا اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی نکلا' اس کے مطابق جب کسی قوم نے اپنا شیوہ اختیار کیا اس کا نتیجہ سرفرازیاں اور خوشگواریاں ہوا۔تو گویا یہ نتائج سے کسی دعوے کی صداقت کو پرکھنا یہ ایک تیسری چیز تھی۔تین طریقے تھے جو اس نے وہاں بتائے تھے انہی طریقوں کو یہاں سورۃ ھود کی سترہویں آیت میں جو آخری درس میں زیرِ نظر تھی' اُسے یہ دہرایا گیا تھا۔کہا یہ گیا تھا آپ دیکھئے کہ اَفَمَنْ

كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً (11:17)

قلب و دماغ سے غیر قرآنی تصورات کو نکالے بغیر قرآنی حقائق کی قدر و منزلت سامنے نہیں آسکتی

کہا کہ ایک یہ چیز کہ خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام لے رہا ہو انسان' یہ بڑی چیز ہے قرآن کے سمجھنے کے لیے کہ ایک تو یہ چیز کہ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79) قرآن نے کہا ہے کہ قرآنی حقائق تک وہی پہنچ سکتا ہے جو پہلے اپنے قلب و دماغ کو تمام غیر قرآنی خیالات سے پاک کر لے یعنی خالی الذہن ہو کر اس کی طرف آئے' پہلے سے ہی خیالات اپنے دل میں جما کے اس کی طرف آئے گا تو پھر یہاں وہ ہدایت نہیں پا سکے گا۔ صاف دل سے اس کی طرف آئے کہ اگر واقعی یہ حقیقت ہے اور میں تسلیم کرونگا اور اگر یہ نہیں ہے تو اس کو چھوڑ دونگا' یوں آئے۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی اس کے لیے۔ اور اس کے لیے کہا یہ کہ ایک شخص اپنی بصیرت سے کام لے رہا ہے یعنی نہ تو وہ تقلیدی روش کو ہی ایسا سمجھتا ہے کہ یہی ہے روش صحیح' میں اس سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ نہ جہالت سے کام لے رہا ہے' نہ Prejudice سے کام لے رہا ہے' علم و بصیرت جو خدا نے دیا ہے' اس سے وہ کام لے رہا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (11:17) اور ایک ایسا شخص اس کا اتباع کر رہا ہے' اس پروگرام کا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ شاہد کے معنی وہ ہوتا ہے جو محسوس طریق پر کوئی چیز کر کے دکھا دے۔

لفظ غیب اور شاہد کے مفہوم کی وضاحت

یہ غیب اور شہادت جو دو لفظ قرآن میں آئے ہیں' اس کے معنی یہ ہیں' غیب وہ چیزیں ہوتی ہیں جو محسوس طور پر ابھی سامنے نہ آئی ہوں اور مشہود وہ چیزیں ہوتی ہیں جو محسوس طور پر سامنے آ گئیں۔ تو شاہد وہ ہوتا ہے جو کسی پروگرام پر اس طرح سے عمل کرے کہ اس کے نتائج گواہی بن جائیں اس کے دعوے کی صداقت کی۔ یہ شاہد کو گواہ اسی لیے کہتے ہیں اور شہادت کے معنی گواہی اسی لیے ہوتا ہے کہ اس کے نتائج گواہ بن جاتے ہیں اس کے دعوے کی صداقت کی۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ کو شاہد کا ایک لفظ قرآن میں آیا ہے وہ اس معنی میں آیا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے کہ جس کے بعد پھر یہ لفظ نگران کے معنی میں آ جاتا ہے کہ دوسروں کا جو پروگرام ہے وہ ان کے اوپر نگرانی کرتا ہے اس اعتبار سے کہ وہ محسوس طور پر بتاتا ہے کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ جسے غلط کہتا ہے اس کی غلطی کو محسوس طور پر Point-out کرتا ہے جسے صحیح کہتا ہے' کر کے دکھاتا ہے کہ یہ دیکھئے صحیح ہے۔ تو کہا دوسری چیز یہ ہے کہ ایک شاہد جو ہے وہ اس کا اتباع کر رہا ہے اس کی پیروی کر رہا ہے اور اس کے پروگرام کا ہر نتیجہ مشہود طور پر اس کے دعوے کی صداقت کی شہادت بنتا چلا جا رہا ہے۔ یوں ہوا اس کا مفہوم۔

بنی اسرائیل کا خدا تعالیٰ کی راہنمائی پر چلنے کا نتیجہ جو سطوتِ داؤدی اور شوکت سلیمانی کی شکل میں ظاہر ہوا

تیسری چیز وہی کہ اگر یہ نہیں تو پھر ذرا پیچھے دیکھو کہ اقوامِ سابقہ نے کیا کیا' ان کا نتیجہ کیا ہوا اور اس کے لیے وہ قومِ بنی اسرائیل کی تاریخ کو نمایاں طور پر قرآن سامنے لاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تاریخ ایسی تاریخ ہے کہ جس میں پہلے ایک قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی' انتہا درجے کی کمزور ناتواں ذلیل محتاج کی ہوئی' ملوکیت اور فرعونیت کے پنجے میں جکڑی ہوئی۔ وہاں سے خدا کی دی ہوئی راہنمائی میں جب انہوں نے قدم اٹھایا ہے تو اس کے بعد آزادی حاصل کی تو پہلا دور تو یہ ہوا کہ استبداد سے نجات حاصل کی' ایک خطۂ زمین آزاد ملا ان کو جسے سینا کی وادیاں کہتے ہیں۔ وہاں پھر انہوں نے اپنی مملکت قائم کی۔ اس مملکت کو جب تک وہ وحی خداوندی کی روشنی میں عمل پیرا رہے تو انہیں سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی تک نصیب ہوئی۔ دنیا کی تاریخ میں یہ عجیب قوم ہے کہ ایک قوم کی تاریخ ایک طرف ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وہ مظلومی' محرومی' محتاجی کے انتہائی پست درجے پہ تھی جب وہ مصر میں فرعون کی غلامی میں تھی۔

وحی کی اقدار کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہی ذلت و رسوائی جس میں آج پوری امت مسلمہ گرفتار ہے

اور اس کے بعد جب اس نے پروگرام وحی خداوندی کے مطابق بنایا تو وہ اس زمانے کی اپنی ہمعصر اقوام میں ممتاز ترین درجے کے اوپر پہنچی ہوئی قوم تھی۔ یہی جو قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے تمہیں عالمین پر تفضیل دی تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری ہمعصر اقوام اس زمانے کی دیکھو تو سہی ان کے مقابلے میں تمہاری عظمت اور شوکت اور ثروت اور دولت کس مقام تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد پھر دور وہ آتا ہے کہ جب انہوں نے پھر وہ راہنمائی چھوڑ دی تو اس کے بعد وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ ٭ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (2:61) کہ پھر خدا کی مار ان پہ پڑی یعنی ذلیل اور خوار وہ قوم ہوگئی The Wandering Jews ان کا نام' گھر بار تک کوئی نہ رہا' مسکن کوئی نہ رہا' وطن کوئی نہ رہا' مملکت تو بڑی چیز ہوتی ہے۔ تو یہ ایک ایسی داستان ہے ایک قوم کی مسلسل جس میں تینوں دور آجاتے ہیں سامنے۔ پہلے دور میں جب راہنمائی سے محرومی تھی تو کیا صورت ہوئی' دوسرے دور میں راہنمائی کے تابع چلے تو کیا عظمتیں حاصل ہوئیں' تیسرا دور پھر جب اسے چھوڑ دیا تو پھر کس مقام پہ پہنچ گئیں۔ تو اس لیے وہ ہمیشہ اس کو دہراتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ تیسری چیز اس کے سامنے ان اقوام کی بالخصوص بنی اسرائیل کی داستان ہو تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ یہ تھا وہ پچھلے درس میں جو آخری آیت ہمارے سامنے آئی تھی اس کا ملخص۔ اب اسی کے تسلسل میں اگلی بات سامنے آئے گی کہ ایک تو یہ ہے کہ اس قسم کی خدا کی تعلیم صحیح پیش کرنے والا۔

افتراءعلی اللہ کرنے والے یعنی نبوت کا دعویٰ الہام وغیرہ کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے ہیں

اب اس کے بعد مذہبی پیشوائیت آتی ہے۔ آج کا درس شروع ہوتا ہے۔ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ o الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (11:18-19)

کہتا ہے اس کے مقابلے میں لفظ یہ ہے خدا کے خلاف افتراء کرنے والے۔ افتراء کے معنی ہوتے ہیں ایک جھوٹی بات ہو اور اس کو کسی کی طرف منسوب کر دی جائے کہ اس نے یہ کہا ہے۔ اصطلاحی طور پر ایک تو مفتری علی اللہ ہوتے ہیں یہ جو نبوت کا دعویٰ کر دیتے ہیں' وحی کا دعویٰ کر دیتے ہیں' یہ کہتے ہیں خدا کی طرف سے ہمیں الہام ہوتا ہے' تو یہ جھوٹا دعویٰ جو ہے اس کو بھی افتراء علی اللہ کہا جاتا ہے۔ خدا کی طرف ایک جھوٹی بات منسوب کر دینا کہ یہ اللہ کی ہے۔ تو میں نے کہا ہے نا کہ اس کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے یہ جو مدعی ہوتے ہیں نبوت کے الہام کے اور سیدھی بات ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد تو ہر شخص جو اس کا دعویٰ کرے گا یا جو شخص بھی اس کا دعویٰ کرے گا کہ اسے خدا کی طرف سے اب براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے' اس کا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھے' وہ افتراء ہے اللہ کے اوپر۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہے بند ہے اب اس میں کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے' نہ یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ تم اپنے دعوے کے لیے دلیل لاؤ۔ جو شخص ختمِ نبوت پہ ایمان رکھتا ہے اس کے بعد تو وہ اس بحث میں ہی نہیں پڑتا۔ یہ افتراء ہے اللہ کے اوپر۔ تو ایک چیز تو یہ ہے۔

شریعت خداوندی کے بارے افتراءعلی اللہ کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا کردار

دوسرا افتراء جو ہے وہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) کہ وہ خود ہی فتوے گھڑتے ہیں' آپ ہی ایک شریعت بنا لیتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ اب یہ چیز جو ہے' یہ مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔ یہ لوگ نبوت کا دعویٰ نہیں کرتے' یہ الہام کا دعویٰ بھی نہیں کرتے' دعویٰ ان کا یہ ہوتا ہے کہ ہم شریعتِ خداوندی پیش کرتے ہیں۔ کوئی نیا دین نہیں۔ انہیں میں سے یہ پیشوائیانِ مذہب ہوتے ہیں اسی دین کے اسی مذہب کے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے کچھ احکام وضع کرتے ہیں اور انہیں شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ اب دیکھئے اس کے اندر مذہبی پیشوائیت ساری آ جاتی ہے۔ یعنی ان کے ہاں سے اگر کوئی بات خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق کوئی وہ حکم دیتے ہیں تو وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن جتنی ایسی چیزیں ہیں کہ جنہیں اپنی طرف سے وضع کرتے ہیں اور شریعتِ خداوندی کہہ کے پیش کرتے ہیں' یہ افتراء علی اللہ ہے وہ خدا کے خلاف جھوٹ ہے۔ یہ ہیں جن کے متعلق یہ کہا۔ دیکھئے دو چیزیں یہاں قرآن نے کہی ہیں۔ بات بڑی صاف ہو جاتی ہے۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (11:19) پہلے بھی یہ بات ایک دفعہ آ چکی تھی میں نے وضاحت سے عرض کیا تھا ایک بڑی اہم چیز ہے يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا(11:19) کے معنی۔ دین کے متعلق اس نے کہا تھا صراطِ مستقیم ہے ایک سیدھا ہموار راستہ جس کے اوپر چلے جانے کا نام دین ہے وہ منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ کوئی نئے دین کا مدعی ہو نئی وحی کا مدعی ہو نئی کتاب کا مدعی ہو تو اس کے تو معنی یہ ہیں کہ اس نے یہ راستہ چھوڑ دیا ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اس کا دعویٰ یہ ہے۔

قرآن حکیم کے متعلق ایران کے بہائی مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ آسمانی کتاب منسوخ ہو چکی ہے

ہمارے دور میں جیسے یہ ایران کا بہائی جو مذہب ہے علی محمد باب پہلا ان میں تھا' بہاء اللہ کے نام سے وہ منسوب ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کا دور ختم ہو گیا وہ ایک خاص دور کے لیے کتاب تھی' جس طرح سے کہ ایک ریلوے کا ٹائم ٹیبل ایک خاص مدت کے لیے ہوتا ہے اس کے بعد وہ اسی شکل میں ٹائم ٹیبل پڑا رہے تو وہ بے معنی ہوتا ہے' منسوخ ہو جاتا ہے' معطل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نیا ٹائم ٹیبل آ جاتا ہے۔ یا اب جو جنوری میں نئے کلینڈر آپ کے ہاں آئے ہیں' سابقہ کلینڈر لٹکا رہے' اس میں کوئی تحریف نہیں ہوتی' اس میں کوئی کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتا ہے۔ تو اُنہوں نے کہا کہ اسی طرح سے خدا کی کتاب جو ہے وہ ایک خاص دور کے لیے ہوتی ہے' قرآن ایک دور کے لیے تھا وہ دور اس کا ختم ہو گیا ہے۔ اس کے اندر ہم کوئی تحریف نہیں کرتے اور نہ ضرورت ہے اس کی' اس کی جگہ ایک نیا کلینڈر آ گیا ہے' نئی جنتری آ گئی' نیا ٹائم ٹیبل آ گیا ہے۔ تو وہ اس کے مدعی ہیں۔ تو انہوں نے تو اسلام سے الگ ایک راستہ ہی اور تجویز کر لیا اپنے لیے' یہ دوسرا راستہ تجویز کیا ہے انہوں نے۔ لیکن ایک شکل یہ ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ ہی وہ رہے' مدعی اسی کا ہو وہ کہے کہ یہی کتاب ہے' یہی دین ہے' یہی اسلام ہے لیکن وہ جو سیدھا راستہ چل رہا ہے اس میں ذرا سی ٹیڑھ پیدا کر دے' یوں ذرا سا تھوڑا سا موڑ دے اس کو۔

یبغونھا عوجاً کے مفہوم کی عملی مثال

آپ دیکھئے کہ یہ جو ذرا سا موڑنا ہے یہ ریلوے کی پٹڑی جو ہے لائن اس میں آپ کو نظر آئے گا یہ ذرا سا مڑنا جو ہوتا ہے' وہ جو ایک ریل چلی جا رہی ہوتی ہے اور راستے میں جہاں وہ کانٹا موڑتا ہے وہ ایک انچ کا بھی فاصلہ نہیں ہوتا اور یجنل لائن سے اس کا' ذرا سا فاصلہ ہوتا ہے۔ اب اس پٹڑی کے اوپر جب یہ پڑتی ہے تو جتنی تیزی سے یہ گاڑی دوڑتی چلی جاتی ہے' اتنا ہی زیادہ اصل راستے سے اس کا فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور دو چار گھنٹے کے بعد اندر بیٹھا ہوا مسافر جس نے مثلاً یہاں سے پشاور جانا تھا' باہر جھانک کے دیکھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ جھنگ کا صدر آ گیا یا لائلپور آ گیا۔ یہ ہوتا کیا ہے؟ اسے کہتے ہیں يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا(11:19) کہ بس ذرا سا ادھر ہو جانا'

تھوڑا سا اس میں پیچ پیدا کر دینا۔ یہ جو اسی مذہب کے اندر آپ دیکھتے ہیں' مختلف فرقے بن جاتے ہیں' مختلف مسلک اختیار کر لیتے ہیں' بحثیں ہوتی ہیں' مناظرے ہوتے ہیں یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ صراطِ مستقیم سے ذرا ذرا سے راستے انہوں نے ہٹائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہی نام' وہی اسلام' وہی دین' اسی کتاب کے ماننے والے' اس کتاب کی تلاوت کرنے والے' حفظ کرنے والے' دہرائے چلے جانے والے' پتہ نہیں کتنی اشاعت اس کتاب کی ہو رہی ہے' کتنا نام بلند ہو رہا ہے۔ لیکن وہ جو صراطِ مستقیم ہے اس سے کج دار راہیں جو ہیں وہ اختیار کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور پھر صورت یہ ہوتی ہے کہ جو شخص انہیں صحیح راستے کی طرف دعوت دے یا بلائے یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (11:19) لوگ اگر آنا چاہیں صحیح راستے کی طرف تو ان کے راستے میں روک بن کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآنِ کریم میں یہ جو مذہبی پیشوائیت ہے اس کے متعلق عجیب انداز میں یہ بات کہی ہے کہ غیر محسوس طور پہ وہ صراطِ مستقیم یا صحیح پٹڑی سے ذرا سا یوں کر دیتے ہیں اور اس کے بعد اگر لوگ پھر اصلی راستے پہ آنا چاہیں تو ان کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ہر نبی جو پہلے آتا رہا اور وہ خدا کا اصلی دین پیش کرتا رہا تو اس کی سب سے پہلے مخالفت جو کی تو دو گروہوں نے کی' ایک سرمایہ پرست گروہ نے ایک مذہبی پیشوائیت نے۔ اور اس نے کہا کہ یہ بھی درحقیقت ان کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے ایک کے بغیر دوسرا چل نہیں سکتا۔ یہی ہیں سارے قرآن میں آپ دیکھئے گا قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ جہاں جہاں آتا ہے' ابھی آتی ہے وہ آیت بھی۔ تکنیک ان کی کیا ہوتی ہے؟

مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ پرستی کے باہمی گٹھ جوڑ کی تکنیک کا نتیجہ

یہ کوئی الگ نام نہیں رکھتے' کوئی الگ کتاب نہیں پیش کرتے' الگ دین کے مدعی نہیں ہوتے' نبوت کے مدعی نہیں ہوتے۔ لیکن انسانوں کی وضع کردہ شریعت' انسانوں کی بنائی ہوئی فقہیں' روایات ان چیزوں کو وہ پیش کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے یہ ہیں هٰـذَا مِـنْ عِنْـدِ اللّٰهِ (2:79) یہی ہے خدا کی شریعت' یہی ہے خدا کا دین اسلام یہی ہے۔ اور اگر کوئی دعوت دے یا لوگ آنا چاہیں اس صحیح راستے کی طرف کبھی کہ بھئی کتاب اللہ میں تو یہ چیز ہے یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰـهِ (11:19) اس کے راستے میں روک بن کے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ۔ یہ ہیں جن کے لیے کہا کہ یہ ہے وہ افتراء علی اللہ کہ جس فریب میں بڑی جلدی آ جاتا ہے آدمی۔ ایک شخص اعلانیہ اگر دعویٰ کرتا ہے کہ نہیں صاحب اسلام چلا ہوا کارتوس ہے' اب ختم ہو گیا اس کا دور یہ کلینڈر تھا' ڈائری تھی' ایک نیا دین پیش کرتا ہے آپ دیکھیں گے کہ اس کے فریب میں نہیں کوئی آتا۔ لیکن ایک شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نہیں میں مسلمان ہوں' اسلام پہ ہوں رسول اللہ ﷺ کا ہی متبع ہوں' اسی قرآن کو مانتا ہوں اسی اسلام کو جانتا ہوں' اور اس کے بعد ذرا سی ٹیڑھ اس میں پیدا کر کے غیر محسوس طور پہ اس گاڑی کا کانٹا بدل کے دوسری پٹڑی کے جب وہ ڈال دیتا ہے' اس فریب میں آ جاتا ہے انسان۔ یہ ہے وہ افتراء علی اللہ جہاں جس کے متعلق کہا کہ وَ

مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ (29:68) اپنی طرف سے یہ چیز کہے جھوٹ اور اسے کہے کہ یہ خدا کا دین ہے خدا کی شریعت ہے۔

مذہب ہمیشہ دین خداوندی کی پیش کردہ اصطلاحات کی بنیاد پر ہی مغالطہ آفرینی کرتا ہے

عزیزانِ من! ایک چیز کو بنیادی طور پہ سمجھ لیجیے۔ نہ کسی مغالطہ آفرینی کی گنجائش رہے گی' نہ غلطی کھا جانے کا کوئی امکان ہوگا اور وہ یہ کہ دین قرآنِ کریم کے اندر آ کے مکمل ہو گیا ہوا ہے' غیر متبدل ہے اور صحیح اور غلط' جائز اور ناجائز' اسلامی اور غیر اسلامی کی حجت' سند اور معیار یہ قرآنِ کریم ہے جو خدا کی کتاب ہے۔ کسی کا کوئی قول جو اس کے مطابق جاتا ہے' اسے ہم سچا اور صحیح مان لیتے ہیں۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے' اس کی نسبت کسی طرف کیوں نہ کر دی جائے ہم کہیں گے کہ یہ غلط ہے۔ یہ چیز اگر راستے میں آپ کے آ جائے اور یہ معیار آپ قائم کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ پھر صراطِ مستقیم کے اوپر آپ چل پڑیں گے۔ لیکن معیار اگر یہ نہ رہے تو پھر تو مغالطہ آفرینیوں کے بھی مقامات بہت سے ہیں اور غلطیاں کھا جانے کا بھی امکان بڑا ہوتا ہے انسان کے پاس۔ پھر دین مذہب کے اندر تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہی نام' وہی اسلام' وہی شعائر بظاہر وہی ارکان اس کے' وہی کلمات' وہی الفاظ سب کچھ۔ لیکن ذرا سی ٹیڑھ اس میں پیدا ہوئی ہوتی ہے۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا (11:19) بس ذرا سی ٹیڑھ یوں ہوتی ہے باقی سب کچھ وہی رہنے دیتے ہیں وہ لوگ۔ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ (11:18)۔ کہا جاتا ہے۔

قرآن حکیم مکافاتِ عمل کے نتائج کو سمجھانے کا ایک تمثیلی انداز اختیار کرتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم جب وہ مکافاتِ عمل کے متعلق گفتگو کرتا ہے' اُسے خدا کے سامنے آنا اس سے بھی تعبیر کرتا ہے۔ وہ سمجھانے کے لیے نقشہ ایسا ہی دیتا ہے جیسے عدالت ہوتی ہے۔ عدالت ہے اس میں جج ہیں' ملزم لایا جاتا ہے (قرآن کے الفاظ ہیں یہ) ہتھکڑیاں پہنے ہوئے' سپاہی آگے سے کھینچ رہا ہوتا ہے' پیچھے بھی اس کے ایک محافظ کھڑا ہوتا ہے۔ پھر گواہ بلائے جاتے ہیں' پھر ریکارڈ طلب کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو مدافعت کا موقع دیا جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ قرآنِ کریم بیان کرتا ہے بات سمجھانے کے لیے ورنہ یہ صورت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں میز کرسی لگا کے عدالت کی کرسی پہ بیٹھے ہوئے مجسم طور پر ہوں گے۔ اس کے سامنے یہ لوگ اس طرح سے آئیں گے جو کہا گیا ہے۔ وہ تو قرآن کے دیگر مقامات میں آپ دیکھیں گے تو وہاں وہ بات صاف کرتا ہے کہ یہ تو ہر شخص کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں لپٹا ہوا ہوتا ہے' وہاں کھل کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ (17:14) یہ اپنا اعمال نامہ آپ ہی پڑھ لے اور آج تیرے خلاف کسی اور کی گواہی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تیرا اپنا نفس تیرے خلاف خود بڑی شہادت

ہے صاحب۔ تو بات تو کچھ ایسی ہے وہ لیکن سمجھانے کے لیے قرآن کریم نے انداز ایسا اختیار کیا ہے جیسے عدالت کا ہوتا ہے۔ تو انہی الفاظ میں وہ کہتا ہے جب یہ خدا کے سامنے آئیں گے۔ یہ لِقَآءِ رب کا بھی قرآن کریم میں آیا ہے خدا کے سامنے آنا' آمنے سامنے کھڑا ہونا' ملاقات ہونا۔ وہاں جب یہ سامنے آئیں گے وَ یَقُوْلُ الْاَشْھَادُ ھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّھِمْ (11:18) اور پھر گواہ یہ کہیں گے کہ یہ ہیں وہ کہ جنہوں نے خدا کے خلاف جھوٹ باندھا تھا' جھوٹ باتیں خدا کی طرف منسوب کی تھیں۔ اشہاد کہیں گے۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ تو میں نے عرض کیا ہے نا کہ یہ بات تمثیلی انداز میں سمجھانے کا انداز ہے قرآن کا۔ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (11:18) یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ہر شے کو اس کے صحیح مقام سے اٹھا کے' دوسری جگہ رکھ دیا تھا۔ یہ ظلم کے بنیادی معنی ہیں نا قرآن کی رو سے۔ عجیب چیز ہے دین کو جب مذہب میں تبدیل کر دیا جاتا ہے تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے۔

مکافاتِ عمل پر یقین رکھنے اور نہ رکھنے والوں کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ وہ لوگ ہیں کہ جو خدا کے اس راستے کی طرف آنے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں وَ یَبْغُوْنَھَا عِوَجًا (11:19) اور اس میں ٹیڑھ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وَ ھُمْ بِالْاٰخِرَةِ ھُمْ كٰفِرُوْنَ (11:19) یہ ہیں وہ لوگ اصل میں جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے عملاً انکار کرتے ہیں۔ زبان سے تو لاکھ بار یہ قیامت اور قیامت اور جہنم اور دوزخ اور حشر اور نشر اور میزان یہ سب کچھ کہتے رہیں گے۔ کہا یہ ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں کہ جو دل سے اس بات کو مانتے نہیں ہیں ورنہ مکافاتِ عمل کا ماننے والا تو عزیزانِ من! کبھی یہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ جو شخص یہ مانتا ہے کہ خدا نگاہ کی خیانتوں اور دل کے خیالات تک سے واقف ہے (یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے (40:19)) جو یہ مانتا ہے انسان کے دل میں گذرنے والا غلط خیال بھی ایک نتیجہ پیدا کر کے رہے گا' وہ اس قسم کی حرکتیں کر ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ لوگ جو ہیں یہ آخرت کے منکر ہوتے ہیں اگرچہ زبان سے دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ پہلے ہی پارے میں یہ چیز آئی ہے ناوَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (2:8) یہ وہ لوگ ہیں کہ جو زبان سے ہزار مرتبہ کہیں گے کہ ہم اللہ پہ ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن یہ ایمان والے نہیں ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یقولون کے بعد یہ کہا کہ یہ مومن نہیں ہیں' کہتے ہیں زبان سے۔ یہاں بھی انہی کے متعلق کہا گیاوَ ھُمْ بِالْاٰخِرَةِ ھُمْ كٰفِرُوْنَ (11:19)۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ یُضٰعَفُ لَھُمُ الْعَذَابُ (11:20)

کہا یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا کا قانون ۔ یہ قرآن میں متعدد مقام میں یہ بات آئی ہے کہ یہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے' اس کے معنی کیا ہوتے ہیں خدا کو عاجز کرنے کے؟ خدا یہ کہتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ تباہی ہے' ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ نہیں ہے ۔ اگر انسان قوت جمع کر لے' تدبیریں کر لے' بساطِ سیاست کے اوپر مہرے ٹھیک ٹھیک مقام کے اوپر رکھ دے' اپنی حفاظت کے لیے سارے سامان کر دے تو پھر جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے مقصد کے حصول کا' وہ بالکل صحیح ہوتا ہے "Means are justified by the ends acheived" ۔اور پھر وہ دیکھتا ہے کہ دیکھ لیجیے کہ کتنے کتنے یہ لوگ سب کچھ کرتے ہیں اوراس کے باوجود کتنے کامیاب ہیں۔

خدا کو عاجز کرنے کا مفہوم

تو گویا خدا نے یہ کہا تھا کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتے' یہ تباہ ہونگے' وہ یہ کہتا ہے کہ دیکھئے کس قدر کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں تو علی الرغم خدا کے سامنے یہ آئے نا۔ یہ جہاں جہاں خدا یہ کہتا ہے نا کہ یہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے' اسے مغلوب نہیں کر سکتے' اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا نے جو بتایا ہے کہ فلاں بات کا نتیجہ یہ ہوگا' وہ نہ ہو۔ یہ اس کے خلاف نتیجہ پیدا کر ہی نہیں سکتے ۔اس نے اگر یہ کہا ہے کہ اتنی مقدار میں سنکھیا کھا لینے سے ہلاکت ہو جاتی ہے' ہزار وعظ وہ کہتا رہے کہ اس سے نہیں ہوتی' بالکل نہیں ہوتی صاحب' اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ دیکھ لو تم ان کا یہ کہنا خدا کے قانون کو جھوٹا ثابت نہیں کر سکتا۔ یہ ہے وہ چیز جہاں وہ کہتا ہے کہ خدا کو یہ عاجز نہیں کر سکتے۔

قوانین خداوندی کے اٹل ہونے والے غیر متبدل اصول کی ایک عملی مثال

اور پھر یہ چیز بھی ہے کہ جہاں بھی کوئی گروہ' کوئی جماعت' کوئی پارٹی' کوئی قوم خدا کے قوانین کو لے کر اٹھے گی' خدا نے یہ کہا ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ناکام رہ جائے ۔خدا اپنے متعلق یہ کہتا ہے کہ مجھ پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ میں اس کو غالب کروں (58:21)۔ وہ قانون اتنے اٹل ہیں' اس کے خلاف آپ جو جی میں آئے کیجئے' وہ اپنے نتائج مرتب کر کے رہتے ہیں۔طبعی زندگی کے اندر تو ہم روز یہ چیز دیکھتے ہیں جیسا کہ اکثر میں بتایا کرتا ہوں کہ آگ کا کام حرارت بہم پہنچانا ہے۔ آپ لاکھ وعظ کیجیے کہ نہیں صاحب یہ آگ جو ہے حرارت نہیں پہنچاتی' سوال ہی نہیں ہے۔ جب بھی عملاً آپ آئیں گے آگ کے پاس' آپ دیکھیں گے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔خدا کے قوانین اٹل ہوتے ہیں' ان کے خلاف جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں' وہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔اور اس تباہی کے وقت یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ خدا کے قانون کو چھوڑ کے کوئی اور قوانین اختیار کریں اور سمجھ لیں کہ وہ ہمیں بچا لیں گے۔ یہ مطلب ہوتا ہے مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ (11:20) سرپرست بچانے والا' رفیق حمایتی خدا کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے کوئی نقصان پہنچا ہے' اس نقصان کی تلافی اسی صورت میں ہوگی کہ اسی کے بتائے ہوئے قوانین کی طرف پھر رجوع کرو' اسے توبہ کہتے ہیں۔

دہرے عذاب میں مبتلا ہونے والوں کی وجہ جواز اوران کی غلط سوچ

یہ لوگ یہ مذہبی پیشوائیت، مفتری علی اللہ جو ہیں یہ جو کچھ کرتے ہیں یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ (11:20) ان کو دہرا عذاب ملتا ہے، دہری سزائیں ان کو ملتی ہیں۔ دوسرے مقام پہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے ہر شخص اپنا اپنا ہی بوجھ اپنی پیٹھ پہ لاد کر ہمارے سامنے آئے گا۔لیکن یہ کچھ لوگ ایسے بھی ہونگے کہ ان کی پشت پر دہرا، دہرا بوجھ لدا ہوا ہوگا، ایک ان کے اپنے غلط اعمال کا اور ایک ان لوگوں کے غلط اعمال کا جنہیں ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا (16:25)۔ بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ ہونا ہی چاہیے۔گمراہ کرنے والا جو ہے اس کی تو بہت بڑی ذمہ داری بڑھتی ہے۔ یہ ہے یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ (11:20) یہ دہری سزا جو ملتی ہے۔ یہ اس بناء پہ ملتی ہے کہ خود غلط چلے اور پھر دوسروں کو غلط راستے پہ چلایا اور جو یہاں کہا گیا ہے کہ جو صحیح راستے پہ آنا چاہتے تھے ان کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو گئے۔

حمیتِ دینی اور غیرت اسلام پر گالیاں دینے کی بجائے دوسروں کی سننے کی تڑپ پیدا کرنی ہوگی

کہاان لوگوں کی صورت یہ ہوجاتی ہے مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (11:20) کیفیت ان کے غصے کی ان کی کیفیت اندر کی مخالفت کی، اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی بات کا سننا برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ یہ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ (11:20) عجیب چیز ہے، برداشت ہی نہیں ان میں رہتی۔ آپ دیکھیں گے اس چیز کا نام انہوں نے حمیتِ دینی رکھا ہوا ہوتا ہے یعنی کسی کی بات ہی نہ سننا۔ بات کیجیے تو صاحب منہ میں جھاگ آ رہی ہے، آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے ہیں اور گالیاں دی جا رہی ہیں اور اس کے بعد تو اب قتل تک بھی نوبتیں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ سارا کچھ ہو رہا ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ حمیتِ دینی ہے، غیرتِ اسلام کا تقاضا ہے یہ، کیا تقاضا ہے؟ گالیاں دی جائیں کسی کی بات نہ سنی جائے، منہ میں جھاگ آ رہی ہو، پاگل ہو رہا ہو، قتل کر دیا جائے، خنجر گھونپ دیا جائے۔ کہتا ہے یہ انداز تو نہیں ہے نا صحیح بات کے منوانے کا، نہ اس بات کے لیے پرکھنے کا کہ جو ہم کہتے ہیں، وہ صحیح ہے۔ جو یہ کہتا ہے یہ غلط ہے۔ اس میں تو برداشت چاہیے، یہ بڑی ضروری چیز ہے، کہتا ہے او سننے کی تاب تو رکھو کم از کم، سن تو لو اگلا کیا کہتا ہے۔ آپ دیکھیں گے یہ سننے کے لیے تیار بھی نہیں ہوتے۔ اور قرآن تو رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (73:10) جو کچھ یہ کہتے ہیں، ہمیں پتہ ہے گالیوں تک اتر آتے ہیں، مخالفت میں یہاں تک پہنچ جاتے ہیں لیکن تمہیں بڑے استقامت سے کام لینا ہوگا۔ ضبط کا دامن تو وہ چھوڑے جو جھوٹ پر ہو۔ ٹھیک ہے جو یہ کہتے ہیں آرام سے سنیے، کہیے ان سے یہ کہ صاحب میری بھی بات سن لیجیے، اگر یہ سننے کی تاب ہی نہیں رکھتے اور اس حد تک مخالفت پر اتر آتے ہیں وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73:10) تو ٹھیک ہے انہیں چھوڑ دے۔

قرآنی اقدار کو تسلیم کرنے والوں کا حسنِ کردار

لیکن کئی دفعہ یہ بات آئی ہے قرآن کی یہ بات عجیب بات ہے صاحب، چھوڑ دے لیکن چھوڑ بھی بڑے حسین انداز سے چھوڑ۔ کیا بات ہے صاحب۔ کسی سے تعلق پیدا کرنے کے لیے یہ کہنا کہ بڑے ہی حسن کارانہ انداز سے تعلق پیدا کرو، یہ بات تو ہماری سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ بات کہنا کہ چھوڑنا بھی ہے کسی کو تو حسن کارانہ انداز سے چھوڑو، شرافت اور انسانیت کے تقاضوں کے ساتھ چھوڑو کسی کو۔ یہ خدا ہی کہہ سکتا تھا، قرآن تو یہ کہتا ہے۔ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (11:20) سامنے کھلی ہوئی بات ہے، آنکھیں بند کی ہوئی ہیں صاحب، جی ہم دیکھنا ہی نہیں چاہتے، ہم سننا ہی نہیں چاہتے ایسی بات۔ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے پھر۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (11:21) بڑی عجیب چیز قرآنِ کریم کہتا ہے بڑی بلندیوں پہ پہنچ کے ایک بات کرتا ہے۔

بغیر کسی محنت کیے دنیاوی متاع حاصل کرنے والوں کا ذکر

ٹھیک ہے غلط راستے اختیار کرنے سے دنیاوی متاع بھی حاصل ہوتی ہے بڑے متاع حاصل ہوتے ہیں، مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھئے مذہبی پیشوائیت کو ہی اگر آپ دیکھ لیجیے تو یعنی یہ اپنے لیے ایک وقت کی روٹی کمانے کا بھی کوئی ہنر نہیں رکھتے، ٹھاٹھ سے گذرتی ہے ساری عمر۔ اور آگے بڑھتے ہیں اگر یہ روحانیت والے جو ہیں تو ان کی کیفیت یہ ہے کہ سب کچھ لا کے ڈھیر کر رہے ہیں، ساتھ پاؤں کے اوپر سر بھی رکھا جا رہا ہے۔ گھٹنے بھی چومے جا رہے ہیں صاحب عقیدت مندوں کی کیفیت یہ ہے۔ استبدادِ ملوکیت کی طرف آیئے تو حکومتوں کی کیفیت یہ ہے کہ ظلم اور استبداد کی بناء کے اوپر سب کچھ حاصل ہوتا ہے ان کو۔ غلط کار لوگوں کو دیکھئے تو Over-night Millionaire بنے ہوئے نظر آتے ہیں، لاکھوں میں کھیل رہے ہیں، سب کچھ حاصل ہو رہا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ بڑے گھاٹے میں جا رہے ہیں۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں تو ان کا بیلنس بڑھتا چلا جا رہا ہے، کسی وقت جا کے بینک سے پوچھ لیجیے، آپ کہتے ہیں گھاٹے میں چلے جا رہے ہیں، تو یہ گھاٹا کہاں ان کو پڑ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے بس یہی نگاہ کا پھیر ہے کہ تم نے اپنی زندگی کو یہی طبعی زندگی (Physical Life) یہی سمجھ لیا ہے۔ جو چیزیں مادی طور پہ حاصل ہوتی ہیں، ان کو ہی متاع سمجھ لیا ہے، وہی مفاد سمجھ لیا ہے۔ یہ چیزیں جو گن کے تم بتا رہے ہیں، بیلنس اور یہ محلات اور یہ قوتیں اور یہ طاقتیں، کہا کہ یہ ہیں جو منفعت بخش چیزیں ہیں، یہ معیار قائم کیا اور بتا دیا دیکھو ہم کتنے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس سطح تک تو حیوانی زندگی ہے انسان کی، کوتل گھوڑا تو ان سے بھی زیادہ اچھا ہوتا ہے کوتل وہ ہوتا ہے جو صرف اصطبل میں بندھا رہتا ہے، کام کاج بھی اس سے کوئی نہیں لیا جاتا، بہترین طور پر اس کو خوراک دی

جاتی ہے' درشنی بنایا جاتا ہے اس کو' جلوس میں صرف نکالا جاتا ہے' بڑی شان ہوتی ہے اس کی' ہوتا تو حیوان ہی ہے نا۔

دنیاوی مفاد کو انسانی ذات کی نشوونما کے ترازو میں نہیں تولا جاتا

قرآن نے کہا ہے کہ حیوانی سطحِ زندگی کے اوپر یہ ٹھیک ہے لیکن انسانیت کی بھی تو ایک زندگی ہے اور اسی کا نام وہ انسانی ذات یا Human Personality یا نفس رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں ضروری ہیں' یہ دنیاوی مفادات کی جو تم کہہ رہے ہو لیکن اصل فائدہ اور نقصان جو ہے یہ دیکھئے کہ جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اس کے فائدے کی بھی یہ چیز ہے یا اس کے نقصان کی چیز ہے۔ ٹھیک ہے چوری کا گھی یا حرام کے پیسوں سے اچھی خوراک کھانے سے جسم تو تمہارا فربہ ہو جائے گا' تندرستی بھی مل جائے گی' پہلوان بھی بن جاؤ گے۔ سوال یہ ہے کہ حرام کھانے سے کوئی نقصان بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ اِن کے نزدیک تو نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے ایک نقصان ہوتا ہے کہ اس سے انسان کی انسانیت اس کی'

قرآن حکیم کے نزدیک اس طبعی زندگی کے مقابلے میں جہاں فردا کی اہمیت

ذات اس کی' نفس اس کی' خودی اس کی' Personality وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ کہتا یہ ہے کہ سوچ رکھو یہ سارا کچھ جو تم نے حاصل کیا طبعی زندگی کا حیوانی زندگی کا۔ اس کی تو ایک مدت ہے پچاس سال' ستر سال' اسی سال' سو سال ایک سو پچیس تک بھی پہنچاتے ہیں کہ صاحب وہ فلاں آدمی اتنی لمبی عمر اس نے پائی۔ یہ تو ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک آگے چیز چلے گی وہ کہ جس کو ہم نے انسانی ذات کہا ہے جسے تم ''میں'' کہہ کے پکارتے ہو۔ عجیب الفاظ ہیں قرآن کے (فردا) جہاں وہ کہتا ہے تم آؤ گے' اس نے کہا ہے کہ یہ جتنی چیزیں جنہیں تم میری کہتے' ہو وہ ساری یہاں رہ جائیں گی اور جو ''میں'' ہے وہ آئے گا آگے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جنہیں تم میری کہتے تھے وہ تو بہت کچھ اکٹھا ہو جاتا ہے' بڑے فائدے کی چیزیں ہیں' میری دولت' میری قوت' میرے مکان' میری زمینیں' میرے بینک بیلنسز' میری طاقت سب کچھ۔ لیکن اس کے بعد آگے تو وہ میں چلتی ہے' سوال یہ ہے کہ اس ''میں'' کے فائدے کی باتیں ہوئیں یا ''میں'' کے نقصان کی چیز ہوئی۔ ہر وہ بات کہ جس میں 'میں' نقصان کے اندر رہی' وہ تباہی ہے اس لیے کہ اس نے آگے چلنا ہے۔ یہ ہے بنیاد اسلام کی' دین کی عزیزانِ من! یہ ہے جسے ایمان بالآخرت کہا ہے۔ ابھی یہ کہا تھا نا کہ یہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے' ٹھیک ہے اپنی اس روش سے متاعِ حیات تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسانی ذات جو ہے اس کی کیفیت کیا رہی۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَھُمۡ (11:21) یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی ذات گھاٹے میں رہی۔ طبعی زندگی کے تو مفاد حاصل ہو گئے' جن کی ذات گھاٹے میں رہی۔ اور یہ ہے عجیب چیز۔ لَا جَرَمَ اَنَّھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ھُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ (11:22)

حضرت انسان کی طبعی زندگی اوراس کی ذات کی باہمی قدر ومنزلت کے فرق کی نوعیت

اور یہ دیکھو کہ سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ ہے جس کی ذات گھاٹے میں رہے۔ یہ اخسرون یہاں لا کے عجیب چیز کہی ہے کہ موازنہ ہی تم نے کرنا ہے نفع اور نقصان کا تو پھر اس معیار کو سامنے رکھ لو کہ جس کی ذات گھاٹے میں رہتی ہے وہ سب سے زیادہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ اگر چہ طبعی مفاد کے اعتبار سے وہ سب سے زیادہ نفع میں ہو لیکن اگر ذات گھاٹے میں رہ گئی ہے انسان کی انسان کی ''میں'' گھاٹے میں رہ گئی ہے اگر اسے نقصان پہنچ گیا ہے تو یہ سب سے بڑا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

انسانی اعمال کے پرکھنے کا معیاراور حدوداللہ کی قدروقیمت

عزیزانِ من! قرآن کی رو سے انسانی اعمال کے پرکھنے کا معیار یہ اس نے دیا ہے کہ یہ سب کچھ حاصل ہو وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) صرف یہ زمین ہی نہیں یہ آسمانی کرے بھی تمہارے لیے تابع تسخیر ہم نے بنا دیے ہوئے ہیں، سب کو مسخر کرو مومن کی یہ شان ہے۔ لیکن اس سب کچھ کرنے کے بعد دیکھو یہ کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جس سے تمہاری ذات کو نقصان پہنچے۔ اوراب یہ جو چیز قرآن نے کہی ہے نا جسے حدوداللہ کہتے ہیں، پابندیاں عائد کی ہیں، اس نے حدیں کچھ مقرر کی ہیں، بعض چیزوں کو ناجائز قرار دیا ہے بعض کے متعلق کہا ہے ہم پسند نہیں کرتے بعض کو کہا ہے یہ حرام ہے۔ یہ سب وہ ہیں کہ جن کے کرنے سے انسان کی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور جن کو اس نے اعمالِ صالحہ کہا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی ذات میں صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے آگے چلنے کی۔ معیار ہی یہ ہے کسی کام کے صحیح یا غلط ہونے کا۔ یہ قرآن کا پروگرام دہری چیز دیتا ہے اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) اس کے نظام سے اس دنیا کی ساری خوشگواریاں، سرفرازیاں عزت دولت حشمت، سب کچھ ملتا ہے۔ پہلا معیار یہ ہے کہ یہ اگر نہیں ملا ہوا تو قرآن کہتا ہے سمجھ لو کہ ہم دین کے اوپر نہیں ہیں۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ یہی نہ بات ہو کہ یہ مل گیا تو سمجھ لیا کہ ہم دین کے اوپر ہیں اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ اس میں کوئی کام ایسا نہ ہو کہ جو قرآن کی بتائی ہوئی حدود کی خلاف ورزی کر رہا ہو کیونکہ اس سے انسانی ذات کو نقصان پہنچے گا۔ اور اخسرون وہ ہیں، سب سے زیادہ نقصان میں وہ ہیں کہ جنہوں نے یہ متاع تو ساری حاصل کیں لیکن ان کی Human Personality قرآن کے الفاظ میں Disintegrate ہوگئی۔

قرآن حکیم کے نزدیک Human Personality کا معیار

بڑے عجیب الفاظ ہیں قرآن کے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (91:8) کیا عرض کیا جائے قرآن عزیزانِ من! چودہ سوسال پہلے بات کرتا ہے آج کے دور کی آپ کے ہاں کی سائیکولوجی جو ہے عجیب بات ہے کہ یہ سائیکولوجسٹ جو ہیں انہوں نے ایک ٹرم اپنے

ہاں دی ہے Human Personality کے متعلق "Integrated Personality" وہ کہتے ہیں کہ جو Balanced ہوتی ہے نشوونما یافتہ ہوتی ہے ان کے نقطہ نگاہ سے سہی۔ اور جو اس کے خلاف ہوتی ہے اسے وہ Disintegrated کہتے ہیں' منتشر ہوئی۔ قرآنِ کریم چودہ سوسال پیشتر یہ کہتا ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (91:7-8) کہ انسانی ذات غیر نشوونما حالت میں ملتی ہے اس کے اندر صلاحیت رکھ دی جاتی ہے اس چیز کی بھی کہ وہ Disintegrate ہو جائے اور اس چیز کی بھی کہ وہ Disintegration سے بچ جائے۔ لفظ ہے یہ فجور کا لفظ' فجر کے معنی Disintegrate ہونا ہیں۔ اصطلاح وہ آج استعمال ہو رہی ہے عزیزانِ من! غیر شعوری طور پہ ہی سہی۔ آپ دیکھتے ہیں جو قرآن نے کہا تھا کہ جب بھی علمِ انسانی کسی حقیقت تک پہنچے گا تو قرآن کے کسی دعوے کی شہادت بن جائے گا۔ میں کہتا ہوں آج کی اصطلاحیں اگر آپ دیکھتے ہیں تو قرآن کے دعوؤں کی شہادت بنتی جا رہی ہیں۔

قدرت نے انسان کے اندر تعمیری اور تخریبی دونوں صلاحیتیں باہمی اصولوں کے تحت عطا کر رکھی ہیں

جس دن میں نے دیکھا ان کے ہاں کہ انہوں Disintegrated Personality کہا ہے صاحب پوچھئے نہیں' نگاہوں کے سامنے چمک پیدا ہوگئی کہ کیا بات ہے قرآن کی!! ۔فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (91:8) اس میں دونوں چیزیں ہیں ہم نے رکھ دی ہوئیں ۔ دونوں چیزیں اس کے اندر ہیں لیکن وہ Potential حالت میں ہیں الھم کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ Potential حالت کے اندر رکھی ہیں Potentialities ہیں یہ اس کے اندر کی' دونوں شکلیں یہ اختیار کر سکتی ہے۔ اب اس کو Actualize کرنا جو ہے یہ ہے انسان کا کام۔ اس کے لیے قرآن پروگرام دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نفع اور نقصان کو کسی میزان کو تولنا ہے تم نے تو یہ یاد رکھو کہ سب سے زیادہ نقصان والا وہ ہے جس کی ذات نقصان میں رہی ہے هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (11:22)۔ ایک طرف تو یہ لوگ ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (11:23)

قرآن حکیم نے انسانی ذات میں صحیح توازن پیدا کرنے والے اعمال کو اعمال حسنہ یا اعمالِ صالحہ سے تعبیر کیا ہے

ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں کہ جو اس نظامِ حیات کی بنیادوں پر' اصولوں پر' اساسات پر یقینِ محکم رکھتے ہیں کہ یہی صحیح راستہ ہے اور پھر وہ کام کرتے ہیں جو ان کی ذات میں صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں ہی چیزیں ہیں اس میں صلح کا لفظ جو ہے یہ دنیاوی معاملات کا سنور جانا یا ہمواریاں پیدا ہو جانا' یہ اصل میں ہے عربوں کا تصور جو تھا۔ یہ بھی اس کے اندر آتا ہے اور انسانی ذات کے اندر

بیلنس پیدا ہو جاتا ہے وہ بھی اس کے اندر آ جاتا ہے یہ ایک ہی لفظ جامع ہے ان کے ہاں کا۔ اور اسی لیے قرآن نے جہاں کہا ہے عملوا الصّٰلحٰت کہا ہے یا اعمالِ حسنہ کہا ہے۔ یہ لفظ بھی عربی زبان کا جو مادہ ح س ن کا ہے اس کے معنی ہیں صحیح Proportion لیے ہوئے۔ جسے حسنات کہا جاتا ہے وہ یا تو اعمالِ صالحہ کہتا ہے یا اعمالِ حسنہ کہتا ہے ان کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ انسانی ذات کے اندر کی صلاحیتیں جو ہیں Potential جو ہے ان کے اندر ان Potentialities کو Actualize کر دینے والا اور یا حسنات ہیں کہ جو ان میں صحیح Proportion پیدا کر دیں۔ کہتا ہے کہ وہ لوگ جو ان قوانین کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے بعد پھر پروگرام ایسا Adopt کرتے ہیں یہاں، ایسے کام کرتے ہیں یہاں جس سے یہ ان کی خارجی دنیا کے اندر کی ناہمواریاں بھی مٹ جاتی ہیں اور ان کی ذات بھی حسن کارانہ انداز سے صلاحیت یافتہ ہو جاتی ہے۔ یوں یہ معنی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ اَخۡبَتُوۡۤا اِلٰی رَبِّهِمۡ (11:23)

بوقت نماز رکوع اور سجود کی اہمیت کے پیش نظر اس کی حقیقی عملی شکل وصورت کی وضاحت

پہلی چیز تو آ گئی یہ ایمان لائے۔ اَخۡبَتُوۡۤا اِلٰی رَبِّهِمۡ (11:23) اس کے معنی ہوتا ہے جھکا دینا اپنے آپ کو کسی کے حکم کے سامنے، کسی صداقت کے سامنے، کسی دعوے کے سامنے۔ یہ جھکا دینا اور سر اٹھا دینا جو ہے یہ علامات ہیں بعض چیزوں کی۔ جب آپ سے کوئی کہتا ہے کہ صاحب آپ وہاں آئیں گے آپ زبان سے کچھ نہیں کہتے اور سر ہلا دیتے ہیں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ اور جب آپ کہتے ہیں کہ بات صاف ہو جاتی ہے زبان سے کہے بغیر، یہی چیزیں ہیں زبان کے اندر جس کو جھک جانا کہتے ہیں۔ جس کو سر اٹھا دینا کہتے ہیں، سرکشی کے معنی ہوتا ہے یوں سر اٹھا دینا۔ سرِ تسلیم خم کرنا، یہ جھک جانا لفظ ہوتا ہے۔ جھکاؤ یہ صرف یہی نہیں جھکاؤ ہوتا یہ تو علامات ہیں اس جھکاؤ کی، اس نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور اگر سرِ تسلیم تو خم ہو اور کرے وہ جو اپنی مرضی میں ہے اس کے خلاف، یہ وہ رکوع و سجود ہے جو ہم کر آتے ہیں مسجدوں کے اندر عزیزانِ من! کھڑے ہو کر مسجد میں خانۂ خدا میں باوضو قبلے کی طرف منہ کر کے، پہلے دعویٰ یہ کرتے ہیں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی کی محکومی اختیار نہیں کرتے۔ کس قدر مقدس ہے یہ اعلان اور اعتراف عزیزانِ من! اس حالت میں کھڑے ہو کے۔ عام مساجد میں نہیں، خانہ کعبہ کے سامنے بھی کھڑے ہو کے لاکھوں کی تعداد میں یہ اعلان کرتے ہیں اِیَّاکَ تیرے سوا کسی اور کا حکم ہم نہیں مانتے، صرف تیری محکومی اختیار کرتے ہیں۔ یہ کرنے کے بعد Automatically غیر شعوری طور پہ انسان کا سر جھکے گا نا جب یہ اقرار کرے گا۔ یہ جو اس کے بعد فوراً رکوع میں چلے جاتے ہیں، یہ علامت ہے اس چیز کی، اسے Parallalism کہتے ہیں فلسفہ کے اندر کہ دل میں جو خیال پیدا ہو طبعی جسم کی علامت سے اس کا اظہار صاف ہوتا ہے۔ یہ جو ہوتا ہے دل کے اندر، آپ نہ کر رہے ہیں نا اور یوں کر رہے ہیں، فیصلہ کرتے ہیں ناہاں کا اور یوں کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ جو ہے کہ صرف تیرے سامنے جھکتے ہیں کسی کے سامنے

نہیں، کسی اور کی محکومی اختیار نہیں کرتے ہیں' جھک جاتا ہے انسان' اسے رکوع کہتے ہیں۔ یہ ابھی ابتدائی جھکنا ہے اور اس کے بعد انتہائی طور پہ وہ ہوتا ہے جس کو آپ سجدہ کہتے ہیں کاملۃً پھر اس کے سامنے جھک جاتے ہیں آپ۔ اس کی محکومی اختیار کرنے سے ساری دنیا کی جتنی بڑی بڑی قوتیں ہیں ان سے انسان سرکشی اختیار کرتا ہے۔ سرکشی نہ کہہ دیجیے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ایک چوکھٹ کے اوپر سر رکھ دینے سے لاکھوں چوکھٹوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

صدیوں سے لاکھوں کی تعداد میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کے بعد ایاک نعبد کے اعلان کے برعکس ہماری متضاد عملی کا نتیجہ

یہ ہے رکوع اور سجود عزیزانِ من! ان کا جو پہلے اعلان کرتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ' اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) کا اعلان کرتے چلے جانا۔ اللہ اکبر کے بعد رکوع میں بھی اس کے بعد سجود میں بھی اس دوران میں بھی سوچتے یہی رہنا ہے کہ اس کا یہ ماننا ہے' اس کا یہ کرنا ہے' فلاں بزنس میں یہ بات کرنی ہے اس کے دروازے پہ یہ جانا ہے' وہاں سلام کے لیے حاضر ہونا ہے۔ رکوع بھی ہو رہا ہے' سجود بھی ہو رہا ہے ایاک نعبد بھی ہو رہا ہے' سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہی تو ہیں جن کے متعلق کہا تھا کہ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ o الَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنۡ صَلَاتِھِمۡ سَاھُوۡنَ (5-107:4) تباہی ہے ایسے نمازیوں کے اوپر کہ جو ھُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) نماز کی یہ حرکتیں تو پوری وہ کر دیتے ہیں جو نظر آ جاتی ہیں' نماز کا جو مقصد ہے اس کو پسِ پشت ڈالا ہوا ہے انہوں نے۔ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ (11:23) یہ جو چیز ہے کہ جھکتے ہیں خدا کے سامنے' یہ یہ ہے جھکنا اس کے احکام کے سامنے ایاک نعبد وہ کہنے والے ہوتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ (11:23) یہ ہیں جو خوشگواریوں کی زندگی بسر کریں گے اور جب تک ایسا کرتے رہیں گے اس کے احکام کے سامنے جھکتے رہیں گے اس وقت تک یہ زندگی آسائشوں' خوشگواریوں کی رہے گی۔

عربی زبان میں لفظ لعنت کوئی گالی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے محرومی ہے

یہ جو ہے نا ہمیشہ رہیں گے جنت میں' عجیب عجیب پھر سوالات پیدا کیا کرتے ہیں لوگ اس کے بعد۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب تک یہ کیفیت وہ اختیار رکھیں گے' ان سے یہ چیز چھینی نہیں جائے گی۔ جب دیکھو گے ان کو یہ سرفرازیاں حاصل نہیں ہیں تو مت اپنے آپ کو فریب میں رکھو کہ یہ جنتی زندگی ہے۔ سمجھ لو کہ یہ جو چیز پہلے اس نے کہی تھی نا کہ اَلَا لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ (11:18) لعنت

کے معنی یہ گالی نہیں ہے لعنت کا لفظ جو ہے' عربی زبان میں اس کے معنی ہوتا ہے محروم ہو جانا کسی چیز سے۔ وہ زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور جب بھی وہ محرومی ہو تو یہ اپنے آپ کو فریب نہ دے لو کہ ہم خدا کے احکام کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جھکنے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سرفرازیاں حاصل ہوں فِي الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِي الۡاٰخِرَةِ(2:201) اس زندگی میں اور پھر اگلی زندگی کے اندر بھی۔

قندیل آسمانی کے ہاں فکر قرآن کو سمجھانے کا انداز بڑا واضح ہے

دو گروہ سامنے آ گئے ایک تو وہ کہ اپنے جی سے فتوے گھڑتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ قرآن کے علی الرغم اس کے مخالف جاتے ہیں ان کے ہاں کے فتوؤں کے فیصلے اور اس کے باوجود شریعت وہی ہے آپ کے ہاں۔ ایک وہ گروہ ایک دوسرا ہے کہ جو اس کے ان احکام کے سامنے جھکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے متعلق کہا مَثَلُ الۡفَرِيۡقَيۡنِ (11:24) ان دو فریقوں کی' ان دو گروہوں کی مثال یوں سمجھئے جیسے۔ وہ بار بار لوٹا لوٹا کے لاتا ہے مضامین کو قرآن سمجھانے کے لیئے' وہ کہتا ہے تصریفِ آیات سے سمجھاتے ہیں ہم بات کو' بار بار لاتے ہیں۔ مثال یوں سمجھئے كَالۡاَعۡمٰى وَ الۡاَصَمِّ وَ الۡبَصِيۡرِ وَ السَّمِيۡعِ ؕ (11:24) اعمٰی ایک اندھا ہے اور ایک وہ ہے جو بینا ہے دیکھ سکتا ہے' ایک بہرہ ہے اور ایک وہ ہے جو سن سکتا ہے۔ هَلۡ يَسۡتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ (11:24) کہا کیا خیال ہے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ مثال طبعی دے رہا ہے جس سے انکار ہی نہ ہو۔ دنیا میں یہ بھی نہیں کہے گا کہ ہاں صاحب اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوتے ہیں' بہرہ اور سننے والا برابر ہوتے ہیں۔ کہتا ہے برابر ہوتے ہیں؟ کبھی برابر نہیں ہوتے۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (11:24) تو کہا کہ کیا اس کے بعد بھی تمہارے سامنے یہ حقیقت نہیں آ سکتی جو ہم نے بیان کی ہے۔ جب اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے تو پھر جو غلط راستے پہ چل رہا ہے حالانکہ اس موڑ کے اوپر ایک سائن پوسٹ لگا ہوا تھا جس نے بتایا ہوا تھا کہ یہ راستہ صحیح سمت کی طرف جائے گا اور یہ دوسری طرف جائے گا۔ تو اس موڑ کے باوجود جو اس راستے پہ چل رہا ہے کیا اس کا دعویٰ یہ ٹھیک ہے کہ میں آنکھوں والا ہوں۔ اور پھر پیچھے سے پکار کے ایک شخص کہہ رہا ہے کہ میاں غلط راستے پہ مڑ گئے ہو' وہ نہیں جاتا جدھر تم نے جانا ہے اِدھر جاؤ' سنتا ہی نہیں ہے وہ۔ کہا کہ کیا یہ بہرہ نہیں تو اور کیا ہے یہ؟ سننے والا ہے یہ؟ تو کیا یہ دونوں برابر ہو جائیں گے' راستہ دیکھ کر چلنے والا اور جہاں کسی نے ٹوکا اس کی سن لینے والا اور ایک وہ جو آنکھیں بند کر کے چلنے والا اور آوازیں دینے والے کی طرف نگاہ ہی نہیں کرتا ہے وہ' دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ (11:24) اس سے نہیں تم بات سمجھتے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ بات یہاں تک آئی۔

قرآن حکیم نے اپنے حقائق کو سمجھانے کے لیے تین مختلف طریق اختیار کیے ہیں

عزیزانِ من!۔ پھر دہرا دوں جو بات جہاں سے چلی تھی۔ قرآن نے اپنے دعاوی کے سمجھنے کے لیے تین طریقے بتائے تھے: علم کی

رو سے اور بصیرت کی رو سے اس کے حقائق پر غور کرو خالی الذہن ہو کر prejudiced Mind سے نہیں۔ پھر اگر یہ نظام قائم ہے تو اس نظام کے نتائج نکلنے تک انتظار کرو، وہ نتائج خود بتا دیں گے کہ اس کا ہر دعویٰ صحیح ہے۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر اقوامِ سابقہ کی جو تاریخ ہے اس پہ ذرا نگاہ ڈالو وہاں تمہیں کیا نظر آتا ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے کا، حقیقی مفہوم، فلاسفی آف ہسٹری ہے، وقائع نگاری نہیں

میں عرض کر دوں تاریخ کے متعلق قرآنِ کریم نے بڑی اہمیت دی ہے تاریخ کو۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ تاریخ یہی نہیں جسے آپ وقائع نویسی کہتے ہیں۔ فلاں سال میں اکبر تخت پر بیٹھا اور فلاں سال میں فلاں سے اس کی لڑائی ہوئی اور جنگ میں یہاں گیا اور اس کے ساتھ یوں صلح کی، یہ کچھ کیا ایسا اس کا مآل تھا، یہ اس کی بیویاں تھیں اور اس کے بعد فلاں سال میں وہ مر گیا۔ اُس نے کہا یہ وقائع نگاری ہے تاریخ یہ نہیں ہوتی۔ میں عرض کر دوں کہ تاریخ کے متعلق اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں یہ ابنِ خلدون نے اس چیز کو پیش کیا لیکن اس نے تو قرآن سے استنباط کیا تھا، اس کی بات نہیں کر رہا۔ قرآن سے باہر ہیگل نے سب سے پہلے The Philosphy of History بیان کی تھی، تاریخ نہیں بلکہ تاریخ کا فلسفہ۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ تاریخ تو اس چیز کا نام ہم سمجھتے تھے کہ فلاں باب میں یہ بات ہوئی، فلاں باب میں یہ بات ہوئی تو اس کا فلسفہ کیا۔ اس نے یہ چیز کہی تھی کہ نہیں تاریخ کا فلسفہ یہ ہے کہ اس قسم کے حالات جب ہوں تو اس کا نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب کہتے ہیں نا کہ History repeats itself تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ پھر دوبارہ اکبر بادشاہ آئے گا اور پھر وہی سن آ جائے گا اکبر بادشاہ کی تخت نشینی کا اور اس کے بعد پھر وہ اسی طرح سے وہ بیٹھے گا، یہ نہیں Repetition جسے کہتے ہیں Repeat کرتی ہے۔ بلکہ وہ کہتا یہ ہے کہ جب اس قسم کے حالات پیدا ہوں اس قسم کے نظریاتِ زندگی کسی قوم کے آ جائیں تو اس کے نتائج یہ ہوتے ہیں۔ Repeat اس طرح سے کرتی ہے کہ جب اور جہاں بھی اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں گے، یہی نتیجہ نکلے گا۔ اسے وہ کہتا ہے فلاسفی آف ہسٹری۔ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پیشتر یہ بات عزیزانِ من! بتائی، اپنے دعوے کے پرکھنے کے لیے اس نے طریق یہ بتایا ہے کہ تاریخ کو دیکھو، اقوامِ سابقہ کے وقائع کو دیکھو اور وہاں دیکھو کہ جس قوم نے اس قسم کی زندگی اختیار کی، اس کا یہ نتیجہ ہوا۔ جب اور جہاں بھی جو قوم اس قسم کی زندگی اختیار کرے گی اس کا نتیجہ یہ ہو گا، قرآن نے چودہ سو سال پیشتر فلاسفی آف ہسٹری بیان کی آپ کے سامنے۔ ٹھیک ہے ابنِ خلدون نے یہ بات کہی ہے اپنے ہاں تو اس نے تو قرآن سے لی ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ انسانی علم بھی ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد جب صداقت، یہ حقیقت پہ آتا ہے تو وہ وہی بات ہوتی ہے کہ جو یہ حقیقت والا کہہ گیا ہے کیونکہ یہ تو علیم و خبیر کی کتاب ہے۔ دو باتیں ہمارے سامنے آ گئیں۔ اب وہ یہ کہتا ہے کہ اگر یہ

بات نہیں تو پھر تیسری بات کی طرف آ جایئے تاریخ کی طرف آ جایئے۔

قرآن حکیم میں تاریخی واقعات کو بیان کرنے کا مقصد اٹل حقائق کو سامنے لانا ہے اور اسی کو نذیر یعنی آ گاہ کرنا کہتے ہیں

میں عرض کروں کہ قرآنِ کریم اپنے ہاں پھر تاریخی بیان کرتا ہے۔ یہ جو واقعات ہیں نا اقوامِ سابقہ اور انبیائے گذشتہ کے تو یہ یونہی کہانیاں نہیں ہیں قرآن کی' یہ اپنے دعوے کے ثبوت میں تاریخی سرگذشت پیش کرتا ہے' فلاسفی آف ہسٹری کی بناء پر' خود پیش کرتا ہے۔ اُس نے یہ کہا ہے کہ ہم نے یہ قرآنِ عظیم نازل کیا اور ذکر نازل کیا' وہ کہتا ہے ہم نے اس کے اندر تاریخ بھی نازل کی ہے کیونکہ یہ بڑا اہم طریق ہے کسی دعوے کے نتائج کو پرکھنے کا کہ فلاں قوم نے اس قسم کی زندگی گذاری تھی' اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اٹل حقیقت ہے کہ جب اور جہاں بھی کوئی قوم ایسی زندگی گذارے گی اس کا نتیجہ وہ نکلے گا۔ اسی لیے وہ جب دعوے پیش کرتا ہے تو اس کے بعد آخر میں آ کے پھر وہ کوئی نہ کوئی تاریخی سرگذشت ضرور پیش کر دیتا ہے۔ اور یہاں تک دعاوی پیش کرنے کے بعد وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ (11:25) اب دیکھو تاریخی سرگذشت۔ اور تاریخ میں جو کچھ بھی محفوظ تاریخ نے کیا ہے اس میں جو پہلا ٹکراؤ ہوتا ہے حق و باطل کا وہ حضرتِ نوحؑ کے زمانے کا کہا جاتا ہے وہیں سے۔

حضرت نوح کا پیغام وحی کہ خدا کے سوا کسی کی محکومی اختیار نہ کرو

قرآن شروع کرتا ہے کہتا ہے پہلے دور سے شروع کرو بات۔ نوحؑ کو ہم نے بھیجا اس کی قوم کی طرف' اس نے کہا اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (11:25) میں تمہیں یہ آ گاہ کرنے کے لیے آیا ہوں' واضح طور پر آ گاہ کرنے کے لیے۔ یہ جو کہتے ہیں نا یہ نذیر کا ترجمہ عام طور پر ہمارے ہاں ڈرانا دھمکانا' کہتے ہیں میں تمہیں ڈرانے دھمکانے کے لیے آیا ہوں۔ ڈرانے کی بات نہیں ہے' آ گاہ کرنے کے لیے آیا ہوں کہ جس راستے پہ تم چلے جا رہے ہو یہ راستہ تباہی کی طرف تمہیں لے جائے گا۔ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (11:25) بڑی واضح طور پہ بات کرتا ہوں' مبہم بات نہیں کر رہا نکھار کر ابھار کر دکھا دیتا ہوں۔ اور خود لفظِ ہدایت کے معنی ہوتے ہیں ابھری ہوئی چیز جو سامنے آ جائے۔ اس نے کہا ہے کہ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (11:25) ہوں آ گاہ کرنے کے لیے آیا ہوں کہ یہ تمہاری یہ جو روش ہے یہ تباہ کن روش ہے۔ عزیزانِ من! سنیئے گا کہ تاریخ کے ریکارڈ میں پہلے نبی نے اپنی قوم سے پہلی دفعہ جو دعوت آتی ہے خدا کی' کیا کہا تھا' کیا بات کہی تھی' کونسی روش ہے تمہاری جو تمہیں لے جائے گی تباہیوں کی طرف۔ اس تک آنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے قرآن نے کہا ہے کہ حضرتِ نوحؑ سے لے کے رسول اللہ ﷺ تک ہر نبی کو دین ایک ہی دیا گیا تھا' دین کی اساس' دین کی بنیاد جو تھی وہ ایک ہی تھی۔ ہر نبی جو آتا ہے قرآن میں آپ دیکھئے گا وہ

اس قوم میں جو خاص طور پہ خرابی ہوتی ہے جس کی اصلاح کے لیے وہ آتا ہے' اس کو تو بعد میں بیان کرتا ہے پہلے دین کی اساس اور اصول بیان کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ (11:26) خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ ہر نبی آ کے یہ پہلی بات اس نے کہی۔ اصل میں بنیاد ہی یہ ہے۔ اور اگر آپ دیکھیں تو وہ 'ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں' اس ایک اصول میں ساری باتیں آ جاتی ہیں۔ کسی اور کی حکومت نہیں' کسی اور کی محکومیت نہیں' کسی اور کی تابعداری نہیں' اطاعت نہیں۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کی پیش کردہ اصطلاحات کا مفہوم ہی بدل دیا گیا ہے

اب وہ آ گئے ناعوجًا والے ذرا سی ٹیڑھ پیدا کرنے کے لیے۔ یہی قرآن پڑھتے ہیں' یہی ایاک نعبد وہ بھی کہتے ہیں۔ عبادت آپ نے دیکھا ہوگا کتنا لفظ دہرایا جاتا ہے۔ کیا کیا اُنہوں نے ذرا سا؟ عبادت کا ترجمہ پرستش کر دیا' خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ اب عبادت گذار آپ ذہن میں رکھ لیجیے نقشہ کیا ہوتا ہے اس کا' ساری رات نفل پڑھتا رہتا ہے۔ پرستش تو ہر حکومت کے تابع ہو جاتی ہے ہر جگہ ہو سکتی ہے' ہر حالت میں ہو سکتی ہے' پرستش کا کیا۔ کیا ٹیسٹ ہے یہ؟۔ اب آپ کے ہاں کا رکوع بھی پرستش' سجدہ بھی پرستش' نماز بھی پرستش حج بھی پرستش۔ آپ نے دیکھا ہے وہ جو میں نے کہا تھا کہ عِوَجًا جو اس نے کہا ہے کہ بس ذرا سا یوں کر دیتے ہیں۔ ذرا سا ہی تو یوں کیا ہے' عبادت کے معنی محکومیت' اس سے ذرا سا یوں کر دیجیے' پرستش پوجا پاٹ' اب ہر جگہ کی پوجا پاٹ جو ہے' ہر جگہ کی خدا کی پرستش کوئی کہے گا تو ٹھیک ہو گیا۔

ابوالکلام کی طرف سے پیش کردہ تصورات کا نتیجہ

اس کے لیے بڑے بڑے دلائل دینے والے ابوالکلام آزاد جیسے لوگ بھی کہ نیک عملی اور خدا پرستی' یہ ہے اصلی دین' خدا کی پرستش۔ اور پھر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ جب خدا کی پرستش اصلِ دین ہے تو جو جس رنگ میں پرستش کرتا ہے خدا کی وہ کرے' بس ٹھیک ہے۔ پرستش معنی ہو گئے نا۔ کیجئے نا قرآن کی رو سے جو اس نے کہا ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ(12:40) عبادت کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اس کے سوا کسی نہیں ہو سکتی۔ اب آیئے نا اس معنی کے بعد پھر کیجیے کہ صاحب ہر حکومت میں' ہر ایک کی محکومی میں' ہر ایک کی غلامی میں عبادت ہو سکتی ہے' ہو کیسے سکتی ہے۔ ارے محکومی تو ایک ہی کی اختیار کی جا سکتی ہے۔ ایک وقت میں دو کی محکومی اختیار ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ پاکستان میں رہتے ہوئے پاکستان کے آئین کی محکومی اختیار کریں اور افغانستان کے آئین کی بھی اختیار کر لیں' یہ تو شرک ہے۔ لیکن پرستش تو عزیزانِ من! ہر جگہ ہر ایک کر سکتا ہے' پاکستان میں رہتے ہوئے سارے اپنی اپنی قوم والے' اپنی اپنی جگہ پرستش کرتے پھرتے ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جسے قرآن نے کہا تھا ناعِوَجًا وہ دیکھئے ذرا سی یوں تھوڑی سی مروڑی جاتی ہے۔ ہر نبی نے

آ کے یہ خدا کا پیغام دیا اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) پہلی بات یہ سن لیجیے خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت نہیں اختیار کی جائے گی' اُس کی اختیار کی جائے گی۔اس لیے کہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ صاحبِ اقتدار خدا کے سوا کوئی نہیں' پہلی بات یہ۔اِنِّىٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَـوْمٍ اَلِيْـمٍ (11:26)اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اطاعتیں اور احکام کی اور قوانین کی کر رہے ہو' کہو میں ڈرتا ہوں کہ تم پہ خطرناک ایک تباہی آنے والی ہے۔بات آ رہی تھی میں نے یہ کہا کہ ہر نبی آتا ہے اساس اور اصول تو دین کا وہ دیتا ہے اور جو اس قوم میں خاص طور پہ ایک بہت بڑا بھاری جرم ہوتا ہے' جرمِ عظیم بنیادی جرم اس قوم کا' وہ اس کو پوائنٹ آؤٹ کرتا ہے۔یعنی یہ نہیں کہ وہ اتنی سی بات کہنے کے لیے آتا ہے' اُسے نمایاں طور پر ذکر اس کا کرتا ہے' اس کی اصلاح چاہتا ہے کیونکہ وہ تو تباہی کی طرف لے جا رہی ہوتی ہے۔اور قرآن بھی نمایاں طور پر اسی کا ذکر کرتا ہے باقی تفاصیل نہیں دیتا وہ۔بنیادی طور پر تو یہ کہہ دیتا ہے کہ ہر رسول نے یہ کہا اور اس کے بعد اس رسول نے اپنی قوم کے اندر جو بنیادی جرمِ عظیم تھا اس کی اصلاح کے لیے جو کیا تھا' اُسے بیان کرتا ہے۔دیکھئے پہلے نبی کی پہلی قوم کی طرف جو کہا ہے وہ جرمِ عظیم کیا تھا جس کی طرف حضرتِ نوحؑ آئے' پہلی چیز سنیے۔فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ (11:27)

حضرت نوح کا مقصد اپنے دور میں نظام سرمایہ داری کی لعنت کو ختم کرنا تھا

قوم کے سرمایہ دار طبقے نے اس سے کہا' مَلَاَ کے معنی ہوتے ہیں جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں' یہ کھانے پینے کی چیزوں سے۔''اے اوہ ہوندے نا او پنجابی اچ جنوں کیندے جدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے' اے سیانے ہون دا معیار ہونداا اے کوٹھی دے دانے۔تلسی داس غریب دی کوئی نہ پوچھے بات''اس کی بات ہی نہیں کوئی سنتا۔فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ (11:27) ''او جناں دیا کوٹھیاں اچ دانے سن'' یہ پنجابی میں ترجمہ ہو جائے گا اس کا' ٹھیٹھ ترجمہ ہے عزیزانِ من! مَلَاَ کا عربی زبان میں' اس کے معنی ہی ہیں جن کے برتن بھرے ہوئے ہوں۔''جناں دیاں کوٹھیاں اچ دانے سن نا'' وہ سب سے پہلے آئے سامنے اُنہوں نے آ کے مخالفت کی۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ یہ کہنے کے لیے آئے تھے کہ بھئی خدا کی پرستش کیا کرو تو یہ جن کے گھر دانے بھرے ہوئے تھے ان کو اس سے کیا چڑ پیدا ہو گئی کہ مخالفت کے لیے آ گئے۔کبھی آپ نے دیکھا ہے یہاں سے بڑے سے بڑا سرمایہ دار لاکھوں پتی کروڑ پتی وہ کسی مُلا سے کہے کہ صاحب تم یہ نماز کے لیے کیوں بلاتے ہو یا نماز کیوں پڑھتے ہو۔سوال ہی نہیں ہے۔کبھی کسی ہندو سیٹھ نے یہاں یہ نہیں کہا تھا۔یہ کیا بات ہو گئی کہ انہوں نے آ کے دعوت دی' اگر ان کے الفاظ میں کہا جائے کہ خدا کی پرستش کرو اور وہ نکل آئیں وہ لوگ جن کے گھر میں دانے بھرے ہوئے تھے۔

حضرت نوح کی طرف سے دی گئی دعوت کی سب سے زیادہ مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوئی تھی

وہاں جن کو آپ سردار یا سرمایہ دار کہتے ہیں وہ ان کے انہوں نے مخالفت شروع کی۔ تو بات کچھ ایسی تھی نا جس سے ان کی رگ دبتی تھی' ان کا پانی مرتا تھا۔ بات تھی ہی یہ عزیزانِ من! خدا کی عبودیت اور محکومیت میں پہلی چیز یہ ہو' وہاں یہ ہوتا ہی نہیں ہے کہ ''کسے دی کوٹھی اچ تے دانے ہون تے کسے دا چولہا جیہڑا ہیگا اے اوہدے اچ اگ وی نہ ہووے' جے دانے ہیگے نیں تے ہر ایک دی کوٹھی اچ ہیگے نیں تے' جس دن نئیں ہیگے' کسے دے نئیں ہیگے''۔ وہ یہ کہنے کے لیے آتے تھے۔ جو یہ کہنے کے لیے آئے گا سب سے پہلے یہ کوٹھی والے آئیں گے اس کے سامنے اس کی مخالفت کرنے کے لیے۔ یہ اٹھے تھے' دلیل کیا دی؟ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (11:27) پہلی چیز تو یہ ہے کہ تم آ گئے بڑے کہیں سے ہمیں سمجھانے والے' کونسی زیادہ بات ہے تم میں' ہمارے جیسے ایک انسان ہو۔ پہلا تصور تو وہ کہ جو یہ کہے کہ خدا کا حکم یہ ہے' میں خدا کی طرف سے یہ کہنے کے لیے آیا ہوں' اُسے عام انسانوں جیسا انسان نہیں ہونا چاہیئے' کوئی مافوق الفطرت کوئی بات ہونی چاہیئے' فوق البشر اس کو ہونا چاہیے۔ وہ جو ذہنوں کے اندر ہے کہ معجزے کچھ دکھاؤ۔ وہ آسمان سے یہ نکال کے بتاؤ' اوپر سے فرشتے اتریں' یوں ہاتھ کرو تو وہ پانی جم جائے۔ درخت کے اوپر سیب لٹک رہے ہوں یعنی اس قسم کی کوئی چیزیں کر کے دکھاؤ پتہ بھی چلے کہ تم کوئی بڑے آدمی ہو۔

نوح کی قوم کا مطالبہ معجزہ طلبی کا تھا

عزیزانِ من! آپ دیکھیں گے ہر نبی کے متعلق یہ چیز قرآن کہتا ہے۔ تو یہ نظر آتا ہے نا کہ وہ نبی کوئی اس قسم کی فوق البشر باتیں کرنے کے لیے نہیں آتے تھے' یہ چیزیں نہیں دکھاتے تھے اور نہ ہی اس قسم کی چیز کسی کے قول کی شہادت بن سکتی ہے۔ تم کسی سے کہتے ہو کہ صاحب تم جھوٹ بولتے ہو' کہتا ہے جھوٹ کیسے بولتا ہوں دیکھو! میں اپنے بالوں میں سے دودھ کے قطرے نکال کے دکھا دیتا ہوں۔ اگر وہ دکھا بھی دے اس کا اُس کے ساتھ تعلق کیا ہے اس بات سے کہ تم جھوٹ بات کہتے ہو' کیا یہ دودھ کے قطرے نکلنے سے جھوٹی بات سچی ہو جائے گی اس کی۔ یہ معیار ہی غلط ہے۔ اسی لیے قرآن ہر جگہ اس کی تردید کرتا ہے کہ غلط ہے۔ لیکن وہ جو جہالت کا زمانہ تھا اور وہ جہالت کا زمانہ اسی قسم کا' آج بھی جو شخص ننگ دھڑنگ کسی درخت کے نیچے بیٹھا ہوا' بالوں میں سے دودھ نکال دیتا ہے آپ دیکھئے اس کے گرد کس طرح سے صبح سے شام تک بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک طرف قرآن کا درس ہو رہا ہو دوسری طرف یہ نظر آ رہا ہو کہ باہر ایک شخص کھڑا ہوا ہے وہ منہ سے فوہ کرتا ہے تو آگ نکلتی ہے۔ دیکھیں گے بھاگ کے چلے جائیں گے لوگ وہاں۔ عجوبہ پرستی انسان کے اندر ہے' بچہ ہے نا ابھی ذہنی طور پہ' تو بچہ جیسا ڈگڈگی کے اوپر جاتا ہے نا' انسان کا ذہن بھی اس ڈگڈگی پہ جاتا ہے۔ تو یہ پہلے دن سے یہ بات چلی آ رہی تھی انسان کی۔ اس نے کہا کہ ہمارا جیسا انسان اور آ کے لگا کہنے یہ کہ خدا یہ کہتا ہے' پہلی بات۔ اور یہ ہے۔

آج بھی انسانیت کے معیار کو دولت کے ترازو میں ہی تولا جاتا ہے

اگلی چیز عزیزانِ من! کہا دوسری چیز یہ ہے کہ ہم تمہارے ہاں کیسے آجائیں' تمہاری جماعت میں کیسے شامل ہو جائیں۔ اب یہ بڑا طبقہ اونچا دولت مندوں کا طبقہ' سردارانِ قوم جو تھے۔ اس زمانے میں دولت ہی معیار تھی' وہی سردار بنتے تھے اور اس زمانے میں کیا عزیزانِ من! آج بھی وہی معیار ہے سردار بن ہی وہی سکتا ہے ''جیہدی کوٹھی اچ دانے ہوندے نیں''۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم تمہارے پاس آ کے بیٹھیں کیسے' تمہاری جماعت میں کیسے شامل ہوں۔ وَ مَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیۡنَ ھُمۡ اَرَاذِلُنَا (11:27) اور تیری جماعت میں تو وہ لوگ ہیں جو ہمارے نزدیک یہ کنجڑے سے' کمینے سے'' کامی ساڈے جیہڑے ہیگے نیں' اے جولاہے' تے موچی' تے درکھان' 'اس قسم کے آدمی ہیں تمہاری جماعت کے اندر تو' ہم آ کے وہیں ان کے ساتھ بیٹھیں۔

پہلے نبی کی پہلی آواز طبقاتی تقسیم کو انسانیت کے خلاف قرار دینا تھا

کیا کہہ گیا ہے قرآن!! جسے آپ طبقاتی تفریق آج کہتے ہیں' بڑی بات کہی ہے صاحب ان لوگوں نے کہ طبقاتی تفریق ہم مٹائیں گے' پہلے نبی کی پہلی قوم کی طرف سے یہ بات آتی ہے کہ تو آیا ہے یہ دعوت دینے کے لیے۔ اب دیکھا کہ وہ جو تھے جن کی کوٹھی میں دانے تھے بھرے ہوئے' وہ مخالفت کے لیے کیوں نکلے تھے؟ یہ مساواتِ انسانیہ سکھانے کے لیے آیا تھا نبی۔ اس نے کہا تھا کہ دولت معیارِ عزت نہیں ہو سکتا' یہ تھا نا پہلا اصول جو دینے کے لیے آیا تھا پہلا نبیؑ' پہلی قوم نے اس کے خلاف یہ کہا اور تیرے ساتھی جتنے بھی ہم دیکھ رہے ہیں' نچلے طبقے کے لوگ ہیں' اَرَاذِلُنَا جس کو کہتے ہیں' ہم میں سے جو نچلے طبقے کے لوگ ہیں وہ ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں۔ باقی رہا یہ کہ یہ تمہارے ساتھی ہو گئے ہیں انہوں نے تمہاری بات مان لی ہے تو یہ معیار کیا ہو سکتا ہے اس بات کا' ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ یہ چھوٹے طبقے کے جو لوگ ہیں ان کی عقل فکر کیا ہوتی ہے بَادِیَ الرَّاۡیِ ۚ (11:27) ان کا کیا ہے ان کی رائے ہی کوئی نہیں ہوتی۔ کیا بات ہے صاحب!!۔ ''ویکھیا جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے''۔ رائے تو ہماری رائے ہے نا' ٹھیک ہے جی۔ پہلے دن یہ بات آ رہی ہے پہلی چیز یہ کہ تم کہنے والے ہمیں کیا آ گئے' کوئی مافوق الفطرت بات تمہارے پاس ہے؟ ہمارے جیسا ایک انسان۔ آج بھی یہی کچھ کہا جا رہا ہے' حضرت صاحب کی بات سننے کے قابل ہے۔ اگلی بات یہ ہو جاتی ہے صاحب کہ تمہارے پاس جو آئے ہوئے ہیں' وہ پست طبقے کے لوگ ہیں' ہم ان کے ساتھ آ کے نہیں بیٹھ سکتے۔ اعتراض سنا ہے۔ اور یہ چیز کہ وہ تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں تو یہ کیا ثبوت ہے تمہاری صداقت کا' ان کی رائے ہوتی ہے کوئی؟ بَادِیَ الرَّاۡیِ (11:27) سطحی رائے ان لوگوں کی' ان کا کیا ہے صائب رائے ہماری رائے ہے۔ وَ مَا نَرٰی لَکُمۡ عَلَیۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۭ (11:27) یہ پوری جماعت بھی تمہاری ہم اکٹھی کر لیں تو ہمارے مقابلے میں

کوئی معاشی فضیلت ہی تمہیں حاصل نہیں ہے۔ یاد رکھئے قرآنِ کریم فضل کہتا ہے یہ دنیاوی معیشت جو ہوتی ہے اس کو۔ کونسی بات ہے تمہارے ہاں' انفرادی حیثیت سے بہ صورت' جماعتی حیثیت سے بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں کوئی معاشی فضیلت تمہیں حاصل نہیں ہے صاحب۔ وہ ہاں اگر یہ امیروں کی جماعت ہوتی تو ٹھیک ہے آ جاتے ہم۔ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ (11:27) دیکھئے دلائل ملاحظہ فرمایئے۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو اپنے دعوے کے اندر۔ ہاں صاحب تمہارے پاس دولت ہے' تمہارے گھر میں کھانے کو ہے' قوم کے سردار ہو' صحیح بات ہے صاحب' تمہاری بات' بات ہوگی سننے کی۔ ان کی بات سننے کے قابل نہیں ہے' یہ یہاں کی بات نہیں ہے عزیزانِ من! آپ آگے آئیں گے تو میں بتاؤں گا ہر جگہ جہاں کسی رسول نے آ کے یہ بات کہی۔

فرعون اپنے دربار میں حضرت موسیٰ اور ہارون سے مخاطب ہے

فرعون کے دربار میں حضرتِ موسیٰؑ اور ہارونؑ جا رہے ہیں' وہ جا کے ایک بات کہتے ہیں کہ ہم تمہیں بتانے کے لیے آئے ہیں کہ یہ جو تمہارا طریق ہے اس استبداد کا' یہ غرق کر دے گا تمہیں' تباہ ہو جاؤ گے۔ فرعون ان سے کہتا ہے اپنے اِدھر اُدھر کے درباریوں سے کہ کیا کہہ رہے ہو یہ آ گئے' ہمیں یہ سمجھانے کے لیے۔ وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) دیکھئے صاحب عٰبدین کا لفظ یہاں آ رہا ہے قرآن میں۔ اِن کی بات ہم سنیں اور یہ تو اس قوم کے لوگ ہیں جو ہماری محکوم ہے' ہماری محکوم قوم کے افراد اور ہمیں آ کے بتانے لگ گئے' ذرا دیکھئے ان کا مزاج شریف' ان کی جرأتیں ملاحظہ فرماؤ۔ یعنی کیا بات ہے۔ قَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) اور ٹھیک ہے عزیزانِ من! محکوم قوم کی دنیا میں کوئی رائے نہیں ہوتی۔ وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) یہ نہیں بات کہ یہ بات کیا کہہ رہے ہیں وہ سنا جائے' کہنے لگے ہم ان کی بات سنیں کیسے صاحب' ہماری محکوم قوم کے افراد اور ہم سے آ کے لگے ہیں وعظ کہنے کے لیے' نکال دو ان کو یہاں سے۔ وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ تمہاری جماعت' ہمارے معاشرے کے پست درجے کے لوگ تمہارے ساتھ یہ ہو گئے' ہم نہیں آ کے بیٹھنے کے تمہارے پاس۔ باقی یہ تمہارے ساتھ ہو جانا ان کی رائے' کوئی رائے ہوتی ہے' لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔ ہاں بڑے بڑے دولت مند تھے وہ تمہارے ساتھ آتے پھر ہم سمجھتے ان کی رائے کچھ رائے بھی ہوتی ہے پھر کوئی بات بھی ہوتی کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو' تمہاری پارٹی ان لوگوں پر مشتمل ہے۔ اور پھر یہ بھی نظر آتا ہے کہ اس دعوت کے اوپر سب سے پہلے لبیک کہنے والے وہی ہوتے ہیں معاشرے میں جن کو پست بنا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بھی میرا لفظ نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے ساتھ فرعون کا سلوک استبدادی حربوں کا ترجمان تھا

قرآن نے یہ کہا ہوا ہے بنی اسرائیل کے لیے کہ فرعون کرتا کیا تھا اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (28:5) وہ ایسی تدبیریں کرتا تھا کہ

ان کو کمزور بنا رکھے۔ ورنہ پست اور اعلیٰ تو درجے بنے ہوئے نہیں آتے عزیزانِ من! یہ تو ہندوؤں کے ورن میں ہوتا ہے کہ پیدائشی ایک شودر ہوتا ہے' ایک برہمن ہوتا ہے۔ خدا کی پیدائش تو یہ نہیں ہوتی وہ تو وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) کہتا ہے وہ تو' ہر بچہ پیدائش کے اعتبار سے انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ لہٰذا پیدائشی طور پہ تو نہ کوئی پست ہوتا ہے نہ کوئی بلند ہوتا ہے۔ اسۡتُضۡعِفُوۡا (28:5) استبداد کرتا یہ ہے کہ ایک طبقے کو اپنی استبدادی حربوں سے پست بنا رکھتا ہے' ایک طبقے کو اوپر چڑھا تا رہتا ہے' فرعون کا تو جرم ہی یہ بتایا تھا قرآن نے کہ وہ کرتا یہ تھا۔ یہی چیز ہے جو پہلے رسول کے خلاف یہ جا رہی ہے' تیرے ساتھی یہ پست طبقے کے لوگ' ان کی رائے' رائے کیا ہے اور یہ جماعت' جماعت کیا ہے' ہم ان کے ساتھ مل کے بیٹھ جائیں۔ یہ تھا عزیزانِ من! پہلی دعوت اور اس کے بعد پہلا اعتراض اور اس اعتراض کا جواب یہ آئندہ سہی کیونکہ اب وقت ہوگیا۔ سورۃ ہود کی آیت 27 تک ہم آ گئے 28 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

پانچواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 28 تا 37)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احترام انسانیت۔قرآن حکیم کا من جانب اللہ ہونے کا ثبوت

عزیزانِ من! آج جنوری 1974ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی 28 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

(11:28)

بات پچھلی آیت سے شروع ہوئی تھی اختصاراً اسے دہرا دینے کے بعد آگے بات سمجھ میں آئے گی۔ حضرتِ نوحؑ سلسلۂ رشد و ہدایت کی اولیں کڑی کی حیثیت سے قرآن میں انہیں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کے متعلق قرآن نے کہا کہ وہی بات جو ہر نبی پہلے آ کے دہراتا تھا، پکار کر کہتا تھا وہ یہ تھی کہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو، یہی پہلی چیز انہوں نے کہی۔ اور اسکے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ جس قوم کی طرف وہ مبعوث ہوتے تھے اس قوم کے اندر نقائص، جرائم، برائیاں مختلف قسم کی ہوتی تھیں لیکن وہ بنیادی خرابی کی طرف سب سے پہلے ان کی توجہ مبذول کرتے تھے۔

وحی کی مکمل تعلیم کے احوال وکوائف میں تمام بنیادی خرابیوں کا ذکر مکمل طور پر کیا جا چکا ہے

قرآنِ کریم بھی بالتصریح جو ذکر کرتا ہے تو ہر نبی کی اس بنیادی تعلیم کا ذکر کرتا ہے جو اس بنیادی خرابی کے ضمن میں اس قوم کو انہوں نے دی تھی۔ اگر آپ انبیائے کرامؑ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان کے احوال وکوائف میں آپ دیکھیں اور یہ جو بنیادی خرابیاں تھیں جن کی طرف انہوں نے توجہ مبذول کی اپنی قوم کی' انہیں آپ اکٹھا کریں تو ایک ایسی فہرست مرتب ہو جاتی ہے جس میں انسانیت کے خلاف بنیادی جرائم پورے کے پورے آ جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر قرآنِ کریم کی طرف آیئے تو وہ ان میں سے ایک ایک خرابی کو لے کر اس کے ازالے کا علاج بتاتا ہے۔ تو اس سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا' یہ بات کچھ پوجا پاٹ کی ہی نہیں ہے بلکہ انسانیت کے خلاف جن جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے قوموں میں جو بنیادی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں یہ آسمانی سلسلۂ رشد وہدایت ان کی اصلاح کے لیے آتا ہے۔

حضرت نوح کی سب سے زیادہ مخالفت کی وجہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد پر دوسروں کو ہیچ تصور کرنا تھا

حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں پہلی بات جو کہی آپ دیکھئے کہ انہوں نے جو تعلیم پیش کی ہے اس کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا جا رہا' یہ نہیں ہے کہ فلاں وجہ کی بناء پر یہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ وہ کسی بحث میں نہیں پڑتے۔ کہا ہے قرآن نے یہ کہ وہ ان میں کا جو کھاتا پیتا طبقہ تھا' جسے وہ مترفین بھی کہہ کر پکارتا ہے' جن کے برتن بھرے ہوئے تھے' جن کے گھروں میں رزق کی فراوانی تھی یہی جنہیں آج کی اصطلاح میں سرمایہ دار طبقہ کہا جاتا ہے۔ وہ مخالفت میں سب سے پہلے آگے بڑھتا ہے۔ ان کی تعلیم کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کرتا' وہ کہتا یہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہارے ساتھ جو لوگ آ کے پہلے ملے ہیں' شامل ہوئے ہیں' تمہاری جماعت جن لوگوں پر مشتمل ہے وہ ہمارے معاشرے کے پست طبقے کے لوگ ہیں' کمینے ہیں' چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے ہیں: نائی دھوبی کنجڑے یہ جیسے ہم آج کی اصطلاح میں کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی آج سے کچھ عرصہ پہلے اور اب بھی گاؤں میں ہمارے ہاں ان لوگوں کو کمین ہی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ ابتداً تو میں سمجھتا ہوں کمی ہو گا کام کرنے والے' تو پھر یہ جو نکمے ہوتے ہیں' دوسروں کی کمائی پہ پلنے والے' وہ تو پھر معتبر بن جاتے ہیں اور یہ جو کمی ہوتا ہے پھر وہ کمین ہو جاتا ہے' پھر وہ کمین ہی کمینہ بن جاتا ہے۔ تو یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے قرآنِ کریم میں سب سے پہلے نبی کی دعوت کا جو ذکر کیا ہے تو وہاں کہا یہ ہے کہ وہ جو کھاتے پیتے لوگ تھے وہ آئے مقابلے میں' مخالفت میں اور کہا کہ بات یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے یہ کمی کمین جتنے بھی ہیں' یہ تمہارے ساتھ آ کے مل گئے ہیں۔ تو اگر ہم آئیں گے تو ہم اور یہ پھر کیا ایک مساوی درجے کے اوپر آ جائیں گے؟ انہیں بھی ہمارے ساتھ برابر میں بیٹھنا ہو گا؟ ہم ان کے ساتھ برابر میں

بیٹھیں گے؟۔ یہ چیز ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔

طبقاتی اونچ نیچ کا تصور تو وحی کے تصور کے ہی خلاف ہے

یعنی ان کی دعوت کے خلاف کوئی دلیل نہیں' علم وبصیرت کی رو سے اس کی تردید نہیں کر رہے' منطقی مخالفت نہیں ہو رہی بات وہ ہے جسے آج آپ طبقاتی تقسیم کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں آنے کو تیار ہیں' ان کو نکال دیجیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو اس داستان میں پہلی کڑی میں جو بات ہوئی ہے آج اس بیسویں صدی میں وہی کڑی آج دہرائی جا رہی ہے۔ اور دوسری بات انہوں نے کہی کہ یہ چیز کہ یہ تمہارے ساتھ آ کے بیٹھ گئے' یہ اس کی کوئی دلیل ہے کہ تمہاری تعلیم' تمہارا یہ نظام بھی بڑا وقیع ہے' قابلِ قدر ہے؟ یہ چھوٹے لوگ جو ہیں کمی کمین ان کی رائے کا اعتبار کیا ہے' یہ یونہی واجبی عقل کے لوگ ہوتے ہیں' عقل تو ان کے پاس ہوتی ہے جن کی کوٹھی میں دانے ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کا مالی طبقات کی بنا پر نفرت کرنے والوں کو جواب

پہلی چیز آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کہا گیا اور بات یہ کہی گئی کہ مَا نَرٰی لَکُمۡ عَلَیۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ (11:27) ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی طور پہ تمہیں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے تم لوگوں کو' مفلسوں کی غریبوں کی ایک جماعت اکٹھی کر لی تم نے اور وہ کہہ رہے ہو کہ ہمارے ساتھ آ و بیٹھ جاؤ' شامل ہو جاؤ۔ اعتراض یہ کیا جا رہا ہے۔ ان کی تعلیم کے خلاف اعتراض نہیں کیا جا رہا ہے' اعتراض یہ کیا جا رہا ہے۔ جواب سنئے۔ میں نے عرض کیا تھا نا پچھلی دفعہ کہ سوال تو ہمارے سامنے ان کا آ گیا ہے جواب آئندہ آیت میں آتا ہے وہ آج جواب ہمارے سامنے آتا ہے۔ قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ اٰتٰىنِیۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِہٖ فَعُمِّیَتۡ عَلَیۡکُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُکُمُوۡہَا وَ اَنۡتُمۡ لَہَا کٰرِہُوۡنَ (11:28)

انہوں نے بات یہ کہی تھی کہ یہ جو تمہارے ساتھی ہیں اس قسم کے کمین لوگ ان کو نکال دو۔ جواب میں کہا جا رہا ہے کہ میں نے ایک بات تم سے کہی۔ سوال یہ ہے کہ علم وبصیرت کی رو سے اس کا کوئی جواب دیجیے کہیے کہ وہ بات قابلِ قبول کیوں نہیں ہے تمہارے نزدیک۔ کہا یہ بات کہ انہیں نکال دیجیے' کہنے لگے یہ کوئی جواب ہے اس بات کا جو میں کہہ رہا ہوں تمہیں۔ کہا کہ ذرا سوچو کہ ایک شخص یا میں علم و بصیرت کے مطابق بات کروں' خدا کی طرف سے مجھے یہ راہنمائی ملے اور تم اندھے ہو جاؤ' تمہیں کچھ یہ دکھائی نہ دے تو پھر کیا صورت ہو۔ یہ اگلی چیز ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں میں زبردستی تمہارے سر نہیں منڈ سکتا' میری دعوت کی یہ صورت نہیں ہے۔ تم تو اپنے مال و دولت کے زور پہ یہ کہتے ہو کہ یہ کمین جو ہیں' یہ چھوٹے طبقے کے جو لوگ ہیں یہ کبھی بھی ان کی بات ایسی نہیں ہو سکتی جو برسرِ توجہ ہو۔ میں تو ایسی بات نہیں کہہ سکتا میں تو جو تمہیں دعوت دیتا ہوں وہ بطیّبِ خاطر تمہیں قبول ہو گی تو قبول کرو' میں زبردستی تمہارے سر تو نہیں منڈ سکتا اس چیز کو۔

کیا قرآن حکیم نے مرتد کی سزا قتل تجویز کی ہے؟

اب یہیں سے یہ ایک بنیادی بات ہمارے سامنے آ گئی' یہ جو روز ہمارے چرچا اٹھتا ہے کہ صاحب مرتد کی سزا قتل ہے یعنی اگر کوئی شخص کسی مذہب پہ یا اسلام پہ رضا مند نہیں رہتا تو اسے اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرلے اگر وہ مذہب تبدیل کرتا ہے تو اسے قتل کر دیا جائے گا یعنی زبردستی اس مذہب کے اندر رکھا جائے گا نا۔ یہ مسلمان' مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے سمجھ لیجیے اور یہ مذہب جو ہمارے ہاں پیش کیا جارہا ہے اگر یہ ان کے علم و بصیرت کے مطابق نہیں ہے' ان کے دل میں ٹھکتا نہیں ہے' ان کا اطمینان اس سے نہیں ہوتا اور کوئی شخص ان میں سے کہتا ہے کہ نہیں صاحب میں تو تمہارے اس پیش کیے ہوئے مذہب کی خرافات کو ماننے کو تیار نہیں جو تم پیش کررہے ہو۔ تو بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ ہم اسے علم و بصیرت کی روسے' دلائل و براہین کی روسے' سمجھائیں گے کہ ہم کیسے صحیح کہتے ہیں' تم کیسے غلط کہتے ہو' اُسے کہیں گے کہ اگر تم نے یہ مذہب تبدیل کرلیا تو تمہیں پھانسی دیدی جائے گی' تمہاری سزا موت ہوگی' تمہیں رہنا پڑے گا۔

اسلام بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کے غلط پروپیگنڈہ کا نتیجہ

سوچیے عزیزانِ من! مذہب بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کے متعلق یہ کہا جائے۔ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں ہمارے ہاں اس کا یہ اقرار کرتے ہیں کہ نہیں صاحب کسی کو زبردستی مسلمان بنایا نہیں جاسکتا۔ جب بھی معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا تو سب سے پہلے یہ کھڑے ہوجاتے ہیں' اس کا انکار کرنے اس کی تردید کرنے کے لیے کہ یہ اسلام کے خلاف' مسلمانوں کے خلاف' بڑا سخت غلط پروپیگنڈہ ہے جو کیا جارہا ہے۔ اسلام تلوار کے زور پہ نہیں پھیلا' مذہب میں زبردستی نہیں ہے' یہ وہاں کہتے ہیں۔ اور دوسری طرف جب کوئی یہ چیز کہتا ہے کہ صاحب یہ مذہب جو تم پیش کررہے ہو' یہ میرے دل کو ٹھکتا نہیں ہے' میں مطمئن نہیں اس سے۔ کہتے ہیں کہ تم مطمئن ہو یا نہیں ہو تمہیں رہنا پڑے گا اس میں' کہتا ہے اگر نہ رہونگا' تو کہتے ہیں کہ تلوار سے تمہارا سر قلم کردیا جائے گا۔ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا نہیں ہے اور تلوار کے زور سے ان کو رکھا جائے گا اس کے اندر۔ آپ سوچیے کہ یہ کیا چیز ہے۔ اور متفقہ طور پر آپ ہمارے ہاں کے یہ تمام فرقے اس پہ متفق ہیں کہ ہاں صاحب مرتد کی سزا قتل ہے۔

اسلام کو قبول کرنے اور اس پر کاربند رہنے کے لیے قلب و دماغ کا یک رنگ ہونا شرط ہے

پہلی دعوت ہے اس میں یہ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے اس نبیؑ کی زبان سے کہ اگر یہ چیزیں تمہیں نظر نہیں آتیں' تم اندھے ہوگئے ہو' اور کیا نہیں نظر آتیں؟ بَيِّـــنَةٍ دلائل و برہان جو میں پیش کررہا ہوں' وحی کی راہنمائی میں جو تمہارے سامنے لا رہا ہوں' اگر تمہیں وہ نظر نہیں

آتیں تو پھر میں زبردستی تو تمہارے گلے ان کو نہیں منڈ تا۔ کتنی صاف بات ہے جو پہلے دن کہی ہے اور یہی چیز ہے جو ہر نبی کہتا ہے' یہی چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ نے کہی لَآ اِکْـرَاهَ فِـی الدِّیْنِ (2:256) قرآن کہتا ہے دین کے معاملے میں زبردستی کی کوئی بات ہی نہیں' یہ تو انسان کے قلب و دماغ کی پوری رضا مندی کے بعد کسی صداقت کو صحیح تسلیم کرنا ہے' زبردستی ایسا کرایا ہی نہیں جا سکتا۔ تو کہا کہ اگر یہ چیز جو ہے فَعُـمِّیَتْ عَلَیْکُمْ (11:28) اگر تمہیں یہ نظر نہ آئے کچھ علم و بصیرت کی دلیلیں جو میں پیش کر رہا ہوں' اگر یہ تمہیں نظر نہ آئے تو میں پھر زبردستی تو کر نہیں سکتا کہ تمہارے گلے منڈ دوں۔ بہر حال میرا کام تو یہی تھا کہ تمہیں یہ بتا دوں کہ جس طریقے پر تم چلے جا رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ کس چیز کا نتیجہ تباہی بتا رہے ہیں؟ یہ کہ تم معاشرے میں عزت اور تکریم کا معیار دولت قرار دے رہے ہو' یہ کسب و ہنر اور جو پیشے ہیں ان کو تم ذلت کا موجب قرار دے رہے ہو۔ یہ بنیادی خرابی ہے۔ کہا کہ یہ تمہیں لے ڈوبے گی یہ چیز۔ اندازہ لگایئے کس زمانے میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ یہ تباہی کا موجب ہے یہ جو تمہارا انداز ہے' یہ نظام جو ہے معاشرے کا یہ تباہی کا موجب ہے۔ اگلی بات وَ یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا ؕ (11:29) یہ بھی بڑی بنیادی چیز ہے ہر نبی یہ دہراتا ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔

نبی کی ذات تو ذاتی مفادات سے ہمیشہ بالاتر ہوتی ہے

کہا ذرا سوچو تو سہی کہ میں نے اپنے دن کا چین رات کا آرام حرام کر رکھا ہے۔ دن رات میں یہ تمہاری اصلاح کے لیے یہ کچھ کر رہا ہوں اور اس کے معاوضے میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگتا۔ تو یہ بات بھی ذرا سوچنے کی ہو سکتی ہے نا کہ بہر حال اس کا کوئی ذاتی مفاد تو اس میں ہے نہیں اپنا' کچھ پرکھو تو سہی اس کی صداقت کو یہ جو کچھ کہتا ہے کیوں کہتا ہے' پاگل تو ہے نہیں۔ اور وہ اس کے بعد تو پھر ان کو پاگل کہا کرتے تھے۔ پاگل وہی ہوتا ہے نا جو اپنے نفع نقصان کا خیال نہ رکھے۔ کہتے ہی ہیں یہ پاگل ہے اس کو اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں ہے۔ ان کے معیار کے مطابق نفع نقصان تو یہ تھا نا کہ یہ شخص اگر اتنا وقت اس میں دیتا ہے' جان کھپاتا ہے' دن رات ایک کرتا ہے تو اس کو کچھ اپنا ذاتی مفاد ہونا چاہیے۔ اور جسے اس میں ذاتی مفاد نہ ہو اور یہ کچھ نہ کرے ان کے نقطۂ نگاہ سے تو واقعی وہ پاگل ہے۔

قوموں کی تعمیر کے لیے اس سنت رسول کو اپنائے بغیر دین مذہب کی شکل میں ایک پیشہ بن کر رہ جاتا ہے

اصل بات یہی ہے کہ جب تک قوموں کے اندر اس قسم کے پاگل اور دیوانے نہ اٹھیں' کبھی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ جس کے سامنے اپنا مفاد آ جائے وہ انسانیت کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا چیزیں بنیادی طور پہ قرآن دے رہا ہے' یہاں پوجا پاٹ کے مسائل نہیں جو وہ بیان کر رہا ہو۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ یہ بھی ایک صداقت کے پرکھنے کی بات ہے کہ ایک شخص کو کوئی اپنا مفاد نہیں ہے ذرا سا بھی' Selfishness کا شائبہ نہیں اس کی بات میں' پرکھ کے دیکھ لو۔ تو پھر تو ذرا سوچنا کہ صاحب دیکھنا چاہیے کہ یہ کیوں کہتا ہے یہ

بات ۔ یہ وجہ ہے جب مذہب آتا ہے تو مذہب پیشہ بن جاتا ہے یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں فوج درفوج یہ مذہبی پیشہ وروں کی موجود ہے' مذہبی پیشوائیت جسے آپ کہتے ہیں' فوج درفوج ۔ ان کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق قریباً پچاس ہزار طالبعلم ان کے ہاں مکتبوں کے اندر تعلیم پاتے ہیں ۔ ان میں سے اگر کوئی دس فیصدی بھی ہر سال فارغ ہو کر نکلتے ہوں تو پانچ ہزار کے قریب اتنے مختصر سے خطے میں ہر سال یہ فارغ التحصیل نکلتے ہیں جو ایک وقت کی روٹی کمانے کا بھی کوئی ڈھنگ نہیں جانتے ۔ اندازہ لگایئے ہر سال جو اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہ فوج درفوج' کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے' پروڈکشن کوئی نہیں کر سکتے' فائدہ کچھ نہیں کر سکتے' تخلیق کچھ نہیں کر سکتے ۔ معاشرے کے اندر یہ لاکھوں کی تعداد کے اندر یہ فوج بیٹھی ہوئی ہے جن کا مدار ہی معاشرے میں' لوگ کمائیں اور ان پہ ان کی روٹی کا دارومدار ہو ۔ سوچئے تو سہی کہ ایسے لوگوں کی بات کا کوئی اثر ہو سکتا ہے ۔ یہاں تو ہماری زندگی کچھ اور قسم کی ہو گئی ہے ۔

دیہات کے اندر امام مسجد کی حیثیت

دیہات کی زندگی میں تو مسجد کا امام جو تھا وہ مردم شماری کے رجسٹر میں کمی جو تھے ان میں ان کا نام ہوتا تھا ۔ جو احباب جانتے ہیں ذرا تھوڑے عرصہ پہلے کی بات ہے' انہیں پتہ ہے کہ یہ جو گاؤں میں کمی گنے جاتے تھے مسجد کا ملاّ کمی گنا جاتا تھا وہاں ۔ اور پھر جس طرح سے وہ گاؤں کے چوہدری کبھی کسی طرف نائی کو بھیج دیا اسی طرح وہ میاں جی کو بھیج دیا کرتے تھے ''جائیں میاں جی اے کم کر آئیں'' ۔ اور پھر ہمارے ہاں شہری زندگی کے اندر بھی محلوں کے اندر محلے کے جو چوہدری ہوتے تھے' یہ مسجد کے امام یہ بالکل ان کے جیسے ذاتی ملازم ہوتے ہیں' یہ کیفیت ان کی ہوتی تھی ۔ اور اب ذرا میں سمجھتا ہوں الفاظ اور پیمانے ہی بدل گئے ہیں اب بھی تو صورت یہی ہے کہ خود کما کے جو نہیں کھانے والے ہوتے' ان کی بات کا اثر ہو ہی نہیں سکتا ۔ یہ ہے بنیادی چیز وہ جو کہہ رہے ہیں پہلا نبیؑ جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے وہ یہ بات کہہ رہا ہے ۔ وَ یٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مَالًا ؕ (11:29) میں تو اس کے معاوضے میں کچھ نہیں مانگتا تم سے ۔ تو خدا کی طرف دعوت دینے والے کی یہ شرط بنیادی کہ وہ اس دعوت کے معاوضے میں کسی سے کچھ نہ مانگے یہ پورے خلوص کے ساتھ یہ کچھ کرے بے غرضی کے ساتھ اور پھر اس بات کا اثر ہوتا ہے ۔ ورنہ جہاں یہ چیز پیشہ بن جائے پھر اس کا اثر نہیں رہتا ۔ تو پہلی بات یہ آئی ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کیا چیزیں آ رہی ہیں ۔ بنیادی طور پہ کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ جو معاشرے کی طبقاتی تقسیم تم نے کر لی اور دولت کو اور مال کو عزت کا معیار قرار دیدیا' بنیادی طور پہ یہ غلط ہے' تباہی پہ چلے جاؤ گے ۔ کہا یہ کہ میں دلائل و براہین پیش کر رہا ہوں تمہارے سامنے تم ان کا جواب علم و بصیرت سے نہیں دے رہے تو میں تمہارے گلے کس طرح سے منڈ سکتا ہوں زبردستی اپنی اس دعوت کو' دوسری بات یہ آ گئی ۔

سنتِ رسول یہ ہے کہ وہ اپنی محنت کا صلہ انسان کی بجائے خدا سے حاصل کرنے کا طلب گار ہوتا ہے

تیسری بات یہ آ گئی کہ میں اس کے معاوضے میں تم سے کچھ مانگتا نہیں ہوں۔ اب یہ جو چیز ہے کہ انسان کچھ نہ مانگے اپنی محنت کے صلے میں' کچھ نہ لینا چاہے یہ نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے (Psychological Imposibility) جس کو کہتے ہیں۔ انسان جو کچھ کرتا ہے چاہتا ہے کہ اس کی محنت کا صلہ ملے۔ یہ آپ کے ہاں کی شاعری میں جو کہا جاتا ہے

وگرنہ ہم خدا ہوتے دلِ بے مدعا پاتے

دلِ بے مدعا ہو ہی نہیں سکتا' کوئی دل جب تک وہ دھڑکتا ہے کوئی نہ کوئی اس کا مدعا ہوتا ہے۔ دلِ بے مدعا کوئی نہیں ہوتا دنیا میں۔ اب یہ جو کہا گیا ان سے کہ میں اس کے معاوضے میں کچھ نہیں مانگتا تو کہا تھا اَسۡـَٔلُكُمۡ (11:29) میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں مانگتا۔ یہ نہیں کہ اس کا معاوضہ میں چاہتا ہی نہیں ہوں محنت کا صلہ نہیں میں چاہتا' تم سے نہیں چاہتا' کس سے چاہتا ہوں؟ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (11:29) اس کا اجر اللہ سے چاہتا ہوں۔ یہ ہے عزیزانِ من! ساری بات۔

مردے کے علاوہ جس کے سینے میں بھی دل ہوگا' اس میں خواہش کا ہونا لازم ہے

دیکھا کہ وہ دلِ بے مدعا والی بات بالکل غلط' وہ تو بدھ مت ہے' یہ تو آپ کے ہاں کا تصوف ہے کہ جو کہے جاتے ہیں کہ مقصد اور آرزو اور تمنا اور خواہش ان کو ترک کرتے جاؤ' ترک کرتے جاؤ۔ جتنا ترک کرتے جاؤ گے' اتنا ہی تم روحانیت میں آگے بڑھتے چلے جاؤ گے حتٰی کہ نروان آ جائے گا جہاں کہ ہر چیز ترک کی جائے گی صاحب کوئی خواہش نہیں رہے گی۔ یہ ساری شاعری ہے' عملی دنیا سے فرار کی راہیں دکھانا ہے Escapism ہے۔ ناممکن ہے کہ انسان کے سینے میں دل ہو اور اس میں کوئی خواہش نہ ہو۔ وہ تصوف میں جو ہم پڑھا کرتے تھے' اس پہ اعتراض بھی بڑا دلچسپ ہوتا تھا کہ ترک کر دو ہر شئے' ترکِ دنیا' ترکِ عقبٰی یعنی ہر چیز ترک' یہ کرو تا کہ کوئی خواہش نہ رہے تمہارے دل میں۔ اعتراض یہ ہوتا تھا کہ صاحب یہ جو چیز ہے کہ میں ترک کرنا چاہتا ہوں' یہ خود خواہش نہیں ہے؟ یہ ترک کرنے کی بھی تو خواہش ہے ایک۔ خواہش کے بغیر کوئی زندہ قلب رہ ہی نہیں سکتا دنیا میں۔ آپ دیکھتے ہیں قرآن ذرا ذرا سی بات میں کیا کچھ کہہ جاتا ہے ورنہ کوئی اور لکھتا تو اتنی سی بات کافی تھی کہ صاحب میں اس کا معاوضہ تم سے کچھ نہیں چاہتا' بس ٹھیک ہے آگے بڑھ جاؤ۔ فوراً یہ بات آئی قرآن میں کہ یہ چیز تو غلط ہے دلِ بے مدعا تو ہو ہی نہیں سکتا' ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم' اقبالؒ تو یہ کہتا ہے کہ ہماری تو زندگی یہ ہے کہ ہم مقاصد کو پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور واقعی زندگی یہ ہے۔ بیکار ہو کے رہ جاتا ہے آدمی' مرنے سے پہلے مر جاتا ہے اگر زندگی میں کوئی مقصد اس کے سامنے باقی نہ رہے۔ اس لیے جہاں یہ کہا کہ میں تم سے کوئی اس کا معاوضہ نہیں چاہتا' فوراً اس کی تردید کر دی

کہ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ یہ نبی روحانیت کے اس بلند مقام پہ ہے جہاں یہ بدھ مت والے صوفیاء پہنچا رہے ہیں کہ دل میں اس کے کوئی آرزو پیدا نہ ہو اس نے کہا یہ بات غلط ہے۔ میرے دل میں بھی آرزو ہے' میں بھی اس کا صلہ چاہتا ہوں صرف فرق یہ ہے کہ تم سے صلہ نہیں مانگتا' خدا سے اس کا صلہ چاہتا ہوں بس یہ بات ہے۔ اب رہا تمہارا یہ مطالبہ کہ جو چھوٹے درجے کے' پست درجے کے لوگ میرے ساتھ آ کے جمع ہو گئے ہیں تمہارے خیال کے مطابق تمہارے معیار کے مطابق' میں انہیں دھتکار دوں۔ کہا وَ مَـآ اَنَـا بِـطَـارِدِ الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا (11:29) میں انہیں دھتکار نہیں سکتا۔ عجیب دلیل دی ہے۔

انسانوں کا اگر وزن کرنا ہو تو انہیں انسانیت کے ترازو میں تولنا ہوگا

کہا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں Accommodate کرنے کی خاطر تمہیں اپنی جماعت میں شامل کرنے کی خاطر' میں ان لوگوں کو دھتکار دوں الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا (11:29) کہ جو عقل و بصیرت کی بطیبِ خاطر بغیر کسی قسم کے ذاتی مفاد کے سامنے رکھنے کے ایمان لے آئے ہیں ان صداقتوں پہ' تمہیں خوش کرنے کی خاطر تمہیں ساتھ ملانے کی خاطر انہیں میں دھتکار دوں۔ کہا یہاں سے دھتکار دوں' چلئے صاحب تم میرے ساتھ مل گئے' ان کے پاس قوت بھی نہیں ہے نکال دیا میں نے ان کو یہ بیچارے غریب آدمی ہیں کیا کر سکتے ہیں۔ اِنَّهُـمْ مُّـلٰقُوْا رَبِّهِمْ (11:29) لیکن کہو کہ جب یہ کل خدا کے سامنے کہیں گے کہ اس شخص نے ہمیں نکال دیا تھا حالانکہ ہم ایمان لائے تھے' میں کیا جواب دونگا وہاں۔ آپ نے سوچا یہ کیوں کہا تھا کہ تم سے میں اجر نہیں مانگتا' اس سے مانگتا ہوں۔ اور جس سے اجر مانگ رہے ہیں پھر خیال بھی اسی کا ہی آ رہا ہے کہ انہوں نے جب اس سے شکایت کی تو وہاں کیا جواب دونگا میں۔ یہ اگلی بات آ گئی ہمارے سامنے عزیزانِ من!۔ اصلاح کے لیے وہی اٹھ سکتا ہے' اس کا ہی اقدام کامیاب ہو سکتا ہے جسے ہر وقت یہ خیال رہے کہ میں خدا کو کیا جواب دونگا۔ بڑی چیز ہے یہ۔ یہ آپ کے ہاں کے بڑے بڑے اصلاحی اقدامات جتنے کرتے ہیں' ایک تو چھوڑ دیجیے کہتے ہیں کہ وہ سیاسی مصلحتیں ہوتی ہیں' نہ بھی ہوں' دیانتداری سے بھی جو قدم اٹھے' وہ بھی آپ دیکھتے ہیں کامیاب نہیں ہوتے' کیا وجہ ہے اسکی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جو چیز ہے کہ میں نے خدا کے سامنے اس کا جوابدہ ہونا ہے۔ یہ بنیاد ہے عزیزانِ من! جسے آپ کہتے ہیں ایمان کی ضرورت کیا ہے' وہ یہ ضرورت ہے Accountable کس کے سامنے ہے انسان۔

زندگی کو آسان اور کامیاب بنانے کا طریق وہ یہ خیال کہ میں نے بھی خدا کو جواب دینا ہے

یہاں آپ کوئی بھی نظام بنالیں' چھوٹے درجے پہ جو ماتحت لوگ حاکمِ اعلیٰ اوپر کے افسران کے جواب دہ ہوتے ہیں' آگے آخر میں چل کے ایک ایسا طبقہ آ جاتا ہے جو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا اور وہیں تو یہ ساری ابتری مچتی ہے جو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں

ہوتا۔ بہترین نظام آپ نے نظامِ جمہوریت دنیا میں قائم کیا ہے۔ اربابِ اقتدار جن کے پاس Executive ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم جواب دہ ہیں پارلیمنٹ کے سامنے (بہت اچھا جناب) اور پارلیمان کے اکیاون نمبر جو بھی فیصلہ کرلیں وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔ یہیں بگڑتی ہے ساری چیز' جو کچھ کل کو کرنا ہوتا ہے' وہ اکیاون آج بیٹھ کے اس کے مطابق ایک فیصلہ کرتے ہیں' اسے کہتے ہیں یہ ملک کا قانون بن گیا' پھر جو کچھ کیا جاتا ہے' کہا جاتا ہے قانوناً کیا جاتا ہے' ازروئے قوانین یہ چیزیں جو ہیں نافذ کی جائیں گی۔ قانون وہاں ہے کہ جو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

ہر قسم کے استبدادی نظام سے محفوظ اور بے خطر رہنے کا طریق

بس جونہی انسان اس مقام پہ پہنچا کہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو پھر دھاندلی میں کوئی چیز رکاوٹ کی نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک فرد ہو جسے آپ ملوکیت کہتے ہیں' جسے فرعونیت کہتے ہیں یا ایک گروہ ہو' فرق کچھ نہیں پڑتا۔ جہاں بھی کسی انسان کو آپ ایسا اختیار دیدیں کہ وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہ رہے پھر استبداد سے کوئی چیز روکنے والی نہیں ہوتی۔ ایمان جسے آپ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ جسے آپ سب سے آخری اتھارٹی یا Sovereign Authority کہتے ہیں قانون کی رو سے وہ بھی کسی کے سامنے جواب دہ ہو۔ قرآنِ کریم نے دو لفظوں میں یہ بات واضح کردی تھی چودہ سو سال پیشتر بلکہ ہزاروں سال پہلے' قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ چیز کہی ہے کہ یاد رکھو کہ ہر انسان سے پوچھا جاسکتا ہے صرف ہم ہیں جن سے پوچھا نہیں جاسکتا (21:23)۔ تو گویا یہ حیثیت اس نے خدا کو دی ہے صرف' کسی انسان کو یہ حیثیت ہی نہیں دی خواہ وہ کسی قسم کا نظام بھی کیوں نہ بنالے کہ اس سے پوچھا نہ جاسکے' مواخذہ نہ کیا جاسکے' باز پرس نہ ہو کوئی نہ ہو اس کی Accountability۔ قرآن جو نظام دیتا ہے اس میں یہ ہے کہ جو آپ کے آئین و قانون کی رو سے بلند ترین شخصیت بھی یا اقتدار جن کے ہاتھ میں ہے' وہ بھی جواب دہ ہیں جسے کہا جاتا ہے خدا کے سامنے جوابدہ ہیں' بس یہ ہے جو نظام ہوتا ہے۔ یہ ہے جو دلیل دی ہے انہوں نے کہ ٹھیک ہے تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ اتنے غریب لوگ' اتنے مفلس لوگ ان کو نکال دینے سے کیا بگڑے گا ہمارا' ہمارا جتھہ بڑا مضبوط ہوگا ہم سارے تمہارے ساتھ آرہے ہیں اتنا بڑا طبقہ امراء کا' صاحبِ اقتدار دولت مندوں کا' سرمایہ داروں کا یہ ساتھ آ گیا۔ یہ جو ہیں یہ آپ کے ہاں کے دھوبی کنجڑے وغیرہ' یہ کیا بگاڑ لیں گے۔ کہا ٹھیک ہے یہ تو بیچارے پوچھ بھی نہیں سکیں گے لیکن تمہارا اور ہمارا جو معاملہ مختلف ہے' تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کچھ نہیں پوچھ سکیں گے تو بالکل ٹھیک ہے اور میں یہ سوچتا ہوں کہ جب یہ کل کو خدا کے سامنے یہ کہیں گے کہ پوچھئے اس سے کہ کس جرم کی پاداش میں ہمیں اس نے نکال دیا تھا' تو میں کیا جواب دونگا۔

ہر آن پندارِ نفس کی زنجیروں میں گرفتار رہنے والا شخص کبھی سکونِ قلب کی لذت سے آشنا ہو ہی نہیں سکتا

وَ لٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (11:29) اب دیکھئے جو میں نے تم سے کہا ہے کہ عقل اور بصیرت کی بنیاد پہ بات نہیں کرتے' دلیل و برہان کوئی پیش نہیں کرتے' تمہارے صرف پندار ہے' صرف پندارِ نفس کہ ہم بڑے لوگ ہیں اس لیے یہ چھوٹے لوگ جو ہیں یہ ہمارے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ تو کہا اب نہ تم علم و دلیل کی بات سنو' دھاندلی یہ مچاؤ تو اس کے بعد سوائے اس کے میں یہ کہوں کہ بڑے جاہل واقع ہوئے ہو تم لوگ' اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ ٹھیک ہے دولت تو تمہارے پاس ہے' اُنہوں نے کہا تھا نا کہ یہ جو تمہارے ساتھ آ جمع ہوئے ہیں ان کی رائے کیا رائے ہے' اِنہوں نے کہا کہ سوال یہ نہیں ہے کہ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ سب سے بڑا عقلمند ہوتا ہے۔ تم دیکھو تو سہی جو میں نے باتیں کی ہیں ان کی رو سے کون جاہل ثابت ہوتا ہے۔ تم ثابت ہوتے ہو یا یہ لوگ جاہل ثابت ہوتے ہیں۔ اگلی چیز پھر وہی آ گئی Accountability۔ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (11:30) پھر میں تمہیں بتاؤں کہ یہ مجھے بتاؤ کہ اگر میں ان کو دھتکار دوں جو بغیر کسی قسم کے ذاتی مفاد اور خود غرضی کے خدا کی طرف آئے ہیں' انہیں میں نکال دوں تو بتاؤ کہ جب یہ خدا کے سامنے یہ کہیں گے تو مجھے کون بچا سکے گا' تم اور تمہاری دولت تو نہیں بچا سکے گی۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سوچتے ہو کہ میں نے کس کے سامنے جواب دینا ہے' وہاں سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

حضرت نوح کے بعد نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی ایک محفل کا ایک ذکر

ضمناً یہ عرض کروں برادرانِ عزیز! کہ یہ بات ہو رہی ہے حضرتِ نوحؑ کی جو اس سلسلۂ رشد و ہدایت کی پہلی کڑی ہیں اور بعینہٖ درمیان کی کڑیاں آپ کے سامنے آتی جائیں گی ایک ایک کر کے' انہیں بھی آپ دیکھئے گا۔ اور میں تو یہ اولیں کڑی کے بعد آخری کڑی کے اوپر آتا ہوں خود نبی اکرم ﷺ سے یہ کہا جا رہا ہے' نظر آتا ہے کہ یہی اعتراض یہاں کے قریش نے بھی کیا تھا' یہاں کے سرمایہ دار اونچے طبقے نے بھی کیا تھا حضور ﷺ کے خلاف کہ یہ جو آپ ﷺ کی جماعت کے ساتھ آ کے مل رہے ہیں کچھ چھوٹے چھوٹے سے غریب لوگ ہیں' بلالؓ حبشی اور صہیب رومیؓ اور یہ لوگ آ گئے ہیں اور ہم بڑے لوگ جو ہیں ہم کس طرح سے تمہارے ساتھ آ کے بیٹھیں ان کو نکال دے۔

مخلص لوگوں کو اپنی محفل سے نکال دینے کے عمل کو بہت بڑا ظلم کہا گیا ہے

تو قرآن نے یہاں کہا ہے وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (6:52) یاد رکھو ان لوگوں کے

اس کہنے پر کہ انہیں نکال دو پھر ہم آتے ہیں' کہیں کان نہ دھر لینا' یہ بڑے مخلص ہیں ان کو اس طرح سے دھتکار کے نہ دور پھینک دینا۔ یہ کیا کاروبار کرتے ہیں' کیا کام کاج کرتے ہیں' اس سے واسطہ نہیں ہے تمہارا' واسطہ تو اس قلب سے ہے' اس دل سے ہے جس کو یہ لے کے تمہارے پاس آئے ہیں اس کی قیمت دیکھو کتنی بڑی ہے۔ یہ خالصتاً لوجہ اللہ صبح شام اپنے خدا کو پکارتے ہیں اس قسم کے مخلص لوگوں کو نکال دینا قطعاً یہ نہیں ہے' اگر ایسا کیا گیا تو یاد رکھو سب سے پہلے ظالم تم ہو گے۔ انہیں دھتکار کر نکال دینے والا سب سے پہلا ظالم' رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے' بات سمجھانے کی ہے۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (11:30)۔ پھر انہوں نے یہ کہا تھا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو کوئی فوق الفطرت بات بھی تو کر کے دکھاؤ' کچھ معجزے' کچھ کرامات' کچھ حضرت صاحب والی باتیں جتنی بھی ہیں' کچھ ایسا ہی ہو۔ پھر انہوں نے کہا تھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم لوگ تو کچھ غریبوں کی سی ایک جماعت ہو' مفلس ہو تمہارے پاس تو کچھ مال اسباب بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔

کشف والہام اور پیش گوئیاں کرنے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ اور پھر آپ ﷺ کا فرمان

یہ بھی ان کے اعتراض تھے نا' ایک ایک اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے کہا ٹھیک ہے وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (11:31) میں نے تم سے کہا کب تھا کہ میرے پاس بڑے بڑے خزانے ہیں جو مجھے آ کے یہ طعن دے رہے ہو کہ تمہارے پاس مال و دولت نہیں ہے' میں نے تو مال و دولت کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا' میرے پاس تو نہیں ہے۔ میں نے یہ چیزیں پیش ہی نہیں کیں' میں ان چیزوں کی بناء پر ایک جماعت بنا ہی نہیں رہا۔ پھر تم نے کہا ہے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (11:31) میں نے کب کہا تھا کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ گویا آپ کے ہاں مدعی جو بنتا ہے کسی قسم کا' خواہ وہ نبوت کا مدعی ہے یا یونہی کشف والہام کا مدعی ہے' ہر شخص پیشن گوئیاں کرتا ہے۔ اپنی دعوت کا مدار ہی پیشن گوئیوں پہ رکھتے ہیں۔ لوگ جاتے ہی ان کے پاس اس لیے ہیں کہ حضرت صاحب سٹے کا نمبر بتا دیجیے' یہ بتا دیجیے کہ یہ کامیاب ہو گا یا نہیں ہو گا یعنی آنے والی باتیں جو ہیں ان کے متعلق ان سے پوچھنے جاتے ہیں' پہلی چیز یہ ہوتی ہے۔ اور جن کی کرامات کی دھوم مچتی ہے ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب وہ بہت پہلے انہوں نے یہ بتا دیا تھا۔ سوچئے کہ یہ مسلمانوں کی قوم یہ کہہ رہی ہے کہ جن کا قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ کل کے آنے والی بات خدا کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ اس قرآن کو روز پڑھتے ہیں' اُن حضرت جی کو میں کہتا ہوں جو ہر روز کہتے ہیں کہ ہم خدا کے ہاں ہوتے ہیں' کہ یہ قرآن کی آیت ان کے سامنے بھی نہیں ہو گی۔ کوئی فرد نہیں جان سکتا کہ کل کیا ہونے والا ہے' قرآن کی یہ آیت ہے (31:34)' خدا اپنے اس غیب کے علم میں کسی کو شریک نہیں کرتا' صرف رسول تھے جن کو یہ کہا اور انہیں ہم صرف وحی کے ذریعے یہ بتاتے تھے (72:26-27)۔ جو بات انہیں

وحی کے ذریعے نہیں بتاتے تھے' اس میں وہ بھی نہیں یہ بات جانتے تھے۔ یہاں ہر حضرت جی جو ہیں صاحب ذرا سی آنکھ بند کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں صاحب چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ قیامت تک کی باتیں ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ خدا کا نبی یہ کہہ رہا ہے وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (11:31) میں تو غیب کی بات نہیں جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے میں نہیں کہہ سکتا۔ وَ لَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَکٌ (11:31) تم کہتے تھے نا کہ ہمارے ہی جیسا یہ ایک انسان ہے کوئی فوق الفطرت باتیں نہیں' کہا کہ میں نے کہا کب تھا آپ سے کہ میں فرشتہ ہوں۔ کیا انداز ہے باتیں کرنے کا۔ میں نے تو یہ دعویٰ ہی نہیں کیا اس قسم کا' اس لیے اس کی تردید کے کیا معنی جو تم کر رہے ہو۔ میں نے جو کہا ہے تم سے اس کی تردید کرو اور کہا ہے میں نے دلیل و برہان کی بناء پہ وہ کہا ہے' دلیل و برہان تم سے مانگتا ہوں۔ یہ بتاؤ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ جس معاشرے کا مدار یہ ہو کہ عزت کا معیار اس میں دولت ہو جائے' ذاتی کریکٹر اور شرافت نہ ہو' میں کہہ یہ رہا ہوں کہ وہ معاشرہ ڈوبے گا۔ اس کا جواب دو دلیل و برہان سے' علم و بصیرت سے کہ نہیں میں غلط کہتا ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ تمہارے پاس مال نہیں ہے' خزانے نہیں ہیں' تم فرشتے نہیں ہو' تم کرامات نہیں دکھا سکتے۔ بات تو میں یہ کہتا ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! کہ دین کیا دعوت پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد جب دین مذہب میں بدل دیا جاتا ہے' مفاد پرستوں کا گروہ بدلتا ہے تو اس کے بعد صبح شام آپ کو ہر محراب و منبر سے یہ سمجھایا جاتا ہے کہ صاحب اسلام غریبوں میں پیدا ہوا' غریبوں میں ہی آخر میں یہ رہے گا' خدا کے سب سے مخلص بندے وہ ہیں نہ جن کے پاس کھانے کو روٹی' نہ پہننے کو کپڑا' نہ رہنے کو مکان۔ یہی اللہ کی صفتیں ہیں نہ وہ کھاتا ہے نہ ان کو کچھ ملتا ہے نہ وہ پہنتا ہے' وہ لامکان ''اے وی لامکان'' یعنی یہ پھر سبق صبح شام پڑھایا جاتا ہے' کہاں لے گئے۔ کہا کہ میں نے تو یہ کچھ کہا نہیں تھا' بات جو میں کہہ رہا ہوں یہ بتاؤ کس طرح سے وہ قومیں ڈوبیں۔ یہی جرم بتایا گیا ہے نا قوم نوحؑ کا کہ تم نے طبقاتی تقسیم کر رکھی ہے' عزت کا معیار دولت قرار دے رہے ہو' غرق ہو جاؤ گے یاد رکھو۔ اور وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (103:1-2) قرآن کہتا ہے زمانے کی تاریخ اس حقیقت کی شہادت دے گی کہ انسان نے جو نظام بھی اپنے ذہن سے بتایا اس نے اس کو تباہ کر کے رکھ دیا' عصرِ گذشتہ کی تاریخ اس بات کی شہادت دے گی۔ اور یہاں تو مصیبت یہ ہے نا کہ جب یہ چیز آئے قرآن میں والعصر' ترجمہ آپ نے دیکھا مولوی صاحب سے پوچھا' قسم ہے عصر کی' ''عصر دی نماز دی سوں کھان ڈیا ہے اللہ میاں' مینوں عصر دی سوں' مینوں ظہر دی سوں''۔ بہرحال کیا بات کہنی ہے ان کی۔

قرآن حکیم کی طرف سے بیان کردہ حقائق کے تحت سابقہ تاریخی واقعات کو پیش کرنے کا مقصد

زمانے کی تاریخ یعنی پوری انسانیت کی تاریخ قرآن لا رہا ہے اپنی شہادت میں' بہت بڑا دعویٰ ہے کہ انسان نے جو نظام بھی اپنے

ذہن سے وضع کیا اس کا نتیجہ تباہی ہوا۔ یہی چیز ہر نبی کہتا رہا ہے۔ انسان کے ذہن کے ساختہ نظاموں کی ایک ایک کڑی لاتا ہے قرآن نمایاں طور پہ۔ پہلے نبی کی طرف سے یہ کڑی لا رہا ہے کہ عزت کا معیار تم نے دولت قرار دے لیا' نہیں بچ سکتے تباہ ہو جاؤ گے۔ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ؕ (11:31) اور پھر یہ سب کچھ تو میں نے پہلے کہا ہے کہ میں تو کہتا ہی نہیں تھا کہ میرے پاس خزانے ہیں' میں کوئی فرشتہ ہوں' میں کہیں آسمان سے آیا ہوں' تمہارے جیسا ایک انسان ہوں' بات ایک کھری سی کہہ رہا ہوں' میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ باقی تمہارا یہ جو ہے کہ ان کو نکال دو' میں ایک بار پھر دہرا دوں کہ وہ جنہیں تمہاری آنکھیں ذلیل دیکھ رہی ہیں تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ (11:31) تمہاری آنکھیں ذلیل دیکھ رہی ہیں' میں تو کبھی یہ بات نہیں کہونگا کہ وہ خدا کے نزدیک بھی محروم ہیں اور دھتکارے ہوئے ہیں کہ خدا کے ہاں سے ان کو کوئی چیز خیر کی نہیں مل سکتی' میں تو یہ نہیں کہہ سکتا۔

ایک امیر اور صاحب ثروت کے مقابلے میں کسی غریب کے لیے جنت کا حصول کیونکر ممکن ہوگا؟

تمہارا یہی ایمان ہے اور ہے ہی یہی چیز آج بھی' زکوٰۃ دینے والا' اس کی نجات ہوگی' وہی دے گا نا جو صاحبِ نصاب ہے' جو بیچارہ دن بھر مزدوری کرتا ہے اور وہ بچوں کا پیٹ بھی نہیں پال سکتا' وہ صاحبِ نصاب ہی نہیں ہو سکتا تو وہ زکوٰۃ کہاں سے دے۔ صدقہ دے گا' زکوٰۃ دے گا' مسجد میں قالین بچھائے گا' فانوس لٹکائے گا' مسجد تعمیر کرائے گا' حج کرنے جائے گا' یہ ساری چیزیں بتائی جا رہی ہیں نا جن سے نجات ہوتی ہے۔ ایک مزدور ایک مفلس ایک غریب جس کو بچوں کا پیٹ پالنے کو بھی کچھ نہیں مل رہا وہ ان چیزوں میں سے کسی میں بھی حصہ نہیں دے سکتا۔ قرآن میں ہے یہ قول ایک سرمایہ دار کا کہ اس سے جب کہا گیا کہ او بابا یہاں تو ٹھیک ہے تمہاری زندگی بڑی خوشگوار گذر رہی ہے ذرا سوچو تو سہی کہ خدا کے ہاں کیا جواب دو گے۔ قرآن میں ہے یہ جواب کہ مولا نے ہمیں یہاں عیش کرایا ہے وہاں بھی عیش کرائے گا (18:36)۔ اور اس کی دلیل اس کے پاس موجود ہے پوچھ لیجیے کسی مولوی صاحب سے' روز وہ وعظ میں کہتے ہیں جو اتنا دیدیگا خدا کے نام پہ' اتنی زکوٰۃ دے گا' صدقہ دے گا' مسجد بنوا دے گا' حج کرے گا یہ سارا کچھ۔ تو یہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں نا تو سیدھی سی بات ہے جنت تو آ گئی' ایک مسجد بنانے میں موتیوں کا گھر وہاں بنتا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے بناتے تو یہ راج مزدور ہیں لیکن ان راج مزدوروں کو پوچھتا کون ہے' تاج محل تو شاہجہان کا بنتا ہے نا۔ تو کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا تم تو یہ بات کہو گے کہ ہاں صاحب یہ جو اس قسم کے لوگ ہیں تمہارے ہاں جن کو تم کہتے ہو کہ کمین ہیں' ذلیل قسم کے لوگ ہیں' انہیں کیا خدا دے گا۔ نہ یہاں کچھ وہ دے رہا ہے نہ وہاں کچھ وہ دے گا۔ کہا میں تو یہ نہیں کہہ سکتا۔ دلیل ملاحظہ فرمایئے۔ کہا کہ تم نے یہ کچھ کہا کہ ان کے محلات نہیں ہیں' ان کے بینک بیلنس نہیں ہیں' ان کی کوٹھیاں نہیں' ان کے کارخانے نہیں ہیں' ان کی دولت نہیں ہے' جاگیردار نہیں ہیں' زمینیں نہیں ہیں' اس بناء پہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ قابلِ

حقارت ہیں، یہ ذلیل ہیں۔

خدا کے نزدیک عزت اور ذلت کا معیار مال و دولت کی بجائے جوہر ذاتی پر ہے

کہا سنو میں کیا کہتا ہوں تم نے یہ معیار قائم کیا ہے نا عزت کا، وقار کا اور ادھر یہ ہے کہ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ (11:31) خدا کی نگاہ ان کے دلوں کے اوپر ہے، تمہاری نگاہ ان چیزوں کے اوپر ہے۔ یہ ہے معیار عزیزانِ من! وہ ان چیزوں کو تولتا ہے اس کے ہاں عزت کا معیار یہ ہے۔ بات لوٹ کے آگئی کہ معاشرے میں اگر معیار جو ہو عزت و تکریم اور تذلیل کا معیار جوہرِ ذاتی ہو جائے، انسان کے قلوب ہو جائیں، ان کے ارادے ہو جائیں، ان کے دل ہو جائیں، اگر یہ معیار قرار پائے تو وہ معاشرہ پھر نہیں ڈوبتا۔ لیکن اگر معیار یا تو یہ کہ پیدائشی یہ صاحب نائی کا بیٹا ہے، نائی رہا، ذلیل ہو گیا یا جس نے اس قسم کے پیشے اختیار کر لیے، ذلیل ہو گئے جو ذلیل ہیں معاشرے کے اندر، اس قابل ہی نہیں کہ امیروں کے پاس بیٹھ جائے۔ جب یہ معاشرے کے معیار تمہارے ہاں ہو گئے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔ وہی معاشرہ زندہ رہے گا، خوشحال رہے گا، سرفراز رہے گا جس میں معیار یہ ہو دلوں پہ نگاہ ہو، کریکٹر پہ نگاہ ہو، جوہرِ ذاتی پر نگاہ ہو اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ (11:31)۔ کہا کہ اگر میں تمہاری بات مان لوں، وہی جو نبی اکرم ﷺ کے ضمن میں ابھی ہمارے سامنے آیت آئی تھی وہی الفاظ یہاں ہیں۔ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ (11:31) تو پھر میں سب سے بڑا ظالم تو میں ہو جاؤں گا۔ ظالم کہتے کس کو ہیں؟ جو غریب کو دھتکارتا ہے، جو کمزور کو مارتا ہے، اُسے تم ظالم کہتے ہو نا تو اگر میں بھی ان غریبوں کو نکال دوں، دھتکار دوں تو مجھ سے بڑا ظالم کون ہو گا۔ میں یہ بات نہیں کر سکتا تمہارے ساتھ۔

حضرت نوعؑ کی طرف سے پیش کردہ دعوت کے جواب میں قوم نوح کا تکرار

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ادھر سے ہر بات معقولیت کی پیش ہو رہی ہے، دلیل دی جا رہی ہے، علم و بصیرت کی بنیاد پہ بات ہو رہی ہے۔ اُدھر سے پہلا مطالبہ تو یہ ہوا تھا کہ انہیں نکال باہر کرو۔ اب یہ جو یہ کچھ اُنہوں نے کہا ہے جواب کیا ہے، وہی جواب جو ہر باب میں ملتا چلا آتا ہے قَالُوۡا یٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَکۡثَرۡتَ جِدَالَنَا (11:32) اے نوحؑ ہم سنتے رہے تمہاری بات اور تم بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو، بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو، کیا جھگڑا مفت کا تم لے کے بیٹھے ہوئے ہو۔ کوئی جواب نہیں، کیا جھگڑا ہے، ہم جو تمہاری کچھ عزت کرتے ہیں یا خاموش یا سن رہے ہیں تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو، بڑھتے جا رہے ہو تم۔ یہی جواب ملتا ہے ناعزیزانِ من! اول تو پہلی بات پہ جھٹک دیے جاتے ہیں، اگر کبھی کسی طرح سے مصلحتاً دو چار سن بھی لیں تو اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ ''ہن بس وی کر، ٹیں ٹیں لا رکھی اے گھنٹے بھر دی۔ سندا تریا جانا پیا ہیگاں، جا جو کرنا ای کر لا''۔ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ (11:32) اتنے ہی بڑے سچے ہو تو جو

کہتے ہو کہ تباہی آئے گی' جاؤ لے آؤ تباہی ۔ کیا بات ہے قرآن کی صاحب !!! میں نے کہا ہے نا کہ اس نے جو کہا تھا نا کہ یہ عربوں کی زبان میں نازل کیا ہے' عربیٔ مبین جاننے والے جانتے ہیں یہ وہی چیز جو بے ساختہ پنجابی آ جاتی ہے نا سامنے' بالکل انداز وہی ہوتا ہے ''سندے ترے آئے ہیں سرتے ای چڑھدا اتریا جاندیا ایں'' ۔قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَکۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ (11:32) ٹھیک ہے جاؤ جو کہتے ہو ہم تباہ ہو جائیں گے' غرق ہو جائیں گے' جاؤ پھر وہ لے آؤ تباہی ہماری ۔ اب وہ تباہی لانا جو ہے وہ تو اس کے بس کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے کہیں آپ چھپا رکھی ہے لے آئیں ۔ یہ تو دنیاوی قوت جن کے پاس ہوتی ہے' پولیس اور فوج اور ہر قسم کی وہ تو جب جی چاہے لا سکتے ہیں تباہی ۔ کہا کہ بات تم مجھ سے کہتے ہو نا کہ جاؤ وہ تباہی لے آ قَالَ اِنَّمَا یَاۡتِیۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ اِنۡ شَآءَ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ (11:33) ورنہ اگر یہ صرف میری ہی کی بات ہو تو وہ پھر اس کے جواب میں یہ کہہ کے جاتا کہ اچھا اگر یہی بات ہے نا پھر ''تو وکھ لینا میں ای پیو دا پتر نئیں جے کل ای نہ لیا کے ایہناں نوں دسیا'' ۔ یعنی کس قدر لیول بلند ہے قرآن کا' قرآن کی دعوت دینے والوں کا' تو ہونا ہی چاہیے بلند ۔ یعنی ہم ہیں تم ہیں' جنہیں ہم کہتے ہیں عام سطح کے انسان' ان میں آپ دیکھئے ان میں اور کتنا بڑا بلند لیول ہے ۔ یہاں نظر آتا ہے ویسے کچھ بظاہر کہ ہاں صاحب یہ کوئی شکست کی سی بات ہے ۔

ظہورِ نتائج کے وقت کوئی نہیں ٹال سکے گا

ٹھیک ہے بھئی تباہی تو مانگتے ہو تو میں تو نہیں لا سکتا تباہی' اس کا قانون یہ ہے کہ ٹھیک ہے کشتی میں پانی تمہارے پڑتا جا رہا ہے یہ تو ہے نہیں کہ میں کنارے پہ کھڑا ہوا اتنے میں ڈوبا دوں' اس کا ایک قانون ہے جب بھی اتنا پانی پڑ گیا اس کے اندر تو اس کے قانون کے مطابق وزن اتنا بڑھ گیا کہ یہ ڈوبے گی تو یہ اس وقت ڈوبے گی ۔ لیکن ایک بات تمہیں میں کہہ دیتا ہوں کہ اس وقت تو تم اس میں سے پانی نکال دو تو بچ جاؤ اور اگر اتنا پانی پڑ گیا وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ (11:33) پھر تمہارے بس کی بات کچھ نہیں رہے گی ۔ وہی بات نہیں کہ تمہارے بس کی بات نہیں رہے گی' عزیزانِ من! یہ ہے ایک مشفق' کہا کہ تمہاری بات ہی نہیں وَ لَا یَنۡفَعُکُمۡ نُصۡحِیۡۤ اِنۡ اَرَدۡتُّ اَنۡ اَنۡصَحَ لَکُمۡ (11:34) کہا تم تو ایک طرف اس وقت میں بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا' او بچ جاؤ ۔ آہاہا ۔ یہ ہے ناصح مشفق ۔ کیا بات ہے یہ کہنے کی !! اِس وقت تو میں بھی تمہیں یہ نصیحتیں کر رہا ہوں' تمہارے بھلے کی کہہ رہا ہوں ۔ اگر وہ وقت آ گیا خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے تو مشکل یہ ہے کہ میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا تمہارے لیے ۔ حالانکہ عام انسان ہمارے جیسے ہوتے تو پھر یہ ہوتا کہ پھر تم یہ کرو گے تو اس وقت تم دیکھنا ہم تالیاں بجائیں گے پوچھیں گے تم سے ۔ یہ وہ مشفق ہے جو چاہتا ہے کہ آخری وقت تک ان کو بچانے کے لیے میں کروں ۔ کہا یہ کہ مشکل یہ آ جائے گی کہ پھر میں بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا ۔ (اردت) میں اگر چاہوں بھی ارادہ بھی' اس وقت

اگر اس بات کا کروں تو اس وقت میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔

ناصح لفظ کا لغوی مفہوم یعنی چاک گریبان کو سی دینے والا

شاید آپ کو یاد ہو گا میں نے یہ بتایا تھا جسے ہم نصیحت کہتے ہیں یا ناصح جس کو کہتے ہیں' عجیب چیز ہے قرآن کی عزیزانِ من! یہ ناصح جو ہے یہ درزی کو کہتے ہیں' پھٹے ہوئے گریباں کو سی دینا کسی کے' اسے نصیحت کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ناصح کہتے ہی ہیں اس طرح سے سینے والا' کسی کے چاک گریباں کو سی دینے والا' یہ ناصح ہوتا ہے۔اور ایک آج کل کی ہماری بھی تو نصیحت ہوتی ہے نا اچھے بھلے دامن کو بھی چاک چاک کر دیتی ہے نصیحت ہماری' وہ طعن آمیز نصیحت ہوتی ہے' کلیجے کے ٹکڑے کر دیتی ہے وہ نصیحت۔اور ایک یہ اس لفظ کے اندر آپ دیکھئے عربی کے اندر ناصح کے معنی ہی ہوتا ہے کسی کے پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینے والا۔اور اصل نصیحت تو ہے ہی یہی کہ کسی کا پھٹا ہوا دامن سی دیا جائے' باتیں کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔کہا اس وقت تو میں یہ کوشش کر رہا ہوں تمہارے یہ گریباں کے چاک دامن ہی کو میں سی لوں کسی طرح سے لیکن وہ وقت جو آ گیا تو کہا اس وقت میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ وہاں تک نہ پہنچو۔ اِنۡ کَانَ اللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يُّغۡوِيَكُمۡ‌ؕ (11:34) اس کے قانون کے مطابق اگر ہلاکت کا وقت آ گیا میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ هُوَ رَبُّكُمۡ وَ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ (11:34) اور یہ بات نہیں ہے میں کہتا ہوں میری طرف آ ؤ میں کچھ کر دوں گا' بات کچھ نہیں ہے' وہ ہے تمہارا نشوونما دینے والا' وہ ہے رب' اس کی طرف رجوع کرو۔اس کی طرف لوٹو جو میں کہتا ہوں صاحب۔کہا کہ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَـرٰهُ (11:35) تم یہ بھی کہتے ہو کہ صاحب یہ جو کہہ رہا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے یہ وحی آئی ہے اور میں یہ کچھ کہہ رہا ہوں یہ تو افتراء ہے جھوٹ ہے' خود ہی یہ کچھ اپنے ذہن سے وضع کر لیا اس شخص نے اور اس کو منسوب کر رہا ہے خدا کی طرف۔

قرآن حکیم کا منجانب اللہ ہونے کا کیا ثبوت ہے

یہاں پھر ایک بات بڑی دلچسپ آئی اور یہ بڑی اہم بات ہے۔سوال یہ ہوتا ہے ہمارے ہاں ہمیشہ کہ صاحب یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ قرآن خدا کی وحی ہے۔یہ رسول اللہ ﷺ یا محمد ﷺ جو ہیں ان کی اپنی فکری تخلیق نہیں ہے' اس کا ثبوت کیا ہے۔یہ ہوتا ہے اعتراض عام طور پہ۔آپ غور کیجیے گا کہ ہمارے پاس تو ایک طرف رسول بھی جو یہ کہتا ہے کہ میں کوئی فوق الفطرت' معجزہ یا کرامت نہیں دکھاتا۔میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔اس کا ثبوت بین یا محسوس جیسا لوگ مانتے ہیں اپنی سطح کے مطابق' اس کے پاس بھی یہ نہیں ہوتا کہ یہ وحی ہے۔ثبوت کیا ہوتا ہے؟ اور انہیں تو چھوڑ دیجیے نبوت تو ختم ہو گئی حضور ﷺ تو دعویٰ اپنا لے کے چلے گئے۔ہم سے بھی آج پوچھا جاتا ہے ہر مدعیٔ قرآن سے یہ پوچھا جائے گا کہ یہ تم کیسے کہہ رہے ہو کیا اس کا ثبوت ہے۔

قرآن حکیم کی پیش کردہ تعلیم کا آن میرٹ ہونا ہی من جانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے

اس کا ثبوت وہی ہے جو قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کی زبان سے دہرایا تھا۔ قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ (12:108) کہا کہ ان سے کہہ دو کہ ہم تمہیں جو دعوت دے رہے ہیں اسی کی۔ علیٰ وجہ البصیرت علم اور بصیرت کی بنیادوں پہ جو بات کہہ رہے ہیں اس کو ابھی تم چھوڑ دو کہ یہ وحی ہے یا کسی انسان کا کلام ہے' سرِ دست اس بحث کو چھوڑ دو۔ یہ جو تعلیم پیش کی جا رہی ہے اس تعلیم کو آن میرٹ تم پرکھو' یہ ہے عزیزانِ من! پہلی چیز کہ بات کہنے کی یہ ہے کہ قرآن کی یہ تعلیم ہے یہ اپنے سامنے رکھو۔ پھر اس زمانے میں جس زمانے میں یہ قرآن نازل ہوا یا ایک شخص نے' رسول ﷺ نے پیش کیا ہے یہ' اس زمانے کے انسانی علم کو دیکھو' اس زمانے کی ذہنی سطح کو دیکھو اور اس کے مقابلے میں یہ ساری تعلیم دیکھو جو اس کے اوپر پیش کی گئی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا کہ یہ ایک شخص تو ایک طرف رہا اس زمانے کے سارے بڑے سے بڑے اربابِ علم جمع ہو کر بھی یہ تعلیم کسی طرح سے دے سکتے تھے؟ اس زمانے میں تو ذہن میں ہی نہیں کسی کے آ سکتی تھی۔ صاحب کوئی بلند تر اور تعلیم' اور ایک طرف رہا' اس زمانے تک نہیں سترہویں صدی تک انسانوں کو غلام بنا لینا Slavory جسے آپ کہتے ہیں اس کے خلاف ساری دنیا میں کبھی آواز ہی نہیں اٹھی تھی۔ بلند ترین آپ کے ہاں فلاسفر جو ہیں' وہ یونان کے کہلاتے ہیں ناجن کو ابوالآباء کہا جاتا ہے علم کا' فلسفہ کا' حکمت کا اور آج تک ان کے ہاں کے جو بنائے ہوئے ہیں اصول ہیں' کم از کم منطق کے اصول ارسطو کے مثلاً منطق کے اصول آج تک غیر متبدل ہیں صاحب۔ اور دوسری طرف ارسطو کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے پاس چالیس غلام تھے۔ غلامی کے حق میں چالیس دلیلیں اس نے دی ہوئی ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا افلاسفر پلیٹو ہو یا یہ ارسطو ہو' ان کی کیفیت یہ تھی۔ ساری دنیا میں کہیں اس کے خلاف آواز اٹھائی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اس زمانے میں جب یہ مسلمہ امر تھا کہ پیدائش کی رو سے ہی' خدا بانٹ دیتا ہے انسانوں کو شودر اور ویش اور کھشتری اور برہمن پیدا کرتا ہے' مسلمات میں تھی یہ چیزیں۔ اس زمانے میں جب عیسائیت یہ کہہ رہی تھی کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ اپنے اولین ماں باپ کا گناہ لے کے آتا ہے اور اس لیے گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جب یہودیت یہ کہہ رہی تھی کہ غیر بنی اسرائیل انسانوں کی صف میں شمار ہی نہیں ہو سکتے۔ جنت میں جاتا ہی نہیں بنی اسرائیل کے علاوہ کوئی۔

نزولِ قرآن سے پہلے عقل انسانی کے مختلف پہلو

ذرا سوچو میں ایک صرف بات لا رہا ہوں آپ کے سامنے' یہ ساری دنیا کے مسلمات تھے نہ سیاست کی دنیا میں نہ مذہب کی دنیا میں ان چیزوں کے خلاف کبھی کوئی آواز بلند ہوتی تھی' یہ مذہب کے مسلمات تھے۔ اُس زمانے میں عرب کی سرزمین میں جہاں حسب اور نسب

کے اوپر فخر کی کیفیت یہ تھی کہ وہ آپ تو ایک طرف رہا' اپنے گھوڑوں کی نسلیں لے جاتے تھے آدم تک' اتنا فخر تھا ان کو اپنے نسب کے اوپر اور حسب کے اوپر۔ اُس زمانے میں ایک شخص وہیں سے پیدا ہوتا ہے اور وہ کہتا یہ ہے کہ نہیں وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہر انسانی بچہ واجب التکریم ہے یکساں طور پر۔ باقی چیزیں تو چھوڑ دیجیے میں پوچھتا یہ ہوں علم کی دنیا سے کہ اس دور میں کوئی انسانی ذہن ایسا ہوسکتا تھا جو یہ بات کہے۔ جو یہ کہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خدا اس کو خواہ حکومت' کتاب' نبوت بھی کیوں نہ دیدے کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم میرے غلام ہو۔ میں کہتا ہوں پوچھو تو سہی اس دور سے کوئی انسانی فکر یہ بات کہہ سکتی تھی؟

حضرت نوح کے دور میں عقل انسانی کی راہنمائی کے لیے ایک غیر متبدل سنہری اصول

اور چیزیں تو ایک طرف رہیں کوئی انسانی فکر یہ کہہ سکتا تھا جو حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلایا جا رہا ہے کہ یہ جو چیزیں تم کہہ رہے ہیں کہ یہ پیشے ذلیل ہیں' کم بختو کبھی پیشہ بھی ذلیل ہوا کرتا ہے' تم جو کہہ رہے ہو کہ عزت کا معیار دولت ہے' عزت کا معیار دولت کیا ہے؟ عزت کا معیار تو یہ ہے کہ انسان کے جوہر ذاتی کیا ہیں' قلب میں اس کے کیا ہے۔ کوئی انسانی فکر یہ چیز کہہ سکتی تھی؟ انسانی فکر کی تاریخ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ آج بھی بٹھا دیجیے جن کو بٹھانا ہے آپ نے' قرآن کا یہ چیلنج تھا نا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں' انسان کی تخلیق ہے اس نے کہا تھا کہ تم خود ہی نہیں جن جن کو دنیا بھر میں بلانا چاہتے ہو اور ان سے کہو کہ اس تعلیم کے دس ٹکڑے ایک ٹکرے مِثل کی جو ہے بنا کے بتا دیں۔ بات اس سے چلی کہ یہ اس کی تعلیم جو ہے پہلے اس کو لو' اسے علم اور بصیرت کے ترازو کے اوپر تو لو اس کسوٹی پہ پرکھو' آج کے علم کی سطح کو بھی سامنے رکھو' اس دور کے علم کی سطح کو بھی سامنے رکھو پھر یہ بتاؤ کہ کوئی انسان ایسا تھا جس کی فکر یہ چیز اس زمانے میں دے سکتی۔ یہ خود پکار اٹھتا ہے انسان۔

تنہا عقل انسانی کا معیار دیکھنا ہو تو علامہ پرویز کی کتاب انسان نے کیا سوچا قابل ذکر ہے

ضمناً بات یاد آ گئی بیچ میں سے اپنی چیز آ جاتی ہے۔ میں نے کتاب لکھی ہے ''انسان نے کیا سوچا'' وہ بڑی اہم اور بنیادی چیز ہے۔ بہت کم لوگوں نے سمجھا اس بنیاد کو میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے یونان کے فلاسفر سے لے کر ساری دنیا کے فلاسفر اور بڑے بڑے سائنٹسٹ جتنے بھی ہیں ان کے اپنے زندگی کے تجربات کے بعد ان کے اپنے نتائج اور ان کی فکر اور ان کے جو بیانات ہیں ان کو میں نے اکٹھا کر دیا ہے مختلف عنوانات کے تابع۔ اور اس میں بتایا ہے کہ یہ دیکھئے انسانی فکر آج سے اڑھائی ہزار سال پیشتر سے لے کے اس وقت تک ان عنوانات میں زندگی کے اہم مسائل میں ان نتائج کے اوپر پہنچی ہے اور ان نتائج کے متعلق انہوں نے خود کہا ہے کہ ہم مطمئن نہیں

ہیں کہ ان سے انسانیت کی مشکلوں کا حل ہوسکتا ہے۔ 1953ء تک تو میں نے اس میں لکھ دیا ہوا ہے جب وہ کتاب چھپی تھی۔ اور اس کے بعد اگلی چیز یہ ہے کہ ان مسائل کے متعلق قرآن نے کیا کہا ہے جو وہ کہتے تھے نا کہ اس قسم کی تعلیم کوئی ہونا چاہیے پھر انسان کی مشکلات کا حل مل سکتا ہے۔ جو وہ چاہتے تھے ایسا ہونا چاہیے' وہ ہے جو قرآن دے رہا ہے۔ تو 1953ء تک کا تو فکرِ انسانی اس کو پیدا نہیں کر سکا 53ء سے 73ء ہوا ہے آج بیس سال میں کیا پیدا ہو جائے گا۔ اس کے بعد بھی میں اس بیس سال کے اندر بھی جو کچھ یہ کہتے رہے ہیں شدہ شدہ اس کو بھی اکٹھا کر رہا ہوں توفیق ہوئی اگر فرصت مجھے ملی تو ہوسکتا ہے کہ اسی کتاب کے اگلے ایڈیشن کا حصہ بنا دوں لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہے طریقہ عزیزانِ من! یہ کہنے کا اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ (11:35) تم کہتے ہو کہ یہ میں نے افتراء کر دیا ہے خدا کے ساتھ' کہا یہ سوچو بات جو میں کہہ رہا ہوں اس کو پرکھو۔ اب اگر یہ بات ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کہی ہے خدا کی طرف میں نے منسوب کر دی ہے' اس سے تمہارا کیا بگڑے گا جی۔ اگر تم نے سوچ لیا کہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے اور میرے متعلق اگر یہ ہو گیا کہ میں نے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے تو تمہارا کوئی نقصان ہو جائے گا اس میں؟ تم نے سوچ لیا ہے کہ بات ٹھیک ہے۔ میں نے اگر جھوٹ بولا ہوا اس میں کہ یہ خدا کی طرف منسوب کردہ ہے تو یہ جرم میرا ہو جائے گا نا اس کی گرفت میری ہوگی تم بتاؤ تمہارا اس سے کیا نقصان ہوگا۔ اور اگر یہ چیز جو بات میں نے کہی ہے تم کہو کہ یہ غلط ہے' ٹھیک نہیں ہے۔

انسان نے کیا سوچا' کے دوسرے ایڈیشن کی کوشش

اس کے بعد تم یہ مان لو کہ میں نے خدا کی طرف سے کہی تھی تو پھر؟ یعنی اس سے تمہارا سنورے گا کیا۔ آپ دیکھتے ہیں کتنی بڑی چیز ہے۔ کہا کہ یہ سیکنڈری چیز ہے' ثانوی چیز ہے کہ خدا کی طرف سے یہ چیز آئی ہے یا میں نے کہی ہے۔ پہلی بنیادی چیز یہ ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں اس کے متعلق تم کیا کہتے ہو مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے جو کہا ہے کہ عزت کا معیار شرافتِ نفس ہے' اس کے متعلق بتاؤ کیا بات ہے۔ آگے بات پھر آ جائے گی۔ عجیب دلائل لا رہا ہے سلسلۂ رشد و ہدایت کی پہلی کڑی کے ضمن میں قرآن یہ باتیں کہتا چلا جا رہا ہے۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ (11:35) میں نے اگر جھوٹ بولا ہے اتنا بڑا اپنے ذہن سے وضع کیا' کہہ دیا خدا کا ہے یہ' کہنے لگے کہ یہ میرا جرم ہے میں پکڑا جاؤں گا نا تمہیں تو اس کی گرفت نہیں ہوگی کہ صاحب اس شخص نے یہ کیوں جھوٹ بول دیا تھا تم تو اس میں نہیں پکڑے جاؤ گے۔ ایسے ہی جیسے جو کچھ تم برائیاں' جرم کرتے ہو اس کے مواخذے میں' میں تو نہیں پکڑا جاتا نا ٹھیک ہے نا' تم بتاؤ کہ جو میں کہہ رہا ہوں اس کا وزن کتنا ہے۔ بات یہی ہے عزیزانِ من! دیکھنے کی۔ کسی سے یہ بھلا کہیے کہ صاحب ذرا دیکھئے نا کس طرح دھاندلی کی زندگی' یہ حرام کی کمائی' یہ سارا کچھ جو ہے' یہ کچھ کرتے رہیں اور سب کچھ۔ اس کا جواب تو کوئی

نہیں ہوتا' ہوتا کیا ہے؟ میاں کی اپنی زندگی دیکھو ان لوگوں کی صاحب' بڑے آ گئے حلال کی کمائی کھانے والے۔ اس کا جواب تو یہ نہیں ہے' جواب تو آن میرٹ ہونا چاہیے۔ کہا ہے یہ کہ جو میں کہہ رہا ہوں اس کو تم پرکھ کے دیکھو۔ یہ اگلی بات ہے میں اگر غلط کہتا ہوں خدا کے خلاف افتراء کرتا ہوں یہ جرم ہے اس کی سزا بھگتوں گا۔

ہم خیال لوگوں کو ساتھ لے کر کسی دوسرے مقام کی طرف نوحؑ کو ہجرت کا حکم

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ (11:36) نوحؑ سے کہا کہ نوحؑ! اس گروہ' اس معاشرہ' اس قوم کو (قریوں میں بستیوں میں رسول آیا کرتے تھے اس زمانے میں۔ یہ مواصلات کا سلسلہ رسل و رسائل کے سامان تو ایسے نہیں تھے کمیونیکیشن کے جیسے آج ہیں' وہاں تو ایک گاؤں کی خبر دوسرے گاؤں تک برسوں تک نہیں پہنچا کرتی تھی) اتنا لمبا عرصہ یہ کچھ کر لیا تو اس کے بعد یہ کہا گیا کہ اے نوحؑ! اب جتنے لوگ ان میں ایسے تھے' سعید روحیں' جنہوں نے اس بات کو' تمہارے اس پیغام کو پرکھا ہے' سوچا ہے' وہ ایمان لے آئے ہیں۔ اب یہ جو باقی رہ گئے ہیں' اب یہ ایمان نہیں لانے والے۔ ایک مقام آیا کرتا ہے ہجرت جسے کہتے ہیں نبی کی زندگی میں وہ یہی مقام ہوتا ہے' اس کی اولیں خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس مقام پہ پیدا ہوا ہے ناوہیں کے لوگوں میں سے وہ صحیح رستے پہ آ جائیں گے۔ جب اس میں یہ بات ہو جائے کہ وہ جتنے آنے والے تھے وہ آ گئے ہیں باقی مخالفت ہی ہے تو پھر وہ ان کو اپنے ساتھ لے کے کسی ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جو مقام اس کی اس دعوت کے لیے ان کے مقابلے میں زیادہ سازگار ہوتا ہے۔ میں نے کسی جگہ یونہی ایک مثال دی ہوئی ہے اس کی وہ محسوس طور پہ بات سمجھنے کی ہے' اب تو وہ ہے نہیں طریقہ' یہ جو سان پہ لوہار لگاتے تھے نا چاقو چھریاں تیز کرتے تھے' وہ سان تو وہ چکر ہوتا تھا نا ایک' اب ہمارے اگلے بچوں نے تو شاید سان بھی نہیں دیکھی ہوگی' اس کے نیچے ریت ہوتی وہ سان کا پتھر اس ریت اور پتھر میں سے نکل کے گھس کے آتا تھا وہ' تو یہ جو لگاتے تھے چاقو چھریاں سان پہ تیز کر کے تو ان کے چھوٹے چھوٹے ذرے اس ریت میں مل جاتے تھے۔ تو ہم چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے تھے' اس زمانے میں یہ مقناطیس آیا کرتا تھا دو چار پیسے کا' بچوں کے کھیلنے کا مقناطیس بنا ہوتا تھا' تو وہاں ہم چلے جایا کرتے تھے ان لوہاروں کی دوکان پہ اس ریت میں وہ مقناطیس پھیرتے تھے تو وہ لوہے کے سارے ذرے اس کے ساتھ چمٹ جاتے تھے۔ وہ دو چار بچے چلے جاتے تھے یا ہم دو چار دفعہ چلے جاتے تھے' وہ پھیرتے رہتے تھے پھر اس کے بعد ہم دیکھتے تھے کہ پھر اس کے ساتھ کچھ نہیں لگتا تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ شاید یہ مقناطیس خراب ہو گیا ہے' وہ اصل میں مقناطیس خراب نہیں ہوتا تھا' اس ریت میں باقی لوہے کے ذرے رہتے ہی نہیں تھے۔ نبی کی ہدایت کرتی یہ تھی کہ ان فولاد کے ذرے ملے ہوئے ریت کے اندر اپنے پیغام کا وہ مقناطیس پھیرتا چلا جاتا تھا اور ذرے لگتے چلے جاتے

تھے اس کے ساتھ۔اور جب یہ ذرے سارے لگ کے ادھر آ جاتے تھے اور باقی ریت رہ جاتی تھی تو وہ ان ذروں کو سنبھال کے چلا جاتا تھا کسی سازگار ماحول کی طرف۔ابھی ابھی مجھے یاد آ گیا وہ کہیں میں نے جو مثال دی تھی۔کہا کہ نوحؑ وہ جو فولاد کے ذرے تھے وہ سارے لگ گئے تمہارے مقناطیس کے ساتھ' اب اس کے بعد یہ باقی ریت رہ گئی ہے ان کو چھوڑ دو۔

آخری حد تک انتھک کوشش کے باوجود پیغام حق پہنچانے کی ترغیب اور شانِ رسالت

چھوڑنے کے وقت میں بھی کیا بات کہی ہے!! فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ (11:36) یہ ہے ناصح مشفق' ساری عمران سے یہ کہتا رہا' ان کی گالیاں کھائیں' اعتراضات سنے' مار بھی کھائی' نبیوں کی یہ بھی صورت ہوئی یہ سب کچھ کیا' ایسا وقت آ گیا کہ وہاں سے اب کوئی امید باقی نہیں ہے' ان کی مخالفت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ایسے وقت میں بھی خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اے نوحؑ! اب ان میں یہ بات نہیں ہے اب ان کی اس تباہی کے اوپر اس طرح سے کیوں اپنی جان گھلا رہا ہے' مت غم کر اس کے اوپر اب۔نبی اس وقت بھی اپنی جان گھلاتا ہے یہ ہے ناصح مشفق۔قرآن میں نبی اکرمﷺ کے متعلق ہے کہ تیرا رب شاہد ہے تو تو ان کے پیچھے جان گھلا لے گا اپنی (18:6,26:3)۔یہ کیفیت ہوتی ہے تنگ نہیں آ پڑتا وہ ان سے' گالیاں نہیں دینے لگ جاتا۔کہا یہ گیا کہ ان کی وجہ سے یونہی اپنی جان نہ گھلا بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ (11:36) جو کچھ یہ کرتے ہیں ان کے اوپر جان نہ اپنی گھلا۔یہ وہاں تک پہنچ گئے ہیں جہاں تباہی آ جایا کرتی ہے۔یہ بات میں آگے چل کے بتاؤں گا کہ یہ مختلف انبیاء کے متعلق یہ چیز جو آئی ہے کہ وہ قوم بارش سے سیلاب سے غرق ہوئی' اس قوم کے اوپر پتھر برسے' وہ قوم آندھی آئی' جھکڑ چلے اس سے تباہی ہوگئی' یہ چیزیں کیا ہیں؟ اس کا تعلق ان چیزوں سے کیا ہے جو کچھ وہ کرتے تھے؟ حضرتِ نوحؑ کی قوم کے متعلق یہ ہے نا کہ وہ پھر طوفان آیا تھا غرق ہوگئی تھی تو ابھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ ہمارے ذہن میں تو یہ ہے اور بتایا ہوا یہی ہے' ہمیں کہ وہ ساری دنیا میں طوفان آ گیا تھا۔اب بیچارے اس ملا کی دنیا بھی تو اب' اکبر الہ آبادی نے ان سے کہا تھا۔

چاہِ زم زم کے آپ مینڈک ہیں

طوفان نوح سے محفوظ رہنے کی ترغیب اور قانون خداوندی کی اہمیت

تو وہ ساری دنیا کا سوال ہی نہیں ہے' نبی ایک بستی میں آتا تھا ایک گاؤں میں ایک بستی میں۔ایک چھوٹا سا علاقہ وہ نشیب میں واقعہ ہے اب بھی وہاں جائیے' نینوا کے پاس تو وہ جگہ موجود ہے تاریخ جہاں بتاتی ہے کہ اردگرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور نشیب میں وہ علاقہ تھا یا وہ بستی تھی جہاں یہ لوگ بستے تھے۔پہاڑوں کے اوپر اگر زیادہ بارش کسی طرح ہو تو آج یہ 1973ء میں ہمارے ہاں یہ ہو گیا ہے پہاڑوں کی بارش نے پورا پنجاب بہا دیا ہے۔تو اس زمانے کا ایک اتنا سا گاؤں پہاڑوں کے اوپر اگر زیادہ بارش ہوئی ہو تو وہ بہہ جانے

والی بات تھی ۔آپ دیکھئے کہ یہ کونسا زمانہ ہے جب یہ خدا کے رسول آ رہے ہیں ۔ جو پہلے رسولؑ کا ذکر ہو رہا ہے زمانہ وہ ہے کہ ابھی ان لوگوں کو کشتی بنانی بھی نہیں آتی ' اتنا ابتدائی دور تھا ۔اب یہ اندازہ ہو رہا تھا (میں یہ بات بعد میں بتاؤں گا کہ نبی یہ اندازہ کیسے کرتا تھا) انہوں نے کہا کہ اگر ان پہاڑوں پہ اگر بارش زیادہ ہوئی اور پانی یہاں جمع ہو گیا تو یہاں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی ۔ بچنے کی صورت یہ ہوگی' کیا صورت ہوگی؟ نبی ہے اس کی مقربین کی جماعت ہے' ہمارے ہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب یہ نبیوں کی جماعت' رسول اللہ ﷺ نے ان کی کہانی کے مطابق کہ جنگِ بدر میں شکست ہونے لگی ہے' تو مٹھی بھری آپ ﷺ نے کنکریوں کی یوں ماری اور ساری قریش کی فوج اندھی ہو گئی اور آپ ﷺ جیت گئے' وہ ابابیلیں آئیں انہوں نے کنکریاں منہ میں لیں' ماریں سر پہ لگتی تھیں' ہاتھی کے پیٹ سے نکل جاتی تھیں تباہ ہو گئے ۔تو واقعی ان لوگوں کو اس طرح سے بچنا چاہیے نا اس قسم کی چیزیں ان کے لیے ہونی چاہئیں ۔ یہ خدا کی طرف سے کیا کہا جا رہا ہے نوحؑ کو' بارش کے آثار نظر آ رہے ہیں نظر آ رہا ہے کہ یہ چیز جو ہے یہ ڈوب جائے گا شہر ۔خدا کہہ رہا ہے وحی کے ذریعے وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا (11:37) جیسے جیسے ہم تمہیں بتاتے جاتے ہیں نا ہماری وحی کے مطابق ہمارے زیرِ نگرانی ایک کشتی بناؤ ۔تو اس زمانے میں ابھی کشتی بنانے کی ترکیب بھی وحی کے ذریعے سے سکھائی جاتی تھی ۔ دیکھا وحی کی ضرورت ۔تو سیدھی سی بات ہے کہ جب وہ کشتیاں بنانی لوگوں نے آپ سیکھ لیں تو پھر اس کے لیے تو وحی کی ضرورت نہیں رہے گی نا ۔ وحی کی ضرورت پہلے دوروں میں یوں ہوا کرتی تھی ۔اب جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اس قسم کی چیزیں پھر بیچ میں سے کم ہوتی چلی جاتی تھیں تا آنکہ وہ دور آ گیا جب انسانیت شباب پہ پہنچ گئی' نوجوانی کا زمانہ آ گیا ۔ یہ بچہ نہ رہا انسان تو پھر اس کو اصول زندگی کے دیدیے گئے پھر ضرورت نہیں تھی کہ وحی کی رو سے کشتیاں بنانا بھی سکھایا جائے ۔تو یہ اصول زندگی کے دینے کے بعد پھر وحی کا سلسلہ ختم کر دیا کہ اب ضرورت نہیں ہے مزید' بات ہی آگے چل کے آئے گی جسے ختمِ نبوت کہتے ہیں ۔اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ ضرورت نہیں تھی کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے وحی یہ بتائے ۔جس وحی کی ضرورت نوحؑ کے زمانے میں تھی اس وحی کی ضرورت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی ۔اس وحی کی ضرورت آج ہمیں بھی نہیں ہے اور جس وحی کی ضرورت نہیں تھی ہمیں خدا خواہ مخواہ کے لیے بیکار اپنی کتاب میں اس کو شامل کر کے کیوں رکھ دیتا صاحب ۔ بڑا اہم پوائنٹ ہے یہ ختمِ نبوت کا ۔بات یہاں یہ آئی کہ نوحؑ سے ہم نے یہ کہا کہ ہماری وحی کے مطابق ہماری زیرِ نگرانی کشتی بناؤ ۔تو گویا یہ انبیاء ان کی جماعتیں بھی اگر اس قسم کے حادثوں سے بچتی تھیں نا جن کو آپ Physical Events یا طبعی حادثے کہتے ہیں' سیلاب آ گیا' جھکڑ آ گیا ہے' وہ آتش فشاں پہاڑ میں سے لاوا نکل رہا ہے' تو وہ اسی ترکیب سے بچا کرتے تھے جس ترکیب سے کہ وہاں طبعی طور پہ بچنا چاہیے' فوق الفطرت کوئی بات نہیں ہوتی تھی ۔ ورنہ سیدھی سی بات تھی طوفان آ جاتا باقی سارے غرق ہو جاتے' نوحؑ اور ان کے یہ جو ساتھی تھے ان کو خدا' یا فرشتے اپنے پروں پہ بٹھا کے لے جاتے' یہ نہیں

بات۔ کہا یہ گیا ہے کہ کشتی بناؤ۔ تو عزیزانِ من! جتنے طبعی حوادث دنیا کے اندر آئیں گے ان کی حفاظت کا سامان طبعی طریقے کے اوپر ہوگا خواہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہو یا کافروں کی جماعت ہو۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ جو طوفان سے بچنے کے لیے بروقت کشتی بنا لے گا' وہ خدا کی وحی کا اتباع کرے گا خواہ وہ رام داس ہی کیوں نہ ہو اور جو کشتی نہیں بنائے گا' وہ خدا کی معصیت کرے گا خواہ عبدالرحمٰن ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خدا کہتا ہے ہم نے وحی کی یوں کشتی بناؤ جو ملاح بھی آج اس طرح کشتی بنا رہا ہے وہ اس وحی کی اتباع کر رہا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے' فرق آگے جا کے آتا ہے کہ اس کشتی کے اندر آپ ڈاکوؤں کو' غنڈوں کو' بدمعاشوں کو بٹھاتے ہیں یا شریف انسانوں کو بٹھاتے ہیں یہاں فرق آجائے گا مومن اور کافر میں۔ کشتی بنانے تک کی بات طبعی ہے۔

فرعون کے اقتدار اور ایک نبی کی سرپرستی میں نمایاں فرق ہوتا ہے

اقتدار تو فرعون کو بھی مل سکتا ہے۔ اقتدار حضرتِ سلیمانؑ اور داؤدؑ کو بھی مل سکتا ہے۔ فرعون کا اقتدار یہ تھا اور قرآن نے یہ کہا ہے کہ قوم جو محکوم تھی' دن بدن اس کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔

نظام سرمایہ داری کو مستحکم کرنے کے سلسلہ میں ایک مقدمہ کی روئداد

اقتدار حضرتِ داؤدؑ کو بھی ملا ہے۔ قرآن نے کہا ہے حضرتِ داؤدؑ کے متعلق کہ اس کے پاس آ گیا وہ مقدمہ' کیا بات ہے قرآن سمجھاتا ہے کس کس انداز سے۔ آ گئے دو مقدمے والے اور قرآن نے اس مقدمے کو اپنے ہاں درج کیا ہے' اپنی آغوش میں' اپنی حفاظت میں لیا ہے مقدمے کی مثال کو۔ فریادی نے فریاد کی آ کر کہ صاحب یہ دیکھئے اس شخص کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں۔ میں غریب آدمی ہوں میرے پاس ایک ہی بھیڑ ہے۔ یہ کہتا ہے کہ ایک بھیڑ رکھ کے تم نے کیا کرنی ہے' مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی بھیڑ بھی مجھے دیدے نہیں تو میں چھین لیتا ہوں اور کہا (ھٰذا اخی) ساتھ یہ کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی بھی ہوں۔ مقدمہ یہ آ رہا ہے کہ کیا ننانوے بھیڑوں کے مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ جس بیچارے کے پاس ایک دنبی ہے' وہ بھی اس سے چھین لے۔ اصول تو یہ ہے نا آپ کے ہاں نظامِ سرمایہ داری کا کہ 'مایہ کو مایہ ملے کر کر لمبے ہاتھ' وہاں واقعی یہ ہوتا ہے کہ جس کے پاس ایک ہے وہ ننانوے والا اتنی کشش رکھتا ہے اپنے اندر' چھین کے لے جاتا ہے' اس کو پتہ بھی نہیں لگنے دیتا کب لے گیا ہے۔ وہ یاد ہے وہ دہقانی کی مثال: اس دہقانی نے یہ سن لیا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ اس نے بڑی محنت مزدوری کر کر کے دو دو چار پیسے کیے اور جا کے اس کو صراف کے ہاں دیا اور پیسوں کا روپیہ لے لیا' کہنے لگے اب روپیہ روپے کو کھینچتا ہے شہر آ گیا۔ ایک صراف کی دوکان پہ دیکھا روپوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا کہنے لگا موج ہو گئی' ایک طرف ہو کے اپنا روپیہ جو تھا وہ مارا اس کے اندر ڈھیر میں اور ایک طرف کھڑا ہو گیا پھر' اب انتظار کر رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا لالہ جی اُس نے کہا کہ بھئی تم اتنے وقت سے یہاں کھڑے ہو' بیکار کھڑے کیوں ہو' کہنے لگا جی میں ایک انتظار میں کھڑا ہوں' کہنے لگے کیا بات ہے' کہنے لگا جی میں نے گاؤں

کے سیانے سے سنا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے میں روپیہ لے کے آیا تھا میں نے وہ اپنا روپیہ اس ڈھیر میں پھینکا ہے اب میں وہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ کھینچ کے لے آتا ہے' لیکن میں ابھی تک دیکھ رہا ہوں کہ وہ بات تو غلط نکلی۔ لالہ جی نے کہا نہیں نہیں نہیں' سیانے کی بات غلط نہیں ہوتی بالکل ٹھیک کہا ہے' روپیہ روپے کو کھینچتا ہے اس روپے نے اُس روپے کو کھینچ لیا ہے' ڈھیر ایک روپے کو کھینچتا ہے۔ اصول ہے سرمایہ داری کا عزیزانِ من! کہ Bigger Capital' Smaller Capital کو کھا جاتا ہے۔ ننانوے دنبیوں والا جو ہے وہ ایک دنبی نہیں رہنے دیتا۔ حضرتِ داؤدؑ کے زمانے میں آیا مقدمہ اور آج ہمیں قرآن یہ بتا رہا ہے۔ اور اس میں جو ٹکڑا ہے نا وہ یہ (ھٰذَا اَخِیْ) کہ کہتا یہ ہے کہ تمہارا بھائی ہوں۔ ''ایویں خوامخواہ اک دنبی سویرتوں شام تیکر لے کے چراندا پھرنا ایں' محنت کرنا ایں' بندیا کی اے ایہد ے وچوں ایناں چُلو جنا دودھ وی نئیں ملدا تینوں' چھڈ ایتھے ملا اے ساریاں دنبیاں میریاں چار لیا کر' فرق ہے کچھ؟ اسی تے بھرا بھرا ہیگے آں''۔ کیا بات ہے عزیزانِ من! قرآن جو کہتا ہے کہ ہر دور کا یہ چھیننے والا دوسرے کو یہ کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں' جو یہ کہہ کے نہیں چھینتا' اسے دنیا ڈاکو کہتی ہے' جو ڈاکو یہ کہہ دیتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اس کو بڑا ہی مشکل سمجھتے ہیں۔ نظام ہی یہ ہے' باتیں ہی قرآن یہ بتانے کے لیے آیا تھا۔ کہہ میں یہ رہا تھا کہ یہ چیزیں جو ہیں' یہ ہے جو قرآن اصول دے رہا ہے۔ کشتی بناؤ نوحؑ سے کہا طوفان سے بچنے کے لیے۔ آج بھی کشتی بنانی پڑتی ہے طوفان سے بچنے کے لیے۔ وَ لَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّہُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ (11:37)

قانون کی حاکمیت کسی نبی کی حمایت کو بھی قبول نہیں کرتی

اور دیکھو کہ اس کے بعد تمہارے دل میں تو غم خواری کے بڑے جذبے اٹھتے ہیں ان کی طرف سے' اب یہ ڈوبنے لگے تو پھر اس وقت ان کی کسی قسم کی حمایت میں ہمارے ساتھ بات نہ کچھ کر لینا۔ جب قانون کی رو سے ایک فیصلہ ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر یہ بات غلط ہے۔ اب مجھے پتہ ہے کہ تمہارا دل پسیجے گا' پگھلے گا۔ کیا بات ہے اس نبی کی!! اور کیا بات ہے اس قانون کی بھی کہ جو پھر اس وقت نبی کی بھی نہیں سنتا۔ نبی کی دوسرے کے متعلق سننا تو ایک طرف نبی اکرم ﷺ کے متعلق اس قرآن میں یہ کہا ہوا ہے کہ اے نبی اعلان کر دو کہ اگر میں بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں گا تو میں بھی اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا' دوسرے کو بچانا تو ایک طرف رہا میں بھی نہیں بچ سکتا (6:15,10:15)۔ اس لیے کہا وَ لَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّہُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ (11:37) ان کے بارے میں اس وقت کوئی بات نہ کہنا مجھ سے' یہ ڈوبنے پہ آئے ہوئے ہیں' یہ ڈوب کے رہیں گے' یہ خودکشی کرنے والے ہیں' خودکشی کر کے رہیں گے۔ اس وقت تھمی ہوئی ہے بارش جناب' بات ہے قصۂ حضرتِ نوحؑ کی اور کشتی تو ہم نے بنائی ہوئی نہیں ہے میرا خیال ہے کہ اس وقت اب ختم کر دیں۔ ہم سورۃ ھود کی آیت 37 تک آ گئے 38 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

چھٹا باب: **سورۃ ھود** (آیات 38 تا 46)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1974ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 38 سے ہو رہا ہے۔ (11:38)

ہر نبی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا دین ہمیشہ ایک ہی نوعیت کا ہوتا تھا

آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلۂ کلام داستانِ حضرتِ نوحؑ سے چلا آ رہا ہے۔ بنیادی طور پر دو نقاط دہرادوں تجدید یادداشت کے لیے کہ یہ آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی پہلی کڑی ہے جن کا ذکر قرآن میں آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ انبیائے کرامؑ کی بنیادی دعوت یہ ہوتی ہے کہ اُعبدوا اللہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو کسی اور کی نہیں' یہ تو ہے اصل و بنیاد دین کی۔ اور یہی وہ ہے اصل و بنیاد جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے قرآنِ کریم میں کہ ہم نے نوحؑ سے لے کر پھر انبیائے کرامؑ کا ذکر آ رہا ہے نبی اکرم ﷺ تک' کہا یہ ہے کہ ہم نے دین ایک ہی دیا تھا اس میں کوئی اختلاف نہیں تھا' فرق نہیں تھا کہ فلاں نبی کو فلاں دین دیا اور دوسرے کو دوسرا دین دیدیا۔

مذہبی سوچ ہمیشہ فرقے پیدا کرتی ہے جب کہ دین اجتماعیت کا علمبردار

یہ جو آپ اختلاف دیکھ رہے ہیں مختلف انبیاء کی امتوں میں یہ مذہب کا اختلاف ہے جو انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ مختلف انبیاء

میں تو ایک طرف رہا ایک ہی نبی کی امت کے اندر اور اپنے ہی اندر دیکھئے' امتِ محمد ﷺ کے اندر' جو آپ کو اتنے فرقے نظر آ رہے ہیں یہ دین کے فرقے نہیں ہیں۔ دین میں تو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا' یہ مذہب کے فرقے ہیں۔ پہلے مختلف مذاہب کے اندر فرقے الگ الگ اختلاف اور پھر وہ لٹھم لٹھا ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک ہی مذہب کے اندر مختلف فرقے' وہ آپس میں ہر روز دھینگا مشتی کرتے رہتے ہیں۔ دین تو ایک ہی تھا جو شروع سے آخر تک آیا اور اس کی بنیاد یہ تھی (اُعْبُدُوا اللّٰہَ) صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو۔

مذہبی پیشوائیت نے تو خدا کی اطاعت اور محکومیت کو پرستش اور پوجا پاٹ میں بدل دیا ہے

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ جو قرآن نے کہا ہے نا کہ ذرا سا Twist کر دیتے ہیں مذہبی پیشوائیت والے۔ وہ ایک لفظ عِوَجًا آیا تھا صحیح ہے' اس کا ترجمہ یہ ذرا سا Twist کر دیتے ہیں اُسے۔ تو وہ Twist انہوں نے یہ کیا کہ اُعبدوا اللہ جو کہا قرآن نے کہ صرف خدا کے قوانین کی اطاعت اس کی محکومیت' انہوں نے عبادت کا ترجمہ کیا پرستش' بندگی' پوجا پاٹ بس جہاں یہ چیز آئی سارا مفہوم تبدیل ہو گیا۔ اب وہ بندگی ہے' پرستش ہے۔ رام بھی وہی ہے' رحیم بھی ہے۔ 'گنگا ایک گھاٹ بہتیرے دیکھ کبیر عقل کے گھیرے۔ ایک ہی گنگا ساری جتنی بھی ہے' گھاٹ بہتیرے ہیں۔ تو یہ انہوں نے کہا کہ یہ عبادت کے طریقے ہیں' یہ پرستش کے طریقے ہیں' پوجا پاٹ کے طریقے ہیں' بندگی کے ہیں یہ سارا کچھ ہے۔ ورنہ اگر عبودیت ہوتی' محکومیت خدا کی ہوتی تو اس کے قوانین کی تلاش ہوتی کہ کہاں ہیں اور مذہب میں تو قانون کا سوال نہیں ہوتا۔ تو پہلی چیز جو تھی وہ یہ آئی' اور دوسرے میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہر نبی آتا تو اسی لیے ہے کہ ایسا نظام قائم کرے جس میں صرف خدا کی محکومیت ہو۔ تو قرآنِ کریم جو ان کا تذکرہ کرتا ہے تو ہر نبی کے معاشرے میں جو جرم سب سے نمایاں ہوتا ہے' اسے وہ قرآن نمایاں طور پر بیان کرتا ہے۔ اور یوں دکھائی دیتا ہے بظاہر کہ وہ نبی صرف اس جرم یا اس کمزوری یا اس نقص کی اصلاح کے لیے آیا تھا' بات یہ نہیں ہے۔ وہ آتا تو تھا دین کا وہی نظام قائم کرنے کے لیے اُعبدوا اللہ والا' اور جو سب سے بڑی خرابی اس معاشرے میں ہوتی تھی' اس زمانے میں اس کا وہ خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔

قومِ حضرت نوحؑ کی طرف سے پیش کردہ دین پر کیا جانے والا اعتراض

حضرتِ نوحؑ کے زمانے کی جو سب سے بڑی خرابی' سب سے بڑا نمایاں جرم بیان کر رہا ہے جس کی بناء پہ کہا کہ وہ اس قابل قوم تھی کہ غرق کر دی جاتی۔ وہ جرم یہ بتایا ہے کہ وہ کہتے یہ تھے کہ معاشرے میں عزت کا معیار دولت ہے۔ وہ کہتے یہ تھے کہ یہ جو لوگ ہمارے معاشرے میں چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں' یہ لوہار ہے' بڑھئی ہے' حجام ہے' یہ کنجڑے ہیں' دھوبی ہیں یا نائی ہیں' کمین ہیں ہمارے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ آپ کی دعوت جو یہ کہتی ہے کہ یہ اور ہم دونوں برابر مساوات کی حیثیت سے ایک ہی جگہ بیٹھیں گے' یہ ہمارے لیے

قابل قبول نہیں ہے۔ وہ کوئی اور اعتراض نہیں کر رہے قرآن نے ایک ہی اعتراض ان کا کہا ہے کہ صاحب یہ تو چیز ہمارے لیے قابلِ قبول ہی نہیں کہ یہ ہمارے ہاں کا دھوبی اور ہم صاحب ایک ہی جگہ بیٹھ جائیں۔ مساوات ہم میں قائم ہو جائے' بالکل غلط ہے۔ یعنی یہ تھا پہلی وحی میں پہلے نبی کی دعوت کا جو قرآن نے نمایاں طور پہ ذکر کیا۔ وہ یہی ہے جسے آج آپ طبقاتی تقسیم کہتے ہیں۔

عقل انسانی کے بیسیوں صدی کے سفر زندگی کا نتیجہ

آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسان یا زمانہ یا دنیا چل چلا کے آخر میں کہاں پہنچ رہی ہے۔ قرآن نے پہلی وحی کا یہ ذکر کیا ہے۔ آج بیسویں صدی میں ہم آخری بات یہ سن رہے ہیں کہ طبقاتی تقسیم جو ہے وہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ تو پہلی وحی نے جو ذکر کیا ہے' وہ اس کا ذکر کیا ہے جسے بیسویں صدی کا انسان تمام برائیوں کی جڑ قرار دے رہا ہے اور بہت بڑا اس کے اوپر شور مچایا جا رہا ہے کہ ہاں صاحب اصل نظام یہ ہے۔ نام اس کا اب وہ کچھ بھی رکھیں' وہ سوشلزم اور کمیونزم اور مساوات اور کیا اور کیا' سوال یہ نہیں سوال بنیادی یہ ہے جو پہلے دن پہلی وحی نے آ کے کہا کہ یہ تمہارا معیار غلط ہے معاشرے میں۔ جو مختلف کام کیے جاتے ہیں' وہ معاشرے کی ضرورت ہے' تقسیمِ عمل ہے' تقسیمِ کار ہے۔ اس سے انسانی زندگی پہ اثر نہیں پڑتا انسانی زندگی سے اثر پڑتا ہے انسانیت کس قسم کی ہے کسی کے اندر۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (11:31) تم دیکھو کہ ان کا کردار کیسا ہے' ان کے دل پہ نگاہ رکھو' یہ دیکھو کہ وہ انسان کس قسم کے ہیں' یہ نہیں کہ وہ معاشرے میں کام کیا کرتے ہیں۔ یہ تو تقسیمِ کار ہے اس کے بغیر معاشرے چل ہی نہیں سکتے۔ پہلی وحی یہ آ کے کہتی ہے اور وہ اسی چیز کے اوپر اڑ جاتے ہیں کہ نہیں صاحب انہیں نکال دو اپنے ہاں سے' پھر ہم آ جائیں گے۔

انسانی دنیا تو آج بھی طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کے پروگرام میں عملی طور پر تیار نہیں ہوئی

دیکھا یعنی جو تعلیم بنیادی ہے اس پہ اعتراض نہیں پڑ رہا۔ اعتراض یہ ہو رہا ہے کہ انہیں کیوں تم وہاں بٹھا رہے ہو اور پھر جب ہم آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کے ایک جماعت' ایک امت' ایک مساواتی بات ہو گی' ہم اسے ماننے کو تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں انہیں نکال دو پھر ہم آ جائیں گے۔ غور سے سنیے اس چیز کو کہ ہمیں اس آنے پہ اعتراض نہیں ہے تمہارے ساتھ ملنے' پہ اعتراض نہیں ہے۔ اعتراض اس پہ ہے جو یہاں آنے کے بعد تم کہو گے کہ یہ سارے انسان مساوات کی حیثیت سے ایک ہو گئے' یہ نہیں ہم ماننے کو تیار۔ آج بھی یہ کوئی ماننے کو تیار ابھی نہیں ہے' جنہوں نے یہ دعوے کر رکھے ہیں' اپنے ہاں کلاسز کو ختم کرنے کی' ان کے ہاں بھی کلاسز موجود ہیں۔ یہ تو ایک ہی چیز ہے جو بنیاد ہے اس کی بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (11:31) . اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (49:13)

قرآن حکیم کے نزدیک انسان کے جوہر ذاتی اور کردار کی بلندی کا راز مکافاتِ عمل اور زندگی کے تسلسل پر ایمان لانے پر ہے

سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے' جس کی زندگی ان قوانین' اس پیٹرن کے مطابق ہے جو قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یہ ہے وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:132) مدارج معاشرے کے اندر انسان کے جوہرِ ذاتی اور کردار سے قائم ہوں گے اور یہ بنیاد ہے' کردار کی بنیاد ہے انسان کے مکافاتِ عمل پر ایمان رکھنے کی جسے آپ آخرت پر ایمان کہتے ہیں۔ جب تک یہ بنیاد نہ ہوگی عزیزانِ من! آپ کوئی ازم بھی لے لیجیے گا خواہ وہ مارکس ازم ہے' خواہ وہ کمیونزم ہے' کوئی ازم بھی لے لیجیے گا جب تک اس میں وہ جو اقبالؒ نے کہا تھا نا کہ خدا پلس بالشوزم' اسلام ہے۔ یہ پلس خدا جو اس نے کہا تھا اس کے معنی یہ تھے کہ یہ جو ایمان ہے مکافاتِ عمل پر' یہ ایمان جو ہے زندگی کے تسلسل پر' یہ درمیان میں آئے گا' یہ بنیاد بنے گا تو پھر خرابیاں مٹیں گی اس کے علاوہ خرابیاں مٹ نہیں سکتیں' طبقات مٹ نہیں سکتے وہ شکلیں اور اختیار کر لیں گے' نام ان کے کچھ اور ہو جائیں گے۔ چھوٹی سی بات ہے عزیزانِ من! کبھی غور کیجیے گا اس پہ' یہ جو آپ کے ہاں یا عام دنیا کے اندر جنہوں نے طبقات مٹانے کا اعلان کیا ہے' یہ جو اصطلاح ہے عوام ذہنوں میں ایسا آتا ہے نا کہ اس سے طبقات مٹا دیئے لفظِ عوام کے معنی ہی ہیں کہ ایک اور لفظ ہے جسے خواص کہتے ہیں۔ یعنی اس لفظ کے معنی نہیں ہو سکتے جب تک اس کے ضد میں ایک لفظ خواص نہ ہو۔ تو یہ جو ہمیں' آپ کو' یہ ساری دنیا کو عوام کہا جاتا ہے تو کوئی کہنے والے خواص ہوتے ہیں نا۔ تحت الشعور کے اندر وہی چیزیں ہیں جو انگڑائیاں لے رہی ہیں' جب بھی کسی نے اپنے آپ کو حاکم کیا' اس پہ مستلزم ہے کہ محکوم ہو دوسرا' حاکم کہہ ہی نہیں سکتے جب تک محکوم کوئی دوسرا نہ ہو ورنہ وہ حاکم کس پہ ہے۔ یہ ہے بنیاد اس چیز کی۔ انسانیت جب آئے گی سامنے تو وہ اس چیز پہ آئے گی کہ ہر انسان کے اندر وہ جسے روحِ خداوندی کہا جاتا ہے' جسے ذات کہا جاتا ہے' ہر انسان کے اندر وہ موجود ہے اب انسانوں کے اندر یہ عوام اور خواص محکوم اور حاکم ماتحت اور افسر یہ تمیز نہیں رہے گی' یہ طبقات نہیں رہیں گے۔ یہ ہیں طبقات عزیزانِ من! اس کا تعلق صرف معاش سے ہی نہیں ہے' دولت سے ہی نہیں ہے۔ یہ تصور جو ہے انسان اور انسان کے درمیان بحیثیت انسان کے کوئی فرق نہ ہونا' اس کی بنیاد اس پہ ہے کہ اس چیز کو تسلیم کیا جائے کہ ہر انسانی بچہ روحِ خداوندی کا پیکر ہوتا ہے۔ اور یہاں یہ جتنی ازمز ہیں' اس میں خدا ہی کا انکار ہے۔ روحِ خداوندی اور نفسِ روح اور مکافاتِ عمل اور آخرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

؎ دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

ہر انسانی بچہ روح خداوندی کا پیکر ہونے کی بنا پر واجب التکریم ہے

تو یہ جو کہا گیا تھا نا کہ خدا اس میں داخل کیجیے ان ازمز کے اندر پھر وہ اسلامی ہوگا تو اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ اس کے ساتھ لفظ اسلامی لگا دیجیے یا خدا لگا دیجیے۔ معنی یہ تھے کہ بنیاد اس کی بنایئے خدا پر تصور اور وہ بنیاد یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے ہر انسانی بچہ روحِ خداوندی کا پیکر ہوتا ہے اور یہ روحِ خداوندی ہے جو مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے جسے انسانی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ اور یہ ہے جو ذمہ دار ہوتا ہے انسان کے ہر عمل کا حتٰی کہ ہر ارادے تک کا بھی۔ یہ بنیاد بنایئے اور پھر دیکھئے معاشرے میں کیسے اصلاح نہیں ہوتی، پھر طبقات مٹتے ہیں عزیزانِ من! پھر برائیاں اور خرابیاں مٹتی ہیں۔ ورنہ عوام تو عوام ہی رہتے ہیں۔ پہلے بھی تھا لفظ یہ 'عوام کالانعام' ہے نا آپ کے ہاں اردو میں ہے یا نہیں محاورہ چلا آ رہا، وہ تو عربی زبان کا ہی ہے آپ نے اپنے ہاں اپنا لیا ہوا ہے 'عوام کالانعام' کہ عوام جو ہیں یہ تو ڈھور ڈنگر ہوتے ہیں۔ سوال ہی نہیں ہے۔ انسانی مساوات جو ہے اس کا مدار اس چیز کے اوپر ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے اور اس کے بعد معاشرے میں درجے مدارج، مراتب، مناصب متعین کیے جائیں (بِمَا عَمِلُوْا) انسان کے کریکٹر اور کردار کی بناء پر متعین کیے جائیں۔

سوشلسٹ اور کمیونسٹ ممالک میں wages کے معیار کا معاملہ جسے عقلِ انسانی آج تک حل نہیں کر سکی

میں نے جیسا عرض کیا تھا یہاں تو ابھی جو بڑے بڑے یہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ کنٹری بنے پھرتے ہیں ان کے ہاں بھی معیار یہ Wages کا بھی ان کے ہاں جو ہے، انسانیت کے اوپر نہیں ہے۔ میں کئی دفعہ یہ دہرا چکا ہوں، وہ بات بڑی بنیادی ہے کہ وہ معیار کیا ہے جس کے مطابق آپ ایک مزدور کو چار روپے دیتے ہیں، ایک مستری کو دس روپے دیتے ہیں، اور سیئر کو تیس روپے دیتے ہیں، کیا معیار ہے۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلی چیز خدا کی پہلی وحی نے جو ہمارے سامنے کہی ہے قرآن کی رو سے وہ یہ ہے کہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ جو عوامی لوگ ہیں، یہ جو چھوٹے چھوٹے پروفیشنز اختیار کیے ہوئے ہیں، کمی ہیں ہمارے ہاں کے، ہم ان کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔

سیلاب کی تباہ کاریاں ہوں یا کوئی اور خرابی اس کی بنیادی وجہ انسانوں کی اپنی کوتاہی اور بدنیتی ہوتی ہے

بہر حال یہ آگے بات چلی جا رہی ہے۔ بات یہاں تک آ گئی تھی کہ حضرتِ نوحؑ نے ان سے کہا کہ یاد رکھو اور چیزوں کو تو چھوڑو ایسا نظر آ رہا ہے کہ اگر یہاں بارشیں زیادہ ہوئیں، یہ تمہارا گاؤں تمہاری بستی، یہ نشیب میں واقع ہوئی ہے۔ اردگرد پہاڑیاں ہیں۔ کبھی بھی ایسا ہوا کہ وہ نارمل سے زیادہ بارشیں آ گئیں (یہ جیسا آپ کے ہاں ہوا تھا پچھلے سال) اور تم نے اپنے ہاں انتظام نہ کیا ان سے بچنے کا تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اُنہوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ یہ ایک چیز بڑی سوچنے کی ہے کہ قرآنِ کریم ہمارے نقطۂ نگاہ سے ذکر تو یہ کرتا ہے کہ ان میں یہ اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، ذکر آگے یہ کرتا ہے کہ وہ کہتے یہ ہیں کہ صاحب تم نے انتظام یہ نہ کیا اپنے ہاں تو یاد رکھئے گا، سیلاب سے

تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ ان دونوں کے اندر ربط کیا ہے۔ یہ خیال آج کا نہیں' اکثر ستاتا ہے ذہنوں میں' یہ بڑا غور سے سنیئے گا جو میں عرض کر رہا ہوں۔ یہ تمام انبیائے کرامؑ کے متعلق یہ بات آئے گی کہ خرابیاں تو وہ ایسی گنائیں گے بظاہر جیسی ہمارے ہاں ذہن میں ہے کہ اخلاقی خرابیاں ہونگی۔ اوراس کے بعد بات یہ آئے گی کہ وہ کہیں ایک طوفان آجائے گا' کہیں جھکڑ چلے گا' کہیں یہ آتش فشاں پہاڑ میں سے لاوا نکلے گا اوراس طرح سے تباہیاں ہونگی۔ کہاں ایک وہ قومِ سبا نے ڈیم بنایا تھا' وہ ڈیم کا پشتہ ٹوٹ جائے گا اور وہ ٹوٹنے کے بعد وہ سارے کے سارے بہہ جائیں گے اس سیلاب میں۔ ذکر ہر نبی کی قوم کا' اخلاقی خرابیوں کا آتا ہے' تباہیاں ان کی اس طرح سے ہوتی ہیں' اخلاقی خرابیوں میں اور ان کے اندر یہ آپس میں ربط کیا ہے جو قرآن بتاتا ہے۔ بڑی گہری چیز ہے یہ۔ اور ربط تو ہمارے سامنے آجاتا ہے صاحب۔ ابھی حال ہی میں پچھلے چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تو یہاں سے لاہور سے یہ جی ٹی روڈ بنی تھی' آپ کے ہاں مرمت ہوئی تھی۔ کہتے ہیں قریباً چھ کروڑ روپیہ اس کے اوپر صرف ہوا تھا اوراس کے متعلق بڑا چرچا تھا کہ ایک تھوڑے سے وقت کے اندراس طرح سے یہ مکمل ہو جائے گی۔ اس کے مکمل ہوئے ابھی مہینہ بھر بھی نہیں ہوا تو آپ کو معلوم ہے اس کے متعلق تحقیقات شروع ہوگئی۔ تحقیقات کے نتیجے میں ابھی پرسوں ہی نکلی یا پرسوں شام یہ دکھایا گیا تھا ٹی وی پہ کہ وہ ساری کی ساری سڑک یا شاید 75% اس کا حصہ جو ہے وہ ایک ہی بارش میں بہہ گیا۔ اوراس کے بعد پھر انہوں نے وہ چیف انجینئر اور جو متعلقہ افسر تھے' سرِ دست ان کو معطل کیا۔ اب ان کے متعلق تحقیقات شروع ہوگئی۔ یہاں تک ہمارے ذہنوں میں یہ بات آرہی ہے کہ واقعی وہ میٹریل خراب تھا دو بارشیں بھی نہیں ہوئیں تو اوپر سے وہ بہہ گیا' نیچے سے وہ دکھایا تھا ٹی وی پہ' انہوں نے کہا مسالہ کیا لگایا تھا انہوں نے۔ تو یہ نظر آتا ہے نا کہ یہ مسالے کی خرابیاں تھیں تو سزا جو ملی ہے۔ مسالے کو نہیں ملی' سزا کے لیے وہ جو مسالہ لگانے والے تھے نا ان کے اوپر یہ بات آرہی ہے۔ اب اس کے بعد تحقیقات ہوگی خرابی جو نکلے گی کہ انہوں نے یہ مسالہ خراب لگایا' یہ کیوں خراب لگایا۔ عزیزانِ من! اس لیے کہ ان کا کریکٹر اچھا نہیں تھا' یہ بے ایمان تھے' یہ بددیانت تھے' رشوت خور تھے ان کی آنکھوں کے سامنے یہ ہو رہا تھا انہوں نے اپنے فرائض کو سرانجام نہیں دیا' اسے ہی تقویٰ کہتے ہیں۔

لفظ متقی یا تقویٰ کا قرآنی مفہوم اوراس سے لاتعلقی کا نتیجہ

عزیزانِ من!۔ اگر قرآن سے پوچھو گے تو وہ اس ساری چیز کو جامع طور پہ کہے گا کہ یہ لوگ متقی نہیں تھے ان کی سڑک اس لیے تباہ ہوگئی' برباد ہوگئی ایک ہی بارش کی حریف نہ ہو سکی کہ یہ بنانے والے متقی نہیں تھے۔ یہ اس کی اصطلاح ہے جی جامع۔ بددیانت' بے ایمان' رشوت خور' فرائض سے تغافل برتنے والے' چشم پوشی کرنے والے' یہ ساری چیز جامع طور پہ تقویٰ کے اندر آتی ہے۔ قرآن کہے گا کہ یہ اس لیے سڑک تباہ ہوئی' سڑک کے ساتھ ہی پھر بستیاں تباہ ہونگی' بند غلط بنائیں گے سیلاب روکنے کے لیے' سیلاب سے یہ سارا ملک تباہ

ہوگا' جیسا تباہ ہوا ہے۔ جب بھی اس کے آگے چلیں گے تو بات تو درمیان میں میٹریل اور مادی آئے گی' سیمنٹ اچھا نہیں تھا' وہ بجری اس قسم کی نہیں' بند میں ریت لگا دی گئی تھی یہ سب چیزیں میٹریل آ رہی ہیں۔ اس کا انتظام بھی یہی تھا کہ اگر وہ میٹریل ٹھیک لگاتے' ترتیب سے قاعدے کے مطابق' قانون کے مطابق یہ سب کچھ بنتا' میٹریل وہی لگتا تو پھر تو تباہی نہ آتی نا۔ یہ میٹریل اچھا کیسے لگتا۔ میٹریل تو اڑ کے کہیں سے آپ نہیں آ جاتا کہ جی میں لگنا چاہتا ہوں۔ دوسرا میٹریل ناقص کہتا ہے نہیں اونہیں' تم چلے جاؤ میں لگنا چاہتا ہوں' یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ سیمنٹ کی بوری وہاں آ کے دوسری ریت اور سیمنٹ کی ملی ہوئی بوری سے ٹکراتی ہے۔ وہ سیمنٹ اچھا لگتا ہے لگانے والے متقی ہوتے ہیں۔ غلط لگتا ہے ان میں تقویٰ نہیں ہوتا' یہ ہے اصطلاح عزیزانِ من! قرآن کی۔

یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے یعنی تقویٰ باقی نہیں ہے' ہم متقی نہیں ہیں

ہم نے یہ متقی اور تقویٰ کو تو سمیٹ کے رکھ دیا مسجد کی چار دیواری کے اندر اور باہر کی دنیا جتنی تھی اس کے لیے ہم نے اپنے معیار اور مقرر کر دیے۔ انجینئر کس کو بنایا جائے گا' ٹھیکہ کس کو دیا جائے گا' سپروائزر کون ہوگا' اس کا معیار تقویٰ نہیں' اس کا معیار کچھ اور۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے معیار' کوالیفکیشن کے اعتبار سے بھی بالکل ٹھیک ہوں بہت اچھا کوالیفائڈ انجینئر لگا دیا ہم' نے بڑی ڈگریاں تھیں اسکے پاس' اوورسیر لگایا بڑا تجربہ تھا صاحب اس کو سڑکیں بنانے کا' یہ سب کچھ جو ہے میٹریل ہم نے سیمنٹ بہترین کمپنی سے منگایا تھا۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے' ان کوالیفکیشن میں یہ نہ دیکھا کہ یہ انسان کے بچے بھی ہیں یا نہیں' متقی ہونا تو آگے کی بات ہے۔ اگر یہ کوالیفکیشن جو آپ کے ہاں ہے کسی کام کے سپرد کرنے کی' یہ سارا کچھ ساتھ رکھ کے اس کے اندر خدا کو لے آیا کریں تو کبھی بھی یہ تباہیاں نہ آئیں۔

ہم نے تو خدا پر ایمان کو مسجد کی چار دیواری تک محدود کر رکھا ہے

اب معلوم ہوا خدا پر ایمان تباہیوں سے کیسے بچاتا ہے۔ خدا پر ایمان نہ ہونے سے تباہیاں کیسے آتی ہیں۔ ربط پتہ چلا اب دونوں کا کیا ہے۔ خدا کو اگر آپ مسجد تک محدود کر دیں اور سجدوں تک مقصود کر دیں پھر تو کوئی ربط نظر آتا صاحب کہ یہ کیا ربط ہے صاحب اس میں کہ یہ نماز نہیں پڑھتا تھا' اس لیے سڑک خراب ہوگئی' نماز پڑھنے والوں کی سڑک کب اچھی ہوتی ہے۔ ہم نے محدود کر دیا تقویٰ اور خدا کو اس میں' لائیے نا تقوے کو وہاں کہ انجینئر کا کوالیفائڈ ہونا' Experienced ہونا' بہترین Talents کا مالک ہونا اور متقی ہونا ضروری ہے' پھر کہیے کہ سڑک ٹوٹ جائے۔ اسے رکھیے ذہن میں اور آگے آ جائیے پھر۔

قرآن حکیم کا فرمان یہ ہے کہ قوموں کی تباہی و بربادی ہمیشہ با اختیار لوگوں کی بدکرداری کی وجہ سے ہوتی ہے

جس معاشرے میں جس نظام میں وہاں طبقاتی تقسیم کی یہ کیفیت تھی کہ اوپر کا خواص کا طبقہ اتنا بدمست ہو گیا ہوا تھا اپنی قوت و دولت وثروت کے نشے میں کہ وہ خدا کا نبی ایک بات کہتا ہے' ایسی معقول بات کہہ رہا ہے۔ اس بات کے خلاف اعتراض نہیں ہے کوئی انہیں' قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ انہوں نے اس بات پہ اعتراض کیا تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ صاحب ہم بھی اور یہ بھی ایک جگہ بیٹھ جائیں؟ قطعاً نہیں۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ جب معاشرے کے اندر اوپر کے طبقے کے اندر یہ چیزیں پیدا ہو جائیں' معاشرے کا کوئی مادی نظام بھی صحیح نہیں رہتا۔ دیکھا اس مادی نظام اور اس معاشرے کے ذمہ دار طبقے کے تقویٰ میں کتنا بڑا ربط ہے آپس میں' بنیاد ہی یہ ہے عزیزانِ من۔ یہ جتنی مادی خرابیاں آج آپ گناتے ہیں اپنے معاشرے کی' خرابیاں تو مادی ہیں نا' پیاز اگر چار آنے سیر سے چار روپے ہوتا ہے تو یہ Purely Material چیز ہے' اکنامک ہے۔ اس میں معاشی چیز ہے یعنی خدا تو کہیں نہیں آتا نہ درمیان میں' آٹا اصلی نہیں ملتا' میٹریل چیز ہے اس میں خدا کا کیا تعلق ہے۔ اس کے متعلق جب یہاں تحقیقات ہوں گی اور یہاں اس کا تجزیہ ہوگا تو وہ بھی میٹریل سارا ہوگا' لایئے خدا کو درمیان میں اور اس کے بعد چلئے پیچھے کو کہ صاحب یہ کیوں چار روپے ہو گیا' کہ جی ذرا سی کمی واقع ہوئی تھی اس پیداوار میں (میں یونہی کہہ رہا ہوں مثال کے طور پر)' جن لوگوں کے پاس انہوں نے اس کو سمیٹ کے رکھ لیا' اندر چلا گیا یہ۔ وہ پیاز اندر چلا نہیں جاتا' وہ پیاز کو اندر روکتے ہیں' یہ کون روکتے ہیں؟ وہ روکتے ہیں جن کے اندر رب نہیں ہوتا' جن کے اندر خدا نہیں ہوتا۔ یہ خدا ہونے والی بات کیا ہے؟ جنہیں یہ معلوم ہے کہ اس روکنے سے ہو سکتا ہے کہ ملک کے قانون کے تو یہ خلاف نہ ہو یا ہم بچ بھی جائیں اس قانون کی نگاہوں سے' ہزار راستے ہیں بچنے کے صاحب۔ لیکن اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سے خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتا' مکافاتِ عمل سے نہیں بچ سکتا اس سے میری ذات تباہ ہو جائے گی جسے جہنم کہتے ہیں۔ یہ درمیان میں بات ہو تو پھر نہ پیاز اندر جاتا ہے لڑھک کر' نہ اکٹھا ہوتا ہے' نہ چار آنے سے چار روپے ہوتا ہے۔

اگر انتظامی مشنری مخلص ہو تقویٰ شعار ہو تو پھر سیلاب بھی تباہ نہیں کر سکتا

ہر مسئلہ کی یہ صورت ہے۔ سیلاب تباہ نہیں کرتے عزیزانِ من! سیلاب کو روکنے کے انتظامات کرنے والے جو تھے ان کا کریکٹر تباہ کرتا ہے۔ بس اسے ہی قرآن کی اصطلاح میں آپ ایمان اور تقویٰ کہتے چلے جایئے۔ ایک بات بدل دیجئے' معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ تقویٰ ہے جو Decisive Factor ہے یہ سارا نظام بگڑا ہوا اس لیے ہے کہ وہی بات کہ یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے۔ Lay Down کیجئے کوالیفکیشن' سلیکشن کے لیے جتنی جی چاہے اونچی سے اونچی' درمیان میں یہ رکھئے کہ اس کا متقی ہونا ضروری ہے پھر

دیکھوں کیسے یہ سیلاب بستیوں کو ڈبو دیتے ہیں۔ اور اگر وہ تقویٰ شعار وہ نہیں ہے تو پھر تو ایک چھوٹے سے جوہڑ میں بھی بستی ڈوب سکتی ہے عزیزانِ من!۔ اب اس چیز کو ذہن میں رکھ کے قرآن کی ان داستانوں کو پڑھئے۔

حضرتِ نوحؑ کی داستان آ رہی ہے بتایا یہ جا رہا ہے کہ معاشرے میں بنیادی خرابی یہ تھی اس خرابی کا نتیجہ یہ تھا کہ اوپر کا طبقہ' یہی اوپر کا طبقہ ہوتا ہے ذمہ دار افراد جن کو آپ کہتے ہیں نظم و نسق والے۔ وہ اپنی اس دولت اور قوت یہ جو معیار تھا ان کے ہاں عزت کا اس کے نشے میں اتنے بدمست تھے کہ انہوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر یہاں اس قسم کی تباہیاں آئیں تو اس کے لیے ہمیں کیا انتظام کرنا چاہیے۔ دیکھا بات کہاں آ گئی۔ ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ ہمارے پاس تو اتنا سامان موجود ہے آ گئے تو کوئی بات نہیں' فوراً سواریوں پہ سوار ہو نگے چلے جائیں گے' ہوائی جہاز پہ اڑیں گے کسی اور ملک میں جا پہنچیں گے۔ وہ مطمئن تھے اس سے۔ غریبوں کا دھیان ہی اس طرف نہیں آنے دیتے تھے۔ جسے آپ عوام کہتے ہیں وہ تو بیچارے صبح اٹھتے تھے' ان کے کام دھندوں میں اتنے لگے ہوئے تھے۔ انہیں فرصت ہی نہیں ملتی تھی روٹی کے دھندے سے۔ فرصت نہیں ان بیچاروں کو ملتی وہ کیا سوچیں کہ سیلاب کا کیا انتظام کیا جائے گا۔ وہ تو پچھلے سیلاب کی زد سے ابھی نکلتے نہیں تو اگلا سیلاب پھر آ جاتا ہے ان کے اوپر۔ یہ چیز تھی جو ان سے کہی گئی۔

قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بدل جانے سے قرآن حکیم کی پوری تعلیم اور تصورات ہی بدل گئے ہیں

اِدھر سے یہ ایک جماعت ہے جس کا سربراہ ایک نبی ہے' عام ریفارمر نہیں' منتخب کیا ہوا خدا کا چنا ہوا ایک نبی' بظاہر دعوت نظر آ رہی ہے رشد و ہدایت جسے ہم کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ الفاظ ہمیں اب یا ان کے مفہوم متعین کرنے چاہئیں یا الفاظ بدل دینے چاہئیں عزیزانِ من!۔ ہمارے ذہنوں میں میں نے کہا ہے نا کہ جب بھی ہم یہ داستانیں پڑھتے ہیں' نبی رسول آتا ہے ایک واعظ ہوتا ہے ہمارے ذہن میں کھڑا منبر کے اوپر وعظ کہہ رہا ہے۔ وہ واعظ نہیں ہوتا' وہ بہت بڑا انقلابی ہوتا ہے' وہ معاشرے کی ان چیزوں پہ جسے آپ زمین کی باتیں کہتے ہیں' وہ زمین کی باتیں کرتا ہے آسمان کی روشنی میں' بس اتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ ان سے یہ کہہ رہا ہے۔ نبی ہے نبی کے ساتھ ان کی جماعت ہے۔ جماعت تو متقین کی صالحین کی نیک بندوں کی جماعت ہے نا یہ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کل کو اگر یہاں بارش ہوگئی تو کیا بنے گا۔ ہمارے ذہنوں میں تو یہی آئے گا نا اس سے کہ خدا نے ان برے لوگوں کو ڈبونے کے لیے یہ انتظام کیا بارش کا' تو اگر خدا نے یہ ان کو ڈبونے کا انتظام کیا تھا تو جو اچھے لوگ نیک لوگ تھے ان کے بچانے کا بھی تو کچھ ہونا چاہیے تھا نا۔ اگر یہ نیکیاں اور برائیاں جو ہمارے ذہن کی ہیں' ان کی بناء پر کوئی یہ ڈوبتے تھے اور وہ بچتے تھے تو پھر تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے ایک آیت سنیے اور اس کے بعد آیئے سورۃ انبیاء میں یہی حضرتِ نوحؑ کا قصہ ہے۔ یہ چیزیں عزیزانِ من! جو میں آج بیان کر رہا ہوں آپ دیکھیں گے بڑی

بنیادی چیزیں ہیں اور قرآن کے سمجھنے میں جو بہت سی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں' اس سے یہ باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔

کسی نبی کا خدا کو پکارنے کا مفہوم

وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ (21:76) اس سے پہلے نوح نے جب ہم کو پکارا۔ اب یہ دیکھئے کہ یہ پکارنا ہے ایک نبی کا۔ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ (21:76) ہم نے اس کی پکار کا جواب دیا۔ تو بات ہوگئی نا کہ نوحؑ نے یہ کہا تھا کہ یہ جو ایک اتنا بڑا ایک عظیم طوفان ہے یہ کچھ آنے والی مصیبت ہے' عذاب ہے' تباہی ہے' اس سے بچنے کی دعا مانگی تھی فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ (21:76) ہم نے وہ دعا قبول کی اس کی۔ فَنَجَّیۡنٰہُ وَ اَھۡلَہٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ (21:76) ہم نے اسے اور اس کی جماعت کو اس بہت بڑی تباہی سے محفوظ رکھا' بچا لیا۔ یہ آیت ہے قرآن کی پھر سن لیجیے نوحؑ جیسے پیغمبر نے خدا کو پکارا۔ ہم نے اس کی پکار کو سن لیا اور اس کے بعد ہم نے اسے اور اس کی جماعت کو اس تباہی سے بچا لیا۔ ہمارے ذہن میں تو یہ ہے نا کہ انہوں نے دعا مانگی ہے اور پھر خدا کہہ رہا ہے' ہم نے قبول کر لی دعا ان کو بچا لیا' ٹھیک ہے جی ایسا ہوا ہوگا کہ وہ طوفان آیا اور آتے ہی پانی جو تھا وہ جو ان کے ہاں کے مخالفین تھے' ان کے گھروں میں تو گھس گیا اور جب ادھر آیا تو اس نے پوچھا کہ یہ کس کا گھر ہے جی' اُنہوں نے کہا کہ یہ نوحؑ کی جماعت والے کا گھر ہے' انہوں نے سیلاب سے کہا' پیچھے چلے جاؤ' ادھر نہیں' اُس گھر میں جاؤ' کچھ ایسا نقشہ ہونا چاہیے تھا نا کہ خدا نے دعا قبول کی کہا ہم نے ان کو بچا لیا۔

حضرت نوح کی دعا پر انہیں کشتی بنانے کا حکم اور پھر اس پر عملی طریق

کیا کہتا ہے قرآن کیسے ہوا؟ نوحؑ نے دعا کی ہم نے قبول کیا اور اسے کہا وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا (11:37) نوحؑ! کشتی بناؤ ایک۔ لیجئے جی ایک میری آپ کی نہیں' ایک پیغمبر کی دعا اور یہ بھی نہیں کہ میں آپ دعا کریں' اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیں کہ قبول ہوگئی ہے۔ خدا کی طرف سے یہ جواب کہ ہم نے قبول کر لیا ہے دعا کو۔ دعا یہ تھی کہ ہمیں بچا لے اس آنے والی تباہی سے' کہا ہم نے قبول کیا تمہاری دعا کو' پھر؟ کہا پھر یہ کہ وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا (11:37) میں نے جب کہا تھا کہ دور وہ ابھی ایسا تھا کہ کشتی بنانا بھی نہیں جانتے تھے لوگ' خدا نے کہا ہماری وحی کے مطابق ہماری زیرِ نگرانی ایک کشتی بناؤ۔ یہ کیسے دعا قبول ہوئی جی یہ' وہ دعا جس کے متعلق خدا کہتا ہے ہم نے قبول کر لی' تو صاحب اگر دعا مانگے پیغمبر' خدا جواب دے کہ ہم نے قبول کر لی تو پھر تو راوی عیش لکھتا ہے۔ بیٹھ جاؤ اپنے گھر میں مزے سے۔ اس کے بعد کہا کہ ہاں دعا قبول کر لی' کشتی بناؤ۔ عزیزانِ من! یہ سیلاب بِلا جو آتا ہے اس میں دعائیں بھی مانگی جاتی ہیں خدا قبول بھی کر لیتا ہے کہ اس سے بچنے کا انتظام یہی ہے کہ کشتی بنانی پڑتی ہے۔ اور کشتی تک کی بات ان کے لیے ہی تو نہیں تھی صاحب' جیسا میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ وہ تو پہلی دفعہ کی بات تھی کہ ابھی آتا نہیں انسانوں کو کہ کشتی ہوتی ہے کوئی چیز یا

کیسے بنائی جاتی ہے' جب وہ بن گئی تو کشتیاں ایسے بنیں کہ آج پھر پوچھو نہیں' وہ جہازوں تک ان کی نوبت پہنچی۔ یہ جتنی کشتیاں بنائی جا رہی ہیں اس کے بعد اور جتنے وہ جہاز بنا رہے ہیں' یہ سارے خدا کی وحی کے اتباع میں ہو رہا ہے یا نہیں؟۔ اب جو بھی اس سیلاب سے پہلے کشتیاں بنا لے گا وہ تو وحیِ خداوندی کا اتباع کرے گا اور وہ جو ایسے وقت میں کشتیاں نہیں بنائے گا یا بنائے گا تو ایسی بنائے گا کہ وہ پانی میں پہنچیں تو پہنچتے ہی ڈوب جائیں ایسی لکڑی لگائے گا ان میں۔ مثال ہے یہ' بند بنانے' دریاؤں کے رخ بدلنے' ان میں سے سِلٹ نکالنا' یہ سارا کچھ اس میں آ جائے گا نا۔ جو یہ کچھ کریں گے وہ تو اتباع کریں گے وحیِ خداوندی کا جو ایسا نہیں کریں گے' وہ خلاف ورزی کریں' معصیت کریں گے۔ اب اس میں اگلی بات یہ آ گئی کہ کشتی بنائیں بِـاَعۡیُـنِنَـا (11:37) یہ کیا کہا اس نے' ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری زیرِ نگرانی' عزیزانِ من! آج بھی اگر یہ کشتیاں جو بنائی جاتی ہیں انسانوں کو مصیبتوں سے بچانے کے لیے' اگر ان کے اوپر Supervision ہے یہ (بـاعیـننا) خدائی آنکھ کی Supervision جسے کہا گیا ہے صاحب' یہ کیوں یہ زور دیا گیا ہے بِـاَعۡیُـنِنَا وَ وَحۡیِـنَـا (11:37) ہماری زیرِ ہدایت جیسے ہم Instructions تمہیں دیتے ہیں ایک تو Instructions کو Follow کرنا ہوا۔ اور اگلی چیز یہ کہی ہے کہ ہماری زیرِ نگرانی بناؤ' اگلی چیز یہ بھی ضروری ہوگئی اچھے سے اچھی انسٹرکشن بھی اگر آپ Carry کر رہے ہیں اور اس کے اوپر آنکھ وہ نہیں ہے' نگرانی وہ نہیں ہے' جو خدا کی نگرانی کہلاتی ہے پھر بھی وہ کشتی صحیح نہیں بنے گی عزیزانِ من!۔ یہاں اول تو وہ انسٹرکشن والی ہی بات نہیں ہوتی' وہاں تو فیصلے ہی کسی اور طرح سے ہوتے ہیں۔ وہ تو Percentage سے فیصلے ہوتے ہیں اور اگر کہیں ایسے ہیں لوگ کہ جو انسٹرکشن صحیح دیتے ہیں تو یہ بِـاَعۡیُـنِنَا کہا ہے۔ کہا ہے نا یہاں آ کے پھر مار پڑ جاتی ہے وہاں وہ آنکھ نہیں ہوتی' پھر وہ نگرانی نہیں ہوتی۔ کہا یوں کشتی بناؤ۔ وَ لَا تُـخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ (11:37) اور دیکھنا اب یہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کے متعلق ہم سے کوئی بات نہ کہنا تمہارے کہنے کے باوجود یہ نہیں بچ سکیں گے۔

انسان کو دنیا کے حوادث کا علاج قوانین کے مطابق خود کرنا ہوگا

جو کشتی نہیں بنائے گا یا کمزور بنائے گا' نبی بھی اگر اس کے متعلق کچھ کہے گا تو وہ نہیں بچ سکیں گے صاحب۔ معاف رکھئے گا آپ کے ہاں دمہ والے آتے ہیں تو کسی حضرت صاحب کے مزار پہ جا کے دعائیں آپ کر رہے ہوتے ہیں اور اس کے بعد خوش ہوتے ہیں کہ ہاں صاحب یہ داتا کی نگری تھی' اسے کون کچھ کہہ سکتا تھا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جو کشتی نہ بنانے والے ہیں' ان کے متعلق ہم سے کچھ نہ کہنا۔ کشتی نہیں بنائیں گے تو نہیں بچیں گے تو بھی کہے گا تب بھی نہیں بچیں گے ''داتا صاحب تے اک پاسے رہے'' یہ ہیں خدا کے قانون عزیزانِ من!۔ پہلے ہی Warn کیا کہ نوحؑ دیکھنا ہم سے کچھ نہ کہنا ان کے متعلق' اس لیے کہ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ (11:37) یہ کشتی نہیں بنا رہے

یہ غرق ہوکر رہیں گے ہم سے نہ کچھ کہنا۔ وَ یَصۡنَعُ الۡفُلۡکَ (11:38) اور نوحؑ نے پھر اس کے مطابق کشتی بنانی شروع کر دی۔ دعا مانگی تھی جواب آ گیا تھا' ہم نے قبول کیا تمہاری دعا کو بچائیں گے تمہیں ہم' پھر وہاں یہ کہا تھا کہ ہم نے بچالیا ان کو' یہ خدا کا بچانا آپ دیکھتے ہیں کیسے ہو رہا ہے' کشتی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ ایسا قادرِ مطلق ہے وہ چاہے تو آسمان سے بارش ہی نہ برسے' وہ چاہے تو پانی کا رخ ہی کسی اور طرف ہو جائے اگر یوں بچانا مقصود ہو۔ اس دنیائے حوادث کے اندر وہ یوں نہیں کرتا' اس نے قانون مقرر کیا ہے' قانون کے مطابق ہی یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ نوحؑ جیسے پیغمبر اور ان کی نہایت صالح جماعت کو بھی اگر سیلاب سے بچنا ہے' تو کشتی کے ذریعے بچنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم کیا چیزیں پیش کرتی ہے یہ ورد و ظیفے نہیں پیش کرتی یہ سیلاب سے بچنے کے لیے کشتیاں بنانے کا حکم دیتی ہے' صحیح انسٹرکشن کے مطابق صحیح نگرانی کے مطابق۔ آہاہاہا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہہ دیا کشتی بناؤ عزیزانِ من! یہ ہے تعلیم اب قیامت تک کے لیے تعلیم یہ جو ہے اصول بیان کر دیا کہ صحیح قاعدہ ہونا چاہیے وَحۡیِنَا صحیح نگرانی چاہیے اس کے اوپر۔ وَیَصۡنَعُ الۡفُلۡکَ (11:38) اور حضرتِ نوحؑ نے کشتی بنانی شروع کر دی۔ وَ کُلَّمَا مَرَّ عَلَیۡہِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِہٖ سَخِرُوۡا مِنۡہُ ؕ (11:38) وہ بڑے بڑے سردار' دولت مند' سرمایہ دار طبقہ جو بڑا بدمست تھا' وہ گذرتا تھا' دیکھتا تھا کہ کشتی بنا رہے ہیں۔ کھڑا ہوتا تھا' کیا ہو رہا ہے صاحب کشتی بنا رہے ہیں' کہتا ہے قرآن مذاق کرتے تھے' ہنستے تھے کہ کر کیا رہے ہیں۔ یہی ہے عزیزانِ من! جب معاشرہ بگڑتا ہے تو اس میں ہر وہ شخص جو صحیح کام کرتا ہے بگڑے ہوئے معاشرے میں' اس کے اوپر پہلے معاشرہ ہنستا ہے پھر اس کی کھال ادھیڑ دیتا ہے۔ صحیح کام کرنے والا' یہ صحیح کام بیٹھے ہوئے کر رہے ہیں۔ کیوں یہ قرآن ایسی تفصیلیں لاتا ہے عزیزانِ من! سوچئے تو سہی یہ کوئی آج سے چھ ہزار سال پہلے کی بات ہو رہی ہے۔ کیا آج کی بات نہیں ہو رہی؟ آج بھی اس معاشرے کے اندر اگر کوئی دوکاندار کہتا ہے کہ میں دیانتداری سے صحیح چیز صحیح ماپ تول کے مطابق' خالص دونگا کیا سارا باقی معاشرہ ہنس نہیں رہا اس کے اوپر' ''ہیں ہیں مت ماری ہوئی یا گل دی' ٹھیک ہے۔ چار ٹوٹے زمین دے سی' وچ کے دوکان کر دا اے میاں صاحب نوں یاد آ جائے گا مہینے دے بعد اپنی اصلی پونجی وی ڈبوئے گا'' آیا ہے دیانتدار بننے کے لیے کہ جی میں کوئی چیز ملاوٹ کی نہیں کرونگا۔ ہنستا ہے ہر شخص دیانتدار پر۔ یہ ہنسنا یہ کیا ہوتا ہے سَخِرُوۡا جسے کہا ہے قرآن نے ہنسی کیا ہوتی ہے؟ دوسرے کو بیوقوف سمجھتا ہے۔

جاگیرداری سسٹم کا یہ خاصہ ہے کہ انسان میں وہ رعونت پیدا کر دیتا ہے

جب بھی معاشرہ ایسا ہو جاتا ہے کہ جس میں ہر طریقہ جو ہے اس کو جائز سمجھ لیا جاتا ہے اور سمیٹا جاتا ہے پھر اور اس کے بعد معیار ہوتا ہے کہ کتنا سمیٹ لیتا ہے' جتنا زیادہ سمیٹتا ہے' اتنا زیادہ وہ کاریگر سمجھا جاتا ہے' ہوشیار سمجھا جاتا ہے' عقلمند سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے

میں جو شخص بھی پھر جائز و ناجائز کی تمیز رکھتا ہے' اُسے کہا جاتا ہے بیوقوف ہے' پاگل ہو گیا ہے۔ یہ ہے جو بات قرآن کہہ رہا ہے۔ جا رہے تھے پاس سے بات بالکل سمجھ میں آ جانے والی بات تھی۔ لیکن وہ تو میں نے کہا تھا نا وہ تو پہلے ہی قرآن نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ جن کے گھر میں پھر کوٹھی میں دانے ہوتے ہیں' بھرے ہوئے برتن ہوتے ہیں' یہ جو کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں پھر وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ جو چھوٹا طبقہ تمہارے ساتھ ہو گیا اس کا ساتھ ہونا تمہاری کوئی سچائی کی دلیل ہے۔ ان میں عقل و فکر کہاں ہے' ان کی رائے بھی کوئی رائے ہے' ان کا فیصلہ بھی کوئی فیصلہ ہے۔ یعنی وہ عقل و فکر بھی ساری جتنی ہے وہ بھی مختص ہو جاتی ہے روپے والے کے ساتھ۔ ہنس رہے تھے یہ صاحب جاتے ہوئے ایک فقرہ قرآن نے کہا یہ عزیزانِ من! کس طرح صادق آتا ہے ہر دور پہ۔ قَالَ (11:38)

مخالفین کی طرف سے رعونت کا جواب اور حضرت نوح کے پروگرام کی تکمیل

نوحؑ نے وہ صرف اتنا سا جواب اٹھ کے دیا اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡكُمۡ كَمَا تَسۡخَرُوۡنَ (11:38) ٹھیک ہے آج تم ہنستے ہو ہم پر' کل جب اس کا انجام تمہارے سامنے آیا تو تم پہ دنیا ہنسے گی' پھر ہم بھی ہنسیں گے۔ کوئی گالی نہیں دی کوئی بحث نہیں شروع کی ان کے ساتھ' ٹھیک ہے آج تم ہنستے ہو کل جب ان دو چیزوں کا انجام سامنے آیا اور دنیا نے یہ دیکھا کہ تمہارے سامنے ایک شخص بیٹھا ہوا اس طوفانِ بلا سے بچنے کا انتظام کر رہا تھا اور تم اس کا مذاق اڑاتے تھے' دنیا پھر تم پہ ہنسے گی نا اس وقت۔ یہ جو چیز ہے کہ اس انجام کے وقت آج تم ہنستے ہو کل دنیا ہنسے گی تم پہ۔

یہ وہی چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ نے یا ہر نبی سے کہلوائی گئی کہ قُلۡ يٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ‌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ (39:39) تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو' مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو' نتائج بتا دیں گے پھر کہ کون کس پہ ہنستا تھا۔ یہ جو اگلا ٹکڑا ہے عزیزانِ من! کہ مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو یہ بڑی اہم چیز ہے۔ مستبد نظام جو ہے جو ظلم و بد دیانتی پہ مبنی ہوتا ہے وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ دیانتدار اپنے پروگرام کے مطابق کام کرے۔ یہ دوسری چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ یہ جو نبیؑ اور رسول اللہ ﷺ اس قوم سے کہتے ہیں کہ میں نہیں دخل دیتا تمہارے نظام میں ٹھیک ہے' میں جب Interfere نہیں کرتا تو تم پھر کیوں اتنا خوامخوہ کے لیے یہ دنگا کرتے ہو' جھگڑا کرتے ہو' مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ انہیں پتہ ہوتا ہے اس چیز کا کہ اگر انہیں اجازت دیدی دیانتداری سے یہ کام کرنے کی تو نتائج بتا دیں گے' یہ صحیح تھے' دنیا ان کے ساتھ ہو جائے گی۔ ان کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ ان کو ان کے پروگرام کے مطابق کام کرنے ہی نہ دیا جائے' بہت بڑی تکنیک ہے۔ یہ نہیں ہوتا اس دوران میں جب ہم کہتے ہیں کہ صاحب پھر دیانت اور تقویٰ شکست کھا جاتا ہے' وہ شکست نہیں کھا جاتا' اسے بروئے کار آنے کے لیے اجازت ہی نہیں دی جاتی

کیونکہ قوتیں اس نے اپنے ہاتھ میں رکھ لی ہوتی ہیں اس غلط نظام نے۔ اگر کہیں ایسا ہو کہ انہیں اجازت ہو' اسی قسم کی ان کو بھی آسانیاں میسر ہوں' اسی قسم کے اسباب و وسائل میسر ہوں۔ نظام اور نظام میں فرق ہو' باقی دونوں یکساں چیزیں ہوں پھر ذرا یہ جیت کے بتائے نا غلط نظام والا جو ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ انہوں نے ان کے ہاتھ سے یہ لکڑی اور وہ ہتھیار نہ چھین لیے جن سے یہ کشتیاں بنا رہے تھے اس لیے کہ ابھی انہیں پتہ نہیں تھا اور نہ کوئی نہیں پھر کشتی بنانے دیتا۔ کہا کہ بہت اچھے۔ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ (11:39) قریب ہی بات سامنے آجائے گی' لمبی بات نہیں ہوتی۔

غلط معاشرے میں صحیح نتائج کے حصول میں رکاوٹ کی بنیاد

عزیزانِ من! غلط معاشرے میں صحیح نتائج نہیں برآمد کرتا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو اجازت نہیں دی جاتی کہ جن وسائل و ذرائع واسباب وسامان سے یہ نتائج برآمد ہونے تھے' ان سے وہ چھین لیے جاتے ہیں۔ یہ اصول اور نظام ناکام نہیں رہتا' یہ چیز ہوتی ہے جس وجہ سے اس کو کامیاب ہونے نہیں دیا جاتا۔ اسی لیے قرآن کہتا یہ ہے کہ تم ادھر Interfere نہ کرو بڑی اہم شرط لگاتا ہے میں اُدھر نہیں کرتا Interfere' کتنی معقول بات ہے لیکن وہ کب مانتے ہیں اِس چیز کو۔ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ یَّاۡتِیۡہِ عَذَابٌ یُّخۡزِیۡہِ وَیَحِلُّ عَلَیۡہِ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ (11:39) ابھی پتہ چل جائے گا۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ (11:40) تآنکہ وہ بارشیں آگئیں پانی آگیا ادھر۔ یہ لفظ ہی خود تنور بتا رہا کہ وہ بات کیا تھی میں نے پہلے بتایا تھا کہ قرآن ایسا انداز دیتا ہے کہ یہ بستی جو تھی یہ نشیب میں واقع ہوئی تھی۔ یہ تنور ہمارے ہاں تو یہ گڑھے کو کہتے ہیں نا یہ جس میں روٹی لگاتے ہیں آپ' تنور عربی میں ہر اس نشیب کو کہتے ہیں جہاں فراز کا پانی جو ہے جمع ہو کے اکٹھا ہو جائے ایک جگہ۔ وادی کا وہ مقام جہاں اِدھر اُدھر کا پانی آ کے جمع ہو جائے اس کو وہ تنور کہتے ہیں۔ وہ اتنا عام حالات میں تو کوئی تھوڑا بہت جمع ہوتا ہی ہوگا وہ کہا فَارَ التَّنُّوۡرُ اتنا جمع ہو گیا کہ جوش مارنے لگ گیا یہ تھا جو ہوا تھا۔

ہمارے ہاں طوفانِ نوح کے متعلق داستانوں کی نوعیت

ہمارے ہاں پھر جو افسانے چلتے ہیں وہ تو پوچھئے ہی نہیں نازیبِ داستان کے لیے' پہلی چیز تو ہمارے ہاں کہی جاتی ہے کہ یہ طوفان جو تھا ساری دنیا پہ آیا تھا۔ یعنی بات تو وہ حضرتِ نوحؑ اپنی قوم سے کہہ رہے ہیں کہ تم میں یہ خرابی ہے اس خرابی کا یہ نتیجہ ہوگا تو یہ ساری باقی دنیا جو ہے بیچاری' یہ کاہے کے لیے لپیٹ میں آجائے گی۔ یعنی تمہاری بستی کے لوگ یہ خرابیاں کرتے ہیں اور میکسیکو والے جو ہیں وہ ڈبو دیے جائیں' صاحب' ہمیں کیوں ڈبویا جا رہا ہے' کہ صاحب نینوا والے دیکھتے نہیں ہو کتنی خرابیاں کر رہے ہیں۔ تو یہ سوال ہی نہیں ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ ساری دنیا میں طوفان آگیا تھا' وہ ایک بستی کی بات تھی اس ایک وادی کی بات تھی۔ اُس زمانے میں تو ابھی سلسلۂ رسل

ورسائل مواصلات کا بھی نہیں تھا۔ایک گاؤں کی خبر دوسرے گاؤں کو نہیں ہوتی تھی۔وہ کشتی بنی۔قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ (11:40)

اس میں ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے اس میں اب سوار ہو جاؤ' بڑی نئی بات تھی' دیکھا نا کہ ابھی تو کشتی بنانا بھی نہیں آتا تھا اور پانی میں اتنے بڑے طوفان میں جوش مارتا ہوا پانی۔طریقہ تو عام طور پہ یہ ہوگا جو انہوں نے اختیار کیا تھا کہ اونچی جگہ پہ بھاگ گئے ہونگے ذرا یہاں تک پانی آیا تو اس دیوار پہ چڑھ گئے' چھت پہ چڑھ گئے' وہ تو یوں کر رہے ہونگے۔انہیں کہا گیا کہ بھاگو نہیں' چھت پہ نہ چڑھو' اس میں بیٹھ جاؤ' وہ ذہن میں یہ پہلے آتا ہوگا نا کہ یہ صاحب اس میں بیٹھ جاؤ یہ تو ابھی ڈوب جائے گی۔وحی کے ذریعے سے کہا کہ نہیں یہ قاعدے کے مطابق بنی ہوئی کشتی ہے اور زیر نگرانی بھی بنی ہوئی ہے۔کچی لکڑی نہیں لگی ہوئی' قاعدے کے مطابق بنی ہوئی ہے بیٹھ جاؤ۔کشتی میں بٹھانے کے لیے بھی ان کو تاکید کی جارہی ہے یہ ہے دور' بیٹھ جا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ (11:40) ضرورت کی چیزیں دو دو جوڑے وہ بھی ساتھ رکھ لو پتہ نہیں کتنے وقت' کتنے دن اس کے اندر لگ جائیں گے کہ یہ خشکی پہ جائے گی تو یہ اتنی چیزیں رکھ لو۔قرآن نے تو اتنی سی بات ہی کہی صاحب اور جو چلے نا ہمارے ہاں کے افسانے پھر زیبِ داستاں کے لیے۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کی بیان کردہ تفاسیر کی نوعیت اور ان کا مقام

کہا جاتا ہے کہ صاحب قرآنِ کریم تفاسیر کی رو سے سمجھ میں آسکتا ہے' ایسے نہیں آسکتا۔تو واقعی تفسیر تو بڑی چیز ہوتی ہے اور میں جو کہا کرتا ہوں کہ ٹھیک ہے فائدہ اٹھانا چاہیے دوسرے کے علم کا' دوسرے کی عقل کا' فکر کا غور و تدبر کا' یہی طریقہ ہے دنیا کے اندر علم کے آگے بڑھنے کا کہ کسی کی فکر سے دوسرے فائدہ اٹھائیں۔لیکن ہماری تفاسیر میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں جو بات کسی نے اپنی طرف سے کہی ہے وہ اپنی طرف سے نہیں کہی' وہ کہتے یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا۔تو اب وہاں پھر دقت یہ ہوجاتی ہے کہ اگر آپ مانیں کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو اس کے متعلق تو کوئی شک وشبہ ذہن میں نہیں آسکتا' اس سے آپ اختلاف نہیں کرسکتے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے یہ۔یہ ہے وہ چیز جس میں آکے آپ کی سوچ اور فکر معطل ہو کے رہ گئی' بند ہوگئی کہ اس کے خلاف کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔حالانکہ وہ حضورِ خاتم النبیین ﷺ وہ تو اتنا بڑا احسانِ عظیم ہے ختمِ نبوت ﷺ کا عزیزانِ من! کہ خدا کی طرف سے جو چیز جس کے خلاف تم نہیں کچھ کہہ سکتے' وہ تو صرف قرآن کے اندر آگئی۔حضور ﷺ نے اپنی کسی بات کا جسے احادیث کہتے ہیں' امت کو ان کا مجموعہ نہیں دیا کہ پابند ہوجائے گی امت ان چیزوں کی جو میں نے صرف اپنے زمان و مکان اور ماحول کے اعتبار سے کی ہیں باتیں' قیامت تک کے لیے ان کی پابند ہوجائے گی امت۔کتنی بڑی چیز تھی صاحب' صرف یہ قرآن' اس کے تو کسی ایک لفظ کے اوپر بھی آپ نہ اعتراض کرسکتے

ہیں نہ دل میں شک آنا چاہیے' ایمان کا تقاضا ہے ایمان لے آئیں۔ اور اس کے بعد آپ کی فکر آزاد ہوتی ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے آپ جس طرح جی چاہے فکر اور غور سے اور علم سے اور مطالعہ سے کام لیں۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ تفسیر اگر اس حد تک ہو میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میری بات آپ سمجھئے آپ کے جی میں جچے' صحیح تسلیم کر لیجئے' نہ ٹھیک کہیے کہ نہیں صاحب' ہمیں اختلاف ہے' بات ختم ہوگئی۔ اور اگر جو کچھ میں کہوں اس کے متعلق یا تو میرا دعویٰ یہ ہو کہ صاحب یہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے تو آپ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے اور آگے بڑھے اور میں کہوں کہ نہیں صاحب خود خدا نے مجھے یہ کہا ہے تو بات ہی ختم ہوگئی۔ ختمِ نبوت ﷺ کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جو کچھ کہا تھا کہ اس کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا' شک نہیں ہوسکتا' شبہ نہیں ہوسکتا وہ ہے جو قرآن کے اندر وحیٔ خداوندی ہے اور اسکے بعد کوئی اور چیز ایسی نہیں ہے۔ اور اب تو یہ دروازہ ہی بند ہو گیا ہے اس بات کے کہنے کا کہ خدا مجھے یہ کہتا ہے تم یہ مانو' سوال ہی نہیں ہے۔ اب جو شخص آپ سے کوئی بات کہتا ہے' قرآن کی آیت پیش کرتا ہے تو قرآن کی ہے' اس کی اپنی بات نہیں ہے اور اس کے بعد جو کچھ کہتا ہے وہ ایک انسان کی بات ہے جو دوسرے انسان سے کہی جا رہی ہے۔ آپ کا جی آئے مانیں' جی آئے کہہ دیجئے کہ نہیں صاحب ہم نہیں مانتے اس بات کو' بات ختم ہوگئی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس نظریہ کے ماتحت جب تفاسیر کو آپ لے کے بیٹھیں گے کہ قرآن کی تفسیر یہ ہے جو حضور ﷺ نے فرمائی یا خدا نے کہی تو وہاں دقت ہوگئی۔

حضرت نوحؑ کی کشتی کے متعلق تفسیر ابن کثیر کا بیان

تفسیروں میں کیا لکھا ہوا ہے؟ میں بہت کم اپنے درس میں ان چیزوں سے کام لیا کرتا ہوں' خوامخوہ کے لیے بات ہوتی ہے لیکن یہ سمجھانے کے لیے جو یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب تفسیروں سے قرآن سمجھ میں آتا ہے۔

اُس نے تو یہ کہا تھا کہ اس میں رکھ لو جوڑا جوڑا' اب انہوں نے اس کشتی کے ساری دنیا کے چرندے پرندے حیوان انعام مویشی درخت یہ بھالے یہ اجناس سب لادنی شروع کر دی صاحب۔ وہ وہاں بیٹھے ہوئے دو چار آدمیوں نے جو کشتی بنائی ہے اس میں یہ دنیا بھر کی چیزیں لادی جا رہی ہیں جوڑے جوڑے لادے جا رہے ہیں۔ اس لادنے میں اب جو یہ ساری چیزیں لادنی پڑیں اس میں تفسیر ابنِ کثیر ہے ہمارے ہاں بڑی معتبر تفسیر مانی جاتی ہے اس میں لکھا یہ ہے کہ صاحب لادتے لادتے گدھا بھی آ گیا' اس کو بھی لادنا پڑا اب گدھے کی ضد کو تو آپ جانتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ اس نے اگلے دو قدم جو تھے وہ کشتی کے اندر رکھے اور پچھلے دو قدم جو تھے وہ خشکی کے اوپر تھے اب اسے کھینچ رہے ہیں مار رہے ہیں وہ آگے قدم نہیں رکھ رہا۔ آپ سوچئے وہ کشتی اتنے میں دھینگا مشتی میں کشتی ہی ڈوب جائے' بڑی مصیبت وہ چڑھتا ہی نہیں ہے۔

کشتی میں گدھے اور شیطان کے سوار ہونے کا قصہ

انہوں نے آ کے حضرتِ نوحؑ سے کہا کہ وہ گدھا چڑھتا کیوں نہیں ہے' اُنہوںؑ نے کہا کہ بات کوئی ضرور ہوگی ورنہ گدھا تو ایسا بے وقوف نہیں ہوتا جیسے تم بے وقوف ہو۔ اُنہوںؑ نے آ کے دیکھا تو گدھے کی پچھلی ٹانگوں سے شیطان چمٹا ہوا تھا اس نے سوچا کہ اگر میں رہ گیا پیچھے اور یہ چلے گئے تو پھر ان کے اندر تو یہی تو باقی ہیں جو بچیں گے تو میری دنیا کونسی ہوگی تو اس نے کہا کہ میں بھی اس میں سوار ہونگا۔ اب اور تو کوئی طریقہ نہیں تھا براہِ راست سوار ہوتا تو اس کو فوراً یہ لوگ اتار دیتے کہ تو نہیں آ سکتا اس کے اندر' وہ چمٹ گیا گدھے کی ٹانگوں سے وہ کھینچ رہا تھا گدھے کو پیچھے اس لیے نہیں گدھا بیچارہ چڑھ سکتا تھا اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اب اسے ہٹاتے ہیں وہ چمٹا ہوا ہے تو بالآخر حضرتِ نوحؑ نے یہ کہا کہ بھئی وہ کشتی ڈوب جائے گی اگر ہم اسی دھینگامشتی میں رہے' انہوںؑ نے کہا کہ آنے دو اس کو بھی آنے دو۔ کہا کہ اس طرح وہ آ گیا اور یہ جو شیطان اس کے بعد دنیا میں پھیلا ہے نا وہ شکر یہ ادا کرو اس گدھے کی بدولت ہے جسے آپ اتنا بیوقوف کہتے ہیں۔

کشتی میں شیر کی موجودگی میں دوسرے جانوروں کی پریشان حالت اور پھر اس کا علاج

پھر اس میں یہ ہے کہ وہ شیر بھی اس میں تھا' اب شیر بیٹھا ہوا ہو وہ اپنے پنجرے میں نہ ہو وہ کشتی میں تو باقی جتنے یہ مویشی جانور بیچارے جو تھے ان کے اوپر تو قیامت آئی' یہ بھاگے بھاگے پھر رہے تھے' پناہ ہی نہیں کہیں مل رہی تھی کشتی میں۔ ان سے کہا گیا کہ یہ کیا مصیبت ساتھ آ گئی پھر حضرت نوحؑ نے دعا کی اللہ میاں سے کہ ہم کیا کریں وہ کہنے لگے کہ وہ شیر کو اللہ تعالیٰ نے بخار چڑھا دیا جس کی غنودگی میں وہ پڑا رہا۔ یہ سارا تفسیر ابنِ کثیر میں لکھا ہوا ہے اس کو دیکھ لیجیے ساری تفسیر ہے یہ اس کے اندر۔ وہ غلہ جتنا لادا ہوا تھا وہ کہنے لگے کہ اس میں چوہے آ گئے اور اس میں سے کتر کتر کے غلہ خراب کر رہے تھے اُنہوں نے کہا کہ غلہ اتنا ہی ہے کشتی میں ہم بیٹھے ہیں یہ تو چوہے کھا جائیں گے کیا کریں ہم پھر۔ تو حضرتِ نوحؑ نے (وہ تو ہر معاملے میں دعا کرتے تھے نا) پھر وہ کیا تو وہ شیر جس کو وہ بخار ہو رہا تھا (نظر آتا ہے کہ شاید اس کو انفلوئنزا ہوگا) اس نے ماری چھینک زور سے تو اس کے نتھنے سے دو بلیاں باہر ٹپکیں' بلیاں باہر آئیں تو چوہے بھاگے صاحب۔ یعنی وہ جو پہلے رکھی تھیں دو دو چیزیں اس میں بلیاں رکھنا بھول گئے' چوہے کو رکھ لیا' بلیاں نہیں رکھیں۔ یہ میرے بھائیو باندھ لو گرہ سے ترکیب ہے بڑی عجیب یہ' یہ آپ کو پتہ ہے سال میں آپ کا کتنا غلہ ضائع کر دیتے ہیں چوہے' تو شیر کو نسوار دو چھینک آئے گی بلیاں ٹپکیں گی اس میں سے۔

افسوس کہ ہمارے ہاں کی یہ تفاسیر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں

عزیزانِ من! کیا کہتے ہیں آپ' پڑھیے اس میں۔کیا کہہ گیا ہے جلے دل سے یہ شخص کہتا تھا کہ

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے

بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

زیبِ داستاں رہتی تو کوئی بات نہیں ہم داستانِ امیر حمزہؓ بھی تو پڑھتے ہیں نا۔اس زیبِ داستاں کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے' عزیزانِ من! وہاں مصیبت آتی ہے۔ہم تو صرف ہنس دیتے ہیں باقی دنیا جو ہے آپ کے ہاں کی غیر مسلموں کی دنیا وہ کیا کہتی ہوگی آپ کے رسول ﷺ اور آپ کے خدا کے متعلق۔اور پھر تحقیقات کا یہ اب بیٹھے ہیں۔

کشتی نوح کے متعلق حضرت ابن عباس سے ایک روایت

حضرتِ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ وہ کشتی جو تھی وہ اتنی بڑی تھی کہ اس میں اسی آدمی سوار ہوئے تھے۔یعنی ساری دنیا کی دو دو جوڑے چیزیں لادی ہوئی ہیں اور وہ اس کے اندر آدمی فقط اس میں اسی آدمی سوار تھے اور وہ کوئی ایک سو پچاس دن تک کشتی پانی میں پھرتی رہی۔کشتی کا رخ جو تھا وہ کہا ہے کہ خانہ کعبہ کی طرف ہوگیا تھا۔اتنا بھی نہیں دیکھا کہنے والے نے کہ قرآنِ کریم کہتا ہے خانہ کعبہ جو تھا حضرتِ ابراہیمؑ نے اس کو تعمیر کیا ہے۔حضرتِ نوحؑ کے زمانے کی بات ہو رہی ہے اب وہ خانہ کعبہ کی عظمت تو اتنی بڑی ہونی چاہیے نا کہ کشتیٔ نوحؑ کا رخ سیلاب نے خانہ کعبہ کی طرف کر دیا۔چالیس دن وہ طواف کرتی رہی خانہ کعبہ کا تو پھر اس کی دعا منظور ہوئی اور اس کے بعد پھر وہ آ کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتی ہوئی' جودی کے پہاڑ کے اوپر آ کے ٹک گئی۔کہاں خانہ کعبہ کہاں یہ جودی کا پہاڑ' وہ ادھر آ کے ٹک گئی اس میں ربط کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔معاف رکھئے اگر آپ کہیں گے تم بھی لگے ہو زیبِ داستاں کے لیے لیکن وہ تو ہوتا ہی ہے زیبِ داستان کے لیے ہے۔

سکھوں کے لیے ایک کالج کی تعمیر کا دل چسپ تاریخی واقعہ

سکھوں نے اپنا پہلا کالج بنایا امرتسر میں ''اوہدا ناں سی پڑھا کواں دا کوٹھا'' وہ بنایا امرتسر میں' اس کے لیے انہوں نے چندہ کیا تھا سارے ہی پنجاب کے سکھوں سے۔کالج بن جانے کے بعد لدھیانہ والوں نے امرتسر والوں کے خلاف احتجاج کیا کہ بڑی زیادتی ہے چندہ تو آپ نے سارے پنجاب سے کیا اور لدھیانے کا اول نمبر آتا تھا اس میں اور کالج آپ نے امرتسر میں بنا دیا یعنی وہ بن بنا گیا اس کے بعد اعتراض کیا انہوں نے۔یہ تاریخی واقعہ ہے ان کے ہاں کا' اس میں ان میں آپس میں بڑا لڑائی جھگڑا' دنگا یہ کچھ اختلافات' یہ کچھ

نمودار ہوئے۔ ایک صلح کانفرنس اس میں کرنی پڑی امرتسر میں آ کے۔ سردار کھڑک سنگھ ان کے ہاں کے بہت بڑے لیڈر تھے وہ Preside کرتے تھے دو تین دن تک آپس میں دلائل ''سکھاں دے دلائل'' وہ ہوتے رہے صاحب۔ اس کے بعد اس نے یہ کہا کہ بھئی میں سوچتا یہ ہوں کہ بات بڑی ٹھیک ہے اب امرتسر میں یہ کالج بن گیا لدھیانے والوں کے دلائل بھی بڑے محکم مجھے نظر آتے ہیں۔ میں اس جھگڑے کو مٹا دینا چاہتا ہوں کالج امرتسر میں بن گیا ہے' ہوسٹل لدھیانے میں بنا دیجیے۔ سیدھی سی بات ہے۔

سیلاب کے اتر جانے کے بعد جودیکھا کہ کعبہ کا طواف کرنے والی کشتی تو پہاڑ پہ ٹکی ہوئی ہے

چالیس دن تک کشتی کعبہ کا طواف کرتی رہی پانی اتر گیا تو دیکھا کہ جودی کی پہاڑی پہ ٹکی ہوئی ہے وہ۔ عزیزانِ من! ہنسنا کیا رونا آتا ہے۔ ان تفسیروں کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ کیا کہتا ہوگا یورپ آپ کے متعلق۔ بہرحال وہاں یہ چیز ہوئی اور پھر انہی کی یہ تفسیر میں ہے تاریخ میں ہے (ہاں یاد آ گیا) کہ یہ عاشورہ یہ جو محرم کی دسویں تاریخ ہوتی ہے کہ یہ عاشورہ محرم کے دن وہ کشتی جودی کی پہاڑی کے اوپر آ کے ٹک گئی اور وہاں سے یہ اس طرح سے یہ بچ گئے۔

عقل انسانی تیرہ سوسال سے ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے

اس تیرہ سو سال میں کوئی نہیں پوچھتا کہ حضرتِ ابنِ عباسؓ وہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مکے میں پیدا ہوئے انہوں نے یہ کچھ کہا ان کی اس تحقیق کی سند کیا ہے۔ کشتی اتنی لمبی چوڑی تھی اتنے آدمی اس میں بیٹھے ہوئے تھے اس کا رخ جو تھا وہ کعبہ کی طرف ہو گیا وہ چالیس دن طواف کرتی رہی ڈیڑھ سو دن اس میں وہ رہے پھر اس کے بعد عاشورے کے دن وہ جودی کی پہاڑی کے اوپر آ کے ٹکی۔ جودی کی پہاڑی کا تو قرآن میں ذکر ہے یہ باقی جتنی چیزیں ہیں یعنی ان کی اس تحقیق کی بنیاد کیا ہے ایک مؤرخ کی حیثیت سے بتانا چاہیے نا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا قرآن میں جو آیا وہ تو یہ ہے کہ صاحب وحی نے یہ مجھے کہی اور یہ بات میں نے کہی۔ حضرتِ ابنِ عباسؓ تو وحی کی رو سے نہیں یہ کہہ رہے تھے یہ تو ایک تاریخی بیان ہے جو وہ بیان کر رہے ہیں۔ لیکن آج یہ سوال کرنا صاحب کہ حضرتِ عبداللہ ابنِ عباسؓ کے متعلق یہ گستاخ سوال کرتا ہے کہ انہوں نے کہاں سے یہ تاریخی بات معلوم کی' یہ آپ سوال ہی نہیں کر سکتے آپ تو نہیں کر سکتے دنیا کا منہ بند کر دیں گے؟ کیا کہیں گے آپ؟۔

کشتی میں اپنے اہل کو یعنی ایمان لانے والوں کو ساتھ لے لیں

بہرحال ہم نے کہا کہ ہاں اس میں رکھ لو ان کو' کیا کیا' یہ جوڑے رکھے۔ **وَ اَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلٌ** (11:40) اپنے اہل کو اس میں سوار کر لو جو ایمان لائے ہیں ان کو لے آؤ۔ اور اہل کا جو لفظ کہا اس میں کہا کہ

اس کے متعلق بجز ان کے جن کی بات الگ ہوچکی ہے پہلے ہوچکی ہے۔ یہ بات ابھی آتی ہے اور وہ دوسری بڑی بات ہے جو پہلا ہی جو حضرتِ نوحؑ کا قصہ آتا ہے پہلے طبقاتی تقسیم ہے جس کے متعلق بات ہوئی ہے۔

لفظ بسم اللہ کے سطحی مفہوم کے برعکس اس کا حقیقی مفہوم جو بڑا معنی خیز ہے

دوسری بات آگے آتی ہے وہ بھی ایک بنیادی اور اصولی چیز ہے دین کی جو قیامت تک کے لیے نافذ العمل رہے گی وہ آگے آتی ہے۔ یہاں کہا کہ ان کو سوار کرا لیجیے۔ وَ قَالَ ارۡکَبُوۡا فِیۡهَا (11:41) پہلے یہ تھا قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا (11:40) ٹھیک ہے سوار ہو جاؤ۔ آگے بات ہے یہ ارۡکَبُوۡا فِیۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖهَا وَ مُرۡسٰهَا (11:41) کیا عرض کروں کہ یہ بسم اللہ کیا چیز ہے۔ ترجمہ ہمارے ہاں ہے کہ ساتھ نام اللہ کے' پھر اس میں کہا جاتا ہے کہ اس میں محذوف ہے میں شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے۔ ٹھیک ہے خدا کے نام کے ساتھ' کبھی آپ کے یہ کہنے سے آپ کے دل میں کوئی بات بھی پیدا ہوتی ہے کہ یہ میں کیا بات یہ کہہ رہا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ میں کیوں کرتا ہوں ہر چیز ہر کام۔ کہا اتنا ہی جاتا ہے کہ اللہ کے نام میں بڑی برکت ہوتی ہے اس لیے اس کے ساتھ۔ بات تو بڑی گہری ہے عزیزانِ من! اور قرآن کی کونسی بات گہری نہیں ہے اس کی تو بسم اللہ ہی بڑی گہری ہے صاحب۔ یہ ساتھ نہیں اس کا ترجمہ صحیح' اسم کے معنی نام بھی صحیح نہیں ہے۔

لفظ اسماء الحسنٰی کی وضاحت

قرآنِ کریم میں یہ ہے اللہ کے متعلق صفاتِ خداوندی ساری گنائی ہوئی ہیں اور اسے اسمآء الحسنٰی کہا ہوا ہے **الاسمآء الحسنٰی** : وہ صفات خدا کی وہ خصوصیات خدا کی جو انتہائی بیلنس لیے ہوئے ہیں' پورا حسن لیے ہوئے ہیں' توازن کے ساتھ صحیح Proportion کے ساتھ' ہر چیز ایک خاص خصوصیت رکھتی ہے' خاصیت رکھتی ہے۔ جن چیزوں کا نام آپ دوائی کا نسخہ کہتے ہیں اس میں نسخے کا ہر جزو ایک خصوصیت رکھتا ہے نا۔ وہ نسخے کے اجزاء بھی ہر ایک کو معلوم ہوں وہ ان کو ملائے تریاق کی بجائے زہر ہو جاتا ہے۔ خصوصیات تو وہی ہیں اور اس علم کا جاننے والا ڈاکٹر ملائے' وہ تریاق ہو جاتا ہے۔ تو وہی تو چیزیں ہیں صاحب یہ تریاق کیسے ہوگئیں' وہ زہر کیسے بن گیا صرف یہ کہ اس نے جو ملایا ہے خاص وزن کے ساتھ خاص Proportion کے ساتھ ملایا ہے۔ اس کے الاسمآء حسنٰی ہوگئے' وہ حسنٰی نہیں رہے۔ یہ ہے وہ ساری چیز جسے آپ کہتے ہیں قوانینِ خداوندی' خدا کا پروگرام اس دنیا کے اندر اس کی صفات کے ظہور کے مواقع اس دنیا کے اندر' ان تمام کو اسمآء کے لیے کہا ہے۔ ب کے معنی عربی زبان میں بھی اسے؟؟ کہتے ہیں For this purpose اس مقصد کے لیے۔

بسم اللہ کے بعد الرحمٰن اور الرحیم خدا تعالیٰ کی وہ جامع صفات ہیں جو انسان کے مقصد کو متعین کرتی ہیں

یہ اب سنیئے جو کہا ہے کہ جو کام شروع کرو اس کے لیے کہو یہ کہ میں اسے اس مقصد کے لیے شروع کر رہا ہوں یا کام کر رہا ہوں جو خدا کی صفت نے مقرر کیا ہوا ہے۔ میرا مقصد اس سے یہ ہے، میں اس مقصد کے لیے کر رہا ہوں خدا کی فلاں صفت کے ظہور میں لانے کے لیے میں یہ کر رہا ہوں۔ اب دیکھئے ہر کام آپ کا جو دنیا کا آپ کام کر رہے ہیں، وہ آپ کا ایک دین کا کام ہو گیا، خداوندی ہو گیا، اس کا فلاں جو Purpose اس نے تجویز کیا ہوا ہے نا اس Purpose کو پورا کرنے کے لیے میں یہ کام کر رہا ہوں یہ ہوتا ہے بسم اللہ۔ اور بسم اللہ کے الرحمٰن اور الرحیم جامع صفت خدا کی جو ہے وہ رحم ہے اس انداز سے پرورش کرنا ہر ایک کی جس طرح رحمِ مادر میں بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ مومن جو کام بھی شروع کرے، دنیا میں یہ کہے کہ میرا مقصد اس سے اس کائنات اور اس نوعِ انسانی کی اس طرح پرورش کرنا ہے جیسے کہ بچے کی پرورش رحمِ مادر میں ہوتی ہے میں یہ کام اس لیے کر رہا ہوں۔ اب دیکھئے مقصد اور مقصد میں ہی تو فرق ہوتا ہے صاحب۔ یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک جملے میں مقصد متعین کر دیتی ہے مومن کے ہر کام کا۔ کشتی میں کہا سوار ہو، کاہے کے لیے، اپنے ہی بچاؤ کے لیے نہیں بلکہ جس مقصد کے لیے تمہیں زندہ رکھا گیا ہے، خدا نے زندہ رکھا ہے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اور اس کے بعد کہا کہ اب یہ کشتی مَجۡرٖىهَا وَ مُرۡسٰهَا ؕ (11:41) میں قرآن پڑھنے والوں سے یہ کہدوں کہ یہ ایک ہی جگہ ہے قرآن کی جہاں یہ اس کے نیچے 'ر' کے الف سا ہوتا زیر، یہ مجری ہا نہیں اس کو پڑھتے مجرے ہا اس کو پڑھتے ہیں یہ ہمارے ہاں تلاوت کی چیز چلی آ رہی ہے۔ بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَ مُرۡسٰهَا ؕ (11:41)

مومن سوار ہونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کشتی اس کشتی کا چلنا بھی اس مقصد کے لیے جو خدا نے مقرر کیا ہے، اس کا رکنا بھی اس مقصد کے لیے جو خدا نے مقرر کیا ہے۔ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَ نُسُكِىۡ وَ مَحۡيَاىَ وَ مَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (6:162) اے رسول کہدو اعلان کر دو کہ میری یہ صلوٰۃ اور میرے یہ زندگی کے طور طریق، کہدو میری زندگی میری موت، صرف خدا کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ مقصد کیا ہے؟ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ مقصد ہے نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عالمینؐ میرا ہر کام اس مقصد کے لیے ہے۔ کیا حسین ہے یہ مقصد عزیزانِ من! بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَ مُرۡسٰهَا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (11:41) کہاں بات آ رہی ہے صاحب، کشتی میں سوار ہو رہے ہیں پہلی چیز تو یہ ہے کہ حفاظت مل گئی ان کو سیلاب میں ڈوبنے سے۔ لفظِ غفور آ گیا مغفرت کے معنی ہی حفاظت ملنا ہے لیکن صرف بچ جانا ہی سیلاب میں مقصد نہیں تھا اس کے بعد رحیم ہے۔ سیلاب کے بعد بڑی تباہی آتی ہے، ملک میں کوئی چیز نیچے باقی ہی نہیں رہتی، کہا اس کے بعد اس نے حفاظت جس نے تمہاری کی ہے، وہ سامانِ نشو و نما بھی عطا کرے گا۔ یہی نہیں کیا کہ سیلاب سے بچا دیا، زندہ

تو تم رہے اوراس کے بعد وہاں جا اتارا جہاں کچھ بھی نہیں کھانے والے کو ملتا' وہاں مر گئے۔اس زندہ سے رہنا تو اچھا یہی تھا کہ وہ سیلاب میں ہی مرجاتا آدمی۔سیلاب میں بچنے والوں کے اوپر جو کچھ گذرتی ہے عزیزانِ من! پتہ نہیں کتنے ان میں سے کہتے ہونگے کہ اس سے تو اچھا تھا کہ سیلاب میں ہی مرجاتے ہم۔غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ دونوں ہونا ضروری ہے نظام کے لیئے حفاظت کا سامان بھی بہم پہنچائے پھر نشو ونما کا سامان بھی دے۔

سیلاب کے دوران حضرت نوحؑ کی طرف سے بیٹے کو محفوظ رکھنے کی کوشش' خدا تعالیٰ سے التجا اور پھر اس التجا کا جواب

اب ایک محاکاتی چیز آتی ہے سامنے' قرآن کا انداز ادبی اعتبار سے بھی عجیب ہے۔کشتی کو چلا رہا ہے وَ هِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ (11:42) دیکھئے انداز عربی جاننے والے جانیں گے کیا کہہ رہا ہے ارے دیکھو وہ کشتی' کیا ہے کشتی؟ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ قف (11:42) کہا وہ اس طرح طغیانیوں کے اوپر جارہی ہے پہاڑ جیسی موجیں اور تلاطم انگیزیاں اس کے سامنے آتی ہیں اور وہ ان پہ ناچتی ہوئی چلی جارہی ہے حفاظت کے ساتھ۔یعنی اس کے اندر ایک ادبی دلکشی بھی ہے۔کشتی کے متعلق کہ پہاڑ جیسی اونچی اونچی موجیں آرہی ہیں اور وہ دیکھیں کس طرح بطخ کی طرح تیرتی ہوئی چلی جارہی ہے وہ کشتی وہ دیکھئے کشتی کیسی جارہی ہے۔وَ نَادٰی نُوْحُ نِ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ (11:42) چڑھتے ہوئے نوحؑ نے آواز اپنے بیٹے کو کہ اے میرے بیٹے آ کشتی میں تو بھی سوار ہوجا۔وَ كَانَ فِیْ مَعْزِلٍ کہا ہے وہ اس گروہ میں شامل تھا جنہوں نے مخالفت کی تھی' الگ رہنے والوں میں وہ شامل تھا' اس کو بھی آواز دیدی اے بیٹے آجا ان کے ساتھ نہ رہ جنہوں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔بیٹا: قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ (11:43) کہا کہ نہیں جایئے آپ کشتی لیے پھرتے ہیں میں کسی پہاڑ کی چوٹی کے اوپر پناہ لے لوں گا پانی سے' مجھے ضرورت نہیں ہے اس قسم کے سہاروں کی جس قسم کے سہارے تم کہہ رہے ہو' میں انہیں کے ساتھ اچھا اپنی پارٹی کے ساتھ میں نہیں آنا چاہتا۔اور بات وہی کہی جو میں نے پہلے کہی تھی کہ ان کے ذہنوں میں بھی یہ تھا کہ پانی آجائے گا ذرا سی اونچی چوٹی ہوگی اس پہ چڑھ جائیں گے' اس نے بھی یہی کہا ہے۔قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ (11:43) کہا بیٹے! آج کے اس سیلاب میں اس طرح سے نہیں بچ سکو گے یہ اس نوعیت کا سیلاب نہیں آرہا اس سے تو وہی بچے گا جس پہ خدا نے رحم کیا ہوگا۔یہ رحم کن پہ کیا ہوا تھا؟ جنہوں نے کشتی بنائی تھی جو کشتی میں بیٹھ گئے۔آج اس سے وہی بچے گا اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ج (11:43) جس پہ خدا نے اپنی رحمت کی ہوگی۔دیکھئے دنیاوی اسباب وسامان سے فائدہ اٹھانا اسے رحمتِ خداوندی قرار دیا گیا ہے۔اور وہ پھر وہی محاکاتی بات' وہ اُدھر کھڑا ہے' یہ کشتی میں کھڑے رہے ہیں

اوروہ آواز دے رہے ہیں کہ جلدی کروآ جاؤ۔ کہنے لگے اتنی سی بات ابھی ہوئی تھی، آدھی ہی بات تھی وَ حَالَ بَیۡنَهُمَا الۡمَوۡجُ (11:43) اور ایک بہت بڑی موج اٹھی اور دونوں کے درمیان حائل ہوگئی فَكَانَ مِنَ الۡمُغۡرَقِیۡنَ (11:43) اور وہ ڈوب گیا۔ کیا بات ہے صاحب بات کہنے کی۔ آپ دیکھتے ہیں ڈائیلاگ کے اندر وہ فقرہ پورا نہیں ابھی ہوا درمیان میں کٹ گیا تھا' کٹ کیوں تھا؟ کہ وہ اتنی بات کہی تھی کہ وہ بہت بڑی موج اٹھی دونوں کے درمیان حائل ہوگئی اور جب وہ تھم کے نیچے گری تو دیکھا کہ بیٹا ڈوب چکا ہوا تھا۔

بارش تھم گئی جو کشتی میں سوار نہ ہوئے وہ ڈوب گئے

وَ قِیۡلَ یٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِیۡ مَآءَكِ وَ یٰسَمَآءُ اَقۡلِعِیۡ (11:44) یہ بھی بڑا انداز ہے۔ ہم نے حکم دیا کہ ہاں وہ زمین اپنا پانی جذب کرلے آسمان تھم جا۔ اب بارش اور نہیں برسنی چاہیے۔ دیکھا یہ کیا انداز ہے بات کرنے کا' ایک احکم الحاکمین جو ہے۔ بات تو یہ کہنی تھی کہ اس کے بعد بارش تھم گئی' زمین میں پانی بھی جذب ہوگیا۔ لیکن کہنے کا انداز یہی ہے پھر ہم نے کہا زمین پانی کو جذب کرلے' آسمان رک جا۔ وَ غِیۡضَ الۡمَآءُ (11:44) پانی رک گیا وَ قُضِیَ الۡاَمۡرُ (11:44) بات صاف ہوگئی پوری ہوگئی۔ ٹھیک ہے کشتی خشکی پہ آ گئی۔ وَ اسۡتَوَتۡ عَلَی الۡجُوۡدِیِّ (11:44) اور وہ جودی کے ٹیلے کے اوپر آ کے ٹک گئی۔ وَ قِیۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ (11:44) اور کہا یہ گیا کہ ہاں وہ جنہوں نے ہر بات کو اپنے صحیح مقام پہ نہیں رکھا ہوا تھا' آج دیکھو وہ کتنے محروم ہوگئے خدا کی اس رحمت سے۔ دیکھا کون محروم ہوگئے تھے اور انہیں ظالمین کہا ہے جو سیلاب سے بچنے کے لیے صحیح معنوں میں کشتی نہیں بناتا' انہیں ظالمین کہا گیا ہے۔

آب آخر پر حضرت نوحؑ کی اپنے دل کی ایک چبن کے ساتھ خدا کے حضور حاضری

عزیزانِ من! یہاں وہ بات آتی ہے جو بڑی ہے' وقت پانچ ہی منٹ باقی ہیں۔ عزیزانِ من! ایک پانی ہے جو زندگی بخشتا ہے' ایک پانی ہوتا ہے جو زندگی لے لیتا ہے۔ پانی تو وہی ہوتا ہے اس میں پروپورشن کا فرق ہوتا ہے صرف (اسمآء الحسنٰی) اسے کہتے ہیں۔ وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ (11:45) بس یہ ٹک گئے۔ امن چین ہوگیا اب بات یاد آ گئی۔ یاد نہیں آئی ذہن میں تو کھٹکتی ہوگی اس سارے وقت میں تو وہ اس افراتفری میں تھے نا ابھی' کیا بات ہے قرآن کی۔

جب اطمینان سے نوحؑ بیٹھا کہا کہ یا اللہ ایک بات اجازت دیں اگر آپ جان کی امان پاؤں تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں' انہوں نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے' کہا کہ آپ نے یہ وعدہ مجھ سے کیا تھا کہ اے نوحؑ! میں تیرے اہل کو غرق ہونے سے بچالوں گا۔ کہا ہاں ہم

نے کہا تھا۔ کہا فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ(11:45) تیرے وعدے تو ہمیشہ سچے ہوتے ہیں' کہنے لگے ٹھیک ہے سچے ہوتے ہیں' وعدہ تھا کہ میرے اہل کو بچا لیا جائے گا' کہنے لگے ٹھیک ہے' کہنے لگا تو بیٹا تو سب سے اہل ہوتا ہے تو پھر وہ کیوں ڈوب گیا۔ فوراً ہی کہتے ہیں وَاَنْتَ اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْنَ (11:45) مجھے آپ کے فیصلے پہ اعتراض نہیں ہے میں یہ بات اصل میں دل میں کھٹکتی پوچھنا چاہتا تھا اَنْتَ اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْنَ(11:45) یعنی میں اس فیصلے کے خلاف اپیل نہیں کر رہا۔ بات یہ دیکھئے ٹکڑے منطقی دلائل دیکھئے وعدہ تھا آپ کا تیرے اہل کو بچا لونگا' تیرے وعدے ہمیشہ سچے ہوتے ہیں' بیٹا میرا میرے اہل میں سے تھا پھر وہ ڈوب کیوں گیا' میں فیصلے کے خلاف نہیں کہہ رہا میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ واہ واہ واہ کیا منطق ہے اس کے اندر۔

ذاتِ خداوندی کے نزدیک اہل ہونے کا معیار تو وحی کی روشنی میں متعین ہوتا ہے

قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ ج (11:46) کہا نوحؑ تمہاری یہ سب کڑیاں تو صحیح ہیں منطق کی' ایک بات ہے جس میں تم غلطی کر گئے ہو ہم نے کہا یہ تھا کہ تمہارے اہل جو ہیں' اپنے جو ہیں ان کو ہم بچا لیں گے۔ تم نے اپنے ذہن میں سمجھا کہ بیٹا بیٹے ہونے کی حیثیت سے اپنوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ جو تم لوگوں کے معیار ہیں Biological اس کے اعتبار سے تو وہ بیٹا باپ کا اہل ہوتا ہی ہے' ہمارے ہاں آ کر یہ معیار بدل جاتے ہیں وہ اہل نہیں رہا تھا۔ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ ج اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (11:46) وہ تیرے اہل میں سے نہیں رہا تھا اس کے کام ایسے تھے کہ جن کی وجہ سے وہ تیرے اہل میں شمار ہوتا؟۔ بات عجیب یہاں سے آئی اپنے اور بیگانے ہونے کا ایک معیار مقرر ہو گیا صاحب۔ دنیا کے ہر معیار کے مطابق قریب ترین رشتہ اپنے کا باپ اور بیٹے کا رشتہ ہوتا ہے لیکن جب بات Biological نہیں رہے گی بلکہ آگے جا کے انسانیت کا معیار سامنے جب آئے گا وہاں ترازو اور ہو جائیں گے۔ وہاں بیٹا بھی وہی اپنا بیٹا ہوگا کہ جو ایمان لایا ہوگا جس کے اعمال صالح ہونگے محض کسی کا بیٹا ہونا اس کو نہیں بچا سکتا۔ وہ اپنوں میں سے نہیں ہو سکتا قرآن نے یہ کہا ہے وہ تیرے اپنوں میں سے نہیں تھا۔

قرآن حکیم کی روشنی میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہوتا ہے، خونی رشتہ کوئی رشتہ ہی نہیں ہوتا

یہیں سے عزیزانِ من! یہ اصول ہمارے سامنے آیا جسے آج کہتے ہیں قومیت کا مدار کیا ہے اسلام میں۔ ارے آپ قوم کہتے ہیں وہ باپ بیٹے کا رشتہ نہیں مانتا عزیزانِ من! اگر بیٹا اہل میں سے نہیں ہے تو۔ قرآن نے یہ کہا کہ ساری دنیا کے انسان کہ جو ایمان کے اشتراک کے اوپر تمہارے اہل میں ہو جاتے ہیں' وہ ایک قوم بنتی ہیں' وہ تمہارے اہل ہوتے ہیں۔ حقیقی بیٹا اگر اس میں شامل نہیں ہے تمہارے ہاں ایمان کا اشتراک اور عملِ صالح کا اشتراک نہیں ہے' وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہو سکتا۔ معیار ہی بدل دیجیے اپنے اور

بیگانے کا عزیزانِ من! ۔ یہاں باپ اور بیٹے کا رشتہ کہا دوسری جگہ اسی میں حضرتِ نوحؑ کی بیوی کے متعلق بھی کہا (66:10) کہ وہ بھی ایمان نہیں لائی تھی وہ بھی ڈوب گئی تھی۔ حضرتِ ابراہیمؑ بیٹا ہے صاحبِ ایمان، باپ صاحبِ ایمان نہیں ہے۔ بیٹے نے باپ سے یہ کہہ دیا کہ میرا کوئی تعلق تمہارے ساتھ نہیں ہے (9:114)۔ یہاں باپ اور بیٹے کے متعلق یہ چیز کہ بیٹا اہل میں سے نہیں ہے وہاں بیٹے اور باپ کی بات کہ وہ باپ بھی اپنوں میں سے نہیں ہے کہ جو ایمان کے اشتراک سے اپنوں میں سے نہیں آتا تھا۔ حضرتِ لوطؑ کی بیوی بھی اسی زمرے میں آئی تھی وہ بھی اپنوں میں سے نہیں تھی (66:10)۔ اور پھر اس کے بعد یہ آخری فیصلے آ کے نبی اکرمﷺ کے دور میں آ گئے نبی اکرمﷺ کے سارے اپنے عزیز رشتہ دار، والد تو پہلے فوت ہو چکے ہوئے تھے، حقیقی چچا تھے نا یہ ابولہب وغیرہ یہ سارے قریش جتنے بھی تھے اپنے تھے، اتنا قریبی رشتہ تھا ان کے ساتھ۔ بدر کے میدان میں جب آ کے جس کو قرآن نے یوم الفرقان اسی لیے کہا ہے کہ اس میں الگ الگ ہو گئے تھے دونوں گروہ۔

بدر کے میدان میں تو قرآن حکیم نے اپنے ہاں دوقومی نظریہ کی وضاحت دوٹوک الفاظ میں کر دی تھی

قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کو پیدا کیا اور وہ دو گروہوں کے اندر دنیا میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ وہ ہے جو صاحبانِ ایمان کا ہے دوسرا وہ جو ہے جو کفر والے ہیں۔ دو ہی گروہ اور دو ہی قومیں ہیں دنیا میں عزیزانِ من! اسے دوقومی نظریہ کہتے ہیں (64:2)۔ بدر کے میدان کو قرآن نے یوم الفرقان کہا تھا کہ اس لکیر سے اپنے جو تھے ایک قوم، ایک نسب، ایک شعوب، ایک قبیلہ وہ دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ امتیازی طور پر اور بٹنے کے لیے قرآن نے فرقان کا لفظ استعمال کیا ہے (8:41)۔ شاید آپ کو یاد ہو عربی زبان میں فرق فرق کو کہتے ہیں، فرقان کہتے ہیں۔ یہ جو بالوں میں مانگ نکالی جاتی ہے نا ایک ایک بال اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے صاحب، ایک بال بھی غلط آ جائے تو کہتے ہیں مانگ سیدھی نہیں نکلی۔ وہ مانگ کی طرح سی بدر کے میدان میں ایک لائن کھینچ دی گئی تھی کہ ایک طرف جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کھڑے تھے دوسری طرف حقیقی بیٹا کھڑا تھا آپؓ کا، اِدھر عمرؓ کھڑے تھے وہاں ماموں سامنے کھڑا تھا، اِدھر رسول اللہﷺ کھڑے تھے وہاں عباس چچا کھڑا تھا ابن عاص داماد کھڑا تھا سامنے۔ دیکھتے ہیں اہل کا معیار یہاں کیا ہے رشتوں کا، معیار کیا ہے اپنوں اور بیگانوں کا معیار کیا ہے۔ ہم قوم ہونے کا معیار کیا ہے۔ چچا بھی ہم قوم نہیں ہو سکتا، داماد بھی ہم قوم نہیں ہو سکتا اور اِدھر ہم قوم کون ہے فارس کا سلمانؓ ہم قوم حبش کا بلالؓ ہم قوم ہے، روم کا صہیبؓ ہم قوم ہے اور رسول اللہﷺ کا حقیقی چچا جو ہے وہ غیروں میں ہے۔ یہ تھا معیار جو پہلے دن مقرر کیا گیا۔

وحی کی روشنی میں قومیت کا حقیقی تصور سامنے آنے پر حضرت نوح کی طرف سے خدا کے حضور توبہ قبول کرنے کی التجا

اے نوحؑ غلطی کر گئے ہو اہل کی Definition یہ نہیں ہے جو تمہارے ذہن کے اندر ہے۔ بیٹا بھی اگر ان چیزوں کے اندر تمہارے ساتھ شامل نہیں ہے تو اپنے اہل میں سے نہیں ہے، غیروں میں سے ہے اس لیے اس کو تباہ ہو جانا ہے۔فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ (11:46) نوحؑ! جس بات کا پہلے سے علم حاصل نہ کر لو اس کے متعلق اعتراض نہیں کیا کرتے۔ ہم نے اس لیے بات سمجھا دی ہے تمہیں کہ تمہیں اس بات کا علم ہو جائے۔ تو پہلی دفعہ جیسے کشتی بنانا سکھایا تھا نا وہ بھی کوئی چیز ایسی نقص کی نہیں تھی کہ انہیں کشتی بنانا بھی نہیں آتی تھی۔ پہلی دفعہ دنیا میں یہ بات بھی سکھائی کہ اپنے اور بیگانے کا معیار ہم قبیلہ ہم خاندان، ہم شعب، ہم نسل، ہم نسب، ہم قوم، ہم وطن، ہونا نہیں ہے، ہم ایمان ہونا اس کے لیے ضروری ہے۔ اور اسی لیے قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ (11:47) یا اللہ میری توبہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا۔ آہاہا۔ اور یہ بات پھر حضرتِ نوحؑ کی آگے چلائیں گے۔ وقت ہو گیا آج۔ ہم سورۃ ھود کی آیت 46 تک آ گئے عزیزانِ من! 47 سے ہم آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

ساتواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 47 تا 49)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1974ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 47 سے ہو رہا ہے۔ (11:47)

قرآن حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا مقصد غیر متبدل ابدی حقائق کو پیش کرنا ہوتا ہے

بات مسلسل چلی آ رہی تھی داستان ہے حضرتِ نوحؑ کی۔ دو آیتوں کے بعد یہ داستان ختم ہوگی تو میں پھر عرض کرونگا کہ ہمارے ذہنوں میں تو یہی ہے نا کہ یہ یونہی ایک تاریخی واقعہ ہے' ایک بات ہے چھ ہزار سال پرانی' کہدی گئی۔ لیکن قرآن تو یہ کہتا ہے کہ یہ اساطیر الاولین نہیں ہیں' پہلے لوگوں کی داستانیں نہیں ہیں۔ یہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے ان کے اندر ابدی حقائق ہیں غیر متبدل زندگی کے اصول ہیں اور اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ کہا ہوا تھا کہ دین ہم نے نوحؑ سے لے کے نبی اکرم ﷺ تک کے تمام انبیاء کو جو دیا وہ ایک ہی تھا' دین ایک ہی تھا اس پر عمل کرنے کے طریق مختلف زمانے میں مختلف رہے تھے۔ تو یہ جو داستانیں ہمارے سامنے مختلف انبیائے کرامؑ کی آئیں گی یا اقوامِ گذشتہ کی سرگذشتیں تو ان میں حقائق وہ بیان کیے جائیں گے جو دین تھا' زندگی کے ابدی غیر متبدل حقائق۔ اور یہی چیز ہے کہ جب بھی کوئی داستان ان میں سے سامنے آئے تو اس کے بعد دیکھنا یہ چاہیے کہ ان میں وہ حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ تو میں نے عرض کیا کہ میں ابھی دو آیتوں کے بعد اس کو Sum-up کرونگا کہ حقائق اس میں کیا ملے۔

تمدنی زندگی کے رشتوں اور نظریاتی تعلقات میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے

بات یہ آ رہی تھی کہ کشتی میں سوار ہوگئے۔ حضرتِ نوحؑ نے یہ پہلے کہا ہوا تھا اور خدا نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ میں تیرے اہل جو ہیں ان

کو بچا لونگا' وہ بچ جائیں گے۔ کشتی میں سوار ہوئے تو حضرتِ نوحؑ کا بیٹا وہ کشتی میں سوار ہونے والوں میں سے نہیں تھا' وہ ڈوب رہا تھا تو قرآن میں ہے کہ حضرتِ نوحؑ نے کہا کہ بارِالہا آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تیرے اہل بچا لیے جائیں گے اور میرا بیٹا سامنے ڈوب رہا ہے اور تو تو وعدوں کا بڑا سچا ہوتا ہے وَ اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ (11:45)۔ میں نے کہا تھا کہ بات کتنی خوبصورت ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ (11:45) وعدے تیرے سچے ہیں یہ بات نہیں ہے کہ تیرے فیصلے کے خلاف میں کوئی اپیل کر رہا ہوں' فیصلہ تو تیرا ہی آخری ہے' بات سمجھنا چاہتا ہوں کہ جب آپ نے وعدہ کیا تھا اور وعدہ تیرا ہوتا ہے سچا تو پھر یہ بیٹا کیوں ڈوب رہا ہے' میرے اہل کے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ جواب ملا کہ نوحؑ! ہم نے وعدہ کیا تھا لیکن تیرے ذہن میں جو اپنے اور بیگانے کا معیار ہے' وہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ باپ یا بیٹا یا بیوی یا یہ اپنوں میں سے ہو جاتے ہیں۔ یہ تمدنی زندگی کے رشتے ہیں۔ یہاں بات دین کی ہو رہی ہے' یہاں اپنے اور بیگانے کا معیار اور ہے' اپنا وہ ہے جو اس نظام کے تابع چلتا ہے' احکامِ خداوندی کا اتباع کرتا ہے۔ غیر وہ ہے کہ جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے خواہ وہ دنیاوی معیار کے مطابق بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ کتنی بڑی ابدی حقیقت ہے جو قرآن نے بیان کی ہے سب سے پہلے نبی کی داستان بیان کرنے کے سلسلے میں۔ یہ آج کی بات نہیں ہے جو یہاں دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے' دنیا نے آج تک جتنے معیار قومیت کی تشکیل کے بیان کیے' وہ کسی نہ کسی طبعی یا Physical Distinction کے اوپر ہی تھے۔ قبائل بنے' تو خون کا رشتہ تھا' تمدنی رشتے بھی اسی طرح سے خون کے یا عہدی یا عقدی رشتے بیوی میاں کے ہوتے تھے۔ قبائل آگے بڑھے تو نسل کا رشتہ چلا' نسل آگے بڑھی اب تو وطن کے اشتراک کا رشتہ چلا۔ قرآن نے ان تمام رشتوں کو کاٹ دیا اس نے کہا ہے کہ رشتہ صرف ایمان کا رشتہ ہے جو اس میں مشترک ہے وہ اپنا ہے اور جو اس میں مشترک نہیں ہے وہ بیگانہ ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے قول کے مطابق فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ ۚ (14:36) جو اس راستے پر میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے' وہ میرا ہے۔ جو اس راستے پہ نہیں چلتا وہ باپ ہی کیوں نہ ہو وہ بھی میرا نہیں ہے۔ یہاں بیٹا کہا' اُنہوں نے باپ کہا سارے رشتے کاٹ کے رکھ دیے۔ یہ ہے معیارِ قومیت جسے کہا جاتا ہے قرآن کی رو سے۔ یہی ہیں دو قومیں یہاں جو بن گئی ہیں حضرتِ نوحؑ ایک اور قوم سے متعلق ہو گئے' ان کا حقیقی بیٹا اسی ملک میں رہنے والا' اسی نسل سے' اسی خاندان سے حقیقی بیٹا' وہی زبان بولنے والا' وطن نسل خون رنگ زبان کا اشتراک ساری چیزیں اکٹھی پھر بھی ایک قوم کے افراد نہیں بن رہے۔ کس چیز نے الگ کر دیا؟ رشتۂ ایمان نے الگ کر دیا۔ تو یہ ایک ابدی حقیقت ہے جیسا میں نے عرض کیا کہ یہ داستانیں نہیں بیان ہو رہیں' ابدی حقائق بیان ہو رہے ہیں' غیر متبدل اصول دیے جا رہے ہیں دین کے۔

نبی کی بشری حیثیت اور احکامِ خداوندی میں فرق

بات یہاں تک آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّیۡۤ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ (11:46) اور دیکھو جس بات کا علم نہ ہو اس کے متعلق نہیں بات کیا کرتے، سوال کیا کرتے۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ (11:47) اے اللہ میں حفاظت چاہتا ہوں تجھ سے کہ میں بے خبری میں، ناواقفیت میں کوئی ایسی بات کر بیٹھوں یا پوچھ لوں تو اس کا مجھ سے مواخذہ نہ کیا جائے۔ یہ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ط (11:47) ایک نبی کہہ رہا ہے کہ جس بات کا مجھے علم نہ ہو، تو نظر آتا ہے کہ دین کے معاملات میں نبی کا علم بھی وحی پر مبنی ہوتا تھا، وحی اسے بتاتا تھا۔ جس بات میں ابھی وحی کی راہنمائی نہیں سامنے آئی ہوتی تھی اس میں وہ خود کہہ رہا ہے کہ مجھے جس بات کا خود علم نہ ہو، میں ناواقفیت کی بناء پر، بے خبری کے عالم میں کوئی ایسی بات پوچھ لوں یا کر بیٹھوں تو اس کا مجھ سے مواخذہ نہ کیا جائے۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بشری حیثیت نبی کی اور ایک نبی کی حیثیت میں کس طرح سے فرق سامنے آجاتا ہے ہمارے۔ یہ بشری حیثیت ہے، یہ بشری حیثیت ہی تھی ناکہ جس میں حضرتِ نوحؑ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اگر سیلاب آ گیا تو اس میں بچنا کیسے چاہیے۔ اس زمانے میں ابھی کشتیاں بنی نہیں تھیں۔ تو قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ خدا نے اس سے کہا تھا کہ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا (11:37) ہماری وحی کے مطابق، ہماری زیرِ نگرانی کشتی بناؤ۔ تو عام انسان تو ایک طرف رہا پہلے نبیؑ کو جس کا ذکر قرآن نے پہلے نبیؑ کی حیثیت سے کیا ہے، یہ بات بھی وحی کے ذریعے بتائی گئی تھی کہ طوفان میں بچا کیسے کرتے ہیں، کشتی کے ذریعے، تو پھر یہ تو پتہ نہیں تھا کہ کشتی کیا ہوتی ہے، کیسے بنتی ہے۔ کہا وحی کے ذریعے ہم نے بتایا۔ وحی کے ذریعے جو علم ملتا تھا نبیؑ کو، وہ دوسرے انسانوں سے الگ مختص، منفرد ہوتا تھا اور جو باتیں وحی کے ذریعے سے نہیں ملتی تھیں اس میں وہ رسول اپنے ہی ماحول کا، اپنے ہی مقامی حالات کا ایک انسان ہوتا تھا۔ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ط وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (11:47) اگر ان چیزوں کے اوپر بھی گرفت ہونی شروع ہو گئی تو میں ڈرتا ہوں کہ پھر تو بڑا ہی نقصان رہے گا، بڑے گھاٹے میں، میں رہونگا۔ تجھ سے میں سامانِ حفاظت بھی چاہتا ہوں، سامانِ نشو و نما بھی چاہتا ہوں۔ بات منظور کر لی گئی۔ آگے بات چلتی ہے۔ پہلے یہ آیا تھا کہ وہ کشتی چلی جا رہی تھی سینۂ بحر پہ بط کی طرح نہایت اطمینان ہے حالانکہ تلاطم انگیزیاں پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھ رہی تھیں۔ معاملہ ختم ہوا ہم نے زمین سے کہا پانی جذب کر لے، آسمان سے کہا کہ بارش روک لے۔ بڑا محاکاتی انداز ہے۔ قِیۡلَ یٰنُوۡحُ اہۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَکٰتٍ عَلَیۡکَ وَ عَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَکَ ط (11:48) خشکی ہو گئی، طوفان تھم گیا، زمین خشک ہو گئی۔ دوسری جگہ ہے کہ وہ کشتی جودی کی پہاڑیوں میں جا کے ٹھہر گئی ہم نے کہا ہے کہ ہاں نوحؑ اب تم اتر جاؤ اس سے (11:44)۔

سیلاب کی تباہ کاریوں سے ہونے والے نقصانات کا ذکر

اب دیکھئے یہ دو چیزیں ہیں بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَکٰتٍ عَلَیۡکَ (11:48) طوفان کے بعد سیلاب تھمنے کے بعد ہم نے تو ابھی پچھلے سال یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سیلاب میں جو تباہیاں آتی ہیں' سیلاب تھمنے کے بعد جو بربادیاں ہوتی ہیں' ان میں کچھ کم تباہیاں نہیں ہوتیں: خطرات ہر طرف سے' پھر سارا سامانِ نشوونما' سارا رزق کا سامان بہہ گیا ہوتا ہے' ختم ہو چکا ہوتا ہے' فصلیں اجڑ چکی ہوتی ہیں' گھر بار برباد ہو چکے ہوتے ہیں' کوئی ذخیرہ باقی نہیں رہتا' بالکل بے سروسامانی کا عالم ہوتا ہے ان کے لیے جو بچ جاتے ہیں سیلاب سے۔ بڑی ضروری چیز ہے کہ وہ خطرات سے بھی محفوظ رہے اور ان کو سامانِ رزق بھی ملے۔ کہا اتر جاؤ اب تم بھی کشتی سے۔ غور کیجیے دونوں چیزوں کی حفاظت۔ اور ابھی ابھی انہوں نے کہا تھا نا کہ تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ (11:47) مغفرت تو حفاظت کو کہتے ہیں خطرات سے' رحمت سامانِ نشوونما کو کہتے ہیں۔ دو ہی چیزیں وہاں مانگی تھیں' دو ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے بنیادی طور پر۔ کہا کہ اتر جاؤ ڈرو نہیں بِسَلٰمٍ مِّنَّا (11:48) پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہماری طرف سے سلامتی کا پیغام ہے' حفاظت کا پیغام ہے' امن کا پیغام ہے' خطرے کی بات کوئی نہیں ہے۔ اس کا انتظام کر لیا ہوا ہے پہلی چیز تو سَلٰمٍ (11:48) ہے۔ تو چلئے خطرہ نہیں سہی' کھانے کو بھی تو کچھ چاہیئے' تو کہا بَرَکٰتٍ عَلَیۡکَ (11:48) ہمارے ہاں تو یہ سلام اور برکات ایسے الفاظ ہیں نا جن کو ہم نے استعمال کر لیا ہوا ہے۔ برکت کہتے ہیں بھرپور طور پر فصلوں کا اگنا' یہ فصلیں جو گھنی ہو کے سیاہ رنگ کے قریب جب ہو جاتی ہیں اتنی زیادہ سبزی شدت سے ہوتی ہے' اس کو کہتے ہیں برکت۔ تو اب یہ دوسری چیز ہے جس کی ضرورت تھی کہ خطرات سے سلامتی اور اس کے بعد سامانِ نشوونما کی اتنی بڑی فراوانی یہ ملے گی۔ عَلَیۡکَ وَ عَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَکَ (11:48) اور یہ جو تیرے ساتھ تیری جماعت آ گئی ہے اس کے لیے بھی۔ گویا حضرتِ نوحؑ اور اس کی جماعت مؤمنین جو اس طرح سے کشتی میں سوار تھی اور ادھر بچ گئی تھی اس کے لیے یہ چیز دی۔ اب دیکھئے قرآن کریم وہ ابدی حقائق کیا بیان کرتا ہے۔ محض واقعہ کے اعتبار سے تو اتنا ہی کافی تھا یہاں بات ختم کر دینی چاہیے تھی' کشتی حفاظت سے ٹک گئی' یہ لوگ حفاظت سے اتر گئے' کہہ دیا گیا کہ سلامتی بھی ہے' سامانِ نشوونما ہے۔ لیکن یہ تو قرآن ہے یہاں کہا ہے کہ جو تیرے ساتھ یہ جماعتِ مؤمنین والے ہیں ان کے لیے پرورش کا' رزق کا سامان ہوگا۔

حضرت نوحؑ کے زمانے کا سیلاب کوئی عالمگیر سیلاب نہ تھا

یہ تو غلط ہے کہ طوفان جو ہے وہ عالمگیر تھا ساری دنیا پہ آ گیا ہوا تھا' وہ تو افسانے ہیں۔ وہ ایک بستی تھی اس میں ادھر اُدھر طوفان آیا تھا۔ دوسرے مقام پہ جا کے یہ کشتی ٹکی ہے وہاں طوفان ہوگا ہی نہیں' وہاں بہرحال دوسرے لوگ بس رہے تھے۔ اب اگر یہ ہو کہ یہ حفاظت

اور سامانِ نشو ونما صرف ان کے لیے ہے جو تیری کشتی میں تھے یا مؤمنین کے لیے ہے اب یہاں اگلی بات آ گئی کہ جو لوگ ایمان نہیں لائے ان کے لیے یہ سامانِ نشو ونما نہیں ہے یہ رزق کا سامان؟ ہمارے ہاں تو تصور یہی ہے نا کہ خدا اپنے بندوں کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے۔ اپنے بندوں کے متعلق یہی چیز ہوتی ہے کہ جو اس پر ایمان لے آتے ہیں‘ یہی چیز جسے ہم کہتے ہیں‘ مسلمان ہو جاتے ہیں‘ یہ جو کفار ہے ان کو تو اس سے محروم ہو جانا چاہیے۔ اور پھر جب دیکھتے ہیں ہم کہ عملاً اس سے الٹ ہو رہا ہے کہ یہ کفار جو ہیں ان کو تو ان مسلمانوں سے کہیں زیادہ مل رہا ہے‘ مسلمان تو اس وقت تعداد کے اعتبار سے ساٹھ ستر کروڑ‘ اس ساری دنیا میں پٹ رہا ہے کفار کے ہاتھوں۔ تو پھر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ مسلمان اپنے ذہن میں یہ خدا کے مقرب بندے یا مقرب امت بنے ہوئے ہوتے ہیں نا کہ ان کی تو کیفیت یہ ہے اور یہ جو غیر مسلم ہیں یہ جو کفار ہیں وہ جو تیرے نام سے بیزار ہیں‘ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو یہ کچھ ملا ہوا ہے۔ عام طور پہ یہ خیال ذہنوں میں آتا ہے لوگ کہتے ہیں یہ چیز بھی کہ صاحب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کیا ہوا۔ بڑی اہم بات ہے۔ یہ خیال عام طور پہ ہی عام لوگوں کے ذہنوں میں نہیں آتا‘ ہمارے حکیم الامت کے ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی۔ ایک دفعہ جب انہوں نے شکوہ لکھا ہے علامہ اقبالؒ نے تو یہ اشعار تو بڑے اہم ان میں ہیں۔ وہ یہی شکوہ کرتے تھے کہ

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی مستِ مئے پندار بھی ہیں
کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ایسے‘ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر
یہ شکایت نہیں‘ ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملے حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مراعات نہیں

انہیں بھی یہ شکوہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہمیں یہ کچھ ملنا چاہیے' تو ذہن میں یہ ہے نا۔

خدائے رحیم کی طرف سے سامانِ رزق کی دستیابی تو ہر کسی کے لیے ہوتی ہے

بات یہاں کہی گئی کہ ہاں نوحؑ تیرے ساتھی جو ہیں ان کے لیے سامانِ رزق بھی یہاں ملے گا۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن ہے' یہ اس کے ساتھ یہ ہے وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (11:48) تیرے علاوہ یہ جو باقی لوگ ہیں' کھانے پینے کو انہیں بھی ملے گا۔ خدا ہونا' رازق ہونا' اسے ہی زیبا ہے۔ ہمارے ہاں تو ذرا کسی سے اختلاف ہو جائے تھوڑی سی بات کے اوپر پھر دیکھئے اس کے ساتھ کیا کیفیت ہماری ہوتی ہے۔ یہ تو تنگ نظری ہے' تنگ دلی ہے۔ خدا کو تو بڑا ہی' جیسے ہم کہتے ہیں' وسیع القلب ہونا چاہیے اور وہ ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں حالانکہ بظاہر کوئی اور اس واقعہ کو مرقوم کرتا تو یہ ذہن میں بھی نہ آتا کہ یہ بات ساتھ کہنے کی ہے۔ کہا کہ تیری جو قوم ہے تیری جماعت جو ہے یہ جو مؤمنین کی جماعت ہے' ان کو رزق بھی ملے گا' فراوانیاں بھی ملیں گی بات ختم ہو جاتی یہاں' قصہ تو حضرتِ نوحؑ کا تھا۔ لیکن کہا کہ ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ صاحب یہ سامانِ رزق صرف انہی کو ملے گا' انہیں کہا کہ یہ جو دوسری جماعتیں ہیں ان کو بھی یہ ملے گا۔ فرق آگے بتایا ہے دو لفظوں میں اور یہی چیز ہے جو میں سمجھتا ہوں ذرا وضاحت طلب ہے۔

طبعی چیزوں کی فراہمی' طبعی قوانین کے ذریعے ہی ملتی ہیں

قرآن کریم یہ بتاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے' تقابلِ مذاہب میں کسی اور مبینہ مذہبی کتاب میں یہ بات نہیں جو قرآن کی خصوصیت ہے۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ اس دنیا کی طبعی چیزیں جتنی بھی ہیں' طبعی قوانین کے تابع وہ چلتی ہیں اور ان میں جو بھی ان قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے اور ان کے مطابق وہ محنت کرتا ہے' اسکے نتائج اس کو مل جاتے ہیں۔ اس میں کافر اور مومن کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ میں نے یہ الفاظ دو استعمال کیے' کافر اور مومن کا فرق نہیں ہے' وہ جو ہم ذہن میں اپنے سمجھتے ہیں کافر۔

میں نے پچھلے درس میں یہ کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے جو کہا حضرتِ نوحؑ سے کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ' میں نے کہا تھا کہ آج بھی جو شخص یا جو قوم سیلاب اور طوفان سے بچنے کے لیے کشتیاں اور جہاز بناتی ہے وہ خدا کی اس وحی کا اتباع کر رہی ہوتی ہے۔ قوانینِ خداوندی دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں جو اس خارجی کائنات میں کارفرما ہیں جنہیں Laws of Nature کہتے ہیں' قوانینِ فطرت کہتے ہیں۔ وہ بھی خدا کے قوانین ہیں' ان کا اتباع بھی خدا کے قوانین کا ہی اتباع ہے۔ جو قوم ان قوانین کا اتباع کرتی ہے' اسے ان قوانین کی رو سے یہ طبعی زندگی کے سارے سامانِ نشوونما' اسبابِ رزق سب میسر آتے رہتے ہیں۔

کائنات کی ہر شے کو بنی آدم کے لیے تابع تسخیر کردیا ہے

اس نے کہا ہے اور یہ آدم سے کہا ہے سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے تمہارے مسخر تابع تسخیر کردیا ہے ہم نے۔ اور یہ آدم سے ہی کہا تھا وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31) ان تمام چیزوں کے قوانین کا علم حاصل کرنا' اس کی صلاحیت ہر آدمی میں ودیعت کرکے ہم نے رکھ دی ہے۔ یہ تو آدمی سے کہا تھا جو بھی ان قوانین کا علم حاصل کرے گا' ان کے مطابق سامان طریق مہیا کرلے گا' یہ ان کے نتائج اس کے لیے آتے چلے جائیں گے۔ یہ ہے وہ حقیقت جو قرآنِ کریم نے بڑی تفصیل سے بیان کی ہے دو چار آیتیں میں پیش کرتا ہوں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 18' جو فرق ہے جہاں جاکے یہ مومن اور کافر کا فرق شروع ہوتا ہے وہ میں اس کے ساتھ بعد میں عرض کرونگا۔ پہلی چیز یہ کہونگا' یہ بیان کرنا چاہتا ہوں قرآن کی ان تفاصیل کو وہ جو کہتا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (17:18)

جو اسی طبعی زندگی کے' اسی قریبی زندگی کے' اسی دنیا کی زندگی کے طبعی سامان طبعی فوائد جو حاصل کرنا چاہتا ہے' ہم اسے یہ دیتے ہیں اپنے قوانین کے مطابق۔ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (17:19) اس کے ساتھ دوسرا جو ان چیزوں کے اوپر بھی ایمان رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی (یہ دوسری چیز جو ہے اس کی تشریح میں بعد میں کرونگا) آخرت کو بھی ذہن میں رکھتا ہے' اس کو بھی اس کی کوشش کے مطابق محنت کے مطابق اجر ملتا چلا جاتا ہے۔ تو گویا دو جماعتیں یہ ہمارے سامنے آگئی ہیں یہاں' ایک وہ ہے کہ جو یہی دنیا کے سامان ہی چاہتی ہے' وہ کہتا ہے اس کو ہم دیے جاتے ہیں اس کی محنت کا ماحصل۔ دوسری جماعت یہ ہے کہ وہ یہ بھی چاہتی ہے اس کے ساتھ وہ بھی چاہتی ہے' آخرت کی چیز بھی چاہتی ہے۔ وہ کہتا ہے اسے بھی ہم دیے جاتے ہیں۔ یہ جو ہے جماعتِ مؤمنین اس کو تو چھوڑیے ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ اس کو ملتا ہے۔ وہ جو دوسری جماعت ہے کہ جو آخرت پہ ایمان ہی نہیں رکھتی' کہا یہ ہے کہ اس کو بھی ہم دیتے ہیں۔ اور اگلا ٹکڑا جو اگلی آیت کا ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ (17:20) اس جماعت کو بھی اور اِس جماعت کو بھی دونوں گروہوں کو ہم مدد دیے چلے جاتے ہیں' بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے عزیزانِ من! جسے رب العالمین ہونے کا شرف حاصل ہے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ (17:20) صورت یہاں یہ نہیں ہے کہ اگر ایک ہندو یا سکھ ہرنام سنگھ جو ہے وہ اگر زمین کو قاعدے کے مطابق اس کی اصلاح کرتا ہے' ہل جوتتا ہے' اچھا بیج ڈالتا ہے' پانی دیتا ہے اس میں' رکھوالی کرتا ہے جو قاعدہ یا قانون ہے اس کے مطابق فصل بوتا ہے تو ہم یہ کہیں کہ نہیں صاحب یہ ہرنام سنگھ ہے اس واسطے اس کی کھیتی تو نہیں اگے گی' اس میں تو نہیں دانے پڑیں گے۔ اور یہ محمد عبداللہ ہے بیٹھا ہوا ہے ٹھیک ہے' وہ نمازیں پڑھتا رہتا ہے' روزے رکھتا رہتا ہے اور کھیتی میں جاکے کچھ

کرتا نہیں ہے وہاں اگے گی' کہنے لگے سوال نہیں ہے۔

قدرت نے کائنات کا ذرہ ذرہ پوری انسانیت کے لیے کھولا ہے

ایک کھیت میں محمد عبداللہ ہل چلاتا ہے' دوسرے میں ہرنام سنگھ ہل چلاتا ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ (17:20) کیا الفاظ ہیں ان دونوں کو ان کی محنت کے مطابق ہم مدد دیتے ہیں۔ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ (17:20) یہ جو چیزیں ہیں وہ ہماری طرف سے بطور عطیہ کے پوری انسانیت کے لیے ہم نے ان کو دیا ہوا ہے۔ اور اگلا ٹکڑا ہے عجیب ہے کہ یاد رکھو وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20) جو چیزیں ہم نے پوری انسانیت کی نشو و نما کے لیے دی ہیں' ان میں کہیں ہم نے پھاٹک نہیں لگا دیا کہ ہرنام سنگھ یہاں تک جائے گا اور محمد عبداللہ آگے تک چلا جائے گا۔ ہم نے کہیں پھاٹک نہیں لگا دیا' ان قوانین کے مطابق صرف انسان اور کوئی اگلی شرط نہیں جسے ہم کفر و ایمان کی شرط کہتے ہیں۔

جو کوئی طبعی فوائد حاصل کرنا چاہے یا اُخروی اور یا پھر دونوں' یہ چیز ہر انسان کے لیے برابر ہوگی

اصل یہ ہے عزیزانِ من! کہ جہاں تک قوانینِ فطرت کے اتباع کا تعلق ہے' جو ان قوانین کا اتباع نہیں کرتا' وہ ان قوانین کا کافر ہے نام مسلمان ہی کیوں نہ ہو اس کا۔ جو ان قوانین کا اتباع کرتا ہے وہ ان قوانین کا مؤمن ہے' آج کے معیار کے مطابق اُسے آپ کافر کی لسٹ میں ہی کیوں نہ لے آئیں۔ صرف اتنا سمجھ لیجیے ان قوانین کا کافر اور ان قوانین کا مؤمن طبعی زندگی کے اندر۔ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20) ہم نے کہیں پھاٹک نہیں لگا دیا کہ یہ جائے گا اور وہ نہیں جائے گا اس سے آگے۔ دوسری جگہ ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا (42:20) جو دنیا اور آخرت دونوں کی کھیتی چاہتا ہے اور اس کی کھیتی بھی ہم بڑھاتے چلے جاتے ہیں جو اس دنیا کی کھیتی اور فصل چاہتا ہے اسے بھی ہم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ فرق آگے آتا ہے۔ جہاں تک اس دنیا کے فطرت کے مطابق قوانین کا تعلق ہے' ان قوانین کے نتائج کا تعلق ہے اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہی ہے کہ جو ان کا اتباع کرتا ہے' اس کا حاصل اسے مل جاتا ہے۔ جو اس کا اتباع نہیں کرتا اسے اس کا حاصل نہیں ملتا۔ اس میں کوئی تمیز نہیں ہے مسلمان اور کافر کی' انسان ہونا' صرف آدمی ہونا اس کے لیے صرف شرط ہے۔

طبعی قوانین کے ضابطے کے برعکس انسانیت کے اقدار کا ضابطہ اور اس کی وضاحت

یہ جو یہاں یہ سب کچھ لے جانے والے ہیں کہا ہے اس کے بعد کہ جو اپنی زندگی کا نصب العین اپنے سامنے پروگرام مطمحِ نگاہ مقصد

حیات صرف دنیا کی متاع کو چاہتا ہے' ملتا ہے اسے یہ سب کچھ۔لیکن انسانوں کی صورت میں قوانین کا ایک اور ضابطہ بھی ہے طبعی قوانین کے علاوہ' Physical Laws کے علاوہ۔ یہ جو ضابطہ ہے قوانین کا' اسے دین کہا جاتا ہے' اسے انسانیت کے قوانین کہہ لیجئے' اسے اقدار کہہ لیجئے' اسے Values کہہ لیجیے۔ یہ طبعی قوانین سے الگ ہیں۔ یہ چیز کہ جو شخص بھی (آج تو شاید یہ بات سمجھ میں نہ آئے یا مذاق اڑے) خالص گھی کھاتا ہے اس کی صحت اچھی ہوتی ہے۔اب تو یہ کبھی کبھی خالص گھی ہمارے بچوں کو مل جاتا ہے' کھانسی لگ جاتی ہے انہیں۔لیکن بہرحال خالص گھی کھانے سے صحت اچھی ہوتی ہے۔ ہرنام سنگھ کھائے گا اس کی بھی اچھی ہو جائے گی۔عبداللہ کھائے گا اس کی بھی اچھی ہو جائے گی۔ ایک چیز آگے آتی ہے کہ ایک گھی اپنی کمائی کا خریدا ہوا اور ایک گھی چرایا ہوا۔گھی تو اپنا فائدہ جسم کے اوپر دونوں کے ایک جیسا ہوگا' جسمانی صحت تو دونوں کی یکساں بڑھے گی۔ یہ ایک فرق اور شروع ہو گیا کہ اس ایک نے چرا کے گھی کھایا' ایک نے حلال کی کمائی کا کھایا جسے حلال وحرام آپ کہتے ہیں۔اس کا جا کے آگے فرق پڑتا ہے یہاں ہرنام سنگھ اور عبداللہ میں فرق شروع ہوتا ہے۔ ہرنام سنگھ وہ ہے کہ جو سمجھتا یہ ہے کہ نہیں صاحب کچھ فرق نہیں ہے' چوری کا ہو یا حلال کا ہو یا حرام کا' وہ ہرنام سنگھ ہے خواہ اس کا نام عبداللہ ہی کیوں نہیں ہے یہاں فرق پڑتا ہے آ کر۔کھیتی دونوں کی یکساں اگتی ہے ایک اس کھیتی کے ماحصل کو لے جا کے اپنی کوٹھیوں میں بند کر دیتا ہے۔

مارکیٹ میں بھاؤ کے چڑھانے کا طریق اور اس کے اثرات

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ (7:88) آیا نا قرآن میں کہ مخالفت کی تھی انہوں نے جو ساری کھیتی کو لے جا کے اپنی کوٹھیوں میں بند کر دیتے تھے۔غریب بھوکا مرتا تھا' انتظار کرتے رہتے تھے کہ اور زیادہ یہ بھوکا مرے تا کہ اور زیادہ بھاؤ چڑھے۔پھر بات میں سے بات نکلتی ہے۔ یہ پتہ ہے یہ بھاؤ چڑھتے کیوں ہیں' اترتے کیوں ہیں۔ میں نے کہا ہے نا کہ ہمارے ہاں تو یہی چیز ہے نا صبح منڈی میں اترو تو کہتے ہیں جی ''اجی کی بھاہ نکلیا ہیگا' جس طراں بل اچوں کیڑا نکلدا اے' او نکلدا کتھوں ہیگا؟ منڈی دے چار بندے جیہڑے نیں پچھے بیہہ کے پہلاں طے کرلیندے نیں فیر کیندے نیں جی اج اے بھاہ نکلیا ہیگا''۔ میں نے کہا تھا نا کہ زبانوں میں یا قوموں میں یہ جو بعض اوقات جن کو محاورہ کہتے ہیں یا ضرب المثل کہتے ہیں' یہ بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ وہ تجربوں کا تت نکالا ہوا ہوتا ہے۔ یہ پتہ ہے کہ بھاؤ پھر یہ چڑھتا کیوں ہے' پنجابی میں دو لفظ ہیں اس کے لیے ''بھاہ کن وگاڑیارات دیاں بھوکیاں'' وہ رات کا بھوکا ہوتا ہے پھر وہ صبح اٹھ کے یہ نہیں پوچھتا کہ کتنے میں دیتے ہو اسے تو یہ ہوتا ہے کہ مل جائے کسی طرح سے۔ ہے نا جس زمانے میں آپ کے ہاں یہ قلت پیدا ہوتی ہے چیزوں کی اور جاتے ہو Cue میں کھڑے ہو کے لینے کو' کبھی کسی نے وہاں دوکاندار سے پوچھا ہے کہ بھئی کتنے کا سیر دو گے' وہ کہتا یہ

ہے کہ ''بابا مینوں ادھ سیر دیدے کس طراں نال خدا واسطے'' وہ پوچھتا ہی نہیں ہے کہ کتنے کا آدھ سیر دو گے۔ ''بھاہ کن وگاڑیارات دیاں بھوکیاں نیں''۔ یہ جو الْمَلَأُ الَّذِينَ (7:88) قرآن نے شروع کیا ہے ناہر نبی کے مقابلے میں جو آتے ہیں ان کو یہ کیوں کہا۔

آج کے دور میں معاشرتی طور پر ضروریات زندگی کی ترسیل کا طریقہ کار

میں نے کئی دفعہ کہا ہے قرآن کے الفاظ پہ غور کیا کرو' یہ اس نے یہ لفظ چیف کا سردار کا استعمال نہیں کیا' عربی زبان میں الفاظ موجود تھے۔لفظ یہ ہے کہ وہ جوان تمام چیزوں کو کوٹھیوں میں بھر لیتے ہیں پھر انتظار کرتے ہیں کہ بھوکے کتنے ہیں' بھوک کتنی بڑھتی ہے' کتنی شدت کی بڑھتی ہے۔جس شدت کی بھوک بڑھتی ہے نا اسی انداز سے بھاؤ بگڑتا ہے نا۔ یہاں فرق آکے پڑ گیا۔کھیتی تو عبداللہ اور ہرنام سنگھ دونوں کی فطرت کے قاعدوں کے مطابق اپنا پھل دیدے گی۔ اگلی چیز یہ ہوگی کہ جو اسے لے جاتا ہے اپنی ذات کے لیۓ' اپنوں کے لیے اور پھر یہ جو انسان ہیں ان کی احتیاج سے فائدہ اٹھانے کے لیۓ' ان کو اس طرح سے ہولڈ کر کے رکھ لیتا ہے' کوٹھیاں بھر لیتا ہے' پھر انتظار کرتا ہے کہ کب یہ بھوکے مریں اور کب میں ان کی کھال اتاروں۔ یہ ہے جو ہرنام سنگھ ہے خواہ عبداللہ ہی نام کیوں نہیں رکھا تا اور دوسرا وہ ہے جو خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق' خدا کے دیے ہوئے اس عطیہ میں سے اپنی محنت کے مطابق تو لے لیتا ہے اور باقی ان کی ضروریات کے لیے عام کر دیتا ہے کہ جو محنت سے اپنی ضروریات پوری کرنے سے معذور ہو چکے ہوتے ہیں۔ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) یہ ہے دوسرا قانون کہ ان کے مال میں ان کی محنت کے ماحصل میں حق ہے As of right وہ ڈیمانڈ کر سکتے ہیں کہ جو معذور ہیں کہ اپنی محنت سے وہ اپنی ضروریات پورا نہیں کر سکتے' یہ ہو گیا جی دوسرا قانون۔

قانون خداوندی کے ہر دو پہلو اور ان کو اپنانے کا طریق اور پھر ان کے ثمرات

اب یہ جو دوسرا قانون ہے' قرآن نے کہا یہ ہے کہ یہ دونوں قوانین کو اکٹھا رکھنا ہوگا اگر قوانینِ فطرت سے آپ نے تغافل برتا تو ان قوانین کی رو سے جو کچھ حاصل ہونا ہے' وہ نہیں ہوگا۔یعنی اگر تم جا کے اپنے کھیت میں اس طریق کے مطابق فصل نہیں بوتے' تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا' وہاں بھی محرومی ہے۔پہلی چیز وہ قوانین اس میں دونوں برابر ہیں۔اور اس کے بعد اگلا ایک ضابطۂ قوانین کا سیٹ شروع ہوا جنہیں آپ یہ اقدار یا Values کہتے ہیں' جہاں حلال اور حرام کی تمیز شروع ہوتی ہے وہاں یہ چیز کہی کہ جو ان قوانین کے ماتحت اپنی محنت کے ماحصل کو رکھتا ہے' اسے کہتے ہیں ایمان بالآخرت' مستقبل کے اوپر بھی ایمان رکھنے والا۔وہ پہلا جو ہے اس کو یہاں تک تو یہ سب کچھ مل جائے گا' یہ دوسرا جو ہے اسے یہ کچھ بھی ملے گا اور اس کے علاوہ اس نے جو اس ضابطۂ قانون کے مطابق پھر ان چیزوں کو رکھا ہے اس کا نتیجہ اس کی مستقبل کی زندگی کی خوشگواریوں کی شکل میں ملے گا۔46ویں سورۃ میں ایک آیت ہے بڑی خوبصورت چیز ہے۔کہتا

ہے یہ جو اسی زندگی کو اپنا مطمح نگاہ یا منتہائے مقصود قرار دیتے تھے' سب کچھ محنت کی' بہت کچھ مل گیا ان کو' یہاں سب کچھ حاصل ہو گیا انہیں یہاں۔ لیکن یہ جو دوسرا حصہ قوانینِ خداوندی کا اس کو انہوں نے Neglect کیا' اس سے معصیت برتی' ان اقدار کے مطابق زندگی بسر نہ کی اور آگے چلے گئے۔ اس آگے چلے جانے کے متعلق ان لوگوں کے متعلق کہا گیا کہ آخرت میں ان کا حصہ نہیں ہوگا کہا ہے کہ وہاں یہ لوگ کہیں گے کہ صاحب وہاں تو اتنا کچھ ہمیں ملا تھا اور یہاں ہمیں یہ ان خوشگواریوں میں ہمارا حصہ کیوں نہیں ہے۔

اُخروی زندگی میں اقدار خداوندی کو نظر انداز کرنے والوں کا انجام

دو لفظ ہیں قرآن کے عجیب چیز ہے' وہ کہیں گے یہاں ہمارا ان میں کیوں حصہ نہیں ہے ان خوشگواریوں میں۔ کہا جائے گا کہ اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا (46:20) تم اپنی محنت کا ما حصل اور تمام خوشگواریاں جو تھیں وہ پوری کی پوری اس زندگی میں لے چکے تھے کچھ باقی نہیں تم نے چھوڑی تھی۔ اس لیے اب یہاں کیا مانگتے ہو بھئی۔ تم نے محنت کی اس کا ما حصل مل گیا' تم لے چکے ہوئے ہو خوشگواریاں زندگی کی وہیں اپنی زندگی کے اندر پہلی زندگی میں دنیا کی زندگی میں' اس لیے مستقبل میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اور مستقبل جو ہے یہ یاد رکھیے قرآنِ کریم کی رو سے قوموں کی زندگی میں ہر اگلا آنے والا سانس بھی مستقبل ہے۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل بھی مستقبل ہے اور اس کے بعد اس زندگی کے بعد مرنے کے بعد جو زندگی آنے والی ہے' وہ بھی مستقبل ہے۔ جو قوم ان اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اس کی یہ زندگی بھی خوشگواریوں کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگواریوں کی زندگی ہوتی ہے اسی لیے مومن کو دعا ہی یہ سکھائی گئی تھی کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔

قدرت کی طرف سے اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں کے لیے واضح اصول موجود ہیں

اس کے مقابلے میں وہ کہتا ہے یہ دوسرے لوگ ہیں جن کی دعا یہی ہوتی ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً (2:201) یہیں کا ہی مال و سامان جتنا ہے اور پھر وہ سمیٹتے چلے جاتے ہیں' لوٹتے چلے جاتے ہیں۔ طبعی زندگی کے مطابق تو یہ ٹھیک ہے' حاصل ہو جاتا ہے ان کی زندگی بڑی خوشگواریوں میں گذرتی ہے لیکن چونکہ اقدارِ خداوندی سے انہوں نے اعراض برتا ہوتا ہے' معصیت برتی ہوتی ہے اس لیے آخرت کی زندگی' مستقبل کی زندگی کے اندر خوشگواریوں میں ان کا حصہ نہیں ہوتا (2:200)۔ اب یہ رہا کہ یہ دو قوانین جو ہیں الگ الگ سیٹ بظاہر ہمارے سامنے آ گئے۔ دونوں خدا کے قوانین ہیں یاد رکھیے دونوں کا اتباع ضروری ہے۔

جہنمی معاشرے سے بچنے کے لیے زندگی کے ہر دو پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ہوگا

لیکن قرآن کہتا یہ ہے کہ دنیا میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ ان میں سے ایک ہی سیٹ ہے جس کو اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں۔ دنیا

کے پیچھے دوڑنے والے قطعاً فراموش کر دیتے ہیں کہ کوئی اقدار بلند بھی ہیں انسانیت کے لیے' دوسرا سیٹ بھی ہے خدا کے قوانین کا' کوئی اُسے چھوڑ دیتے ہیں صاحب۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ چیزیں تسخیرِ فطرت سے یہ سب کچھ حاصل تو ہوجاتا ہے لیکن چونکہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے' ان کی تقسیم خدا کی اقدار کے مطابق نہیں ہوتی اس لیے وہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہوجاتا ہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود جہنم کا معاشرہ جسے قرآن کہتا ہے کہ کھانے کو وہ ملے گا جس سے حلق بند ہوجائے گا' گلا گھٹ جائے گا صاحب۔ یہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہوجاتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اس طبعی زندگی کو Physical Laws کو دنیا کی زندگی کو' قابلِ نفرت قرار دیدیا ہے۔ ہر چیز مادی یا میٹریل جو بھی ہے وہ قابلِ نفرت ہے' قابلِ ترک ہے' روحانیت کے خلاف ہے۔ اللہ کے بندوں کے لیے آخرت کی زندگی ہے یہ زندگی اس میں ان کا کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔ غریبی انکساری عجز اور بے بسی بے کسی بیچارگی' محکومی محتاجی یہ اللہ کے مقرب بندوں کی نشانیاں ہیں اور یہ دنیا تو دنیاداروں کے لیے ہے۔ انہوں نے جو خدا کے قوانین کا پہلا سیٹ تھا طبعی قوانین کا اس سے انکار برتا۔ اپنے تصور کے مطابق یہ سمجھا کہ یہ ہے اصل میں دوسرا جو سیٹ اب ہم کہہ رہے ہیں' یہی ایک ہے قوانین کا آدھا حصہ یہ ہوا۔ ہمارے ذہن میں یہ آتا ہے کہ خیر کوئی بات نہیں اِدھر کے قوانین کا آدھا حصہ سہی یا دوسروں میں اُدھر کے قوانین کا آدھا حصہ لے لیا تو ان میں سے 50% تو مارکس مل گئے نا۔ یہ تو ہمارا اور آپ کا معیار ہے نا ان کے اعمال کے تولنے کا سنیئے قرآن کیا کہتا ہے فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ (2:85) کیا تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ہمارے ضابطۂ قوانین کے ایک حصے کے اوپر ایمان رکھتے ہو' دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ تو میں نے عرض کیا نا کہ ہمارے ذہن میں تو یہ ہوگا نا کہ دس سوال برابر نمبروں کے تھے' پانچ کر لیے اس میں سے پہلے پانچ کر لیے یا آخری پانچ کر لیے' 50% مارکس تو مل گئے اور یہی پاس مارکس تھے راوی عیش لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ تمہاری کیفیت ہے کہ ہمارے ضابطۂ قوانین کے ایک حصے سے انکار کرتے ہو اور دوسرے حصے پہ ایمان لاتے ہو۔ سنیئے فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ (2:85) تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا (الفاظ غور سے سنیئے عزیزانِ من!) فَمَا جَزَآءُ مَنۡ اس کا اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں ہوگا۔

دنیا و آخرت کے عذاب سے محفوظ رہنے کا علاج

پھر سن لیجیے کہ جو یہ کرتا ہے کہ اس ضابطۂ قوانین کو یعنی جس کا ایک حصہ قوانینِ فطرت ہیں' دوسرا حصہ یہ اقدارِ خداوندی ہیں' پورا یہ ضابطہ ہے۔ جو اس کے ایک حصے پہ ایمان رکھتا ہے' دوسرے سے انکار برتتا ہے تو کہا ہے کہ جو بھی ایسا کرتا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (2:85) اس دنیاوی زندگی کے اندر ذلت نصیب ہوتی ہے وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ (2:85) اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ سخت عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے یہ جو طبعی قوانین اس دنیا

کو اس طرح سے قابلِ نفرت قرار دے کے‘ ان سے اعراض برتتا ہے‘ اجتناب برتتا ہے اور ذہن میں یہ رکھنا ہے کہ اصل چیز روحانی زندگی ہے‘ اسے مذہب کہا جاتا ہے‘ دین نہیں۔ اور وہ جو ہے کہ زندگی یہی زندگی ہے اس کے بعد اقدار‘ مستقل قوانینِ خداوندی‘ آخرت یہ کوئی شے نہیں ہے۔ یہ اگر چیز ہو تو اسے آپ کفر کہتے ہیں‘ دہریت کہتے ہیں‘ کچھ بھی نام رکھ لیجیے اس کا۔ یہ زندگی ہے یا وہ مذہب کی زندگی ہے۔

اسلام تو دین و دنیا کے قوانین پر عمل کرنے کا نام ہے

وہ کہتا ہے اس کے اندر یاد رکھیے یہ جو اس زندگی کو قابلِ نفرت قرار دینے والے ہیں خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ (2:85) اسی زندگی میں ذلت ان کے نصیب میں ہو جائے گی۔ اور جس کے نصیب میں اس دنیا کی ذلت ہوتی ہے قرآن کہتا ہے وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (17:72) جو یہاں کا اندھا ہوتا ہے وہ آخرت کا بھی اندھا ہی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ یہاں ذلت اور خواری کی زندگی بسر کر رہی ہے قوم اور جونہی اس نے آنکھیں بند کیں خدا کے ہاں پہنچے تو وہ مقربینِ بارگاہِ خداوندی اور معزز ترین زندگیوں کے وہ حامل قرار پا جائیں گے‘ قطعاً نہیں۔ یہ ضابطۂ قوانین جس کے دو حصے ہیں ان دونوں حصوں کے اوپر عمل کرنے سے جنت بنتی ہے۔ دونوں حصوں پہ عمل کرنے کا نام دین ہے۔ جسے آپ اسلام کہتے ہیں اس میں یہ زندگی بھی جنت کی زندگی ہوتی ہے‘ آنے والی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوتی ہے یہ ہے اسلام عزیزانِ من! ۔ اب آئیے جہاں بات ہم نے چھوڑی تھی کہ حضرتِ نوحؑ کو جب کہا گیا کہ ہاں تیری جماعت جو ساتھ آئی ہے اس کو برکات فراوانی رزق ملے گی تو اس کے ساتھ فوراً کہا کہ یہ نہ سمجھئے کہ یہ جو دوسرے بندے ہیں یہ جو ہل چلا رہے ہیں کھیتیاں کر رہے ہیں محنت کر رہے ہیں انہیں یہ کچھ نہیں ملے گا وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ (11:48) ان کو بھی ملے گا‘ فرق کیا ہوگا؟ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (11:48) فرق یہ ہوگا کہ یہ رزق کی فراوانیاں تو ملیں گی ان کو لیکن چونکہ ان کا معاشرہ غلط قوانین‘ انسانوں کے خودساختہ قوانین کے اوپر متشکل ہوگا‘ اس کا نتیجہ جہنم کی زندگی ہے‘ عذاب کی زندگی ہے جسے قرآن نے کہا ہے۔ بس یہ ہے فرق جو قرآن بتاتا ہے۔ اور جس طرح میں نے ابھی عرض کیا کہ دین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ زندگی بھی جنت کی زندگی ہوتی ہے‘ آنے والی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوتی ہے۔ یہ پورے سَیٹ کے خلاف زندگی بسر کرنے سے یہ زندگی بھی جہنم کی زندگی ہوتی ہے‘ آخرت کی زندگی بھی جہنم کی زندگی ہوتی ہے۔ صرف طبعی قوانینِ خداوندی پر عمل کرنا اور اقدارِ خداوندی کو نظرانداز کرنا۔

آج پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ جہنم کی زندگی بسر کر رہی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ کس قسم کا جہنم پیدا کرتی ہے وہ تو آج ہمارے سامنے ہے‘ آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہی نہیں ہے کہ ہم ایسی قومیں جو پسماندہ ہیں‘ جو ہم پیچھے رہ گئے ہیں‘ ہماری زندگی جہنم کی ہے۔ یہ قومیں جو بہت آگے بڑھ گئی ہیں اس میں اور جن کے ہاں ان

سامان کی رزق کی فراوانیاں ہیں۔جنہوں نے زمین چھوڑ کر چاند تک کو مسخر کر لیا ہے' معاشرہ ان کا بھی جہنم کی زندگی کے اندر ہے۔ان کے ہاں کے مفکرین کی آج کل جو کتابیں آ رہی ہیں آپ دیکھئے قرآن نے جس طرح Describe کیا ہے کہ جہنم میں جانے والے کیسے چیخ و پکار کر رہے ہونگے۔ان کتابوں میں ان کی چیخیں بلند سنائی دے رہی ہیں جو آج کل ہو رہا ہے اس معاشرے کے اندر۔ہمیں تو دوہری مار پڑ رہی ہے نا کہ ہم نے قوانینِ خداوندی کا جو پہلا حصہ طبعی ہے اس کو بھی Neglect کیا چھوڑا نتیجہ یہ ہے کہ اتنا کچھ قدرت کی طرف سے جو سامان ہمیں ملا ہوا ہے اس کے باوجود ہم روٹی تک کے لیے دوسروں کے گداگر ہیں' یہ کوئی چھوٹا عذاب نہیں ہے۔

وحی کے قوانین کے بغیر رزق کی فراوانی یا رزق کی فراوانی کے بغیر قدم قدم پر محتاجی' دونوں جہنم کی زندگی ہے

قرآنِ کریم میں سورۃ نحل میں دیکھئے کہا یہ ہے کہ ایک بستی تھی اچھی خوشحال زندگی بسر کرتی تھی لیکن انہوں نے انعاماتِ خداوندی ہماری دی ہوئی نعمتوں سے کفران برتا تو ہم ان پر عذاب لے آئے' کیا عذاب لے آئے؟ کہا کہ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (16:112) دو عذاب ان کے اوپر آئے ایک تو ہر وقت ان کو دھڑکا لگا رہتا تھا' اب مارے گئے' اب کسی نے حملہ کیا اور دوسرا یہ ہے کہ بھوک کا عذاب ان کے اوپر مسلط تھا۔تو یہ جو چیز تھی کہی گئی کہ نہیں ان کو بھی ملے گا دنیاوی زندگی میں حصہ جس حد تک وہ قوانینِ فطرت کا اتباع کریں گے' اس کا حصہ تو ان کو بھی ملے گا بس فرق یہ ہے کہ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (11:48) اس کے بعد زندگی جہنم کی ہو جائے گی۔فراوانیِ رزق کے باوجود جہنم کی زندگی اور رزق کی محتاجی سے جہنم کی زندگی' دونوں زندگیاں جہنم کی ہو جاتی ہیں۔دوسری زندگی وہ ہے جیسے میں نے کہا تھا دونوں مجموعۂ قوانین کے اوپر عمل کرنے سے یہ زندگی یہاں کی بھی جنت کی زندگی' آنے والی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوتی ہے۔قصہ یہاں ختم کیا' داستان جسے ہم کہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (11:49) یہ وہ باتیں ہیں اے رسول جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے سے بتا رہے ہیں' غیب کی باتیں ہیں' وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں۔ان باتوں کو تو بھی نہیں جانتا تھا' تیری قوم بھی نہیں اس سے پیشتر جانتی تھی۔

علمِ غیب یعنی خواہ آنے والے واقعات ہوں یا کوئی گذرے ہوئے واقعات' اس کا علم صرف خدا کو ہی ہوتا ہے

یہاں سے ایک اور نقطہ ہمارے سامنے آ گیا جو میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے غیب کا علم صرف خدا کے لیے ہے۔قرآن میں یہ چیز متعین طور پر بالصراحت کہی گئی ہے کہ غیب یعنی آنے والے واقعات یا ماضی کے وہ واقعات جو ابھی انسان کی معلومات میں نہیں آئے' ان

کا علم صرف خدا کو ہے۔اس کے بعد اس نے یہ کہا ہے کہ ہم اپنے رسولوں میں سے ان میں سے جو بات چاہتے ہیں' انہیں وحی کے ذریعے سے اس کا علم دیدیتے ہیں' ماضی کی باتوں کا بھی بعض آنے والے واقعات کا بھی۔قرآن کی رو سے صرف رسول کو وحی کے ذریعے سے آنے والے واقعات کا علم ہوتا ہے۔اور یہ جو ہمارے ہاں پیشین گوئیوں کے دعوے لے کے بیٹھ جاتے ہیں' حضرت صاحب نے فرما دیا ہے کہ اس کے ہاں یہ ہوگا صاحب' ٹھیک ہے جاؤ یہ ہوجائے گا۔یہ ہوجائے گا کیسے صاحب؟ قرآن متعین طور پہ کہتا ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل میں کیا کرونگا' کوئی شخص نہیں جانتا میری موت کہاں ہوگی (31:34)۔کتنی بڑی چیز ہے کتنا بڑا دعویٰ ہے قرآن کا۔اور یہاں یہ لوگ ہیں حضرت صاحب ہیں اور اس قسم کے پیشن گوئیاں کرنے والے ہیں اور دور تک کے آنے والے واقعات کے متعلق صاحب بتاتے چلے جاتے ہیں پھر اپنی صداقت کا نشان کہتے ہیں' دیکھئے نا پیشن گوئی ہماری پوری ہوئی۔کوئی نہیں پوچھتا کہ قرآن پہ ایمان رکھتے ہو وہ تو یہ کہتا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور اگر ہے تو خدا وحی کے ذریعے سے اپنے رسولوں میں سے کسی کو یہ علم دیتا تھا۔تو آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں کل کی بات بتا سکتا ہوں تو وہ دعویٰ کرتا ہے نا کہ وہ رسول ہے اور وحی کے ذریعے سے اس کو یہ بات ملی ہے۔اور اگر ایسا دعویٰ نہیں ہے تو پھر خدا کے خلاف چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے چیلنج کرتا ہے کہ تم تو یہ کہتے ہو کہ کوئی نہیں جانتا کل کیا ہوگا' ہم بتائیں گے سال بھر کے بعد کیا ہوگا۔کرلو کیا کرتے ہو۔

سائیں جی اپنے اردگرد جھرمٹ میں بیٹھے' آنے والے وقت کی نقاب کشائی کر رہے ہوتے ہیں

عزیزانِ من! آپ سوچئے کہ قرآن کو چھوڑ دینے سے ہم کن مقامات میں پہنچ گئے ہیں۔یہ جو جھرمٹ لگا رہتا ہے نا یہ سائیں جی کے گرد' وہ کل کی بات معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے نا ''ہور کجھ نئیں تے سٹے دا نمبر ای سہی''۔جو باتیں معلوم ہیں کسی کو اس کے لیے تو سائیں جی کو کوئی نہیں پوچھتا جا کے' ٹائم ٹیبل اگر ریلوے کا پاس ہے تو کبھی نہیں جا کے پوچھتے کہ ''سائیں جی کل سویرنوں خیبر میل کنے وجے شام نوں آئے گی''۔پوچھتے یہی ہیں نا کہ بتائیے صاحب میرے مقدمے کا کیا فیصلہ ہوگا۔میرے گھر اولاد ہوگی یا نہیں۔مجھے دولت ملے گی یا نہیں' آنے والے واقعات کا۔وہ بھی مسلمان ہی نہیں ہوتے بتانے والے حضرت صاحب' وہ مقرب ہوتے ہیں خدا کے' یہ پوچھنے والا بھی مسلماں ہے' دونوں خدا کی اس کتاب پہ ایمان رکھتے ہیں جس میں یہ کہا ہوا ہے کہ کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔قرآن یہ کہتا ہے رسول سے کہ یہ باتیں غیب کی تھیں تو نہیں جانتا تھا' ہم نے وحی کے ذریعے تمہیں بتائیں اور جو بات وحی کے ذریعے رسول کو بھی نہ بتائی جائے' رسول کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا قرآن یہ بتاتا ہے۔آگے ہے وہ بات۔یوں تو میں نے کہا ہے نا کہ جیسے ایک داستان بیان ہو رہی تھی یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔فَاصْبِرْ (11:49)

ایک لفظ ہے بات کیا بتائی تھی کہ یہ حق اور باطل کے درمیان آویزش چلی آ رہی ہے پہلے دن سے' پہلے پیغمبر نے کہا (اُعْبُدُوا اللّٰهَ) خدا کے سوا کسی کی محکومیت نہیں ہو سکتی' اُس نے کہا کہ تمام انسان خدا کی نظروں میں برابر ہیں انسان ہونے کی جہت سے۔ وہ جن کی کوٹھیاں دانوں سے بھری ہوئی تھیں' سرداران قوم اٹھ کے کھڑے ہو گئے انہوں نے کہا کہ قطعاً غلط ہے جو تم یہ کہتے ہو۔ پہلی ہماری شرط یہ ہے کہ یہ جو لوگ اس طرح سے تمہارے ساتھ آ کے بیٹھ گئے ہیں کمین' ہمارے معاشرے کے کمی جنہیں ہم کہتے ہیں چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والے ان کو نکال دو یہاں سے۔ مخالفت ہوئی بڑی کشمکش ہوئی۔ کہا یہ کہ یہ نہ تو حضرتِ نوحؑ سے بات متعلق تھی نہ آج تمہارے ساتھ خصوصیت سے ہے یہ ہوگا یہ ہوتا چلا آ رہا ہے' یہی ہوگا۔

حصول مقصد کی خاطر اس کے طریق کار پر یقین محکم ہونا ضروری ہے

جہاں حق کی آواز بلند کرنے والا کوئی اٹھے گا' مفاد پرست گروہ اس کی مخالفت کرے گا۔ اس میں اس گروہ کو بڑی پریشانیاں' تکالیف برداشت کرنی پڑیں گی۔ استقامت بڑی ضروری چیز ہے' مستقل مزاج رہنا ہوگا' ثابت قدم رہنا ہوگا۔ پہلی ہی داستانِ حق و باطل کے بعد کہا فَاصْبِرْ بات سمجھ لی اے رسول! تمہارے لیے ضروری ہے استقامت سے رہو' ثابت قدم رہو۔ ثابت قدم کون رہ سکتا ہے؟ صرف وہ جسے یقین ہو کہ جس راستے پہ میں چل رہا ہوں یہ مجھے ضرور منزلِ مقصود پہ پہنچا دے گا۔ وہی مسافر راستے کی صعوبات برداشت کرتا چلا جاتا ہے نا جسے یقین ہو یہ۔ کہا کہ فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (11:49)۔ ٹیپ کے ذریعے درس سننے والوں کی خدمت میں میں اتنی وضاحت کر دوں کہ درمیان میں بجلی یہاں چلی گئی تھی اس کی وجہ سے دو چار منٹ کا جو درس کا حصہ تھا وہ ٹیپ نہیں ہو سکا۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ایک داستانِ پارینہ نہیں جو قرآن نے بیان کی ہے' اس کے اندر ابدی حقائق ہیں۔ ان حقائق میں پہلی حقیقت یہ تھی کہ معیار تعظیم و تکریم کا قرآنِ کریم نے انسان کے عمل اس کے جوہرِ ذاتی اور اس کے کردار اور کریکٹر کو قرار دیا ہے' دولت کو قرار نہیں دیا۔

دعا خواہ وہ کسی نبی کی طرف سے ہو اس کی قبولیت کا دارومدار قوانین خداوندی کی بنا پر ہی ہوتا ہے

اب آگے بات ہے دوسری چیز جو کہی قرآن نے وہ یہ کہ حضرتِ نوحؑ نے دعا کی کہ یا اللہ اس آنے والی تباہی سے ہمیں بچا لو' ہماری قوم کو بچا لو۔ کہا کہ اے نوحؑ! ہم نے تمہاری دعا کو سن لیا ہم نے وہ دعا تمہاری قبول بھی کر لی' بچا لیں گے تمہیں ہم۔ نبی کی دعا سنی گئی کہا قبول بھی کر لیا' بچا لیں گے ہم تمہیں اور اس کے ساتھ کہا وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا (11:37) ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بناؤ اس طرح بچ سکو گے۔ نبی کی دعا مقبول ہو رہی ہے' خدا کی طرف سے کہا جا رہا ہے' ہم نے قبول کر لی دعا' بچا لیں گے تمہیں اس سے۔ دعا مانگنے سے نہیں بچ گئے کہا کشتی بناؤ' بس بچ جاؤ گے۔ اگلی چیز دین نے یہ بتائی کہ طبعی دنیا کے اندر Physical World کے اندر یہ

سارا کاروبارِ حیات جو ہے Physical Laws کے تابع ہوتا ہے۔ایک نبی بھی محض دعا مانگنے سے درآں حالیکہ اس دعا کے متعلق یہ بھی خدا کی طرف سے آ جائے کہ ہم نے قبول کر لی ہے' دعا مانگنے سے غرق ہونے سے بچ نہیں سکتا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کشتی بنائے۔دوسری حقیقت یہ آ گئی ہمارے سامنے عزیزانِ من! تیسری حقیقت ہمارے سامنے یہ آ گئی کہ دنیا میں یہی چلا آ رہا تھا کہ اپنے اور بیگانے کا معیار یہ ہے کہ جو اپنی قوم سے' اپنی نسل سے' اپنے خون سے' اپنے رشتہ دار ہیں' وہ اپنے ہیں جن میں یہ چیز مشترک نہیں ہے وہ بیگانے ہیں۔قرآن نے الٹ دیا اس سارے معیار کو۔اس نے کہا یہ غلط ہے یہ چیز جو ہے یہ Physical چیز ہے جسے تم یہ خون اور رنگ اور نسل کا اشتراک کہتے ہو یہ تو حیوانوں کے اندر ہوتا ہے Breeds ان کی دیکھی جاتی ہیں۔انسانیت میں قومیت کا معیار یہ ہے کہ جو ایمان میں مشترک ہیں' وہ اپنے ہیں۔جن کا اس میں اشتراک نہیں' وہ بیگانے ہیں خواہ اپنا بیٹا اپنا باپ اپنی بیوی کیوں نہ ہو صاحب۔ حضرتِ نوحؑ اور اس کے بیٹے میں کونسی چیز مشترک نہیں تھی Physical Level کے اوپر طبعی سطح کے اوپر ہر چیز مشترک تھی عزیزانِ من! باپ بیٹے کا رشتہ' خون مشترک' نسل مشترک' زبان مشترک' وطن مشترک۔کہا کہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے تیرے اپنوں میں سے نہیں ہے اپنوں میں سے یہ ہیں جن میں کوئی چیز ان میں سے مشترک نہیں ہے لیکن ایمان کا اشتراک ہے' یہ اہل میں سے ہیں۔

قومیت کا ابدی معار جو اپنے اور بیگانوں کے فرق کو واضح کرتا ہے وہ صرف وحی کے غیر متبدل اصول ہی ہیں

تیسری چیز ہمارے سامنے عزیزانِ من! یہ آ گئی ایک ابدی حقیقت کہ قرآن کی رو سے معیارِ قومیت یا اپنے اور بیگانوں کا معیار کیا ہو سکتا ہے۔دیکھا آپ نے کیا چیزیں آ رہی ہیں۔اور اگلی چیز یہ آ گئی کہ طبعی قوانین کا اتباع کرنے سے Physical Laws کے مطابق چلنے سے جو نتائج نکلتے ہیں اس میں مومن اور کافر کا فرق نہیں ہوتا۔وہ انسانوں کی طبعی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔صحیح آپریشن غیر مسلم ڈاکٹر کرے یا مسلمان ڈاکٹر کرے اگر وہ فطرت کے قاعدے کے مطابق کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بالکل وہی نکلے گا۔آپریشن یہ مسلمان کے اوپر ہو یا کافر کے اوپر ہو دونوں پہ یکساں ہے' کونین کی گولی حلق سے اترنے سے پہلے یہ نہیں راستے میں ٹانسلز سے پوچھتی ہیں کہ ''ناں کی اے ایہدا' ہرنام سنگھ' میں تاپ چڑھاواں گی ایہنوں ہور بوہتا'' یہ نہیں پوچھتی وہ۔طبعی قوانین میں کوئی فرق نہیں رکھتا۔ وہ فرق رکھتا ہے آگے چل کے جہاں اقدار کا سوال آتا ہے۔یہ حلال کی کمائی کا یہ ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔حرام کی کمائی کا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔آج تو عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ ہم بھی یہ کچھ الفاظ ہی ہیں جو ہماری زبانوں سے آجاتے ہیں اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ (53:23) کچھ الفاظ ہیں اب حلال اور حرام کے اس کا کوئی امتیاز اور تفریق تو ہمارے ذہنوں میں بھی نہیں آتی۔اور آگے تو میں سمجھتا ہوں جس معاشرے میں' جس ماحول میں ہم نے اپنے بچوں کی پرورش کی ہے' شاید ان کے زبان پہ یہ الفاظ بھی نہ آئیں آگے۔اب تو کچھ مثالیں رہ

گئی ہیں جس سے سمجھایا جاسکے یونہی بچپن میں یہ پڑھا کرتے تھے۔

محمود غزنوی کے عہد میں ایک مردِ مجاہد کی کہانی اس کی ماں کی زبانی

محمود غزنوی یہاں سے واپس گیا۔اس کی فوج میں کچھ سپاہی تھے' یہاں وہ تو شہید ہوئے' مارے گئے۔ایک بڑھیا آئی بیوہ اور اس نے آ کے فوج والوں سے پوچھا کہ میرا بیٹا بھی گیا تھا کہو وہ زندہ ہے' کہاں ہے۔اُنہوں نے کہا کہ نہیں وہ تو میدانِ جنگ میں شہید ہوگیا ہوا' مارا گیا تو اس نے کہا کیسے مارا گیا' کہنے لگے کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ رہا تھا اس کی پیٹھ میں تیر لگا وہ مر گیا۔وہ بڑھیا کہنے لگی کہ تم جھوٹ بولتے ہو یہ غلط ہے' اس کی پیٹھ میں تیر نہیں لگا۔بات بڑے زور سے کہی' پھیل گئی ایوانوں تک پہنچی' سلطان تک پہنچ گئی اس نے بلایا اس بڑھیا کو' کہا مائی تجھے کیا پتہ یہ تو وہاں موجود تھے جو یہ بتا رہے ہیں تو کیسے کہہ رہی ہے۔کہنے لگی یہ غلط کہہ رہے ہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا' ہو نہیں سکتا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگے اور اس کی پیٹھ میں تیر لگے' مرا ہے یہ صحیح بات ہے لیکن اس کی چھاتی میں تیر لگا ہوگا اس کی پیٹھ میں تیر نہیں لگ سکتا۔کہنے لگا مائی تو اس یقین سے کیوں کہتی ہے کہنے لگی اس لیے کہتی ہوں کہ میں نے اس کے حلق میں ایک قطرہ بھی حرام دودھ کا نہیں ٹپکنے دیا تھا' اس لیے ہو نہیں سکتا کہ حلال کے دودھ کے اوپر پرورش پایا ہوا بچہ میدانِ جنگ سے بھاگ گیا ہو' سینے میں اس کے گولی لگے گی' پشت پہ نہیں لگے گی اور سپاہیوں نے اعتراف کیا کہ واقعی اس کے سینے میں تیر لگا تھا۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ کم از کم ہمیں بچپن میں یہ کچھ پڑھایا جاتا تھا اس لیے ہمیں تو یہ اس زمانے میں کم از کم ذہنی طور پہ پتہ تھا کہ حلال دودھ کے قطرے میں اور حرام دودھ کے قطرے میں فرق کیا ہوتا ہے۔

حرام اور حلال کی تمیز حیوان اور انسان میں فرق پیدا کرتی ہے

عزیزانِ من! آج کے اس ہمارے دور کے اندر تو یہ فرق ہی مٹ گئے کہ اس کے بعد شاید یہ الفاظ ہی مٹ جائیں۔اے اللہ قبل اس سے کہ وہ دور آئے' اٹھا لے اس زندگی سے کہ جس دور میں حرام اور حلال کی تمیز ہی باقی نہ رہے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ تو پھر Animal Life ہے حیوان کی زندگی میں عزیزانِ من! حرام اور حلال کی تمیز نہیں ہوتی اس کا شعور ہی وہاں نہیں ہوتا' وہ اقدار کے پابند نہیں ہوتے۔گائے جب باہر جاتی ہے' بھوک ہوتی ہے چارہ چرنا ہوتا ہے اس نے' وہ نہیں پوچھتی کہ ادھر کا کھیت اس کے اپنے مالک کا ہے اور اُدھر کا دوسرے کے مالک کا ہے۔جو کھیت سامنے آتا ہے اس میں سے وہ چر لیتی ہے۔لیکن اگر انسان کا بچہ بھی وہاں جا کے یہ امتیاز سامنے نہ رکھے کہ یہ حرام کا ہے یا حلال کا ہے قرآن کہتا ہے کہ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) کفریہ

ہے کہ تم حیوانات کی طرح کھاؤ پیؤ زندگی کے اندر۔ کفر یہ ہے کہ زندگی کے کھانے پینے کا سامان جو ہے ان کو حیوانات کی سطح کے اوپر کھاؤ پیؤ' یہ کفر ہے کیونکہ وہاں حرام اور حلال جائز اور ناجائز کی تمیز نہیں ہوتی۔ جس معاشرے کے اندر پھر یہ تمیز اٹھ جائے' عوام وہاں کالانعام ہوتے ہیں' بڑے ان کے درندے ہوتے ہیں عزیزانِ من! انسان اس معاشرے میں نہیں بچتا جس میں حرام اور حلال کی تمیز اٹھ جاتی ہے عزیزانِ من!۔ سورۃ ھود کی ہم آیت 49 تک آ گئے عزیزانِ من! 50 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

آٹھواں باب: سورۃ ھود (آیات 50 تا 53)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1974ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی 50 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (11:50)

سورۃ ھود میں انبیاءِ سابقہ اور اقوام گذشتہ کی باہمی کشمکش کی داستانِ جلیلہ کو بیان کرنے کا انداز

جیسا کہ اس سورۃ کے شروع سے آپ دیکھتے چلے آ رہے ہیں اس میں ان تمام منازل اور وادیوں کا ذکر ہے جن میں سے گذرتا ہوا دین کا کارواں نبی اکرم ﷺ تک پہنچا یعنی مختلف انبیائے سابقہؑ اور اقوامِ گذشتہ کی باہمی کشمکش کی داستان۔ اس باب میں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ جس قوم کا تذکرہ سامنے لایا جاتا ہے برائیاں اور خرابیاں تو بڑی ہوتی ہیں اس قوم میں لیکن جو سب سے زیادہ سنگین جرم ہوتا ہے جو ان کی تباہی کا موجب بن رہا ہے' اسے نمایاں طور پر ابھار کر سامنے لایا جاتا ہے اور وہ گویا اس داستان کا عمودی نقطہ بن جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس قوم میں صرف وہی ایک اخلاقی جرم ہوتا ہے جرائم تو جسے آپ کہیے' چھوٹے چھوٹے عام ہوتے ہیں لیکن ان میں سے جو سب سے بڑی خصوصیت کسی دور کی ہوتی ہے' کسی معاشرے کی ہوتی ہے' کسی قوم کی ہوتی ہے' اسے وہ نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے۔

سورۃ ھود کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا فرمان کہ اس سورۃ نے تو مجھے بوڑھا کر دیا ہے

جب یہ مختلف اقوام اور مختلف انبیائے کرامؑ کی اس طرح سے کشمکش سامنے آئے گی تو ظاہر ہے کہ جب ان کا ایک مجموعہ سامنے آئے

گا تو اس کے معنی ہونگے کہ انسانیت کے جتنے بڑے بڑے جرائم ہیں' وہ بیک نظر سامنے آ جائیں گے اور نظر آئے گا کہ حق کی طرف دعوت دینے والے انقلابی کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا' کس کس قسم کے جرائم کا تدارک کرنا ہوگا کس کس قسم کی ذہنیت کی افراد اقوام اور گروہوں اور پارٹیوں سے اس کا مقابلہ ہوگا۔ یہ ساری چیز اس کے سامنے آئے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس میں کس قسم کی کشمکش کا ذکر ہے اور اس کے لیے ایک آخری داعیٔ انقلاب کے لیے جن دشوار گذار گھاٹیوں کے مناظر سامنے لائے گئے ہیں' ان کے پیش نظر واقعی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سورۃ ھود نے مجھے ﷺ بوڑھا کر دیا ہے۔

قرآن حکیم میں قوموں کے نشیب وفراز کو بیان کرنے کے پیش نظر قوم عاد کے جرم کا ذکر

اس داستان کی ابتداء ہوئی تھی تذکرۂ حضرتِ نوحؑ سے اور اس میں ہم نے دیکھا کہ پہلی چیز جو اس میں کہی گئی تھی وہ یہ کہ اس قوم نے اس معاشرہ میں طبقاتی تقسیم کر رکھی تھی۔ عزت اور تکریم کا معیار ان کے ہاں دولت اور قوت تھا نہ کہ جوہرِ ذاتی نہ اخلاقیات نہ شرافت نہ دیانت' صرف دولت اور قوت۔ اور اس سے انہوں نے اپنے معاشرے کو اونچے اور نیچے دو طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور اونچے طبقے کے لوگ اسے گوارا ہی نہیں کرتے تھے کہ جنہیں وہ اپنی دانست میں نچلے طبقے کے لوگ کہہ رہے ہیں' ان کے ساتھ مل کر بیٹھ بھی سکیں۔ وہ انہیں نیچ سمجھتے تھے۔ یہ لفظ نیچ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ نیچا جسے آپ کہتے ہیں اسی سے تو ہے یہی لفظ ہے ہمارے ہاں کمی سے کمین ہو گیا ہے پھر اور وہاں سے کمینہ ہو گیا ہے یہ اسی دور کی ذہنیتیں ہیں نا' کمی کام کرنے والا کمین اور کمینہ' انہوں نے اونچ اور نیچ کی طرف کی اور نیچ کا لفظ پھر ہر قسم کے کمینے کے لیے استعمال ہونا شروع ہو گیا۔ یہ طبقاتی تقسیم تھی اور اس کے بعد پھر اگلی چیز یہ تھی کہ قومیت کا اپنے اور بیگانے کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ ان کے ذہن میں یہی تھا کہ جن کے ساتھ خون کا رشتہ ہے' رنگ اور نسل کا رشتہ ہے' وطن کے اشتراک کا رشتہ ہے وہ اپنوں میں سے ہیں اور یہی تھا معیار ان کے ہاں اپنے اور غیر کا۔ اس باطل کے معیار کے خلاف بھی آواز بلند ہوئی کہ یہ غلط ہے یہ خون اور رنگ اور وطن کے رشتے' یہ وجہٗ جامعیت نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف ایمان کا رشتہ ہے ہم آہنگیٔ فکر ونظر کا رابطہ ہے جس کی بناء پر ایک قوم وجود میں آتی ہے۔ دو نمایاں چیزیں ہمارے سامنے سورۃ ھود کے سب سے پہلے تذکرہ حضرتِ نوحؑ کے ضمن میں آئیں۔ اب اگلی قوم کا ذکر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًاؕ (11:50)

قومِ نوحؑ کے بعد قومِ عاد ان کی طرف حضرتِ ھودؑ مبعوث ہوئے۔ جیسا کہ قرآن کا انداز ہے وہ پوری تفصیل کسی بات کی' کسی ایک مقام پہ بیان نہیں کرتا۔ مختلف مقامات پہ وہ تفاصیل بکھری پڑی ہوتی ہیں انہیں وہاں سے چن کر ایک سلک میں' ایک لڑی میں پرو دیا جائے

تو اس طرح سے وہ داستان مسلسل مربوط شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔ قومِ عاد کے متعلق کہ ان کا نہج زندگی کیا تھا ان کا وہ سب سے بڑا سنگین جرم کیا تھا جس کی بناء پہ کہا گیا کہ معاشرہ تمہارا تباہ ہو کر رہے گا۔ پہلے تو یہ کہا وہ قوم بڑی خوشحال تھی۔ آج کی اصطلاح میں جسے ہم کہتے ہیں بڑی مہذب تھی۔ وہ ذہنی اور علمی اعتبار سے بھی بہت آ گے تھی۔ یہ ساری چیزیں قرآن میں آتی ہیں اس کے متعلق۔ مملکت بہت بڑی تھی، قوت بہت زیادہ تھی گویا اس زمانے کی مہذب ترین مملکت یا قوم یوں سمجھ لیجیے اپنے دور کی۔ اب دیکھئے کیا کیا چیزیں ہیں جو حضرتِ ھودؑ ان کی گناتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ ان سے

انسانی ذات کو دوام بخشنے کا بہترین طریق انسانیت کی منفعت سازی میں ہے

کہا کہ تمہارے ہاں دولت کی بڑی فراوانی ہے لیکن تم اس دولت کو صرف کس طرح کرتے ہو دیکھو تو سہی۔ اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ اٰیَۃً تَعۡبَثُوۡنَ (26:128) غور سے سنیے عزیزانِ من! یوں کہیے کہ آج سے قریب چھ ہزار سال پہلے کی بات ہو رہی ہے۔ چھ ہزار سال پہلے کا پس منظر ذہن میں رکھیے اور پھر آج کے دور پہ نگاہ ڈالیے۔ پہلا ہی جرم یہ بتایا گیا کہ روپیہ بہت ہے تمہارے پاس، دولت کی بڑی فراوانی ہے بجائے اس کے کہ اسے منفعتِ عامہ کے لیے صرف کرو، معاشرے کے افراد کی زندگی کی سطح بلند کرو، مفادات کے لیے صرف کرو۔ تم کرتے یہ ہو کہ بڑی بڑی اونچی اونچی چٹانوں پہ اس قسم کی یادگاریں تعمیر کرتے ہو کہ جس سے تمہاری بڑائی تو ٹپکے تَعۡبَثُوۡنَ (26:128) اور ان کا فائدہ کوئی نہ ہو انسانیت کو۔ آپ غور کر رہے ہیں کس چیز کو جرم قرار دے رہا ہے ایسی یادگاریں قائم کرنا ان یادگاروں کی تعمیر میں قوم کا روپیہ صرف کر دینا، جن کی افادی حیثیت کچھ نہ ہو، جن کی Utility Value کوئی نہ ہو۔ چار سو فٹ اونچا بلند ایک مینار کھڑا کر دیا جائے۔ کروڑوں روپے اس پہ صرف آ جائیں گے، ہزاروں روپے مستقل خرچ ہوگا اس کی حفاظت کے لیے، اس کی نگہداشت کے لیے، اس کی مرمت کے لیے۔ ایک آدمی بھی اس میں سو نہیں سکے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں جرم کیا گنا رہا ہے قرآن!! جذبہ تمہارے اندر یہ ہے تم بہت بڑے نظر آ ؤ دنیا میں، آنے والی نسلوں تک تمہاری یادگار قائم رہے۔ قرآن نے اس کے لیے معیار یہ بتایا ہے، میں پھر دہرا دوں کہ حضرتِ ھودؑ قوم سے کہہ رہے ہیں کہ تم بڑی بڑی یادگاریں قائم کرتے ہو روپیہ اس کے اوپر صرف کرتے ہو۔ مقصد تمہارا یہ ہے کہ آنے والی نسلوں تک تمہاری یاد قائم رہے۔ آنے والے زمانے ان کو دیکھیں اور کہیں کہ ہاں صاحب یہ قوم کتنی بلندیوں پر تھی، کتنی مرفع الحال تھی، کتنی آ گے تھی۔ اور اس کی Utility Value کچھ نہ ہو اس کی افادی حیثیت کچھ بھی نہ ہو۔ کہا کہ یاد رکھو، معیار یہ ہے جسے تم کہتے ہو کہ تمہارا نام دائم و قائم رہے، تمہاری یاد دائم رہے معیار یہ ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (13:17) یاد رکھو جو چیز نوعِ انسانی کو منفعت بخشنے والی ہے وہی باقی رہ سکتی ہے۔ نام باقی رکھنا چاہتے ہو ایسی چیزوں کو تعمیر کرو وجود میں لاؤ جو

انسانیت کے لیے منفعت بخش ہو' فائدے مند ہو۔ یہ ہے یادگاریں قائم کرنے کا معیار۔ یہ ہے اپنے نام کو شہرتِ دوام بخشنے کا طریقہ۔ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ(13:17) یادا سی کی باقی رہ سکتی ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کچھ کرتا ہے۔ لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ (26:128) بڑی بڑی اونچی اونچی چٹانیں اور پہاڑیاں تلاش کرتے ہو کہ دور سے نظر آئے۔ ایک تو وہ اونچا ہو جائے پھر اس کے اوپر اس قسم کی تم یادگاریں' مینار قائم کرتے ہو' لاٹھیں نصب کرتے ہو اس قسم کی چیزیں نصب کرتے ہو تَعْبَثُوْنَ (26:128) فائدے کے اعتبار سے عبث کوئی افادی حیثیت ہی ان کی نہیں ہے۔ سوچ رہے ہیں عزیزانِ من! کیا کہہ رہا ہے قرآن' چھ ہزار سال پہلے کی قوم کو اور آپ کے اس زمانے کی قوم کو' آپ کی قوم کو' ہمیں اور آپ کو۔ زندۂ جاوید ہونا چاہتے ہو تو وہ کام کرو جس سے نوعِ انسانی کی منفعت ہو۔ اپنی یادگاریں قائم کرنا چاہتے ہو تو ایسی یادگاریں قائم کرو کہ آنے والی نسلوں تک اس سے فیض یاب ہوتی چلی جائیں۔ نہ یہ کہ تمہارے ہوسِ استکبار کی تو تسکین ہو جائے' بہت بڑائی آپ کو مل جائے کہ ہاں صاحب کیا بات ہے انہوں نے کیا عمارت قائم کی کیا مینار قائم کیا' اتنا بڑا اور اس کی افادی حیثیت کچھ بھی نہ ہو تَعْبَثُوْنَ (26:128) عملی اعتبار سے' افادی اعتبار سے دیکھا جائے تو عبث ہو بالکل۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! جرم گنایا جا رہا ہے قوم کا۔ اس کے خلاف خدا کا ایک رسول آواز بلند کر رہا ہے کہا کہ یہ کیفیت ہے ٹھیک ہے بہت کچھ مال و دولت ہے' صنعت کاریاں بھی تمہاری بہت ہیں' تہذیب و تمدن میں بھی بہت آگے ہو تم۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس سے تم کرتے کیا ہو صرف کیا کرتے ہو' تمہارا ذہن کس طرف جا رہا ہے' اپنے نام کی بڑائی یہ نہیں کہ نوعِ انسانیت کی منفعت کوشی' یہ ہے پہلا جرم۔

ہر قسم کی وہ صنعت جو انسان کے ذاتی مفاد یا ذاتی شہرت کی حامل ہو کبھی دوام حاصل نہیں کر سکتی

عزیزانِ من!۔ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ (26:129) ویسے تو یہ ہر وہ چیز جس میں صنعت نظر آئے' یہ لفظ تو وہ ہے۔ اس میں محلات بھی آتے ہیں' قلعے بھی آتے ہیں' صنعت کاریاں بھی آتی ہیں۔ ہر وہ چیز جو صنعت کے اعتبار سے تم بناؤ عام طور پہ یہ لفظ محلات اور قلعوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دیگر اس قسم کی چیزیں جس میں صنعت ہو۔ کاہے کے لیے یہ کرتے ہو لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ (26:129) تاکہ تمہیں دوام اور ہمیشگی نصیب ہو جائے۔ پھر قلعے ہو سکتے ہیں اس میں کہ کوئی تمہیں شکست نہ دے سکے بڑے بڑے محلات بڑی بڑی مصنوعات' مقصد یہ نہیں ہے ان سے کہ انسانیت کو فائدہ پہنچے' مقصد یہ ہے کہ تمہاری جڑیں مضبوط رہیں۔ جرائم سن رہے ہیں آپ!! اپنی جڑیں مستحکم کرنے کے لیے یہ ساری کی ساری صنعت کاریاں' یہ ساری مصنوعات' قلعے اور محلات اور عمارات اور پھر اپنا نام بلند کرنے کے لیے اس قسم کی یادگاریں کہ جن کا افادی پہلو کوئی نہیں ہے۔ انسانیت کی منفعت کے لیے نہیں تم یہ کچھ کرتے یہ اپنی ذات کے لیے اور اپنے جذبات کی تسکین کے لیے کرتے ہو۔ اور پھر اتنی چیزیں جو ہیں بنانا اتنی مصنوعات اس قسم کی بے فائدہ قسم کی

یادگاریں قائم کرنا اس میں تو بڑا روپیہ صرف ہوتا ہے نا۔تو روپیہ کہاں سے آئے گا؟ کہا اس روپے کے لیے تم کرتے یہ ہو۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ حقائق کبھی پژمردہ نہیں ہوتے

عزیزانِ من! دیکھئے کب کی باتیں قرآن کہہ رہا ہے'ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے' اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ یہ نغمہ فصلِ گلِ لالہ کا نہیں محتاج' یہ ابدی حقائق ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے۔ بات قومِ عاد کی ہو رہی ہے تذکرہ آج کی دنیا کا ہو رہا ہے' ساری انسانیت کا ہو رہا ہے۔ کہا کہ اب اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی اس کے لیے تم اپنا فولادی پنجہ غریبوں کے گلے کے اوپر تم ڈالتے ہو وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (26:130) اور اس طرح سے اس کے اوپر ہاتھ ڈالتے ہو کہ ہڈیاں توڑ دیتے ہو ان بیچاروں کی۔ اس گرفت سے تم ان کا خون نچوڑتے ہو اور اسے صرف کرتے ہو یا اپنے محلات کی رنگینی کے لیے بڑے بڑے قلعوں کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے اپنے نام کو یادگارِ دوام بخشنے کے لیے' بڑی بڑی یادگاریں قائم کرنے کے لیے۔ تو اس طرح سے حاصل کردہ قوم کی دولت اس کو ان چیزوں کے اندر تم صرف کرتے ہو اور اس سے چاہتے ہو کہ تمہیں بقائے دوام نصیب ہو جائے' تم دیکھو گے تباہی کیسے آتی ہے تمہارے ہاں۔ کہا یہ بات غلط ہے یہ طریقہ چھوڑ دو' ایک ہی بات کہی فَاتَّقُوا اللّٰهَ (26:131) قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو' ان کی نگہداشت کرو۔ اور وہ چیز جو پھر دین کو مذہب سے ایک سانس میں الگ کر دیتی ہے سارے قرآن میں آپ دیکھیں گے عزیزانِ من! مذہب انفرادی چیز ہوتا ہے' ہر ایک پہ چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جاؤ اپنے اپنے طور پہ پوجا پاٹ کرو' بھگتی کرو' کچھ خیرات کر لو' دان کر دو' پُن کر دو' صدقہ دیدو' زکوٰۃ دیدو۔ دین انفرادی طور پہ اس طرح سے نہیں عمل میں آتا۔ کہا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ(26:131).

قوانین خداوندی کی اطاعت کا واحد طریق وہ ایک مرکزی اتھارٹی ہوگی جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی

قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو اور اس کا طریقہ کیا ہے؟ اَطِيْعُوْنِ (26:131) اس کا پہلا مرکز میں ہوں اس خداوندی معاشرے کا' میری اطاعت کرو۔ تو گویا دین میں اطاعت ہوتی ہے' ایک نظام ہوتا ہے' اس نظام کی اطاعت ہوتی ہے اور اس میں جو نظام کا سربراہ یا سنٹرل اتھارٹی آپ کہہ لیجئے جسے اس کی اطاعت کہا جاتا ہے وہ درحقیقت اس نظام کی اطاعت ہوتی ہے اور جسے نظام کی اطاعت کہا جاتا ہے' وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (26:131) ایک ایک لفظ میں کیا کیا باتیں کہہ جاتا ہے قرآن کہ مقصد تو خدا کے قوانین کی نگہداشت کرنا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہوگی کہ کسی انسان کی نہیں میری بھی نہیں' وہ رسول یہ نہیں کہتا کہ میرے قوانین اور میرے احکام کی اطاعت کرو' اطاعت تو خدا کے قوانین کی کرنی ہے لیکن اس کا طریقہ' انفرادی نہیں ہے اجتماعی ہے۔ ایک ایک فرد اپنے اپنے طور پہ نہیں بلکہ اس نظام کے تابع اس نظام کی اتھارٹی کی اطاعت کرتا ہوا پھر فَاتَّقُوا اللّٰهَ (26:129) ہوسکتا

ہے اس میں۔ کہا کہ یہ کرو پھر بچ جاؤ گے۔ تو پہلی چیز اس قوم کی جو خرابیاں گنائی جا رہی ہیں میں نے عرض کیا پہلی چیز اس میں یہ کہی جا رہی ہے کہ اس طرح استبداد سے، جبر سے، اس طرح سے تم خون نچوڑ کے دوسروں کا روپیہ حاصل کرتے ہو اور انہیں ان کاموں میں تم صرف کرتے ہو، یہ ہے جس سے تباہی آئے گی تمہاری۔ اور آگے چلیے۔ اس قوم کے متعلق بتایا یہ کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (46:26) اپنی قوم مخاطب سے کہا جا رہا ہے کہ اس قوم کو اتنا زیادہ تمکن حاصل تھا جو تمہیں بھی حاصل نہیں ہے۔ تمکن جو ہے یہ لفظ ہے قرآنِ کریم کا مملکت کا بڑا محکم مستحکم ہونا، اقتدار کا بڑا مضبوط اور محکم ہونا۔ کہا کہ اس قوم کو اتنا بڑا تمکن حاصل تھا اے قومِ مخاطب تمہیں بھی اتنا تمکن حاصل نہیں ہے۔ پھر تمکن میں ایک کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ ہلاکو اور چنگیز کا ہو، ذہنوں میں ہمارے آتا ہے کہ ٹھیک ہے انہوں نے محض قوت کے زور پر کچھ تمکن حاصل کر لیا تھا وحشیانہ قوت۔ ان کی تو افواج اور یورشیں بھی ایسی تاریخ میں آئی ہیں جیسے وحشی اقوام اور قبائل ہوں، لوٹ مار کرتے ہوئے چلے آ رہے ہوں کہا کہ ان کے تمکن کی یہ کیفیت نہیں تھی۔

آج ہمارے دور کی مہذب اقوام جو سمع، بصر اور فواد کی نعمتوں کی مالا مال ہیں ان کے ہاں Values کی کوئی اہمیت نہیں

یہاں سے ایک اور اگلی بات آتی ہے عزیزانِ من! جو پھر ہمارے ہی دور کی ہے اگر چہ ہماری قوم کی نہ سہی، دنیا کی مہذب قومیں جہاں اس وقت تک پہنچی ہوئی ہیں یہ ان کا تذکرہ آ رہا ہے۔ تمکن تھا اور کہا وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً (46:26) وہ دنیاوی علوم میں بہت آگے تھے۔ قرآن جہاں بھی سمع اور بصر اور فواد کا ذکر کرتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جسے آپ Perceptual Knowledge کہتے ہیں، حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم۔ یہ فطرت کے قوانین کا علم، طبیعاتی دنیا کا علم، ان تمام کے لیے وہ ہوتا ہی کیا ہے سمع اور بصر اور قلب۔ آج بھی یہی کیفیت بیان کی جاتی ہے ان کی کہ پہلے انسان کے یہ جو حواس ہیں، یہ کچھ انفرمیشن اکٹھی کرتے ہیں۔ یہ ابھی ابھی ہمارے کانوں میں یہاں سے کچھ آواز آ رہی تھی ہم نے دیکھا نہیں تھا اسے، ہمارے دل کا فیصلہ تھا کہ کسی موٹر کا انجن چل رہا ہے۔ موٹر کھڑی ہے اور انجن سٹارٹ ہوا ہوا ہے۔ بغیر دیکھے ہوئے اس نتیجے پہ پہنچ جانا، یہ جو چیز اندر نتیجے پہ پہنچانے والی ہے، اسے مائنڈ قلب یا فواد کہا جاتا ہے۔ تو آپ دیکھئے قرآنِ کریم جس انداز سے بات کرتا ہے کہ اس قوم کے حواس بھی ایسے تھے کہ وہ بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی تھیں انہیں اور پھر وہ قوت کہ جسے آپ ذہن کہہ لیجیے، دماغ کہہ لیجیے، وہ بھی انہیں حاصل تھی کہ اس سے وہ نتائج اخذ کرتے تھے کہ یہ چیز ایسے ہے، یہ یوں ہو جائے گی، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ تو جو قوم علم اور تہذیب کی بلندیوں پر ہو ان کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ کہا کہ وہ قوم علمی اعتبار سے اتنی آگے تھی، قوت اتنی بڑی حاصل تھی انہیں، یہ چیز بھی موجود تھی اور کیا چاہیے۔

قوم عاد سمع‘ بصر اور فواد کی نعمت سے مالا مال ہونے کے باوجود آخر پھر کیوں تباہ ہوئی

آج اس دور میں آپ سوچیے‘ قومیں یہی سمجھتی ہیں کہ اگر قوت حاصل کر لی جائے اور Scientific Knowledge حاصل ہو جائے جسے سمع اور بصر اور فواد کہا ہے قرآن نے‘ جس قوم کو یہ کچھ حاصل ہو جائے پھر اس قوم پر کبھی تباہی نہیں آ سکتی۔ قوم یا مملکت کے دوام کے لیے انہی چیزوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے‘ اخلاقی اقدار کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اخلاقیات کا سبق تو وہ کمزوروں غریبوں محکوموں کو دیتے ہیں۔ یہ قومیں جتنی اقوامِ غالب ہیں ان کے ہاں ان Values کا تصور ہی نہیں ہے۔ ان اقدار کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں ہے‘ یہ معیار نہیں کہ جو قومیں اخلاقی اقدار کے اعتبار سے بلند ہونگی‘ انہیں ثبات و دوام حاصل ہوگا۔ یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جو قومیں جس طرح سے بھی قوت حاصل کر لیں اور پھر اس کے بعد Scientific Knowledge ان کا اتنا ہو (Technical Knowledge آج کی اصطلاح میں) وہ اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہو‘ بس یہ چیزیں ہیں یہ حاصل ہو جائیں تو قوموں کو دوام حاصل ہو جاتا ہے صاحب۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قوم کو قومِ عاد جس کا تذکرہ سامنے آ رہا ہے‘ تمکن بھی انہیں اتنا حاصل تھا‘ قوت اتنی حاصل تھی‘ جڑیں بڑی مضبوط تھیں اور Scientific Knowledge بھی ان کا بہت وسیع تھا۔ لیکن وہ اقدارِ خداوندی کی پاسداری نہیں کرتی تھیں۔ اخلاقی اقدار کو انہوں نے نظر انداز کر رکھا تھا‘ ان کی پابندی نہیں کرتی تھیں۔ یہیں بتا دیا کہ پھر ہوا کیا اور یہ ہے غور سے سننے کی چیز ہمارے دور میں خاص طور سے غور سے سننے کی چیز ہے کہ آج Scientific Knowledge بڑی بلندیوں پر پہنچا ہوا ہے اور عام طور پر ذہنوں میں یہی چیز ہے کہ جو قوم علومِ سائنس میں آگے چلی جاتی ہے Technical Knowledge جن کے ہاں زیادہ ہو جاتا ہے‘ قوت فراہم کر لیتی ہیں‘ وہی قومیں ہیں کہ جن کو دوام حاصل ہے۔

قومِ عاد کا پہلا جرم جو ان کی تباہی اور بربادی کی سبب بنا

قرآن کہتا ہے ان کے جرائم گنانے کے بعد پہلا ہی جرم سب سے بڑا تو یہ دیکھ لیجیے کہ جب کسی پہ ہاتھ ڈالتے تھے تو اس کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ دو لفظوں میں بات ساری کہہ دی۔ خواہ وہ اپنے ہاں کے کمزور و ناتواں ہوں خواہ وہ دوسری قومیں کمزور ہوں۔ جن کے اوپر جا کر یہ حملہ کرتے تھے ان کو مسلط کرتے تھے کہ سخت گرفت ہوتی تھی ان کی۔ سب سے بڑا یہ جرم ہے‘ یہی جرم ہے اس کو اور الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ ابھی بات آتی ہے۔ دو چیزیں ابھی سامنے ہمارے آ گئیں: اس طرح سے خون نچوڑ کر روپیہ حاصل کرتے تھے اور اس طرح سے تعیش سامانیوں میں اور اس قسم کی ذہنی کاوشوں میں صرف کر دیتے تھے کہ جن سے ان کا نام و نمود تو باقی رہے اور نوعِ انسانی کا کوئی خیال ہی نہ ہو۔ کہا کہ اتنی بڑی Scientific Knowledge اور اتنے تمکن کے باوجود فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ

اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـئِدَتُهُـمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِذۡ كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (46:26) کہ جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار برتا' اخلاقی اقدار کو پسِ پشت ڈال دیا تو ان کا یہ سارا Scientific Knowledge جو تھا ان کے کسی کام نہ آیا اور ان کو اس تباہی سے نہ بچا سکا جو اقدارِ خداوندی کی سرکشی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔

آج کے سائنٹفک دور میں اقدار سماوی یا اخلاقی اقدار کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں کرہ ارض کی حالت زار اور قرآن حکیم کا ارشاد

آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے آج کے دور کے لیے کیا بات قرآن یہ کہہ گیا ہے کہ کتنی بڑی کیوں نہ سلطنت کی قوت حاصل کر لی انہوں نے' کتنے ہی بڑے Scientific Knowledge کو کیوں نہ حاصل کر لیا کسی قوم نے۔ لیکن اگر آیات اللہ جسے وہ کہتا ہے' یہی اقدارِ سماوی جنہیں کہتے ہیں' اخلاقی اقدار جنہیں کہا جاتا ہے' قوانینِ خداوندی کہا جاتا ہے' زندگی کے ابدی اصول کہا جاتا ہے' ان کو اگر نظر انداز کر دیا تو اس کے بعد کہتا ہے کہ ان کا یہ Scientific Knowledge وغیرہ بالکل نہیں بچا سکتا اس قوم کو اس تباہی سے جو اخلاقی اقدار کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ بات چھ ہزار سال پہلے کی نہیں ہو رہی' بات آج کی ہو رہی ہے اور اگر آپ کے سامنے اقوامِ مغرب کے مفکرین کے افکار آ رہے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کس طرح سے چیخ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں ہمارا نظام جس نے اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دیا ہے' اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی سائنٹفک تباہیوں سے کس طرح سے موت کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے۔ چیخنا شروع کر دیا ہے انہوں نے' واویلا مچا رہے ہیں وہ' لیکن جب پوری کی پوری قوم کو صدیوں سے اسی راستے کے اوپر ڈال دیا گیا ہو تو وہ اس قسم کی چیخ و پکار پھر سنا نہیں کرتیں۔ قرآن یہی کہتا ہے کہ یہ انبیائے کرامؑ بھی یہی کچھ کہہ رہے تھے جو آج یورپ کے یہ مفکرین اور مدبرین اور دیدہ ور اپنی قوموں سے کہہ رہے ہیں کہ یاد رکھو تمہاری یہ سائنٹفک ترقیاں تمہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکتیں جو اخلاقی اقدار کو نظر انداز کرنے سے آیا کرتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کا یہ علم و فضل ان کی یہ تہذیب اور ان کا تمدن ان کی یہ مملکت کی اتنی مستحکم جڑیں انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکیں کہ جو اقدارِ خداوندی کے نظر انداز کرنے کا فطری نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (46:26) پھر وہی الفاظ آ رہے ہیں یہاں بھی کہ جب وہ قوت کے نشے میں بدمست تھے اور انہیں یہ کہا جا رہا تھا کہ تباہی تم پر مسلط ہو رہی ہے تو وہ ایسا کہنے والوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کہا کہ وہی چیز جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے' اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور کوئی باہر نکلنے کا راستہ بھی باقی نہ رہا۔ یہاں ہم نے دیکھ لیا قرآنِ کریم بتا یہ رہا ہے کہ اس قوم کو تمکن فی الارض بھی حاصل تھا اور قوانینِ فطرت یا فطرت کی قوتوں کے اوپر بھی ان کو بڑا قابو تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس تباہی سے نہ بچ سکے جو آیات اللہ

کے نظر انداز کرنے کا فطری نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ یہ جو سمع اور بصر قرآن بار بار کہتا ہے جسے آپ علم وفضل کہہ لیجیے' جسے آپ قوانینِ فطرت کا علم کہہ لیجیے' تہذیب کہہ لیجیے' تمدن کہہ لیجیے یہ چیزیں انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتیں۔ ہوتا کیا ہے غلطی کہاں ہوتی ہے اس کی وضاحت کرتا ہے قرآن اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ (45:23)

اپنی خواہشات کو ہی معبود بنا لینے والوں کا حشر

کہا تم نے کبھی ایسے شخص کی حالت پہ بھی غور کیا ہے کہ جس نے اپنے جذبات' اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا' انہی کی پرستش کرنا شروع کر دیا اس نے۔ وَاَضَلَّـهُ اللّٰـهُ عَلٰى عِلْمٍ (45:23) نتیجہ اس کا یہ کہ وہ علم حاصل ہونے کے باوجود تباہ ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں آپ دیکھئے' کسی سے پوچھئے جو آج کل کے یہ نئے نئے قسم کے ہی نشے چلے ہیں' پرانے نشے بھی پرانے ہو گئے' ویسے کسی سے پوچھئے ہر ایک کہے گا کہ ہاں مجھے پتہ ہے بڑی ہی خراب چیز ہے' صحت بھی برباد ہوتی ہے اور دولت بھی جاتی ہے اور انسان بڑی بڑی تباہیوں کے کام کرتا ہے پھر جرائم پہ بھی اتر آتا ہے' سب کچھ یہ ہے۔ معلوم ہے یہ سب کچھ' چھوڑ کیوں نہیں سکتا؟ وہ جو ایک خواہش اندر سے پیدا ہوتی ہے' اس سے مغلوب ہو گیا ہوا ہے۔ خواہشات کو معبود بنا لینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے تابع چل رہا ہے' وہ غالب آ جاتی ہیں اس کے اوپر۔ علم تو ہوتا ہے۔ یہ جتنے لوگ بھی اس قسم کے کاروبار میں ہیں' یہ تو میں نے نشے کی بات کہی ہے' جو کچھ اور کرنے والے لوگ ہیں' کسی سے پوچھئے وہ اعتراف کرے گا اس چیز کا' بہت تھوڑے ایسے نظر آئیں گے جو اس کے باوجود بھی یہ کہیں کہ نہیں او کچھ نہیں ہوتا بہر حال وہ اس کا اعتراف کریں گے۔

یورپ کی قوموں کے مدبرین کی چیخ و پکار

یورپ کی قوموں کے مدبرین کی تو کتاب پہ کتاب چلی آ رہی ہے صاحب اس چیز پہ کہ کتنا بڑا غلط نظام ہے جو ہم نے اختیار کر رکھا ہے' کتنی تباہیاں جو ہم پہ آ رہی ہیں صاحب۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ وہ اسی نظام میں چلے جا رہے ہیں وہ کیا چیزیں ہیں؟ وہ ان کی اپنی خواہشات ہیں' اپنے مقاصد ہیں' اپنی آرزوئیں ہیں' وہ غالب آ جاتی ہیں علم کے اوپر۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (45:23)۔ جہالت کی بناء پہ تو جو تباہیاں آتی ہیں وہ بڑی معمولی قسم کی ہوتی ہیں۔ معمولی میں نے اس لیے کہا ہے کہ جب جہالت کی جگہ علم اور واقفیت آ جاتی ہے تو وہ چیز دور ہو جاتی ہے۔ جسے علم نہیں ہے جہالت کی وجہ سے کوئی غلط دوائی کھا لیتا ہے جب بھی اسے ڈاکٹر کہے او اس میں تو سنکھیا پڑا ہوا ہے تو کیا کرتا ہے؟ اسی وقت چھوڑ دیتا ہے وہ کیونکہ اس نے ایک چیز کا علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ راستہ اختیار کیا تھا۔ علم آ جاتا ہے تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن جو شخص جاننے بوجھنے کے باوجود اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ رک نہیں سکتا ایسے وقت میں' وہ جو کہتے ہیں

کہ صاحب میں کیا کروں۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

لفظ ھوٰہ کا لغوی مفہوم

یہ طبیعت کے نہ آنے کے معنی کیا ہیں؟ رک نہیں سکتا ایسے وقت میں' اندر کی جو اپنی طلب اور خواہش ہے' جسے جذبات آپ کہتے ہیں جسے قرآن ھوٰہٗ کہتا ہے' عجیب الفاظ ہیں قرآن کے عزیزانِ من! عربی زبان میں ھوٰہ ہوتا ہے پہاڑ کی چوٹی سے پتھر کو لڑھکا یئے شروع میں تو وہ آہستہ سے چلتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے کوئی قوت نہیں اسے دھکیل رہی ہوتی' اپنے زور سے وہ رفتار میں اتنی تیزی اختیار کر لیتا ہے کہ کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی اسے ھوٰہٗ کہتے ہیں اور عربی زبان میں جذبات کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عجیب قوم تھی۔ پہلے جن کی عادت تو یونہی معمولی سی ہوتی ہے پتھر ذرا سا لڑھکتا ہی ہے ابھی' اس کے بعد وہ اپنے مومنٹم سے خود اپنے اندر کی قوت اتنی زیادہ اس کی بڑھتی چلی جاتی ہے تو اس کے بعد کوئی قوت اس کے سامنے جو ہے اسے کریش کر کے رکھ دیتی ہے' اس کا اپنا علم کیا چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس کے اپنے جذبات یہاں تک پہنچ چکے ہوں کہ وہ اس کے معبود بن گئے ہوں' اس کے خدا بن چکے ہوئے ہوں' عَـلٰی عِلْـمٍ (45:23) پھر وہ علم کے باوجود تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ میں کیا کروں' رک نہیں سکتا۔ وہ جو میں کبھی بتایا کرتا ہوں ہمارے بڑے ایک عزیز دوست تھے ان کی یہ بات' وہ یہ بات تھی کہ صاحب سگریٹ چھوٹتا نہیں ہے بڑی بلا ہے کم بخت' وہ کہتے تھے کہ چھوٹتا کیوں نہیں ہے بالکل غلط ہے جو کہتے ہیں کہ نہیں چھوٹ سکتا۔ اچھا جی نہیں چھوٹ سکتا' کہنے لگے ہم نے بیسیوں دفعہ چھوڑا ہے۔ بیسیوں دفعہ چھوڑا ہے' ذرا دیکھئے بات۔ یہ کیا چیز ہے' علم کے باوجود چھوڑتا ہے تو کوئی سوچ کے چھوڑتا ہے کہ یہ چیز خرابی کی ہے اور پھر اس کے بعد جو ادھر آتا ہے تو علیٰ علم ہے نا' یہ ہے۔

علم و ادب کے اس دور میں انسانی جذبات کی حکمرانی اور پھر مصائب و آلام کی جہانگیری

عزیزانِ من!۔ جتنا علم ہمارے زمانے میں عام ہوا ہے اس سے پہلے تاریخ میں ہمہ گیر علم کا اس قدر سے ابلاغ اس سے پہلے نظر نہیں آتا تاریخ میں۔ تاریخ میں پہلے کسی خاص خطوں کے اندر رہتا تھا علم اب تو ساری دنیا میں پہنچا ہوا ہے۔ اور جس شدت سے تباہیاں آج آ رہی ہیں اس علم کے باوجود اس کی بھی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ پہلے خاص خطے ہی ہوا کرتے تھے جن میں یہ اس قسم کی برائیاں خرابیاں ہوا کرتی تھیں اب یہ بھی عالمگیر ہو گئی ہیں۔ یعنی علم کے عالمگیر ہونے کے ساتھ' بجائے اس کے کہ انسان کے حسنات بڑھتے'

تباہیاں اور برائیاں جو ہیں وہ عام ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اب سنیے قرآن کے الفاظ' کہتا ہے وہ کیوں یہ ہوتا ہے کہ جانتا ہوں' علم ہے مجھے اس چیز کا اور اس کے باوجود رک نہیں سکتا۔ کہتا ہے قرآن کہ اس لیے کہ جب جذبات غالب آ جاتے ہیں کسی پہ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ (45:23)

جذبات کی حکمرانی انسانی سماعت و بصارت کو پامال کر دیتی ہے' مفلوج کر دیتی ہے

جذبات غالب آ جائیں تو ہوتا یہ ہے پھر کہ سماعت اور بصارت جواب دیدیتی ہیں۔ اس پہ مہریں لگ جاتی ہیں۔ آنکھوں پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔ کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ اسی جذبے سے مغلوب ہو جو انسان آپ دیکھئے کہ واقعی وہ جسے ہم کہتے ہیں نا' اندھا ہو گیا ہے اس میں صاحب' بہرہ ہو گیا ہے' پاگل ہو گیا ہے یہ ہے نا جو قرآن کہتا ہے۔

قدرت کی طرف سے انسانی جذبات ایک بہت بڑا عطیہ ہے بشرطیکہ انہیں وحی کی حدود میں رکھا جائے

قرآن کی رو سے انسانی جذبات بری چیز نہیں ہیں یہ تو بڑی قوت ہے انسان کے اندر' یہ جتنے بڑے بڑے عظیم کام دنیا میں آپ کرتے ہیں' جذبات کی بناء پہ کرتے ہیں۔ ایک جذبہ آپ کے ہاں پیدا ہوتا ہے کہ ظلم نہیں رہنا چاہیے' یہ بھی ایک جذبہ ہے اور اس کے لیے آپ بڑی سے بڑی قربانی بھی دیدیتے ہیں۔ جذبات بڑی قوت رکھتے ہیں۔ وہ کس چیز کو برا کہتا ہے وہ کہتا یہ ہے کہ جذبات کو ہمیشہ علم کے تابع رہنا چاہیے' عقل کے تابع رہنا چاہیے اور عقل کو خدا کی وحی کے تابع رہنا چاہیے' یہ ہے جی دین۔ ایک تو یہ ہے کہ جذبات کی شدت وہ عقل سے بیگانہ نہ بنا دے' ایسی صورت نہ پیدا ہونے دو' سمجھ سوچ جو ہے' سوجھ بوجھ جو ہے' وہ ہمیشہ برقرار رہے۔ اور سوجھ بوجھ کی راہنمائی کے لیے خدا کی اقدار جو ہیں' وہ شمع کا کام دیں بس یہ ہے صراطِ مستقیم۔ وہ کہا کہ اس قوم کی کیفیت یہ تھی کہ سمع اور بصر اور فواد حاصل تھا لیکن وہ اس کے کسی کام نہ آ سکے جب قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کی تباہیوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور اس آیت میں یہ کہا کہ یہ اس لیے کہ جب جذبات غالب آ جاتے ہیں تو پھر انسان کی یہ سمع اور بصر اور فواد کسی کام نہیں آتا' اس پہ تو مہریں لگ جایا کرتی ہیں۔ یہ کیفیت جب ہو جاتی ہے' جذبات کے تابع آ جاتے ہیں انسان کے حواس اور سمجھنے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوتیں اسے قرآنِ کریم نے جہنم کی زندگی کہا ہے۔ وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ (7:179)

اہل جہنم کی پہچان کی وضاحت

کہتا ہے اکثریت ایسی نظر آئے گی تمہیں مہذب انسانوں کی بھی اور ان وحشی انسانوں کی بھی کہ جو اپنی صورتحال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہونگے کہ یہ جہنم والوں کی زندگی ہے صاحب۔ تو آپ سوچئے کہ یہیں جو نظر آ جائیں کہ یہ جہنمی ہیں' کتنی بڑی چیز ہے' پتہ چل جائے

کہ یہ جہنمی ہے۔ یہ کون ہیں جن کے متعلق کہا کہ تم دیکھتے ہو یہ ہیں اہلِ جہنم۔ سنیے عزیزانِ من! اہلِ جہنم۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۚ (7:179) سمجھ سوچ کی قوت رکھتے ہیں' اس سے کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ (7:179) آنکھیں ہیں ان کی دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (7:179) کان بھی رکھتے ہیں اس سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) شکل وصورت میں تو انسان نظر آتے ہیں درحقیقت یہ حیوان' حیوان نہیں بلکہ کہا کہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں' کیوں؟ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) یہ غافلون یہاں کہا ہے' حقائق کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ ہے وہ جو کہہ رہا ہے قرآن چلتے پھرتے ہوئے تمہیں نظر آئیں گے کہ یہ تو جہنمی ہیں۔ دوسرے مقام پہ اسی چیز کو کہا گیا ہے' جہنم کا داروغہ ان سے پوچھے گا اس وقت جہنم میں جانے والوں سے کہ تم نے یہ کیا کیا تھا جس کی وجہ سے یہاں آ گئے ہو۔ تو گویا ایک بہت نمایاں چیز وہ پوچھ رہا ہے نا کہ ساری تفصیل نہیں وہ کیا بات تھی کہ تم یہاں آ گئے ہو۔ وہ کہیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (67:10) اگر ہم سمجھ سوچ سے کام لیتے' عقل وفکر سے کام لیتے تو کبھی جہنم میں نہ آتے۔ لیکن اس نے کہا یہ ہے کہ سمجھ سوچ بیکار ہوجاتی ہے جب جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ اس لیے اس سمجھ سوچ کو وحی خداوندی کے تابع رہنا چاہیے اور جذبات کو اس سمجھ سوچ کے تابع رہنا چاہیے۔ یوں افراد بھی بچ سکتے ہیں اور قومیں بھی بچ سکتی ہیں۔

قوم عاد کے فولادی پنجے کا نتیجہ اور پھر تصوف کے ہاں قرآنی مفہوم کے برعکس لفظ تکبر کا مفہوم

پہلی چیز تو قوم عاد کے متعلق یہ آئی کہ ان کے استبداد کا پنجۂ فولادی اس قدر استخواں شکن تھا' ہڈیاں توڑنے والا تھا کہ جس پہ ہاتھ ڈالتے تھے' کچل کے رکھ دیتے تھے۔ اور پھر اس طرح سے حاصل کی ہوئی دولت کی کیفیت یہ' اپنے محلات تعمیر ہوتے تھے' اس زمانے کے اعتبار سے قلعے بناتے تھے کہ ہم محفوظ رہیں کسی طرح سے اور اپنا نام بلند کرنے کے لیے بڑے بڑے مینار تعمیر کرتے تھے' لاٹھیں گاڑتے تھے پہاڑیوں کے اوپر تَعْبَثُوْنَ جن کا کوئی فائدہ انسانوں کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جذبے کی تسکین ہے نا یہ ساری۔ بڑی سمجھ بوجھ کے مالک تھے لیکن کہا کہ جب اقدار کی طرف سے غفلت برتنے کی سزامیں جب وہ تباہیاں آتی ہیں تو یہ علم اور فضل یہ سمع اور بصر یہ فواد یہ کوئی کام نہیں پھر دے سکتے۔ دو چیزیں آئیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک تھے مملکت بھی ان کی بڑی عظیم واقع ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں تو یہ چیز چلی آ رہی ہے نا وہ جو تصوف کا تکبر ہے کہ تکبر عزازیل راخوار کرد' وہ تکبر تو ہمارے ہاں سب سے بڑی برائی گنی جاتی ہے۔ بڑا بننا یہی نہیں کہ کوئی برائی ہے۔ یہ تو بہت بڑی چیز ہے بننا چاہیے بڑا' (هو المتكبر) یہ تو خدا کی صفت ہے تو صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرنا (معاذ اللہ) یہ تو ہم کہہ ہی نہیں سکتے نا کہ نہیں صاحب یہ صفت تو بڑی خراب ہے صاحب بڑی متکبر' تو کیا کیا جائے اب۔ کبریائی کا ہم

چاروں طرف اعلان کرتے ہیں اور اس کے بعد تو سیدھی بات ہے کہ خدا کی اگر یہ صفتِ عظیم ہے تو اس کے بندوں کے اندر بھی علیٰ حدِ بشریت یہ صفت ہونی چاہیے۔

تصوف کے نزدیک سب سے بڑی عبادت' خودی کو مٹانا ہے جب کہ کبریائی کی یہ صفت اپنے ہاں ایک اہم مفہوم لیے ہوئے ہے

کبر اور متکبر اور یہ الفاظ ہمارے ہاں اصل میں اتنے غلط معانی میں استعمال ہوتے ہیں یہ Ethics of Misticism' تصوف کا ضابطہ اخلاق ہے 'ہو جا ککھ مسیت دا سارے تینوں لتاڑ دے ترے جان تے توں کنڈے وانگوں چبھیں ویں نہ'۔ ان کے ہاں تو 'خودی خداداو یہ' عام ہے ہمارے ہاں یعنی Assertion of Self جو ہے مقامِ خویش ہے جو انسان کا اس کا احساس سب سے بڑا کفر ہے ان کے ہاں۔ تو جب خودی اس معنی میں ہوتی ہے ان کے ہاں تو اس خودی کو مٹانا سب سے بڑی عبادت' زندگی کا سب سے بڑا مقصد' خودی کو مٹانا ہے۔

خودی کو خود مٹا اپنی اگر تو مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

چلی ہوئی ہے وہ ''سائیں بلھے شاہ ہوناں دیاں کافیاں''۔

کبریائی بری چیز نہیں ہے بڑی ضروری چیز ہے عزیزانِ من! اور خودی تو جو ہر ہے جسے آپ میں کہتے ہیں۔ موت میں ہوتا کیا ہے' آپ کا جسم تو وہی کچھ ہوتا ہے' میں نہیں نہ باقی رہتی۔ وہ کہتے ہیں مرنے سے پہلے مر جا 'موتوا قبل ان تموتوا' یہ مسلمہ ہے ان کے ہاں 'سفر سامان چلن دا کر یے مرنے توں فیر پہلاں مریئے'۔ یہ وہ حشیش کا نشہ ہے' بھنگ ہے جو پلائی جاتی ہے عجمی سازش کی بناء پر' مقتدر قوتیں آ کے پھر بہت زیادہ پروپیگنڈہ اس کا کرتی ہیں 'ایک گال پہ طمانچہ مارے' دوسرا گال آگے کر دے' پھر وہ سکھاتی ہیں نا آ کر۔ کبریائی تو نہایت بڑی چیز ہے لیکن دیکھئے قرآنِ کریم کیا کہتا ہے' میں کہہ رہا ہوں کیا کتاب ہے یہ عزیزانِ من!۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ (41:15) لفظ آ گیا استکبار یہاں۔ میں نے یہیں تک پڑھا ہے نظر آیا وہ کہیں گے دیکھئے صاحب کہا اس نے کہ صاحب وہ استکبار چاہتے تھے زمین کے اندر' ملک کے اندر تو اللہ تعالیٰ نے گنایا' کتنی بری بات تھی یہ۔ تباہ ہو گئے وہ' کاہے سے؟ بڑے بنے پھرتے تھے اپنی طرف سے' استکبار وہ چاہتے تھے۔ ہے نا وہی بات جو وہ کہتے تھے۔

الحق کو قبول کیے بغیر استکبار کے حصول کی خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی

اب آیت کے اگلے لفظ سنیے فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ (41:15) وہ الحق کے بغیر استکبار چاہتے تھے۔ استکبار بالحق: قوت جو خدا کے قوانین کے حق وصداقت کو نافذ کرنے کے لیے دنیا کے اندر ہو۔ بن جائے فولادی' جو ظالم کے سینے میں خنجر گھونپنے کے لیے ہو' مظلوم کی امداد کرنے کے لیے اٹھے۔ قوت نہیں ہوگی تو آپ مظلوم کی امداد کیا کر سکیں گے' آپ اپنی مدد نہیں کر سکیں گے۔ کسی اور مظلوم کی امداد کیا کریں گے۔ قوت نہیں ہوگی تو آپ فراعنہ دہر اور نمرودِ عصر جو ہیں' متکبر بنے پھرتے' ان معنوں میں اب میں لیتا ہوں سرکش کے معنوں میں' ان کو نیچا کیسے دکھا سکیں گے ان کا سر کیسے توڑ سکیں گے۔ یہی تو قوت ہے جس کو کبریائی کہتے ہیں۔ یہی تو کبر ہے لیکن یہ کبر اور اُس کبر میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایک فرعون کا کبر تھا جس کے متعلق موسیٰ سے کہا کہ جاؤ (طغیٰ فی الارض) بہت بڑا بن گیا ہے ایک یہ ہے کبر جس کو بتایا گیا ہے۔ کیا فرق ہے فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ (41:15) حق کے بغیر استکبار یہ ہے برا' وہ ہیں جن معنوں میں ہم کہیں گے' متکبر تکبر استکبار ان معنوں کے اندر وہ آئے گا۔

وحی کی تعلیم کے برعکس تصوف کی دنیا میں استکبار یا تکبر کو تو فی ذاتہٖ برا جانا جاتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ تصوف تو ان چیزوں کو فی ذاتہٖ برا کہتا ہے' قوت ہے ہی بری چیز' کبریائی ہے ہی بری چیز۔ قرآن کہتا ہے بالکل غلط ہے۔ قوت بغیر حق کے بری چیز ہے۔ قوت تو اتنی بڑی چیز ہے عزیزانِ من! سورۃ حدید میں آپ دیکھئے قرآنِ کریم یہ کہتا ہے لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ (57:25) ہم نے رسولوں کو بھیجا ان کے ساتھ کتابیں بھیجیں اور میزان بھیجی' عدل کا ترازو بھیجا' کاہے کے لیے؟ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ (57:25) کہ لوگوں کو وہ عدل اور انصاف کے راستے کے اوپر قائم کریں۔ عدل وانصاف کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے ہم نے رسولوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ ضوابطِ قوانین کو بھیجا' یہ چیزیں بھیجی تاکہ دنیا میں عدل قائم کریں۔ تو کیا اتنے سے عدل قائم ہو جاتا ہے کہ ایک کے پاس اچھا ضابطۂ حیات بھی ہو اور وہ اس کی تبلیغ بھی کر رہا ہو۔

قرآن کریم نے الحق کے ساتھ شمشیر بھی عطا کی تاکہ نظامِ عدل قائم کیا جا سکے

سنیے عزیزانِ من! یہی چیزیں نہیں اس کے لیے کہا وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ (57:25) اور اس کے ساتھ ہم نے شمشیرِ خارہ شگاف بھیجی۔ کاہے کے لیے؟ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ (57:25) اس میں بڑی سختی ہوتی ہے یاد رکھو۔ سختی تو ہر شمشیر میں ہوتی ہے اب شمشیر اور شمشیر میں فرق آ گیا۔ وہ شمشیر جو رسولوں کے لائے ہوئے یہ جو ضوابطِ قوانینِ خداوندی ہیں' جو دنیا میں عدل قائم کرنے کے لیے آتے ہیں'

وہ جس شمشیر کی سختی اس کام میں آئے گی کہاوَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25) بشرطیکہ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے شمشیر جو ہے اس کا استعمال کیا جائے۔ اسی کا نام عزیزانِ من! کبریائی ہے۔ اگر شمشیر یہ جو ضوابطِ خداوندی ہے اس سے بے نیاز ہو جائے' بے لگام ہو جائے' تو وہ تباہی کہ جو وہ تو نام ہے ان کا ہلاکو اور چنگیز' ہر دور کے اندر صاحبِ قوت جتنے لوگ ہیں جو تباہیاں مچاتے ہیں اگر وہ کیفیت ہو جائے تو یہ صورت ہو جائے۔ اور اگر یہ دعوت اور یہ مقاصد اور یہ قوانین تو ہوں اپنے پاس اور ان کے ساتھ شمشیر نہ ہو تو پھر یہ وعظ بن کے رہ جاتی ہے۔ پھر وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کے پنڈت پرارتھنا کرتا ہے واعظ آپ کا ہاتھ جوڑ کے کہتا ہے اومیاں دیکھو اوڈرو خدا سے' او میں تمہیں بار بار کہتا ہوں اللہ واسطے چھوڑ دو یہ۔ ''او ترلے لین ڈیا ہویا ہیگا اے' اے ترلے لین نال تے دنیا اچ انصاف کدی قائم نئیں ہو یا عزیزانِ من! ترلے تے ہر مظلوم لیندا ہیگا''۔

دلِ شاہیں نمی ترسد بآں سازے کہ در چنگ است

باز کے پنجے میں جو چڑیا آ جاتی ہے اس کی بیچارے کی واویلے اور چیں چیں سے عقاب کا دل نہیں پسیج سکتا۔

نظامِ عدل کے ساتھ قوت کا حصول لازم وملزوم ہیں

دنیا میں انصاف ''ترلے لین نال'' قائم نہیں ہو سکتا عزیزانِ من! قائم ہو سکتا تو قرآن یہ ساتھ کہتا کیوں کہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (57:25) ہم نے اس کے ساتھ یہ فولاد نازل کیا فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (57:25) سختی کی ضرورت ہوتی ہے عدل قائم کرنے کے لیے بشرطیکہ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ اس کی سختی نوعِ انسانی کی منفعت کے کام آئے۔ یہ ہے عزیزانِ من! یہ کتاب بھیجی ساتھ شمشیر بھیجی۔ اور پھر وہی اقبالؒ آ جاتا ہے بار بار' عجیب چیز ہے اس کی نگاہ بھی کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

ساری کائنات قرآن اور تلوار یا تلوار اور قرآن کے گرد ہی گھومتی ہے

قرآن اور شمشیر کا ذکر کر کے وہ کہتا ہے یہ دو قوتیں ہیں جو ایک دوسرے کی محافظت کرتی ہیں نگہبانی کرتی ہیں' شمشیر قرآن کی نگہبانی کرتی ہے کہ یہ وعظ نہ بن کے رہ جائے' دنیا میں عدل قائم کرنے کا زندہ مؤثر نظام ہو اور قرآن تلوار کی نگہبانی کرتا ہے کہ یہ کہیں بیباک نہ ہونے پائے۔ اور یہی دو قوتیں ہیں

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

اور

کائناتِ زندگی را محورند

بس اس کے بعد پھر زندگی کی ساری کائنات ان کے گرد گھومتی ہے تلوار قرآن' قرآن اور تلوار۔ اس لیے جب اس نے کہا کہ فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ (41:15) وہ دنیا میں بڑا بننا چاہتے تھے حق کو چھوڑ کر حق کی خاطر نہیں۔ للحق ہوتا تو پھر تو استکبار پوچھو نہیں یہ تو خدائی صفت ہے پھر۔ بغیر الحق استکبار چاہتے تھے' ذہنیت کیا تھی' کہا وَ قَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً ؕ (41:15) وہ یہ کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت کس کے پاس ہے صاحب' کس کی مجال ہے آنکھ اٹھا کے بھی ہماری طرف دیکھ سکے۔ یہ تھا جرم۔ یہ نہیں کہا تھا کہ ہم سے زیادہ عادل کون ہے' ہم سے زیادہ انصاف کا پابند کون ہے' ہم سے زیادہ امین و دیانتدار کون ہے' یہ نہیں' ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے۔ بات ان کی کہی کہا اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَہُمۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً ؕ وَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ (41:15) کہا ان سے پوچھو تو سہی کتنی قومیں اس سے پیشتر گذر گئیں ان سے بھی زیادہ قوت میں تھیں موجود' جب انہوں نے ہمارے قوانین کا مذاق اڑایا' زندگی نے ان کا مذاق اڑا دیا۔ وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاہُمۡ ہُوۡدًا ؕ (11:50) اسی سورۃ میں چند ہی آیت آگے یہ بات بھی کہی ہے کہ یہ خود قوم کی پوری کیفیت یہ تھی ان کی مملکت ان کی سلطنت ان کی کیفیت یہ تھی وہاں کے عوام بیچارے جو تھے ان کی حالت کیا تھی۔ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ (11:59)

عوام بیچارے' وہ حاکم اس قسم کے سرکش جبار' جبر کرنے والے' سخت دشمن حق اور انصاف کے' یہ بیچارے عوام ان کے تابع تھے۔ اور اربابِ اقتدار جو تھے ان کی کیفیت وہ تھی جو بتایا گیا' استکبار بغیر الحق چاہتے تھے صاحب اور پھر وہ اپنی نمود اپنی یادگاریں قائم کرنے کے لیے قوم کا روپیہ جو اس طرح سے نچوڑا ہوا ہوتا تھا' اس طرح سے صرف کرتے تھے۔ ذہنیت یہ تھی کہ قوت ہی قوت ہے جس کے پاس قوت ہے' اس کے پاس سب کچھ ہے' یہ ذہنیت ہے۔ ان کی طرف حضرتِ ھودؑ تشریف لائے اور کہا قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ (11:50) وہی ایک بات جو پہلی ہر نبی کہتا چلا آیا ہے کہ صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کرو کسی اور کی نہیں' اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار ہے ہی نہیں۔ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُفۡتَرُوۡنَ (11:50)

ذہنی افترا کی بجائے قانون خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہونا کامیابی کی ضمانت ہے

جنہیں تم سمجھتے ہو کہ یہ اربابِ اقتدار ہیں' صاحبِ قوت و غلبہ ہیں' یہ تمہارے ذہن کے خود ساختہ معبود ہیں یہ جو ہیں۔ کہاں لفظِ افتراء لایا ہے قرآن' افترا ہوتا ہے کسی جھوٹے کو وہ کچھ بنا دینا جو کچھ وہ ہے نہیں۔ یہ برف کے مجسمے کھڑے ہیں جن کو تم سمجھتے ہو صاحبِ

اقتدار ہیں۔سورج نکلنے دیجیے آپ دیکھئے ذرا سی تپش سے کیسے پگھل کے پانی ہوجاتے ہیں۔مفترون' انہیں تم صاحبِ قوت سمجھتے ہو' افترا ہے یہ' تمہارے ذہن نے انہیں معبود بنا دیا ہے۔وہی اقبالؒ

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خدا است

یہ خدا جب تک تو اس کے سامنے سجدے میں پڑا رہے' یہی خدائی اس کی قائم ہے

تو یکے اندر قیام آئی فنا است

تو اٹھ کے کھڑا ہوجا' ختم ہوگیا۔اواس کی خدائی تو رہینِ منت ہے تیرے سجدے کی تو جھکتا رہے تو یہ خدا' تو اٹھ کے سامنے کھڑا ہوجائے ختم ہوگیا۔عجیب چیز ہے عزیزانِ من!۔اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُفۡتَرُوۡنَ (11:50) یہ تمہارا ذہنی افترا ہے جنہیں تم اس طرح سے صاحبِ اقتدار سمجھ کے ان کا اتباع کر رہے ہو' جابر اور عنید کا اتباع۔قرآن اس کو بھی تو نہیں بخشتا' بات آئے گی جہنم کی تو عرض کرونگا۔وَيٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ؕ (11:51) پھر وہی بات ہر پیغمبر یہ بات دہراتا تھا عزیزانِ من! آپ دیکھیں گے حضرتِ نوحؑ کے ضمن میں ہم نے یہ آیتیں دیکھیں۔ہر رسول جو آتا ہے یہ داعیٔ انقلاب' دو باتیں کہتا ہے۔

داعیٔ انقلاب کی دعوت کسی اجرت کا طلب گار نہیں ہوتی

پہلی چیز یہ کہ اقتدار اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں' کسی انسان کو حق حاصل نہیں دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے۔تو پہلا پیغام ہوتا ہے۔انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرتا ہے اور اگلی بات یہ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں میرا ذاتی فائدہ کچھ نہیں ہے۔میں تم سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا۔اور وہ جو میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ یہ نہیں کہ یہ دلِ بے مدعا ہوجاتا ہے پھر' یہ مال و دولت یا یہ ذرائع اور یہ چیزیں جتنے بھی زندگی کے سہارے ہیں وہ ان تمام کو چھوڑ دیتا ہے۔یہ نہیں بات کہ وہ کہتا ہے میں اجر نہیں اس کا چاہتا' تم سے اجر نہیں چاہتا لَاۤ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ ؕ (11:51) میرا یہ اجر جو ہے یہ اس خدا کے ہاں سے ملے گا کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہوا ہے۔

انسانی زندگی کے ایک نفسیاتی پہلو کی نشاندہی

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (11:51) بظاہر نظر آتا ہے کہ یہاں یہ کیا بات تھی کہ کیا تم سمجھ بوجھ سے عقل سے فکر سے کام نہیں لیتے' ذہن میں آتا ہے کہ کونسی بات ہے جس کے لیے وہ کہہ رہے ہیں یہ ان سے کہ کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔بات تو بڑی صاف ہے' ایک شخص کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہوجائے' دیانتداری سے کہ جو یہ کہہ رہا ہے اس میں اپنا اسکا کوئی مقصد نہیں' کوئی غرض نہیں اپنی تو یقیناً پھر سوچنا

پڑتا ہے نا کہ بھئی پھر یہ کیوں روز مغز کھپائی کرتا ہے' کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے' کیوں بار بار ہمیں یہ کچھ سمجھانے کو آ رہا ہے۔ اپنا تو کوئی مقصد اس کا نہیں ہے۔ آپ دیکھئے کہاں قرآن کہتا ہے اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (11:51) وہی بات جسے میں کہا کرتا ہوں کہ کسی سے یہ بات کہیے کہ ''اوتوں جھوٹھ بولیا ہیگا سی' او کہندا اوئے تیری مت ماری ہوئی اے' میںوں کی لوڑ پئی ہوئی سی میں جھوٹھ بولدا''۔ بڑی گہری بات ہے یہ' اپنی سچائی کے ثبوت میں اتنی سی بات وہ کہتا ہے کہ تم یہ بتادو کہ مجھے ضرورت کیا تھی جھوٹ بولنے کی اور یہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! ۔عدالتوں کے اندر بھی یہ بڑی چیز ایک ہوتی ہے Circumstancial Evidences بھی سامنے اگر آ جائیں نا کسی کے خلاف کہ ہاں صاحب حالات بتا رہے ہیں کہ اس نے یہ جرم کیا ہوگا' آگے بات یہ ہوتی ہے کہ Motive اس کا کیا تھا پھر' تم بتا سکتے ہو کہ اس کا اس سے مقصد فائدہ کیا تھا' کیوں یہ بات کرنا چاہتا تھا' یہ بڑی چیز ہوتی ہے۔ اور یہ روزمرہ کی بات ہے ہم آپ سارے کہتے ہیں یہ' آپ نے بھی ہم نے بھی کئی دفعہ کہا ہوگا ''میںوں لوڑ کی پئی ہوئی سی میں جھوٹھ بولدا''۔ ہے نا بات یہ بڑی پتے کی۔ یہ ہے وہ جو کہا اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (11:51) تم روزانہ اپنے ہاں یہ کہتے ہو کہ یہ جو کچھ کرتا ہے سوچو اس کا اپنا اس کے اندر کیا فائدہ ہے'' گل ضرور ہیگی اے ایہدے اندر''۔ وہ کہتے ہیں ان سے کہ تم یہ جانتے ہو کہ میں تم سے کچھ نہیں معاوضہ مانگتا میری تو اس میں کوئی غرض ہی نہیں' تو پھر ذرا سوچو تو سہی کہ کیا میں بالکل پاگل ہو گیا ہوا ہوں کہ اس کے باوجود دن رات جان مار رہا ہوں تمہاری خاطر' اپنی کوئی غرض نہیں۔ ہاں یہ بات کہ میں پاگل ہو گیا ہوں' عزیزانِ من! قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جب وہ ان سے یہ کہا کرتے تھے کہ سوچو تو سہی تو وہ آپس میں کہا کرتے تھے (مجنون) پاگل ہو گیا ہے۔ اور اس قسم کے جنون کے بغیر عزیزانِ من! کوئی اصلاح دنیا میں نہیں ہو سکتی کہ اصلاح کا داعی جان کھپا دے اپنی لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ؕ (11:51) اس حد تک یہ چیز کہے کہ میرا اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں کہ وہ کہنے لگ جائیں کہ پاگل ہو گیا ہے۔

اپنی غلطی کا عملی طور پر اعتراف کرتے ہوئے صحیح راستے کو اختیار کرنا' اسے استغفار کہا گیا ہے' اسے توبہ کہا گیا ہے

وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ (11:52) ابھی وقت ہے آنے والی تباہی سے بچنے کے لیے سامانِ حفاظت طلب کرلو خدا سے۔ کیسے طلب کرلو کیا جائے؟ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ (11:52) غلط راستے پہ جا رہے ہو پیچھے لوٹو' لوٹو کس طرف' کسی اور غلط راستے کے اوپر نہ پڑ جاؤ پھر' الیہ اس کے قوانین کی طرف لوٹو اس کے نظام کی طرف لوٹو اسے اختیار کرو۔ دیکھا استغفار کے معنی کیا ہیں' توبوا الیہ۔ کس خدا کی طرف لوٹنے کو کہہ رہا ہوں؟ کہا اس خدا کی طرف۔

قوم عاد کا ذریعہ معاش اور خدا کے نظام ربوبیت کی وضاحت

اب یہ قوم جو ہے ابھی وہ دور ایسا تھا جس میں زراعت' غلہ بانی' یہ معیشت کے سامان ہوا کرتے تھے' نظر آتا ہے کہ یہ قوم جو تھی

زراعت کے اوپر ان کا زیادہ دارومدار تھا' چراگاہوں پہ بھی ہوگا۔ یُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِّدۡرَارًا وَّ یَزِدۡکُمۡ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمۡ (11:52) کہا اس کی بخشائشوں کا تو یہ عالم ہے' کتنی فراوانی سے تمہاری زمینوں پہ بارش مینہ برستا ہے اس کے لیے تم ٹکا پیسہ نہیں دیتے' مفت میں یہ ملتا ہے اور اسی سے تمہاری روز بروز قوت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے عطا کردہ ایک ذریعے اور سامان سے تمہاری قوتوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن تمہاری یہ کیفیت ہے کہ انہی قوتوں کو بجائے اس کے کہ اسی کے قوانین کے تابع صرف کرو وَ لَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِیۡنَ (11:52) تم ان قوانین کی خلاف ورزی میں' انہیں استعمال کر رہے ہو۔ اب سوچو وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک دو سال تک بارشیں نہ ہوں تمہارے ہاں تو یہ جتنی بڑی قوت جس کے اوپر استکبار چاہتے ہو' ختم ہو کے رہ جائے' زمینیں بنجر ہو جائیں تمہاری' ان سے حاصل کردہ ساری قوت ختم ہو جائے۔

خدا کی اس قدر رحمانیت کے برعکس انسان کے حسنِ سلوک کی مجرمانہ کیفیت

تو کیا یہ سمجھ سوچ تمہیں اس فیصلے پہ نہیں پہنچا رہی کہ جس مقصد کے لیے وہ خدا بارش برساتا ہے اور زمین سے یہ سب کچھ اگاتا ہے' اس زمین کی پیداوار کو اسی کے مقصد کے لیے صرف کیا جائے۔ وَ لَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِیۡنَ (11:52) اور تمہاری کیفیت یہ ہے' میں نے عرض کیا تھا عربوں کے ہاں جرم کہتے تھے دوسروں کے درخت کے پھل کو کاٹ کے اپنے گھر لے جانا۔

دانہ او می کارد ایں حاصل برد

کھیتی کوئی بوتا ہے' فصل کوئی لے جاتا ہے' اسے کہتے ہیں وَ لَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِیۡنَ (11:52)۔

افسوس اور صد افسوس کہ اس قدر واضح اور کھلی نشانیوں کے باوجود عجوبہ پرستی کا مطالبہ

اب وہ تمام باتیں عقل کی فکر کی ان سے کہہ رہے ہیں' تعقلون ان سے کہہ رہے ہیں' سوچ و بچار کی ان سے تاکید کر رہے ہیں۔ عقل و فکر رکھتے ہیں وہ لوگ لیکن تقاضا کیا ہے قَالُوۡا یٰہُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَیِّنَۃٍ (11:53) کہا کہ تم خدا کی طرف سے مدعی ہو نبی ہونے کے' وہی بات بیـــــنة جن کو وہ کہتے تھے معجزے کہتے تھے' کوئی فوق الفطرت چیز کہتے تھے' ایسی کھلی ہوئی چیز نمایاں محسوس طور پہ ہمارے سامنے آئے' یہ تو تم دلائل دے رہے ہو۔ مذہب میں عقل کا کیا تعلق۔ یہ اگلے الفاظ ان کے کہہ رہے ہیں وَّ مَا نَحۡنُ بِتَارِکِیۡۤ اٰلِہَتِنَا عَنۡ قَوۡلِکَ وَمَا نَحۡنُ لَکَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ (11:53)۔ ذرا پھر سن لیجیے غور سے کہ ان کا اعتراض کیا تھا' وہ کہہ رہے تھے کہ تم دلائل و براہین کی رو سے ہمیں ایک بات منوانا چاہتے ہو لیکن ہم اس طرح تمہاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں' ہمیں تو کوئی فوق الفطرت بات کر کے دکھاؤ تو اس سے ہم سمجھیں گے کہ تم سچے ہو۔ آپ نے دیکھا عزیزانِ من! کہ یہ جو کشمکش ہے دلیل و برہان' علم و بصیرت ایک

طرف انسان کی اعجوبہ پرستی کا جذبہ ایک طرف یعنی دین ایک طرف مذہب دوسری طرف ۔تو یہ کشمکش آج کی نہیں بہت پرانی چلی آ رہی ہے بلکہ اس کو الٹ کے کہیے کہ یہ بات اس دور کی نہیں جسے ہم آج دورِ جہالت کہتے ہیں یہی بات آج بھی ہمارے سامنے آتی ہے جسے ہم علم وبصیرت روشنی اور تہذیب وتمدن کا زمانہ کہتے ہیں۔آج بھی آپ ایک طرف کسی کو کوئی بات دلیل و برہان سے سمجھانے کی کوشش کیجیے اور دوسری طرف وہی سائیں جی جنہیں اپنا بھی ہوش نہ ہو وہ کوئی ایسی بات کر کے دکھا دیں جسے آپ کرامات سمجھیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے حضور تو سب سجدہ ریز ہو نگے اِن کی بات کوئی نہیں مانے گا۔اس کا اگر محسوس مظاہرہ دیکھنا ہو تو آج بھی کسی شام کسی بڑے مقبرے پر کسی بڑی زیارت گاہ پر کسی بڑے مزار پر چلے جایئے۔اور قرآن نے جو کہا تھا قومِ عاد کے متعلق کہ وہ سمع اور بصر اور فواد رکھتے تھے یعنی علم وبصیرت رکھتے تھے آج بھی آپ ان خانقاہوں اور مزاروں پہ جا کے دیکھئے کہ کتنے لوگ جنہیں آپ اس قدر تعلیم یافتہ اس قدر دانش و بینش کے مالک سمجھتے ہیں وہ وہاں جا کے زندہ انسانوں کے سامنے نہیں اینٹوں اور پتھروں کے چبوتروں کے سامنے کس طرح سے گڑگڑاتے ہیں وہ ان کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوتے ہیں عقل وبصیرت کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔اور یہی ہے عزیزانِ من! مذہب اور دین کی کشمکش جو ہر زمانے میں اسی تسلسل اور تواتر سے چلی آ رہی ہے قرآن اس چیز کو توڑنے کے لیے آیا تھا۔ اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمادیا تھا کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ ؕ (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے ماننے والے بھی ایسا ہی کریں گے۔تو یہ چیز عزیزانِ من! آپ دیکھ لیجیے کہ کس طرح انسانی ذہن آج تک اسی نہج پہ چلا جا رہا ہے اور قرآن نے آ کے اس بت کو کس طرح سے توڑا تھا۔ہم سورۃ ھود کی آیت 53 تک آ گئے 54 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

نواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 54 تا 60)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1973ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 54 سے ہو رہا ہے۔ (11:54)

قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی معاشرے کی تشکیل ہمیشہ اطمینان قلب عطا کرے گی

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ میں انبیائے سابقہؑ اور ان کے ساتھ ہی اقوامِ گذشتہ کے احوال وظروف کا تذکرہ چلا آ رہا ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ تاریخی حوادث یا وقائع بیان ہو رہے ہیں۔ قرآنِ کریم زندگی کے کچھ غیر متبدل اصول دیتا ہے' اقدار دیتا ہے' Values دیتا ہے۔ دعویٰ اس کا یہ ہے کہ یہ ابدی اور غیر متبدل ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی زمانہ بھی ہو' کوئی ملک بھی ہو' کوئی قوم بھی ہو' جو ان اصول واقدار کے مطابق زندگی بسر کرے گی' اس کے حصے میں خوشگواریاں آ جائیں گی۔ جو ان کی خلاف ورزی کرے گی' وہ تباہ اور برباد ہو جائے گی۔ گویا یہ ایک اصول ہے جو اس نے بیان کیا اور اس اصول کی صداقت کی شہادت

میں وہ پھر تاریخ کے واقعات کو سامنے لاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اولین مخاطب قوم جو تھی قرآن کی وہ عرب تھی تو وہ ان کے سامنے وہی وقائع تاریخ کے لانے چاہئیں تھے، جن سے وہ واقف ہوتے، جنہیں وہ جانتے تھے۔ اس لیے وہی جوان کے گردو پیش انبیاء اور اقوام گذری تھیں، ان کے واقعات کو قرآن ایک ایک کر کے بیان کرتا ہے۔ ان اقوام میں برائیاں تو بہت سی تھیں لیکن ان میں سب سے اصولی بنیادی خرابی جو تھی اس کو وہ نمایاں طور پہ سامنے لاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ دیکھئے اس کا نتیجہ ان کا زوال اور اس کے بعد تباہی ہو گیا تھا۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ جب اور جس زمانے میں بھی کوئی قوم ان اصولوں کی خلاف ورزی کرے گی، اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ پہلے قومِ نوحؑ کا ذکر آیا تھا جس میں بنیادی خرابی بتائی تھی طبقات کی تقسیم کہ وہ عزت کا معیار دولت کو قرار دیتے تھے اور یہ لوگ جو ورکرز کام کرنے والے، محنتی ہاتھوں سے کام کرنے والے کمی جنہیں کہا جاتا ہے، ان کو بڑی حقارت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ ایک پہلا بنیادی جرم تھا۔ اس کے بعد قومِ عاد ہمارے سامنے آتی ہے ان کے متعلق بتایا کہ وہ عقل وفکر کے اعتبار سے بہت آگے تھے، بڑی مہذب قوم تھی۔ لیکن ان کا سیاسی نظام یہ تھا کہ وہ استکبار بغیر الحق چاہتے تھے۔ دنیا میں وہ بڑائی چاہتے تھے، کبریائی چاہتے تھے، اقتدار چاہتے تھے لیکن الحق کو چھوڑ کر۔ یعنی یہ جو اصول اور اقدار ہیں، انہیں چھوڑ کر وہ دنیا میں اقتدار چاہتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب وہ غریبوں، کمزوروں، مظلوموں پہ ہاتھ ڈالتے تھے تو بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ (26:130) وہ اتنی سختی سے ہاتھ ڈالتے تھے کہ کچل کے رکھ دیتے تھے انہیں۔ یہ دو جرم ان کے بتائے اور اس کے بعد کہا یہ کہ چونکہ وہ زندگی کی سطحیت پر نگاہ رکھتے تھے، وہ اپنا دوام چاہتے تھے اس قسم کی یادگاروں کے قائم کرنے میں یَعْبَثُوْنَ (26:128) کہ بڑی بڑی اونچی وہ یادگاریں ہوں لیکن ان کی افادی حیثیت کچھ نہ ہو کوئی فائدہ اس سے نہ پہنچے۔ بڑی بڑی لاٹھیں اور بڑے بڑے مینار کھڑے کر دیتے تھے۔ یعنی ذہنیت یہ بتائی ہے کہ منفعت عامہ یا مفادِ خلق ان کے سامنے نہیں تھا، اپنی ذات کی نمود تھی اور اسی اوچھے پن کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ یادگاریں قائم کرتے تھے۔ اتنا روپیہ صرف کرتے تھے قوم کا اور ایسا کہ جن کی کوئی افادی حیثیت نہ ہو۔ یہ قومِ عاد کے جرائم قرآن نے گنائے۔ ان کی طرف حضرتِ ھودؑ مبعوث ہوئے انہوں نے آکے کہا کہ یہ اندازِ زندگی بڑا غلط ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اور اقوام کے ذکر میں آیا ہے انہوں نے بھی یہ کہا کہ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم خدا کی طرف سے یہ باتیں ہم تک پہنچانے آئے ہو تو کوئی معجزہ کر کے دکھاؤ، کوئی فوق الفطرت بات کر کے دکھاؤ، یہ کیا کہ ہمارے ہی جیسے تم ایک انسان ہو اور ہم سے آکے اتنی بڑائی کہہ رہے ہو کہ میں خدا کی طرف سے باتیں کہہ رہا ہوں۔

صداقت کبھی فوق الفطرت امور کی محتاج نہیں ہوتی

انہوںؑ نے کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، میں عقل و بصیرت کی بنیادوں پہ کہہ رہا ہوں، دلیل و برہان اس کی تائید میں پیش کر رہا ہوں،

تم مجھ سے بات کرو اس بنیاد کے اوپر۔ یہ کیا مطالبہ ہے تمہارا کہ صاحب کوئی فوق الفطرت بات کر کے دکھاؤ' کوئی معجزہ کر کے دکھاؤ تو پھر ہم تمہاری صداقت کے قائل ہو جائیں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں ھودؑ ! ہم اس طرح سے بات یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں وہی کچھ کر کے دکھاؤ۔تو اِنہوںؑ نے یہ کہا کہ یہ مطالبہ تمہارا غلط ہے۔اور اگلی بات: اب وہ آ گئے طنز اور استہزاء پہ۔**اِنْ نَّـقُـوْلُ اِلَّا اعْتَـرٰکَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ** (11:54) کہا کہ وہ ایسا نظر آ تا ہے۔

حضرت انبیاء کرام اپنی قوم کے اندر بلند صفات کے حامل ہوتے تھے

یہ انبیائے کرامؑ انہی اقوام میں سے ہوتے تھے'انہیں میں پیدا ہوتے تھے انہیں میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ فقرہ آ گے چل کے ہم حضرتِ صالحؑ کے قصے میں دیکھیں گے کہ یہ حضرات اپنی قوم کے ممتاز افراد ہوتے تھے یعنی اس دعویٔ نبوت سے پہلے کی زندگی بھی ان کی بڑی ممتاز' بڑی باعزت' صاحبِ تکریم ہوتے تھے' بڑے سمجھدار ہوتے تھے یعنی اپنی قوم میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ آ گے چل کے ہم دیکھیں گے قوم ثمود کے سلسلہ میں حضرتِ صالحؑ کے متعلق: انہوں نے کہا یہ تھا کہ صالحؑ ! تم سے تو ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں تو تمہیں یہ کیا ہو گیا کہ یکا یک اس قسم کی (معاذ اللہ) بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے۔تو یہ جو چیز ہے نا کہ تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں'اس سے نظر آ تا ہے کہ قوم میں وہ بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔اور اس قوم کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ آ گے چل کے جو ہمارا یہ نظام ہے اس میں بڑی ترقی دے گا' اس میں آ گے لے جائے گا اور زیادہ ہمیں اس کے مفاد حاصل ہونگے اور یہ الٹا ہمیں کہنے لگا کہ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔تو وہ انہوں نے انؑ سے کہا تھا کہ صالحؑ ! تم سے تو ہمیں بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں یہ تمہیں کیا ہو گیا۔

قومِ عاد کی حضرت ھودؑ سے ناروا گفتگو ان کی جہالت اور پست سوچ کا عکس تھی

یہ قومِ عاد حضرتِ ھودؑ سے یہ کہتی ہے کہ ھودؑ ! کچھ ایسا نظر آ تا ہے کہ ہمارے معبودوں کی کچھ مار پڑ گئی ہے تم پہ''او جیہڑی حضرت صاحب دی بد دعا لگدی ہوندی اے کہندے نیں''۔ وہی ذہنیت ہے آج بھی' جب بھی کسی سے آپ دیکھیں گے کہ کوئی کسی کی دلیل کا جواب نہ بن پڑتا ہو تو اس کے بعد پھر وہ اس چیز پہ آ جائے گا جیسے وہ لوگ کہتے تھے کہ تم تو کچھ پاگل سے ہو گئے' نظر آ رہا ہے۔کبھی کہتے تھے کسی نے تم پہ جادو کر دیا ہے۔اور ان کے الفاظ جو ہیں وہ یہ کہ نظر آ تا ہے کہ تم جو ہمارے معبودوں کی شان میں اس قدر گستاخیاں کرتے تھے کہ یہ باطل کے معبود ہیں' انہیں کوئی اختیارات حاصل نہیں ہیں تو کچھ ایسا نظر آ تا ہے کہ ان معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی تم پہ۔ اصل میں لفظ جو ہے وہ تو بڑا ہی گہرا لفظ ہے اعْتَرٰکَ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو ننگا کر دینا۔تو وہ کہہ یہ رہے تھے کہ پہلی تمہاری زندگی جو

تھی وہ کچھ نقاب پوش سی نظر آتی ہے ہمیں' اب تم کھل کے سامنے آئے ہو اب پتہ چلا ہمیں۔ لیکن محاورے کے طور پہ یہ استعمال کرتے ہیں وہاں جہاں یہ کہا جائے کہ کسی پر کسی کی مار پڑ گئی کوئی۔ تو کہنے لگے کہ ہاں ہمارے معبودوں کے خلاف جو تم نے یہ کہا تو ان کی پھر تم پہ کچھ مار پڑ گئی ہے جو تم اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ اب یہ کہیے کہ یہ دلیل و برہان پیش کر رہے ہیں' وہ سامنے سے یہ کہہ رہے ہیں۔ اس کا جواب کیا دیا جاتا تھا۔ قَالَ اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ (11:54) کہا بس اس کے سوا میں کیا کہوں کہ جو میں کہہ رہا ہوں اس کی صداقت میں میں خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کسی معبود کی مار پڑ گئی ہے یا میں اس کی طرف سے یہ بات تمہیں کہہ رہا ہوں جو میں باتیں تمہارے حق میں کہہ رہا ہوں۔ وَ اشۡهَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ (11:54) اور تم بھی اس کے گواہ رہو۔ اب انہوں نے یہ کہا تھا نا کہ ہمارے معبودوں میں سے مار پڑ گئی ہے کسی کی تم پہ' تو اس کے بعد تو ہونا یہ چاہئے تھا نا کہ کانپ اٹھتے' لرز اٹھتے کہ ہاں یہ واقعی صاحب ایسا ہوا ہے اور میں جاتا ہوں ابھی معافیاں مانگتا ہوں حضرت صاحب سے اور میں ابھی جاتا ہوں' وہاں دیا جلاؤنگا' چراغ جلاؤنگا' غلاف چڑھاؤنگا مزار پہ۔ یہ یہاں جو چیز آئی ہے کہ میں تمہیں بھی گواہ ٹھہراتا ہوں اور خدا کو بھی گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں اس قسم کا شرک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تم اپنے عقیدے کے مطابق جو جی میں آئے سمجھتے رہو کہ تمہارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی' انہوں نے بد دعا دی۔ انکی شان میں میں نے گستاخی کی تو یہ کچھ ہوا لیکن اس سے میں ڈرنے کا نہیں ہوں کہ خوف کھا کے میں کہوں کہ ہاں صاحب ٹھیک ہے میں معافی مانگتا ہوں حضرت صاحب سے۔

بغیر کسی مفاہمت کے حضرت ھود کی طرف سے اپنے جذبہ ایمانی کا اظہار

یہ جو ہے نا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ (11:54) یہ شرک تمہیں ہی مبارک ہو میں تمہارے اس ڈراوے میں' دھمکی میں آ کے اس تخویف و ترغیب کی بناء پر' میں یہ نہیں کہ تمہارے معبودوں کو معبود مان لوں' میں یہ کچھ نہیں کرونگا۔ مِنۡ دُوۡنِهٖ (11:55) صرف ایک خدا ہے کہ جس کے سامنے میں جھکتا ہوں کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا۔ مجھے پتہ ہے کہ ان کی حیثیت یہ کیا ہے' دنیا میں ہر خدائی کے دعوے والے کی میں قیمت جانتا ہوں کہ کیا ہے اس کی صاحب۔ فَكِيۡدُوۡنِیۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ (11:55) کہا بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا ہے بجائے اس کے کہ تم دلیل و برہان کی رو سے بات مجھ سے کرتے' تم الٹے حربوں پہ اتر آئے اور میں اس سے بھی نہیں ڈرتا جو کچھ تم سازشیں میرے خلاف کرنا چاہتے ہو کر واور مجھے مہلت بھی نہ دو بیشک اس کے لیے۔ یہ جو اعلان ہے یہ بھی ایک عظیم اعلان ہے اصل میں' اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں کسی مفاہمت کے لیے کسی Compromise کے لیے تیار نہیں ہوں تمہارے ساتھ۔ دوٹوک بات کی نا' میں تمہارے معبودوں سے نہیں ڈرتا' تم سے نہیں ڈرتا اور یہ نہ سمجھ لو کہ ذرا لمبا اس بات کو ڈال دو گے تو

میں کسی مفاہمت پہ آ جاؤنگا' کوئی Compromise ہو جائے گا' قطعاً نہیں۔اس لیے میرا اعلان یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے جی میں آئے تم کرو اور مجھے قطعاً مہلت نہ دو۔ یہ اتنی بڑی جرأت سے اتنی بڑی وکالت سے یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے۔ اگلے دو لفظوں میں قرآن نے بتادیا کہ یہ جرأتیں اس قسم کی' کس کے دل میں پیدا ہوسکتی ہیں کہا کہ اِنِّیۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ (11:56) اس لیے کہ مجھے خدا کے ان قوانین کی محکمیت پہ پورا پورا بھروسہ ہے میں اس لیے نہیں ڈرتا تم سے' میں اس لیے خائف نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے اس بات کا کہ جو میں کہہ رہا ہوں' وہ حق ہے اور جو حق ہے وہ غالب آ کے رہا کرتا ہے اس لیے مفاہمت کا سوال نہیں ہے' ڈرنے کا سوال نہیں۔ تمہارے معبودانِ باطل کی حقیقت کو میں جانتا ہوں۔ خدا کے قوانین کی محکمیت پہ مجھے پورا پورا بھروسہ ہے۔رَبِّیۡ وَ رَبِّكُمۡ ط (11:56) عجیب چیزیں ہیں قرآن ایک ایک لفظ میں کہہ جاتا ہے۔ ربی ٹھیک ہے میرا نشوونما دینے والا میرا پروردگار۔تو اس میں تو کچھ ایسا آ جاتا کہ میں اور میرا رب یہ ایک پارٹی بن گئے تو تمہارا تو وہ کچھ لگتا نہیں جسے ہم کہتے ہیں۔ کہا یہ بات نہیں ہے کہ وہ میرا ہی رب ہے اس لیے وہ کچھ میری رعایت کرے گا میری طرفداری کرے گا رَبِّكُمۡ (11:56) وہ تمہارا بھی رب ہے اس لیے یہ نہ سمجھو کہ اس میں وہ کوئی رعایت کرے گا میری۔ یہاں تو یہی ہے نا کہ جب پارٹی بنتی ہے تو جو کوئی بڑا ہوتا ہے' وہ جس پارٹی کا طرفدار ہو جاتا ہے' اسے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری پارٹی سمجھتی ہے کہ یہ ہمارے دشمنوں سے جا کے مل گیا۔

خدا کی ربوبیت کا سلسلہ تو بغیر کسی تفریق کے پوری نوعِ انسانی کے لیے یکساں ہے

کہا وہ تو نشوونما دینے والا ہے پوری کائنات کا' مجھے بھی نشوونما دیتا ہے' تمہاری نشوونما بھی اس کے ذمے ہے اس لیے سوال نہیں ہے کہ وہ میرا بہت زیادہ رب ہے' تمہارا رب نہیں ہے وہ تو یکساں رب ہے۔سوال صرف یہ ہے کہ میں نے اس رب کے احکام واصول کی اطاعت اختیار کر رکھی ہے' تم اس سے سرکشی برت رہے ہو نتیجہ ان قوانین کی اطاعت وسرکشی کا آئے گا سامنے' یہ نہیں ہوگا کہ وہ میرا خدا ہے اور تمہارا نہیں ہے۔تم نے تو کہا نا کہ تمہارے معبود تھے انہوں نے یہ گستاخی برداشت نہیں کی اس لیے میرے خلاف ہوگئے اور مجھ پہ کوئی بددعا دے کے بری بات کر دی' میرا رب اس قسم کا نہیں ہے وہ میرا بھی رب ہے تمہارا بھی رب ہے' ربوبیت میں وہ فرق نہیں لائے گا۔ یہ تو اس کے قوانین کی اطاعت وسرکشی کے نتائج کا فرق ہے جس کی طرف میں تمہاری توجہ دلا رہا ہوں۔مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا (11:56) اور کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ اس رب کا اقتدار اور کنٹرول کیا ہے' روئے زمین پہ کوئی اس قسم کا متنفس نہیں ہے' یہ عربی زبان کا محاورہ ہوتا ہے کہ جس کے ماتھے کے بال اس کے ہاتھ میں نہ ہوں' محکم گرفت سے جس نے پکڑا ہوا ہو جسے کہتے ہیں نا۔ میرا تو بال بال جکڑا ہوا ہے ان معنی میں یہ چیز آتی ہے ان کے ہاں۔کوئی بھی متنفس ایسا نہیں روئے زمین کے اوپر کہ جو اس خدا کے قوانین

کی گرفت کے اندر نہ ہو۔ اس واسطے مجھے تم سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، نہ ہی یہ ہے کہ تم اتنی بڑی قوت کے مالک ہونے کی وجہ سے قانونِ خداوندی کی گرفت میں نہ آسکو۔ ہر شے اس کائنات کی اس کے قانون کی گرفت میں ہے۔ اب یہ بات رہی کہ میں جس راستے پہ چل رہا ہوں، یہ وہ راستہ ہے کہ جو صحیح منزل پہ پہنچائے گا۔ تمہارا راستہ غلط ہے جس پہ تم چل رہے ہو۔

خدا کی طرف سے صحیح منزل کی نشاندہی صراطِ مستقیم کی شکل میں نہایت واضح طور پر پیش کر دی گئی ہے

اگلی بات یہ آئی کہ یہ راستہ کونسا ہے، یہ ہے عزیزانِ من! ایک ٹکڑا اس آیت کا جسے میں اکثر دہرایا بھی کرتا ہوں، بڑی عظیم چیز ہے یہ۔ ہمیں سکھایا یہ گیا سورۃ فاتحہ قرآنِ کریم کا افتتاحیہ، اس میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے وہ یہی ہے نا اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (1:5) اے خدا ہمارے سامنے صراطِ مستقیم نمایاں طور پر ابھر کے سامنے آ جائے، اس میں کوئی التباس، نہ کسی قسم کا کوئی ابہام نہ رہے، کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ ہدایت کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کا ابھر کر سامنے آ جانا کہ جو نمایاں طور پہ نشانی بن جائے اس منزل کی طرف جانے کی جو کسی نے اختیار کر رکھی ہو، ھدی کے معنی نمایاں طور پہ سامنے آ جانے کے ہوتے ہیں۔ تو اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (1:5) کے معنی یہ ہوئے کہ صراطِ مستقیم ہمارے سامنے ابھر کر آ جائے۔ اب یہ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ مختلف مقامات پہ قرآنِ کریم نے اس کی تفصیل دی ہے، وہاں تو یہی کہا ہے کہ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ ۙ۬ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ (1:6-7) تاریخی اعتبار سے وہاں بات کی گئی ہے اور انسانوں کی طرف سے یہی بات ہونی چاہیے تھی کہ ہم چاہتے ہیں اس راستے پہ چلنا وہ جو ان لوگوں کا راستہ تھا کہ جس پر چلنے سے وہ خدا کی نعمتوں اور خوشگواریوں سے سرفراز کیے گئے جس کا نتیجہ انعاماتِ خداوندی تھا زندگی کی خوشگواریاں تھیں۔ بڑی جامع چیز ہے جسے یہ نعمت یا انعام کہتے ہیں بہر حال وہ چیز تو آ گئی تھی اس زمانے میں سامنے۔ یعنی ہم راستہ چاہتے ہیں ان لوگوں کا، ان اقوام کا، ان افراد کا جو زندگی کی خوشگواریوں سے سرفراز ہوئے تھے، وہ ایسے لوگ نہیں تھے کہ جن کی کوششیں ناکام رہ گئیں جھلس کر رہ گئیں، تباہیاں آ گئیں، بربادیاں آ گئیں۔

صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے کہ جس پر خدا خود اور اس کی یہ پوری کائنات چل رہی ہے

وہاں تو اتنی سی بات کہی ہے لیکن قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں یہ بتایا ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہے۔ اور یہاں جو الفاظ آئے ہیں وہ بڑے ہی گہرے الفاظ ہیں، بڑے بنیادی الفاظ ہیں۔ کہا یہ کہ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) یہ صراطِ مستقیم جس پہ میں جا رہا ہوں، جس پر چلنے کے لیے تمہیں کہہ رہا ہوں، یہ کس کا راستہ ہے؟ کہا انسان تو ایک طرف میرا رب بھی اسی صراطِ مستقیم کے اوپر جا رہا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ یعنی ہم کس کے پیچھے جا رہے ہیں، راستے میں کوئی آگے آگے جا رہا ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ یہ کون

ہے جو سب سے آگے جا رہا ہے' اب یہ جو وہاں کہا گیا تھا کہ وہ قومیں جن پر خدا کا انعام ہوا تھا وہ بھی پیچھے چلنے والی قومیں تھیں کوئی آگے جا رہا ہے سب سے آگے اس راستے کے اوپر' جس کے پیچھے پیچھے یہ پوری کائنات جا رہی ہے' وہ آگے آگے جانے والا کون ہے؟ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) خود خدا اس راستے کے اوپر چل رہا ہے۔ اب یہ کسی انسان کی راہ نہ ہوئی' آگے آگے ہمارے چلنے والا کوئی انسان نہ ہوا' ہم اس کا اتباع نہیں کر رہے اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) خود میرا خدا اس راستے کے اوپر آگے آگے جا رہا ہے صاحب۔ جسے خدا کی راہ کہا جاتا ہے وہ یہ چیز ہے جو یہاں کہی گئی ہے' میرا خدا آگے آگے جا رہا ہے۔

خدا کی طرف سے صراطِ مستقیم کی وضاحت مکمل طور پر کتاب اللہ کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے

اب یہاں سے ایک بڑی عجیب چیز سامنے آتی ہے سورۃ فاتحہ میں یہ چیز کہی گئی تھی کہ واضح طور پہ ہمارے سامنے وہ بات آئے یہ دعا آخری لفظ زبان پہ ہی تھے کہ اگلا ورق الٹا قرآنِ کریم نے کہ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ (2:2) تم چاہتے تھے کہ وہ جو راستہ ہے نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئے کہ اس میں کوئی کسی قسم کا شک وشبہ یا التباس وابہام نہ رہے۔ کہا وہ راستہ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ (2:2) یہ ہے وہ کتاب کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ تو گویا یہ کتاب ہے جو اس راستے کو متعین کرتی ہے۔ اور آگے یہ چیز جو کہی گئی هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (2:2) وہی ہدایت کہتے تھے نا کہ چاہیے ہمیں هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (2:2)۔ یہ تو گویا دوسری باتیں چلی آئیں گی' میں جس بات پہ آنا چاہتا ہوں وہ آگے ہے۔ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ (2:3) پہلی چیز یہ آئی ہے صلٰوۃ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بنیادی طور پر اس کے معنی یہ بتائے تھے کہ المصلی یہ جو ریس کے اندر گھوڑے دوڑتے ہیں تو ایک گھوڑا جو اول نمبر کے اوپر ہو شروع سے آخر تک وہ جائے اس کے پیچھے جو دوسرے نمبر کے اوپر گھوڑا ہو جو اس کے ساتھ یوں جا رہا ہو کہ اس کی کنوتیاں اس کے دم کے ساتھ لگیں یہ اس سے آگے تو نہ بڑھے لیکن اس میں اور اس میں فاصلہ بھی نہ درمیان میں ہو' یوں پیچھے پیچھے جانے والا جو ہوتا ہے اس دوسرے گھوڑے کو المصلی کہتے تھے عرب۔ کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح سے جانا کہ اتباع تو اس کا مکمل ہوتا رہے لیکن یہ ذرا اس سے آگے نہ بڑھ سکے رہے اس کے پیچھے لیکن فاصلہ بھی درمیان میں نہ رہے۔ اور یہ جو کیفیت ہوتی تھی اسے وہ صلٰوۃ کہتے تھے۔ اب بات یہ کیا ہوئی۔ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56)

قرآنی نظام حیات کے راستے کی پہلی کڑی نظامِ صلٰوۃ ہے

خدا جا رہا ہے اس راستے کے اوپر آگے آگے اور وہ ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مصلی بن کے میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ تو صلٰوۃ درحقیقت اس راستے کے اوپر جس کے اوپر آگے آگے خدا جا رہا ہے' قرآن کے الفاظ میں اس راستے کے اوپر اس انداز سے چلنا ہے' خدا سے آگے تو

کوئی بڑھ نہیں سکتا لیکن درمیان میں کوئی خلا بھی نہ رہ جائے اس تسلسل کے ساتھ اس کا اتباع کیا جائے' یہ چیز ہوگی کہ جسے آپ صلوٰۃ کہیں گے۔ میں کہا کرتا ہوں قرآن کی رو سے زندگی کے ہر شعبے میں قوانینِ خداوندی کا مسلسل اتباع۔ اور قیامِ صلوٰۃ جسے کہتے ہیں ان عربوں کے ہاں اقیموا الصلوٰۃ جسے کہتے ہیں کسی چیز کو التزاماً کرتے جانا مسلسل کرتے جانا جس میں کوئی ناغہ نہ ہو کبھی اس طرح سے جو چیز کی جائے اس کے لیے اقامت کا لفظ آتا تھا۔ تو صلوٰۃ اپنے وسیع معنوں میں قوانینِ خداوندی کا اتباعِ مسلسل اور لازمی طور پہ کرتے چلے جانا' تواتر سے اتباع کرتے جانا زندگی کے ہر شعبے میں' یہ ہے۔ اور اسکی ایک Miniature Form ہے ایک محسوس سی شکل ہے۔

اجتماعِ صلوٰۃ یا نماز کے اجتماعات دراصل یہ نظامِ صلوٰۃ کی ہی ایک سمٹی ہوئی شکل ہے

وہ جسے ہم اجتماعِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ نماز کے اجتماعات یہ بھی ضروری چیز ہے' اس کا بھی ذکر ہے قرآن کے اندر نماز کے اجتماعات کا' جسے ہم نماز کے اجتماع کہتے ہیں' نماز تو عربی کا لفظ نہیں ہے یہ تو قدیم فارسی زبان کا لفظ ہے' پہلوی زبان کا لفظ ہے۔ صلوٰۃ کے جو اجتماعات مساجد میں یا دوسرے مقامات پہ ہوتے ہیں یہ اجتماع جو ہیں صلوٰۃ کے وہ بڑی چیز جو ہے' وہ جو عالمگیر صلوٰۃ ہے' اسکی ایک سمٹی ہوئی سی شکل ہے جسے Miniature Form کہتے ہیں یہ بھی ضروری چیز ہے۔ لیکن صلوٰۃ مسجدوں کی چار دیواری کے اندر محدود اور محصور نہیں ہے یہ تو زندگی کے ہر سانس میں صلوٰۃ ہوگی۔ وہ مصلی گھوڑا جس طرح سے وہ تسلسل کے ساتھ چلتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ کبھی چلتا ہے کبھی رک جاتا ہے وہ اسی رفتار سے چلا جاتا ہے۔ یہ جو اس قسم کی اتباع اور اطاعت ہے قوانینِ خداوندی کی' اسے کہیں گے آپ اسی راستے پہ چلتے جانا جس راستے پہ آگے آگے خدا چل رہا ہے۔ تو اس نے جو کہا کہ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (11:56) کہ میرا رب اس راستے کے اوپر آگے آگے جا رہا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے میں اور میرے ماننے والے چلتے جائیں گے' یہ ہے ہمارا مسلک جس کی طرف ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں۔ اور ضمناً چونکہ یہ بات آ گئی یہ خدا کی راہ' دو ایک جگہ اور بھی اس چیز کو قرآن نے کہا ہے۔

قرآن حکیم نے صراطِ مستقیم کا ایک دوسرا نام الاسلام بھی کہا ہے

اسی صراطِ مستقیم کا نام قرآنِ کریم نے الاسلام بھی بتایا ہے۔ فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (6:125) جو چاہتا ہے کہ وہ صحیح راستے پہ قائم رہے تو اسے کشادہ ظرفی کے ساتھ' وسعتِ قلب کے ساتھ' دل کی کشاد کے ساتھ اسلام کو قبول کرنا چاہیے۔ اسلام کے معنی بھی ہیں خدا کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا' جھک جانا اس کے سامنے۔ یہ ہمارے ہاں جو لفظ ہے سرِ تسلیم خم کرنا یہ صحیح ہے اسلام کے معنی' خدا کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔ کہا جو چاہتا ہے کہ صحیح راستہ اس کے سامنے رہے اور اس صحیح راستے پہ وہ چلتا رہے تو وہ نہایت کشادہ نگہی سے' کشادہ ظرفی سے' بیچا ہوا دل نہ ہو اس کے لیے کہ ایک بیگار ہے جو پوری کرنی ہے' مرتا کیا

نہ کرتا کہ ہاں صاحب یہ ٹھیک ہے اٹھنا ہے خدا کا یہ حکم جو ہے اس لیے اس کو پورا کرنا ہے یعنی بیگار کی طرح نہیں بلکہ دل کی پوری کشادے' اطمینانِ قلب کے ساتھ ان قوانین کے سامنے وہ جھکتا چلا جائے' یہ ہوا الاسلام۔ اور اس کے بعد کہا وَ ھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسْتَقِیْمًا (6:126) یہ ہے تیرے رب کی صراطِ مستقیم۔ تو گویا جسے یہ کہا تھا کہ میرا رب صراطِ مستقیم پہ چل رہا ہے دوسرے مقام پہ کہا کہ تمہارے لیے اس کا نام الاسلام ہے۔ تو الاسلام اس راستے کے اوپر چلنے کا نام ہے جس میں آگے آگے خود خدا جا رہا ہے اس کے متعین کردہ قوانین کا متعین کردہ راستہ جس پہ ساری کائنات چل رہی ہے' یہ خدا کا راستہ بتایا گیا ہے۔

نبی اکرم سے کہا گیا کہ وحی سے قبل تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وحی کیا ہوتی ہے

دوسری جگہ اسی کو قرآنِ کریم کے متعلق کہا گیا نبی اکرمﷺ سے فرمایا گیا وَ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط (42:52) کہ یہ ہے وحی جو تیری طرف ہم نے یہ کی ہے۔ اس سے پیشتر تو جانتا ہی نہیں تھا کہ وحی کیا ہوتی ہے اور کتاب کس کو کہتے ہیں۔ یہ تیری طرف وحی کی گئی ہے۔ وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (42:52) اے رسول! تو اس کتاب کے ذریعے سے پھر اب لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے لوگوں کی۔ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط (42:53) یعنی اس خدا کے راستے کی طرف کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے اس کے اقتدار کے اندر ہے۔ یعنی تیسری چیز ہمارے سامنے یہ آئی کہ قرآنِ کریم یا وہ وحی جو نبی اکرمﷺ کی طرف نازل ہوئی تھی' وہ ہے خدا کا صراطِ مستقیم' اسے کہیں گے وہی جو ہم نے دعا مانگی تھی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5)۔ تو الاسلام کو کہا گیا صراطِ مستقیم' یہاں قرآن کو کہا گیا صراطِ مستقیم۔ اور ایک مقام پہ وہ زیادہ تفصیل کہی گئی ہے اور بتایا گیا ہے رسول نے کہا ہے کہ یہ ہے میرا راستہ۔ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ج وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاھُمْ ج (6:151) یہ تمام احکام قرآنِ کریم دیتا چلا گیا ہے بڑی تفصیل سے ان دو آیتوں میں 53-152 میں بنیادی احکام آئے ہیں قرآنِ کریم کے۔

صراطِ مستقیم کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن حکیم کے مطابق نبی اکرمﷺ کا ارشاد

اور ان دینے کے بعد کہا ہے کہ وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ ج (6:153) رسول اللہﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ میرا راستہ ہے صراطِ مستقیم' وہی خدا کا راستہ' اسی پہ چلنے کے بعد رسولﷺ نے یہ کہا کہ یہ میرا راستہ صراطِ مستقیم۔ اب اطاعتِ خداوندی یا اتباعِ خداوندی کے معنی بھی ہوئے قرآن کی اتباع اور رسول اللہﷺ کا اتباع جو ہے سنتِ رسول اللہﷺ کا اتباع جسے آپ کہتے ہیں وہ بھی ہوا قرآن کا اتباع کہ قرآن کے ان احکام کے بعد تو حضورﷺ نے فرمایا کہ وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ ج (6:153) یہ

ہے میرا راستہ اس کا اتباع کرو تم وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (6:153) اس کے سوا اور راستوں کا اتباع نہ کرنے لگ جانا۔ اور راستوں کا اتباع کیا تو کیا ہوگا اس کا نتیجہ؟ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ (6:153) یہ چیز خدا کے راستے سے تمہیں الگ کر دے گی یاد رکھو۔ گویا جس راستے پہ خود خدا چل رہا ہے یعنی اس کے قوانین کا راستہ جس پہ ساری کائنات چل رہی ہے، وہی راستہ ہے کہ جسے القرآن کہا گیا ہے وہی راستہ جسے الاسلام کہا گیا ہے۔

القرآن کے بیان کردہ اس ایک راستہ پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ

اس کے احکامات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ہے میرا راستہ اس راستے کے اوپر چلو اگر اس راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ تم نے اختیار کیا تو وہ تمہیں اس خدا کے راستے سے الگ کر دے گا۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ وہ راستے جو ہیں وہ بھی بہر حال چلتے چلے جائیے بات ایک ہی ہے۔ گنگا ایک گھاٹ بہتیرے' یہاں یہ صورت نہیں ہے یہاں تو وہ ایک ہی راستہ ہے جس کے اوپر چلنا ہے' میں بھی اسی راستے پہ چل رہا ہوں' میرے بعد تم نے چلنا ہے اسی راستے کے اوپر چلنا ہے۔ تو گویا خدا کا راستہ بھی وہی صراطِ مستقیم' اس کے رسول کا راستہ بھی وہی صراطِ مستقیم' اسی پہ چلنے کی دعا ہمیں سکھائی گئی۔ اسی پہ چلنے کا نام الاسلام ہے اور یہ ہے قرآنِ کریم کا اتباع۔

اس شاہراہ پر یا اس صراطِ مستقیم پر چلنے والوں میں تفرقے کا کوئی نشان تک بھی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! ۔ یہ (6:152) میں رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا کہ یہ ہے میرا راستہ جس پہ میں چل رہا ہوں کیونکہ اس سے پیشتر جب بھی دین مذہب میں تبدیل ہوتا تھا تو وہ اس راستے کو منسوب تو کرتے تھے اپنے رسول کی طرف' اپنے نبی کی طرف لیکن وہ راستہ وہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ راستہ وہ تھا جس میں تفرقہ پڑتا تھا۔ یاد رکھئے صراطِ مستقیم جو ہے وہ ایک ہی شاہراہ کا نام ہوتا ہے وہ ہائی وے ہوتی ہے وہ ایک ہی ہوتی ہے' مختلف راستے نہیں ہوتے اسی لیے امت میں جو صراطِ مستقیم پہ چلنے والی ہوگی اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوسکتا۔ یہ فرقہ بندی' یہ مختلف فرقے جو آپ کو نظر آتے ہیں' مختلف فرقوں پہ چلنے والا کوئی بھی صراطِ مستقیم پہ نہیں ہوتا۔

امت ہو نبی اکرم کی اور اس کے اندر تہتر فرقوں کا وجود سب سے بڑا فریب ہے' سب سے بڑا دھوکہ ہے

یہ عزیزانِ من! یہ فریب ہے اپنے آپ کو فریب دیا ہوا ہے جو کہا جاتا ہے کہ ہاں صاحب وہ بہتر نہیں تہتر فرقے ہو جائیں گے اور ان میں سے ایک فرقہ جو ہے وہ ناجی ہوگا' جنت میں جانے والا اور باقی سب جہنم میں چلے جائیں گے اور ہر فرقہ اپنے متعلق سمجھتا ہے کہ وہ ایک جنت میں جانے والے ہم ہیں' یہ باقی سارے جہنمی ہیں۔ تو اگر ان میں سے ہر ایک کی یہ بات صحیح ہو جو وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ہیں تو یہ تو تہتر کے تہتر ہی جنت میں چلے گئے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ جب امت میں تفرقہ پیدا ہو جائے تو پھر صراطِ مستقیم کے اوپر امت رہتی نہیں

ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اپنے آپ کو وہ فریب دے لیتے ہیں قرآن نے یہ کہا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا ط (32-31-30:31) یاد رکھنا اسلام لانے کے بعد ایک خدا کے راستے پہ چلنے کے بعد کہیں تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ کون ہیں یہ مشرکین؟ وہ لوگ کہ جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا' فرقے پیدا کیے اور خود ایک فرقہ بن گئے اس میں۔ اور پھر ہوتا یہ ہے كُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) پھر ہر گروہ ہر فرقہ یہ سمجھ لیتا ہے' مگن ہو جاتا ہے (عجیب لفظ ہے یہ) اس میں مگن رہتا ہے کہ ہم صحیح راستے کے اوپر ہیں' باقی سارے غلط راستے کے اوپر ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تفرقہ شرک ہے۔ امت امتِ واحدہ ہے تو وہ توحید پرست ہے' وہ خدا کو ماننے والی ہے' اللہ کے صراطِ مستقیم پر چلنے والی ہے' اس کے رسول کا اتباع کرنے والی ہے اور اگر اس میں تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ صراطِ مستقیم باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے یہاں کہا گیا تھا کہ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ج وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ط (6:153) مختلف راستوں کے اوپر چلو گے تو یہ چیز تمہیں اس ایک راستے سے الگ کر دے گی پھر' یہ نہ اپنے آپ کو فریب دے لینا کہ نہیں صاحب مختلف راستے ہو گئے' کوئی بات نہیں ہم تو اس ایک راستے پہ چل رہے ہیں۔

الدین پر کاربند نہ رہنے کا نتیجہ مختلف فرقے مختلف پارٹیاں مختلف اقوام اور مختلف مملکتیں

الدین وہ امتِ واحدہ کی شکل کے اندر ہی ایک راستہ ہوگا اور وہ صرف قرآن کا اتباع ہوگا۔ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (6:153) یہ ہے وہ حکم جو خدا تمہیں دیتا ہے' اسی کے اتباع کا نام تقویٰ ہے یاد رکھو۔ یہ فرقہ بندی مذہب کی دنیا کے اندر اور پھر آپ نے مذہب اور سیاست کو الگ کیا تو یہ پارٹی بازی سیاست کے اندر' یہ مختلف اقوام آپ کی ایک امتِ محمد ﷺ کے اندر' یہ ان کے ہاں کی الگ الگ مختلف مملکتیں امت کے اندر' تفرقہ نہیں تو اور کیا ہے لیکن یہ اس لیے ہے کہ الدین نہیں ہے۔ جو سیکولر اختیار کر لیتے ہیں اپنے ہاں ان کو تو بڑی طعنہ زنی ہم کرتے ہیں کہ صاحب انہوں نے سیکولر نظام اختیار کیا۔ یہ جن کے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم سیکولر نظام نہیں اختیار کرتے' مذہب اختیار کرتے ہیں دین کے اوپر تو وہ بھی نہیں ہوتے' وہ مذہب اختیار کیے ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک کفر اور ایمان کی پہچان

دین کے تو معنی یہ ہیں پوری امت کا ایک نظام' ایک امت' ایک ملت' اور ایک قانون ان کے ہاں کا' ایک نظام ان کے ہاں کا' اس لیے کہ وہاں تو کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہی یہ ہے کہ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ تو خدا کی کتاب کے مطابق جب آپ آئین اور نظام اور حکومت بنائیں گے تو اس میں تو اس نے کہہ دیا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ دو نظام ہو نہیں سکتے' دو آئین ہو نہیں سکتے' دو قوانین ہو نہیں سکتے'

دو امتیں نہیں ہوسکتیں۔ چہ جائیکہ آپ اس میں بہتر فرقے گناتے رہیں۔ نہ فرقہ' نہ پارٹیاں' نہ الگ قومیتیں' نہ الگ نظام' نہ الگ قوانین' یہ ہو ہی نہیں سکتا' الدین یہ ہے عزیزانِ من!۔اور یہ ہے اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) ہمارا رب صراطِ مستقیم پہ ہے۔ یہاں الگ نظام' الگ قوانین اور آئین کا تو ایک طرف رہا' یہ صلٰوۃ کہ جس کے معنی تھے کسی پیچھے المصلی بن کے چلنا' یہ جب نماز میں تبدیل ہوگئی ہے تو ہر فرقے کی نماز الگ الگ ہے۔تو کیا سمجھتے ہیں آپ پھر صلٰوۃ کے لیے اگر یہ صلٰوۃ کا مفہوم ذہن میں آپ کے خدا کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کہ اس میں اور تمہارے درمیان کوئی خلا بھی نہ باقی رہے۔

کیا خدا کے پیچھے پیچھے چلنے کا یہی طریق ہے کہ ہم صدیوں سے صلٰوۃ کے نام پر' قدم قدم پر انتشار کا شکار رہیں

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مختلف بیس مسجدوں میں بیس طریقوں سے نماز پڑھنے والے' ایک خدا کے پیچھے چل رہے ہوتے ہیں۔اور یہ تو Humanly Impossible جسے آپ کہتے ہیں یہ تو ناممکنات میں سے ہے ناجی کہ ایک ایک راستے کے اوپر وہ چل رہا ہے۔آپ کہہ رہے ہیں ہم اس کے پیچھے پیچھے جارہے ہیں اور بیس الگ الگ راستوں پہ چل رہے ہیں اور ہر ایک ان میں سے کہہ رہا ہے کہ ہم اس کے پیچھے جارہے ہیں۔یعنی خود صلٰوۃ کا فرق آپ کے ہاں کا جو ہے' وہی تکذیب کررہا ہے آپ کے اس دعوے کی کہ یہ صلٰوۃ ہے۔نماز تو ہے' وہ صلٰوۃ نہیں ہے' نماز مذہب کی چیز ہے وہ ٹھیک ہے سُنیوں کے اس طرح' شیعوں کے ہاں اس طرح' سنیوں میں پھر اہلِ حدیث کے ہاں اس طرح' اہلِ فقہ کے ہاں اس طرح' اہلِ فقہ میں حنفیوں کے ہاں اس طرح' شافعیوں کے ہاں اس طرح' حنبلیوں کے ہاں اس طرح' مالکیوں کے ہاں اس طرح' بریلویوں کے ہاں اس طرح' دیوبندیوں کے ہاں اس طرح۔نمازیں تو مختلف ہوتی جائیں گی ان میں سے تو کوئی بھی مصلی نہیں ہوسکتا' مصلی تو دو طریقوں پہ چلنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ هٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ ۚ (6:153) یہ ہے میرا راستہ مستقیم' ایک ہی مستقیم کہا۔آگے کہا ہے یاد رکھنا سبلِ متفرق اختیار نہ کرلینا پھر تم اس صراطِ مستقیم پہ نہیں رہو گے۔تو اس لیے عزیزانِ من! جب تک یہ حالت ہے ٹھیک ہے مسلمان ایک قوم ہے اس دنیا کے اندر' دین کے اوپر تو نہیں ہے اس میں تو تفرقہ ہو نہیں سکتا۔اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) فَاِنۡ تَوَلَّوۡا (11:57)

رسالت کا فریضہ دوسروں کو حقائق سے آگاہ کرنا ہے' زبردستی اپنی بات منوانا نہیں

میں نے بات پہنچادی تم تک' اگر تم اس سے گریز کی راہیں نکالو گے' اعراض برتو گے ایک طرف ہو جاؤ گے اس پہ نہ چلو گے فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖۤ اِلَيۡكُمۡ (11:57) تو میں نے اپنا فریضہ ادا کردیا۔یہ ایک پیغام تھا تمہارے خدا کا میں نے تم تک پہنچادیا'

میری ذمہ داری اتنی ہی ہے۔میری ذمہ داری یہ نہیں ہے لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ (88:22) کہ میں داروغہ بن کے تمہارے اوپر آ گیا ہوں کہ مار مار کے تمہیں اس راستے کے اوپر چلاؤں گا' قطعاً نہیں۔ میرا کام صرف بات پہنچا دینا ہے۔تم نوعِ انسان ہو' حیوانوں کی زندگی میں گدڑیے کا کام یہ ہوتا ہے کہ لٹھ لے کے ان کے پیچھے پیچھے وہ رہے اور جو ادھر سے جائے لٹھ کے ذریعے سے ان کو صحیح راستے پہ رکھے۔انسانوں کے لیے یہ صورت اختیار نہیں کی گئی ہے' انسانوں کے لیے یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ لاعلمی کی وجہ سے ایک صحیح بات تمہارے سامنے نہ ہو تو تمہارے سامنے لے آنا' یہ تھا ایک فریضہ۔خدا نے اپنے ذمہ لیا اس کو اس نے رسولوں کے ذریعے پورا کرایا' میں نے اس کی بات تم تک پہنچا دی۔مَّآ أُرۡسِلۡتُ بِهِۦٓ (11:57) کیا بات ہے!! جس پیغام کو دے کے مجھے بھیجا گیا تھا وہ پیغام میں نے تمہیں دیدیا اس سے زیادہ میری ذمہ داری نہیں ہے۔اگر تم اس کے مطابق نہ چلو گے تو پھر کیا ہوگا' اب آگے وہ بات آ گئی۔

ہم نے اپنے اپنے طور پر عذاب کے لیے ایک خاص تصور قائم کر رکھا ہے

عزیزانِ من! جسے ہم کہتے ہیں نا کہ خدا کا عذاب آ جائے گا ان کے اوپر اور جونہی ہم نے عذاب کہا اور ذہن میں وہی پہلی قوموں کے وہ نقشے آ گئے' ہم پہ نہیں آتا وہ عذاب' نہ!!' کیونکہ وہ عذاب کے مخصوص نقشے ہیں ہمارے ذہن میں کہ جی وہ سیلاب آ گیا تھا' غرق ہو گئے (ہمارا سیلاب عذاب نہیں تھا) جی وہ بارش پتھروں کی ہو گئی (یہ جھکڑ جو چلتے ہیں یہ عذاب ہمارے لیے نہیں ہیں)۔یعنی یہ شکلیں ہیں وہ ابابیلیں کنکریاں مارتی تھیں وہ ہاتھی کا اس سے کچومر نکل جاتا تھا' یہ شکلیں متعین کیں اور جب یہ کہا نا کہ دیکھئے نا ہمارے اوپر عذاب آتا تو ابابیلیں آتیں اور مارتیں وہ کنکریاں' تو ابابیلیں تو وہ روز شام کو اڑتی ہیں تو وہ تو نہیں مارتی ہیں نا تو اس لیے ہم تو تیرے محبوب کی پیاری امت ہیں نا جی۔عذاب کا تصور ذہن میں یعنی مذہب میں ہوتا یہ ہے کہ دین کے Concepts بدل جاتے ہیں۔یہاں تک آپ نے دیکھ لیا نا اس قوم سے کہا جا رہا ہے کہ یہ ہے سیدھا راستہ' میں نے دکھا دیا' بات پہنچا دی۔نہ چلو گے تو پھر' پھر آگے بات یہی ہے نا کہ تم پہ خدا کا عذاب آئے گا۔آپ کو معلوم ہے کیا کہا گیا ہے کہ کیا ہوگا اس کے بعد عذاب کیا ہوتا ہے۔یَسۡتَخۡلِفُ رَبِّی قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ج (11:57) تو تمہاری جگہ ایک دوسری قوم آ جائے گی اقتدار اس کے ہاتھ میں دیدیگا میرا خدا' یہ ہے عذابِ خداوندی۔یوں قومیں تباہ ہوتی ہیں جس کو ہم کہتے ہیں کہ تباہ ہوتی ہیں' زمین میں نہیں دھنس جاتیں کہ نام ونشان یوں نہیں مٹ جاتا' وہ مملکت چھن جاتی ہے' حکومت چھن جاتی ہے' اقتدار چھن جاتا ہے۔تمہاری جگہ ایک اور قوم آ جائے گی اور اس کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا صاحب۔یہ ہے عذابِ خداوندی عزیزانِ من! آہستہ آہستہ آتا ہے تو اسے زوال کہتے ہیں' قوم کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔

قوموں کے تمام تر زوال کی اصل وجہ اخلاقی طور پر کمزور ہونے میں ہے

اس کمزوری کی مختلف شقیں ہوتی ہیں' اقتصادی طور پہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے' معاشی طور پہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ تو علامات ہیں اصل چیز یہ ہے کہ اخلاقی طور پہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اس دوران میں یہ چیزیں اس تک پہنچائی جاتی ہیں کہ بچ جاؤ تباہی آ رہی ہے یاد رکھو اب بھی وقت ہے' مہلت کا زمانہ ہے' وقفہ ہے سنبھل جاؤ' سنتے نہیں ہیں' آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر آخری تباہی کس طرح سے آتی ہے' اس قوم کی جگہ' ایک دوسری قوم آ جاتی ہے۔ یہ محکوم ہو جاتی ہے' وہ قوم حاکم ہو جاتی ہے۔ کسی دوسرے کی محکومیت کے اندر یہ قوم چلی جاتی ہے صاحب۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے لیے بھی جو عذاب کی شکلیں قرآنِ کریم نے بتائی ہیں وہ کیا تھیں۔ یہی الفاظ ہیں۔ نمایاں طور پہ دو اہم چیزیں قرآن نے بتائی تھیں اور دیکھئے بنیادی گوشے کتنے قرآن نے بتائے ہیں۔

قوموں کی سرفرازی کا راز لفظ انفاق کو عملی شکل دینے میں ہے

پہلا گوشہ یہ ہے کہ هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (47:38)

کہتا ہے تم وہ قوم ہو کہ تم سے کہا یہ جاتا ہے کہ یہ جسے تم اپنے مال و دولت سمیٹ کے' پرائیویٹ پراپرٹی کی حیثیت سے سنبھال کے اپنے اپنے کر لو کہ بھئی یہ میری ہے' کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے' یہ تمہاری کیفیت ہے۔ تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جو کچھ مال و دولت ہے اس کو کھلا رکھو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے' ہر ضرورت مند اور حاجت مند کی ضرورت اس سے پوری ہونی چاہیے۔ تم سے یہ کہا جاتا ہے تمہاری کیفیت یہ ہے کہ فَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يَّبۡخَلُ (47:38) تم میں وہ لوگ بھی ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب یہ تو ہماری کمائی ہے' ہماری ملکیت ہے' ہمارے پاس رہے گی ہم تو نہیں کسی دوسرے کو اس میں سے دیں گے' کسی کا کیا حق حاصل ہے کہ ہم سے یہ چھین لے ہم سے یہ لے لے۔ دینا ہے تو ہم نے تو خیرات کے طور پہ' صدقے کے طور پہ' رات کی باسی روٹی ہم دیدیں گے یہ بات غلط ہے کہ ہم اسے کھلا رکھیں۔ عجیب چیز ہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ساری بنیاد انفاق (کھلا رکھنے) پر ہے خرچ کرنے پر نہیں

عزیزانِ من! وقت آئے گا کسی درس میں جب میں معاشی نظام پہ آؤں گا میں بتاؤں گا قرآن کے ان الفاظ کے ترجمے ہمارے ہاں اب یہ جو اکنامکس والے جو ہیں' وہ ترجمے کر رہے ہیں۔ انفاق کا ہم نے اپنے ہاں تو خرچ کرنا ترجمہ کر دیا تھا' يُنۡفِقُوۡنَ خرچ کرتے ہیں' یعنی گویا خرچ کرنا جو ہے یہ ہوا صحیح راستہ' یہ خرچ کرنا کیا بات ہے؟ کہ جی' جس طرح سے جی چاہے خرچ کرے اپنے مال کو' اس پہ تو کوئی پابندی نہیں ہے' پابندی تو یہ ہے کہ خرچ کرو تم اس کو رکھ نہ چھوڑو۔ انفاق کا یہ ترجمہ کیا اور ہم نے یہ کہہ دیا کہ دیکھئے ناخدا کہتا ہے خرچ کرو تو

اس کی اپنی ملکیت کی چیز ہے نا اسے کہا جاتا ہے خرچ کرو۔ ترجمے جو ہیں وہ ہیں Concepts بدلے اور ان کی جگہ پھر ترجمے آئے ان Concepts کے مطابق۔ عربی زبان میں یہ لفظ انفاق جو ہے نفقہ جو ہے اس معنوں میں نہیں آتا' خرچ کرنے کے معنوں میں نہیں آتا' اس کی شکل اور ہے۔ یہ پتہ ہے جسے یہ نیفہ کہتے ہیں یہ تو آپ کی سمجھ میں آتی بات ہے نا' وہ جو پرانے زمانے میں روپیہ ڈالنے والی ایک تھیلی کی بنی ہوئی ہوتی تھی وہ تو اب نہیں رہی' روپے ہی نہیں رہے۔ پیدا کیے چلے جاؤ اور اس کو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کھلا رکھو' اسے انفاق کہتے تھے۔ یہ میں نے عرض کیا تھا نا کہ اس کی ابھی کچھ شکل بگڑی ہوئی یہ لفظ نیفقۃ ہے جسے ہم نے نیفہ بنا دیا اپنے ہاں' وہ دونوں منہ کھلے ہوتے ہیں نا۔ تصور یہ تھا ان کے ہاں اور قرآن نے اسی لیے اس لفظ کو اپنے ہاں تجویز کیا تھا کہ ٹھیک ہے ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق پیدا کرے اور اس کو پھر یہ نہیں ہے کہ آگے وہ ''گنڈھ دے کے رکھ لوے اپنے لئی'' اسے وہ کھلا رکھے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے ماعون کہا ہے اس چیز کو' بہتے ہوئے پانی کی طرح رزق رہنا چاہیے جس کے سامنے بند نہ لگا ہوا ہو۔ یہ جو چیز ہے کہ رزق کو بہتے ہوئے پانی کی طرح رہنا چاہیے' اسے انفاق کہا جاتا ہے' کھلا رکھو ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لیتا چلا جائے' یہ تھا اقتصادی نظام قرآن کا۔ کہا کہ ہم تمہیں یہ کہتے ہیں لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ ۚ (47:38) جوڑ کے رکھنے والا' باندھ کے رکھنے والا' ساتھ والا مر رہا ہے اگر ضرورت کے لیے اس کے پاس فاضلہ پڑا ہوا ہے' یہ میرا ہے اس کا کیا حق ہے اس میں سے' یہ کرنے والا۔ کیا لفظ قرآن کہہ رہا ہے' کہنے لگا بظاہر تم یہ سمجھتے ہو کہ ایسا کرنے سے تم نے کسی اور کو محروم کر دیا ہے اس رزق سے' تم بات یہ سمجھے نہیں ہو کہ

دوسروں کو محروم کرنے والا شخص دراصل وہ خود محروم ہو جاتا ہے

وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ؕ (47:38) جو یہ روش اختیار کرتا ہے معاشرہ وہ دوسروں کو محروم نہیں کرتا' رزق سے خود محروم ہو جاتا ہے ایک دن آ کر۔ کیا چیز کہہ گیا ہے!! کہ اس نظام کا نتیجہ تنگی رزق ہے اس قوم کے لیے' رزق کی کشاد اور خوشحالی اس قوم کے لیے ہے کہ جو پیداوار کو کھلا رکھے ہر ایک کی ضرورت کے لیے۔ جونہی آپ نے الگ الگ پرائیویٹ حصوں کے اندر اس کو بند کیا ہر بند کرنے والا' جمع کرنے والا' اپنی ذات کے لیے سمجھتا یہ ہے کہ میں نے دوسروں کو اس سے محروم کیا۔ کہا وہ سمجھتا نہیں اس بات کو کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ خود محروم ہو جائے گا اس سے۔ وَاللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ۚ (47:38) یہ بھی ذہن میں نہ رکھو کہ خدا بھیک مانگ رہا ہے تم سے۔ اللہ واسطے دیتے ہیں نا ہم۔ کہتا ہے کیا کہہ رہے ہو محتاج وہ ہے؟ وہ تو غنی ہے' بے نیاز ہے' محتاج تم ہو' یہ نہ سمجھو کہ اللہ واسطے دے رہے ہیں' خدا تم سے بھیک مانگ رہا ہے' اپیلیں کر رہا ہے' بالکل نہیں۔

انفاق کے نظام پر عمل نہ کرنے والی قوم کی جگہ ایک دوسری قوم آ جائے گی

وہ بات آئی اب وَاِنْ تَتَوَلَّوْا (47:38) اگر تم اس نظام سے اعراض برتو گے نتیجہ کیا ہوگا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ لا (47:38) تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم آ کے لے لے گی۔تو کیا کوئی دوسری قوم آ جائے گی' قرآن ہے عزیزانِ من! کہانہیں ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38) وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔یعنی استبدال کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس قسم کی قوم دوسری آ جائے گی وہ تو سوال ہی نہیں ہے۔اسی قسم کی قوم جو ہے وہ کیسے آ سکتی ہے کسی دوسری قوم کی جگہ۔وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی وہ قوم یہ نظام رکھنے والی قوم ہوگی۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہمارے لیے بھی جو عذاب قرآن نے بتایا ہے وہ یہی استبدالِ قومی ہے تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔اور جگہ لینے کے معنی جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ نہیں کہ اس قوم کے افراد سارے زمین میں دھنس جاتے ہیں' کہیں گم ہو جاتے ہیں پتہ ہی نہیں چلتا' قوم تو موجود ہوتی ہے وہ' وہ شے جسے کہ قوم کا تشخص کہتے ہیں اپنی آزادی' اپنا وجود' اپنی ہستی یہ ختم ہو جاتی ہے اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔تو ایک تو جرم یہ بتایا یہ اقتصادی نظام کہ جس میں ہر فرد اپنا کچھ باندھ باندھ کر رکھتا پھرے اور انفاق نہ ہو اور دوسری چیز یہ بتائی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (9:38)

نظامِ صلوٰۃ کے لیے نظام نفاق کو محفوظ رکھنے کی خاطر جہاد کی اہمیت

دوسری چیز جہاد کی تھی کہ جب یہ جو حق اور صداقت پر مبنی نظام ہے اس نظام کے خلاف کوئی ایسی قوتیں اٹھ کھڑی ہوں جو اسے تباہ کرنا چاہیں' اسے بدلنا چاہیں تو اس وقت پھر فریضہ عائد ہو جاتا ہے تم پر کہ باقی سب کام چھوڑ کر اپنی جانیں ہتھیلی پہ رکھ کے تم تیر بکف میدان کے اندر آ جاؤ۔کہا ایسے وقت میں اپنی جان کو پیارا رکھنا' دنیاوی زندگی کی متاع جو ہیں ان کو زیادہ عزیز رکھنا' اس سے ایسا کرنے کے لیے اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ (9:39) اگر تم ایسے وقت میں نہیں نکلو گے جہاد کے لیے تو ایک الم انگیز عذاب تم پر نازل ہو جائے گا۔یہاں لفظ عذاب بھی آ گیا اور وہی عذابِ الیم تو قرآن کی خاص اصطلاح ہے کرب اور اذیت جس کے اندر ہوتی ہے۔وہ عذاب تم پہ آ جائے گا۔تو یقیناً ایک انسان اس کے بعد پھر منتظر رہتا ہے معلوم کرنے کے لیے کہ وہ الم انگیز عذاب کیا ہوگا اس کی شکل کیا ہوگی کیسے آئے گا۔يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (9:39) تمہاری جگہ ایک دوسری قوم آ جائے گی۔الم انگیز عذاب۔

زندگی میں قوموں کے لیے اذیت ناک عذاب کسی دوسری قوم کا محکوم ہو جانا ہے

عزیزانِ من! محکومیت سے زیادہ اور اذیت انگیز عذاب ہو نہیں سکتا بشرطیکہ احساسِ انسانیت باقی ہو کسی کے اندر۔دو چیزیں تھیں:

اقتصادی نظام اس قسم کا کہ جس میں ہر شے افراد ہی کی ملکیت اور تحویل میں رہے، وہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی جگہ دوسری قوم آتی ہے اور دوسری چیز یہ کہ جہاد سے گریز کرنے والی قوم جو ہے، وہ باقی نہیں رہ سکتی۔ تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی صاحب۔ نظام تو ہمارے ہاں کا یہ تھا ہی شروع سے یہی سرمایہ دارانہ نظام جو ہے وہ چلا آرہا تھا، وہی ہمارے ہاں Adopt کیا اور پھر ہماری شریعتِ حقا کہہ کے جسے بیان کیا جاتا ہے، کہا کہ اس کا تقاضا یہ نظام ہے قارونیت کا نظام۔ شریعت کا نظام آپ کے ہاں بنا اُسے چھوڑیے ایک جہاد کی چیز آپ کے ہاں چلی آرہی تھی اور یہ ایک بڑی ولولہ انگیز چیز تھی۔

ہندوستان میں انگریز کے خلاف جنگ مسلمانوں نے شروع کی۔ جہاد کی یہ سکیم شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کی تھی

انگریز جب یہاں آیا ہے اور اس نے آ کے اپنی سلطنت قائم کی ہے، تجارت کے لیے آیا تھا، دو کانیں چند کھولیں، بہرحال بات لمبی ہے، یہاں آ کے وہ پورے ہندوستان کی مملکت اس کے ہاتھ میں آئی۔ سارے ہندوستان میں اگر کسی نے اس کے خلاف احتجاج کیا یا سرکشی برتی تو وہ مسلمان تھے نا جسے غدر کہا جاتا ہے 'آزادی کی جنگ' یہ جو مری پٹی ہوئی قوم تھی جسے اب مسلمان کی قوم کہتے ہیں، اسی کے اندر یہ ولولہ تھا نا۔ اس جنگ کی تاریخ بھی صحیح ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس کا جذبۂ محرکہ ہمارے سامنے نہیں لایا گیا۔ پس منظر اس کا سامنے نہیں آنے دیا گیا۔ یہ بات دیر سے چلی ہوئی تھی یہ بات چلی ہوئی تھی شاہ اسماعیل شہیدؒ سید احمد بریلویؒ ان کی وہ جو جہاد کی سکیم تھی، وہی تھی سلگتی ہوئی، سرکتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ جنگِ آزادی کے بعد بھی آپ حیران ہونگے اس دور کی تاریخ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس قدر مسلمانوں کو یہاں کچلا گیا لیکن جہاد کی جو تحریک تھی وہ یہاں جاری رہی تھی۔ یہ جو اس کے بعد مقدمات چلے ہیں اتنے دنتے واڑہ پور والوں کے اوپر وہ لمبی بات ہے وہ اسے وہابی تحریک کہہ کے بدنام کیا گیا تھا۔

یہ جہاد کی تحریک تھی اور اس سے یہ بڑا خائف تھا انگریز، اسے پتہ تھا Crusades کی جنگ اس کے ذہن میں تھی۔ سارا یورپ ایک طرف تھا تین سو سال تک وہ لڑائیاں رہیں جنہیں صلیبی جنگیں کہتے ہیں۔ عیسائیت کے اندر جنگ یا تلوار تو ایک طرف وہ تو ایک طمانچہ کھا کے، دوسرا گال آگے کرنے کی تعلیم دے رہی تھی انجیل اور تین سو سال تک ساری عیسائی اقوام جو تھیں وہ مسلمانوں کے مقابلے میں آئیں اور اس کا نام صلیبی جنگ رکھا گیا یعنی صلیب کی جنگ۔ تین سو سال تک جنگوں میں سارے یورپ کی ایک ایک قوم کی ہڈیاں توڑ کے رکھ دیں ان مسلمانوں نے Crusade کے اندر۔ یورپ کے سینے میں یہ زخم پنہاں چلے آرہے تھے ان کو جہاد کا لفظ جو تھا مسلمان کا، اس سے خوف پیدا ہو جاتا تھا۔

انگریز مسلمانوں کی طرف سے جہاد کے جذبے سے خائف تھا چنانچہ ایک قادیانی نبی پیدا کیا گیا

ہندوستان میں بھی یہ خوف پیدا ہوا انگریز کے دل میں کہ اگر کہیں سے خطرہ ہماری مملکت کو ہو سکتا ہے تو یہ قوم ہے جس کے اندر جہاد کا جذبہ ابھی باقی ہے۔ اور یہ تھی یہاں وہ سازش کہ جذبۂ جہاد مسلمانوں کے دل سے ختم کیا جائے اس کے لیے ایک نبی یا مامور من اللہ جو ہے وہ پیدا ہوا قادیان کے اندر' ایک ہی اس نے آ کے کہا کہ خدا کے ہاں سے میں حکم لایا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جہاد منسوخ ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہوا تھا کہ یاد رکھو اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ (9:39) کہ جہاد کا جذبہ اگر نکل گیا تمہارے ہاں تو پھر دوسری قوم تم پہ مسلط ہو گی۔ یہ دوسری قوم جو آئی ہوئی تھی اس نے اپنے آپ کو مسلط کرنے کے لیے یہاں سے سبق لیا تھا۔ يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَ لَا تَضُرُّوۡهُ شَيۡــًٔا ؕ (9:39) اور اس سے تم خدا کا کوئی نقصان نہیں کر سکو گے' اس کو کوئی ضرب نہیں پہنچے گی' تم محکوم ہو جاؤ گے ایک دوسری قوم کے۔ غور فرمایا عزیزانِ من! کہ خدا کا عذاب ہے۔ جسے عذابِ خداوندی کہا گیا ہے' قوموں میں وہ کس شکل میں آتا ہے' قوموں کے اقتدار کو کوئی دوسری قوم آ کر لے جائے یہ قوم محکوم بن کے رہ جائے اس قوم کی۔ بات قومِ عاد کی تھی۔ تو میں جو عرض کر رہا تھا کہ یہ باتیں پرانے زمانے کی قوموں کی نہیں ہو رہیں' ہمارے لیے ہدایت کے سرچشمے ہیں۔ بات قومِ عاد کی ہو رہی ہے اس سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے یہ نظام اپنا نہ بدلا یہ سیاست کہ جس میں تم جس کے گلے پہ ہاتھ ڈالتے ہو' اس کو کچل کے رکھ دیتے ہو' استکبار بغیر الحق چاہتے ہو دنیا کے اندر۔ اگر تم نے نہ بدلا وَيَسۡتَخۡلِفُ رَبِّىۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ (11:57) تمہاری جگہ ایک دوسری قوم آ جائے گی۔ اور آگے قرآن بتاتا ہے کہ آئی پھر قوم دوسری۔ وَ لَا تَضُرُّوۡنَهٗ شَيۡــًٔا ؕ (11:57) اور پھر تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اِنَّ رَبِّىۡ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَفِيۡظٌ (11:57) یہ کہ وہ تو تمام کائنات کی ہر شے کے اوپر نگرانی کر رہا ہے' اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔

تعمیری صلاحیتوں سے محروم قوم اپنے اقتدار کی کبھی حفاظت نہیں کر سکتی

جو قوم بھی اپنے اندر صلاحیت ختم کر دیتی ہے' اقتدار حاصل کرنے یا اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ اَنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوۡنَ (21:105) قرآن کہتا ہے کہ یہ جو ہے وراثتِ ارض جسے کہا گیا ہے' استخلاف فی الارض جسے کہا گیا ہے' اقتدار جسے کہا گیا ہے' اس کے لیے صلاحیت شرط ہے اسی قوم کے حصے میں آتا ہے جو اس کے لیے صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اور یہاں ہمیں کم از کم دو بنیادی چیزیں دیں صلاحیت کے لیے کہ اگر کسی طرح سے آ بھی جائے اقتدار تو قائم رکھنے کے لیے اس کے بعد ضروری چیز ہے کہ نظام آپ کا وہ ہو کہ جس میں انفاق ہو فی سبیل اللہ' اقدارِ خداوندی کے مطابق دولت جو ہے وہ کھلی رہے مملکت کے اندر اس کی سرکولیشن اس طرح سے ہوتی چلی جائے۔ اور دوسرا ہے جذبۂ جہاد اس قوم کے اندر رہنا چاہیے۔ جہاد مظلوموں کو کچلنے کے لیے

نہیں اس کے تو خلاف کہا تھا قرآن نے۔ ابھی ابھی جو ہم دیکھ چکے ہیں قومِ عاد کے سلسلہ میں استکبار چاہتے تھے ناوہ' تو اگر یہ قوت یا جہاد یا جنگ صرف استکبار کے لیے ہے تو وہ قرآن نے کہا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

اس کے لیے قرآن نے بتایا ہے نا کہ مدینے میں یہ قوم مسلمان آ گئے' اور وہاں اپنی مملکت قائم کی' مکہ اس مملکت سے باہر تھا۔

ہجرت کے دوران مکہ میں رہ جانے والے مسلمانوں کی مشکلات کے حل کے لیے قرآن حکیم کی راہنمائی

ابتدائی دور کی بات ہے۔ مکے میں مسلمان رہ گئے تھے اور یہ مکے کے قریش ان کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے' اذیتیں دیتے تھے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے مدینے کی مملکت کو مخاطب کر کے' کہا یہ گیا ہے کہ اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے' مکے کے کمزور و مظلوم ہم سے فریاد کر رہے ہیں کہ اے خدا کسی طرح ہمیں اس ظالم بستی سے نکال' کہیں سے کوئی ہمارا حامی و مددگار بھیج۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے یہ انداز قرآن کا' خدا کہتا ہے مدینے کے مسلمانوں سے کہ تم سنتے نہیں ہو کہ مکے کے مظلوم ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں اور تم بیٹھے ہوئے ہو۔ یعنی وہ ہمارے جیسے ہوتے بنی اسرائیل کی قوم والے ہم ویسے ہی ہیں نا' تو ہم یہ کہتے کہ صاحب ذرا بات منطق کی کیجیے نا' آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو وہ پکار رہے ہیں مدد کے لیے تو آپ کو پکار رہے' مدد کیجیے ''سانوں وچ کیوں گھسیٹن ڈیے ہو'۔ پوچھا جاتا تھا کہ کیوں حضرت صاحب آپ میں اتنی قوت نہیں ہے کہ مدد میں وہ آپ کو پکار رہے ہیں تو آپ اٹھ کے ان کی مدد کریں جا کر اور پھر اگلی چیز یہ کہ وہ ہمیں تھوڑا پکار رہے ہیں آپ کو پکار رہے ہیں ''تسی جانو او جانن''۔ ہمیں کہا جا رہا ہے کہ کیوں ''کھان پین نوں بھاگ بھری تھون بھنوان نوں جمعہ' سانوں کیندے او کہ چلو اٹھو جاؤ''۔ کیا بات ہے۔ قرآن کی عزیزانِ من!

انسانی زندگی کے معاملات کا حل انسانوں کے ہی ذریعے سرانجام پاتا ہے' اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا ایک تاریخی فقرہ

دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کے معاملات میں وہ براہِ راست نہیں دخل دیتا' ورنہ خدا کے لیے یہ کیا مشکل تھی کہ وہ ایک وہاں کا مظلوم جو قریش کا تھا اسکی براہِ راست مدد کرے' جرأت کسی کی ہو سکتی ہے صاحب لیکن نہیں۔ یہاں اس نے جو اصول اور قانون مقرر کر دیے ہیں ان کے خلاف نہیں جاتا' یہاں مظلوم کی مدد جو ہے وہ انسان ہی کرے گا وہ جو الحق کے ساتھ استکبار لیے ہوئے ہے۔ تو یہ بتایا گیا تھا مدینے کی مملکت کو کہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ جو بھی خدا کو مدد کے لیے پکارے تم اٹھو اس کی مدد کے لیے' یوں مدد دی جاتی ہے صاحب۔ اور یہی وہ حقیقتِ کبریٰ ہے عزیزانِ من! جسے میں نے اپنی کتاب 'شاہکارِ رسالت' میں لکھا ہے الگ باب باندھ کے' بڑی عظیم چیز تھی بات چھوٹی سی تھی' میں نے الگ باب اس کے لیے باندھا ہے۔ حضرتِ عمرؓ نے جو بات کہی عجیب نگاہ تھی قرآن پہ ان کی صاحب' یہ چیز تھی کہ خدا

نے کہا ہے مدینے والوں کو کہ پکار رہے ہیں مجھے مدد کے لیے تم سنتے نہیں ہو؟ اٹھتے کیوں نہیں ہو۔ حضرت عمرؓ کا یہ فقرہ ہے نا انہیںؓ پوچھا گیا تھا کہ آپ کو جو خلافت ملی ہے کیا ذمہ داری ہے؟ آپؓ نے کہا تھا کہ میری ذمہ داری یہ ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ بڑی عظیم ہے عزیزانِ من! اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں مل سکتی، اتنی عظیم حقیقت دو لفظوں کے اندر۔ تم خدا سے دعا کرو گے اپنی کسی ضرورت کو کوئی رکی ہوئی ہوگی تو اس کے لیے اوخدا نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہ فریضہ ہی مملکت کا ہے کہ وہ یہ کچھ کرے تو سوال ہی کیا ہے کہ تم دعائیں کرو اور خدا تک جائیں درمیان میں جو بیٹھا ہوا ہے اس کا مقرر کیا ہوا ذمہ دار آدمی میرا کام یہ ہے کہ تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں یہیں ان دعاؤں کو قبول کرتا ہوا چلا جاؤں، ضرورتیں تمہاری پوری ہوتی چلی جائیں۔

جب تم خدا کے ہاں دعا کرتے ہو تو یہ تو میری خدا کے ہاں شکایت ہو جاتی ہے

اگلی بات یہ ہے کہ اگر کوئی دعا خدا تک پہنچ جائے تو وہ تو میری شکایت ہو جائے گی کہ یہ بیٹھا ہوا میرا کام نہیں یہ کر رہا اللہ میاں اس سے کہو یہ کام میرا کرے۔ میری شکایت ہو جائے گی اس لیے سوال ہی نہیں ہے کہ میں کسی تمہاری دعا کو خدا تک پہنچنے دوں۔ انہی کو حق تھا عزیزانِ من! اس نظام کو سنبھالنے کا۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان کی نظر اس چیز پہ تھی کہ خدا خود کہہ رہا ہے مدینے کی مملکت کو، سنتے نہیں ہو، اٹھتے نہیں ہو مدد کے لیے ہمیں پکار رہے ہیں، دعاؤں کو ہم تک کیوں پہنچنے دے رہے ہو راستے میں کیوں نہیں روکتے تم اٹھ کے۔ یہ ہے وہ جہاد کہ جب کوئی مظلوم قوم خدا کو پکارتی ہے تو وہ کہ جس کو خدا نے اس طرح اقتدار دیا ہوتا ہے، جس نے خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے اقتدار لیا ہوا ہوتا ہے، وہ پھر اس کی مدد کے لیے اٹھتی ہے، اسے جہاد کہتے ہیں۔ تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ دنیا کے ہر ظالم کے سینے میں دل کپکپا اٹھے گا جہاد کے جذبے سے کہ جہاں ہم نے کسی پہ ظلم کیا، یہ کہیں بھی ہونگے اٹھ جائے گا اس کے لیے۔

محمد بن قاسم کی شکل میں خدا کے نام پر حکومت کرنے والوں کا کردار

ہماری تو اس مملکت میں جسے کہا جاتا ہے کہ ملوکیت بنی امیہ کا زمانہ تھا نا کہ جس میں یہاں آپ کے کراچی کے ساحل پہ ہی کہہ لیجیے نا کراچی کے ساحل پہ ایک مظلوم لڑکی نے، اسے معلوم نہیں تھا کہ خلیفہ کہاں ہے اور کتنی دور ہے اور میں کہاں کھڑی ہوں۔ یہ ڈاکو ملاح آئے تھے ناکشتی کے اندر اور ایک مظلوم لڑکی یہاں کی تھی جس کے اوپر اس نے ہاتھ ڈالا تھا، اس نے آواز دی تھی کہ خلیفۃ المسلمین تم کہاں ہو میری مدد کو کیوں نہیں پہنچ رہے، مجھ پہ یہ ڈاکو آئے۔ محمد بن قاسمؒ آیا تھا نا پھر اس مدد کے لیے۔ یہ اس خدا کی طرف جو اس نے دعا کی تھی اس دعا کی ایجابت دعا اس شکل میں ہوئی تھی کہ محمد بن قاسم آ گیا تھا فوراً وہاں۔ یوں دعائیں قبول ہوا کرتی تھیں عزیزانِ من! اس کا نام جہاد تھا۔ اور پھر یہ نہیں کہ وہ مسلمان لڑکی یا مسلمان قوم یا کوئی وہ پکار رہی ہے مدد کے لیے، بالکل نہیں۔

مملکت اسلامیہ کا فریضہ اور ہمارے اس دور میں جہاد کے خلاف دو خود ساختہ نبیوں کا اعلان

قرآن نے کہا ہے کہ کوئی بھی مظلوم دنیا کا اگر کوئی آواز دیتا ہے تمہارا فریضہ ہے کہ اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ مظلوم کی آواز کے اوپر ہی نہیں عزیزانِ من! قرآن ہے میں کیا عرض کروں' وہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ کافر' یہ مشرک ان کی عبادت گاہیں اگر خطرے میں آ جائیں تو تم جا کے جانیں دیدو اور ان کے مندروں کی حفاظت کرو۔ اللہ اکبر۔ اس لیے کہ یہ کمزور ہیں وہ دھاندلی کر رہا ہے آ کے' اس سے غرض نہیں ہے کہ اس مندر میں بت پوجے جاتے ہیں۔ اسے جہاد کہتے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ اس ولولہ اور اس جذبۂ جہاد سے تو دنیا کا ہر فرعون کانپے گا۔ کانپتے تھے جب تک یہ ولولہ مسلمانوں کے سینوں کے اندر زندہ تھا۔ پھر اتنی اتنی بڑی سازشیں کی گئیں ان کے خلاف کہ یہ مسلمانوں کا یہ پہلی دور میں جہاد اور جنگ ہم دیکھ رہے ہیں یہ صاحب یہ بزورِ شمشیر پھیلانے والی بات نہیں تھی' یعنی خائف کیا گیا شمشیر کے نام سے ڈرا دیا گیا ان کو۔ یہ نہیں تھا اور آخر میں آ کے اس کو صاحب جہاد کو حرام ہی قرار دیدیا۔ ہمارے اس دور میں دو ہی نبی آئے تھے نا ایک تو بہاء اللہ تھا ایران میں' یہ بہائی مذہب تھے' ایک ہمارے ہاں کا قادیانی۔ یہ صرف ایک ایک ہی حکم لائے تھے' بہاء اللہ نے تو خیر دوسرا بھی حکم دیا تھا بنیادی طور پہ یہ دونوں ایک ہی حکم لائے تھے جہاد منسوخ ہے۔ یہ تھی وہ چیز' قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر یہ جذبہ تم سے نکل گیا تو پھر تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی' اسے عذابِ الیم کہا ہے عزیزانِ من!۔ اس سے بڑا عذابِ الیم اور کونسا ہو سکتا ہے' دردانگیز عذاب۔ کہا گیا اس سے کہ وَ يَسۡتَخۡلِفُ رَبِّىۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ۚ وَ لَا تَضُرُّوۡنَهٗ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَفِيۡظٌ ○ وَ لَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا هُوۡدًا وَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّيۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ (11:57-58)

انبیائے کرام اپنے فریضہ نبوت کی ادائیگی میں شب و روز مصروف کار رہتے تھے

جب وہ تباہی کا وقت ان کے اوپر آیا تو یہ جو جماعت تھی حضرتِ ھودؑ اور ان کے ساتھیوں کی' انہیں اللہ تعالیٰ نے اس عذاب سے محفوظ رکھا۔ یہ انبیائے کرامؑ ہجرت کر جاتے تھے اس مقام سے جہاں اس قدر ذلت آمیز عذاب آنے والا ہوتا تھا۔ خدا کی آزاد فضا میں جا کے وہ متمکن ہوتے تھے اور وہاں پھر خدا کی حکومت کو قائم کرتے تھے۔ یہ درویشوں اور فقیروں کی طرح جا کے ''کُلیاں نئیں سی پالیندے ہیکے تے بھنگاں نئیں سی گھوٹن لگ پیندے ہوندے''۔ وہاں جا کے یہ خدا کی حکومت کو قائم کیا کرتے تھے یہ تھا ہجرت سے مقصود ان کا۔ واہ قرآن کا انداز!! داستان کو ختم کر رہا ہے۔ یہ کس شکل میں یہ چیزیں ہوئی تھیں یہ آگے جا کے آئے گی میں وہاں پھر اس کی تفصیل بیان کرونگا۔ یہاں اتنی ہی بات کہی اس نے کہ دوسری قوم آ جائے گی اور وہ لے لے گی اور آگے وہ قوم ہے جس کا ذکر آ گیا کہ یہ آ گئی تھی یہ قوم۔ اس لیے یہاں یہ تفصیل نہیں قرآن نے دی' اتنی ہی تفصیل بڑی تھی کہ یہ آ گئی قوم۔ وَ تِلۡكَ عَادٌ (11:59) قومِ مخاطب ہے نا

میں نے کہا تھا کہ انہی قوموں کی داستانیں بیان کی گئی تھیں جن سے وہ آگاہ تھے' واقف تھے' جانتے تھے آتے جاتے تھے راستے میں ان کی بستیاں تھیں' ان بستیوں کے کھنڈرات تھے' ان کے قصے کہانیاں ان کے اندر روز سنتے سناتے تھے یہ لوگ' یہ واقف تھے ان سے۔ بیان کرنے کے بعد کہا تِلْکَ عَادٌ (11:59) یہ تھے وہ عاد بہت بڑے بنے ہوئے۔ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ (11:59) خدا کے قوانین کے خلاف سرکشی برت رہے تھے یہ تھے عاد۔ خدا کے قانون کے مقابل میں کھڑے ہو گئے ہوئے تھے۔ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ (11:59) اور اگر وہ اپنی طرف سے کوئی پیغام بر بھیجتا تھا جو صحیح راستے کی طرف دعوت دیتے تھے تو اس کے خلاف معصیت اختیار کرتے تھے' بغاوت اختیار کرتے تھے۔

سرکش لوگوں کی اتباع کرنے والوں کا نتیجہ

وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (11:59) کرتے کیا تھے؟ اپنا والی' اپنا حاکم اس کو مقرر کرتے تھے جو بڑا ہی سرکش اور بڑا ہی عناد والا ہو۔ عَنِيْدٍ (11:59) خدا کے ہر حکم کی خلاف ورزی کرنے والا ہڈیاں توڑ دینے والا اس قسم کا اپنے ہاں سے وہ حاکم مقرر کرتے تھے اور اس کا اتباع کرتے تھے۔ یہ تھی قوم وَ اُتْبِعُوْا (11:60) وہ اس کا اتباع وہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے ان کے پیچھے بھی ایک چیز چلتی تھی پھر اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط (11:60) ان کے پیچھے پیچھے اس دنیا میں بھی خدا کی لعنت ان کے پیچھے جاتی تھی اور قیامت تک پیچھا کرے گی ان کا یہ۔ لعنت کوئی گالی نہیں ہے' عربی زبان میں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو جانا یا دور ہو جانا اسے لعنت کہتے ہیں۔ انداز محاکاتی ہوتا ہے یہ اس قسم کے حاکم کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے یہ خدا کی لعنت چلی آ رہی تھی۔ اس کا اتباع تو اس دنیا تک انہوں نے کیا۔ وہ بھی ختم ہو گیا' یہ بھی ختم ہو گئے اور یہ لعنت قیامت تک ان کے پیچھے رہی۔ کیونکہ بہت بڑی صاحبِ قوت و مقدرت قوم تھی اس لیے اس کا مقطع کا بند بھی جو آیا ہے نا اس کی داستان ختم کرنے کے لیے تو پہلے تو یہ کہا ہے تِلْکَ عَادٌ (11:59) یہ تھے عاد بہت بڑے بنے پھرتے تھے خدا کے قوانین کی سرکشی برت رہے تھے۔ اور اس کے بعد اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ط (11:60) او سن رکھو سننے والو عاد نے کیا جرم کیا تھا' اپنے خدا کے قوانین سے انکار کیا تھا سرکشی برتی تھی۔

قرآن حکیم میں پیش کردہ واقعات زندگی کے حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں

داستانیں کہانیاں تو ہمارے ہاں رات کو بچوں کو سلانے کے کام آتی ہیں نا' دن کو بھی جو ہم پڑھتے ہیں' یہ افسانے تو ذرا تفریح کے لیے ہی پڑھتے ہیں۔

قرآن حکیم میں قوم عاد اور قوم ثمود کے پیش کردہ واقعات اپنے اندر ابدی حقائق لیے ہوئے ہیں

قرآن ایک داستان بیان کرتا ہے اور اس کے الفاظ ہیں اَلَا او سونے والو! جاگو سنو جو میں کہہ رہا ہوں آگاہ رہو خبردار رہو جو میں بات کہہ رہا ہوں۔ عاد جیسی قوم خدا کے قوانین کا انکار کرتی تھی۔ اَلَا (11:60) پھر اَلاَ اَلَا بُعۡدًا لِّعَادٍ قَوۡمِ هُوۡدٍ (11:60) یہ قوم کس قدر دور کر دی گئی زندگی کی خوشگواریوں سے۔ اَلَا سنتے ہو' یہ ہیں الا کے معنی' سن لیا تم نے دیکھ لیا ان کا انجام' قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں کا۔ اَلَا بُعۡدًا لِّعَادٍ قَوۡمِ هُوۡدٍ (11:60) اور اس قوم کی جگہ لے لی پھر وَ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا (11:61) قومِ ثمود کہ جس کی طرف صالح آئے۔ بات اب قومِ ثمود کی شروع ہو جائے گی چند منٹ ہی صرف باقی ہیں لیکن چونکہ تسلسل قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ داستان ایک ہی درس میں بیان کی جائے ہم آئندہ اس آیت سے لے لیں گے۔ ہم سورۃ ھود کی آیت 60 تک آ گئے عزیزانِ من! 61 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

دسواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 61تا68)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من ! آج مارچ 1974ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی 61 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (11:61)

سابقہ اتوار درس کا ناغہ رہا یہ کانفرس کی وجہ سے ٹریفک میں جو رکاوٹ تھی اس کے پیشِ نظر پہلے ہی ہم نے طے کر لیا تھا کہ ناغہ ہوگا۔ اس ہفتے مجھے اس فلو نے آلیا جو ایک وباء کی طرح پھیل رہا ہے اس وقت بھی آپ دیکھ رہے ہیں میرا اگلا جو ہے بڑا ماؤف ہے لیکن جی نہیں چاہا کہ پچھلا ہفتہ بھی ناغہ رہا، آج بھی ناغہ کر دیا جائے تو جتنی ہمت ہوگی اس کے مطابق میں درس پیش کر دونگا۔

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سورۃ ھود میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں پیش ہوتی چلی آ رہی ہیں ایک کے بعد دوسری۔ ان داستانوں میں بتایا یہ گیا ہے کہ ویسے تو قوموں میں اکثر و بیشتر خرابیاں ہوتی ہیں لیکن ان میں سے بعض خرابی ایسی ہوتی ہے جس کی وجہ سے پھر وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ تو قرآنِ کریم ان اقوام کے ان جرائم کو نمایاں طور پہ سامنے لاتا ہے جس کا نتیجہ ان کی تباہی ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ اب آپ کو معلوم ہے یہ داستانیں محض تاریخ کی کہانیاں نہیں ہیں وہ کہتا یہ ہے کہ یہ اٹل اصول اور قوانین ہیں غیر متبدل۔ جو قوم جس ملک میں، جس زمانے میں اس قسم کا نظام اپنے ہاں رائج کرے گی جس کا ذکر ان مختلف اقوام کی داستانوں میں وہ ہمارے سامنے لاتا ہے،

وہ قوم تباہ ہوکر رہے گی۔ یہ ہے وہ فلسفہ تاریخ کا جو قرآن نے پیش کیا ہے کہ کچھ اصول اور قوانین چلے آ رہے ہیں، جہاں بھی ان کی خلاف ورزی ہوگی، نتیجہ تباہی ہوگا۔ جو قوم اس کے مطابق اپنا نظام مرتب کر لے گی، رائج کر لے گی اس کا نتیجہ خوشگواریاں ہوگا۔ یہ ایک ابدی قانون ہے یہی فلسفۂ تاریخ ہے جو قرآن نے پیش کیا۔

ذات برادری کا معاملہ ہو یا رنگ و نسل کا امتیاز ہو یا خونی رشتوں کی رفاقت کا یہ تو سب چیزیں اضافی ہیں

پہلے حضرتِ نوحؑ اور ان کی قوم کا ذکر آیا تو جو جرائم نمایاں طور پر سامنے لائے گئے ان میں پہلا یہ تھا کہ ان کے ہاں طبقاتی تقسیم تھی۔ معاشرے میں جو لوگ چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے تھے یا کام کاج کرنے والے لوگ وہ انہیں بڑی ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہی جنہیں ہم بھی اب کمی یا کمین کہتے ہیں، وہ انہیں یہ سمجھتے تھے۔ اور یہ بڑے بڑے لوگ، وہ بڑے بڑے کون ہوئے کہ جو کچھ کام نہ کریں اور عیش اڑائیں، کیا معیار ہے بڑے ہونے کا!!! لیکن بہرحال یہ تھا نظام جو ان کے ہاں رائج تھا اور اس کے خلاف حضرتِ نوحؑ نے انہیں ایک پیغامِ انقلاب دیا تھا کہ معاشرے میں اگر اس قسم کی ناہمواریاں پیدا کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے، غرق ہو جاؤ گے۔ اُنہوں نے نہ مانا، قوم تباہ ہوگئی۔ پھر اگلی چیز یہ بتائی تھی کہ تم اپنے اور بیگانے کا معیار خون کا رشتہ یا نسل میں مشترک ہونا قرار دیتے ہو۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے نسلی اعتبار سے، آگے چل کر میں آؤں گا جہاں قرآن اس کو خاص طور لاتا ہے تو عرض کروں گا کہ نسل کو کتنی اہمیت دی انسانوں نے۔ ایک تو یہ تھا نا کہ ایک خاندان نے اپنے آپ کو بڑا بنا لیا۔ ایک قوم کے اندر بعض برادریوں نے اپنے آپ کو بڑا اونچا سمجھ لیا تو اگلی چیز یہ تھی کہ دنیا میں بعض نسلوں نے اپنے آپ کو بڑا اونچا سمجھ لیا۔ داستانِ حضرتِ نوحؑ میں یہ جو چیز تھی کہ وہ اپنے اور بیگانے کا رشتہ خون کا رشتہ قرار دیتے تھے، ہم قبیلہ ہونا، ہم خاندان ہونا، ہم نسل ہونا، خون مشترک ہونا، اسے وہ اپنا قرار دیتے تھے اور جن کا خون میں اشتراک نہیں ہوتا تھا، قبیلے میں اشتراک نہیں ہوتا تھا، انہیں وہ بیگانہ سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس غلط خیال کی تردید کی خود حضرتِ نوحؑ سے کہا کہ تیرا بیٹا جو ایمان اور عملِ صالح میں تیرا شریک نہیں ہے، وہ تیرے اپنوں میں سے نہیں ہے، بیگانوں میں سے ہے۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے درجے کے لوگ جنہیں کہا جاتا ہے یہ اگر ایمان اور تقویٰ میں تمہارے شریک ہیں، یہ تمہارے اپنے ہیں اور وہ تمہارا بیگانہ ہے۔ تو جسے قومیت کا معیار آج کہا جاتا ہے، قرآن نے پہلے نبی کی داستان میں پہلی اہم چیز یہ بتائی کہ قومیت کا مدار وطن زبان رنگ نسل کا اشتراک نہیں، ایمان کا اشتراک ہے۔ ایمان کے اشتراک میں اگر حبش کا بلالؓ بھی مشترک ہے تو وہ عرب کے فاروقِ اعظمؓ کا ہم قوم ہو سکتا ہے اور اگر اس کا اشتراک نہیں تو پھر ابولہب اور ابوجہل بھی دوسری قوم کے فرد ہوتے ہیں، اس قوم کے فرد نہیں جسے امتِ محمد ﷺ کہا جاتا ہے۔ پہلے نبیؑ کے قصے میں دو باتیں سامنے ہمارے آئیں۔

قوم عاد کی مجرمانہ زندگی کے خدوخال کی وضاحت

اس کے آگے قومِ عاد کا قصہ آیا اس میں یہ کہا گیا کہ وہ لوگ علم وبصیرت میں بہت آگے تھے' سمع اور بصر اور فواد ان کو حاصل تھا' بڑے بڑے محلات بناتے تھے۔لیکن کیفیت یہ تھی کہ معاشرہ نظام استبداد پر مبنی تھا۔وہ بطشِ شدید سے پکڑتے تھے غریب کو کمزور کو' مظلوم پہ ہاتھ ڈالتے تھے تو اس کی ہڈیاں توڑ کے رکھ دیتے تھے۔اس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کے رکھ دیتے تھے۔اور اپنے بڑے بننے کا ان کو اس قدر زعم اور لالچ تھا' چاؤ تھا کہ وہ اپنی ہمیشہ کی زندگی اس دنیا کے اندر ثابت کرنے کے لیے بڑی بڑی یادگاریں بناتے تھے۔لیکن قرآن کہتا ہے کہ یادگاریں ایسی بناتے تھے جن کی افادی حیثیت کچھ نہیں ہوتی تھی۔یونہی مینار کھڑا کر دیا لاٹھ بنادی۔قرآن کہتا ہے کہ غریب قوم کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ کے روپیہ اکٹھا کرتے تھے اور وہ اس طرح سے اپنی ذہنی عیاشیوں میں اس کو صرف کر دیتے تھے کہ آنے والا زمانہ ہماری یاد سے ہمیں دیکھے کہ ہم کتنی بلندیوں پر تھے اور وہ ایسی کہ جس سے کوئی افادی حیثیت نہ ہو۔یہ نہیں تھا کہ اس روپے سے ہسپتال بنا دیں اور اس کا ہی نام اپنے نام پہ رکھ دیں کہ چلیے کچھ لوگوں کو فائدہ تو ہوا' کہا کہ نہیں یہ کچھ نہیں کرتے تھے وہ۔ایسی چیزیں بناتے تھے جن کا کوئی افادی پہلو نہیں ہوتا تھا۔تو کہا کہ استبداد کا نظام جو آہنی شکنجے سے غریب کا گلا گھونٹ لے اور اس طرح سے ان کی کمائی کو لے کر اپنے ذہنی عیاشیوں کے اندر صرف کرنا شروع کرے' کہا کہ وہ قوم نہیں بچ سکتی۔اب تیسری قوم ہمارے سامنے آتی ہے یہ ہے قومِ ثمود۔وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (11:61)

وحی خداوندی کی روشنی میں قوم ثمود کا طرزِ زندگی خدا کی عبودیت اور ملوکیت کی وضاحت

قومِ ثمود کی طرف اسی قوم کا بھائی بندصالحؑ وہ مبعوث ہوئے قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (11:61) وہی پہلا اعلان جو ہر نبی آ کر کرتا ہے اور جو دین کا عمودی نقطہ ہے۔اقتدار اور اختیار کسی انسان کو حاصل نہیں ہے اس لیے کسی انسان کی محکومیت نہیں کی جا سکتی۔کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنا حکم دوسروں پر چلائے۔اقتدار صرف خدا کا ہے خدا کے جو احکام وحی کی رو سے نبی کو ملتے ہیں ان قوانین اور احکام کی محکومی درحقیقت خدا کی عبودیت ہے۔انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین خواہ وہ ایک فرد کا ہو جیسے ملوکیت میں ہوتا تھا یا انسانوں کے کسی گروہ کا ہو جیسا کہ اب جمہوری نظام میں ہوتا ہے' خواہ ساری دنیا کے انسان بھی اکٹھے کیوں نہ ہو جائیں' قرآن کا اصول یہ ہے کہ انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسانوں پر اپنا حکم چلائیں خواہ اس کا نام قانون ہی کیوں نہ قرار دیدیں۔قوانین ابدی خدا کی طرف سے ملتے ہیں وہ وحی کی رو سے انبیاء کی وساطت سے آتے ہیں ان کی اطاعت' یہ ہے حکومت کا فریضہ' خود بھی وہ ان کی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی ان کی اطاعت کرائیں یہ ہے صحیح نظامِ حکومت۔اس لیے ہر نبی پہلا فقرہ آ کے

یہ کہتا تھا کہ اُعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ (11:61) خدا کی محکومیت اختیار کرو اس کے سواحقِ اقتدار کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے وہ بات چلتی ہے۔ ھُوَ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ (11:61)

اس زمین میں اس نے تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے جیسا یہ نہیں کہ زمین کے اندر سے پیدا کرنا ہوتا ہے' الارض ملک کو کہتے ہیں جس میں کوئی قوم بستی ہے۔ اس ملک کے اندر کسی کا کھڑے ہو جانا' صاحبِ اقتدار ہونے کو کہا جاتا ہے۔ اس ملک میں اس نے تمہیں صاحبِ اقتدار بنایا ہے۔ وَ اسۡتَعۡمَرَکُمۡ فِیۡہَا (11:61) اور تمہاری آبادی بڑی خوشحال ہے' فارغ البال ہے یہ چیز بھی حاصل ہے تمہیں۔ فَاسۡتَغۡفِرُوۡہُ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ (11:61) ابھی یہاں وہ جرم نہیں گنایا گیا ان کا جن کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ کہا یہ کہ تم تباہیوں کی طرف جا رہے ہو اپنے خدا سے حفاظت طلب کرو۔ حفاظت طلب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ اپنا خود ساختہ نظام اور جس روش پہ تم چل رہے ہو' اسے چھوڑو' خدا کی طرف جانے والے راستے پہ چلو تم۔ جو قوانین اس نے دیے ہیں جو نظام اس نے دیا ہے' اس نظام کی اطاعت کرو۔ اس طرح سے تمہیں حفاظت مل جائے گی جسے مغفرت کہا جاتا ہے۔ آنے والی تباہی سے تم محفوظ ہو جاؤ گے۔

خدا کو پکارنے کا مفہوم اور اس کا طریق کار

یاد رکھو یہ بات نہیں کہ تم اپنی اس سرکشی میں بہت دور نکل گئے ہو تو اب جو میں کہتا ہوں کہ لوٹو اپنے خدا کی طرف تو تم کہو کہ نہیں صاحب ہم تو اس سے بہت دور چلے آئے ہیں' اب لوٹ کے بھی اس تک کیسے پہنچیں گے' اس نے کہا یہ بات نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ قریب ہوتا ہے ہر پکارنے والی کی پکار کو سنتا ہے یہ نہ کہو کہ تم خدا سے بہت دور چلے گئے ہو۔ یہ ایک خاص خصوصیت ہے پیغامِ خداوندی کی کہ وہ بجز اس وقت کے کہ جب کسی کی تباہی اس کے سامنے ہی نہ آ کھڑی ہو' کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ ہاں تم لوگ تو بہت دور نکل گئے اس سرکشی میں' اب تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ آخری لمحات تک یہ کہتا ہے کہ اب بھی تم بچ سکتے ہو' اب بھی تمہیں حفاظت مل سکتی ہے تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ ؕ (11:61) اس روش کو چھوڑ کر' اس کا بتایا ہوا طریقہ جو ہے' اس کے اوپر چل نکلو وہ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ (11:61) بہت قریب ہے اور تمہاری پکار کا جواب دیتا ہے۔ یہ چیز جب یہ سورۃ بقرہ میں یہ بات آئی تھی تو وہاں میں نے تفصیل سے عرض کیا تھا جہاں یہ تھا کہ وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) کہ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو کہو کہ میں بہت قریب ہوں ان کے' ہر پکارنے والی کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ میں پھر اسے دہرا دوں کہ خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحب ہم تو سینکڑوں مرتبہ خدا کو پکارتے ہیں' ہمیں تو اس کا جواب کبھی نہیں ملتا' یہاں وہ کہتا ہے کہ ہر پکارنے والی کی پکار کا جواب دیتا ہوں میں۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ خدا سے کچھ پوچھنا دریافت کرنا اسکی طرف سے جو جواب ملنا

ہے' وہ جو اس نے کلام اور اپنی وحی دے رکھی ہے' یہ اس سے جواب ملتا ہے۔ خدا کی وحی کے اندر یہ چیز موجود ہوتی ہے کہ زندگی کی ہر احتیاج کے متعلق زندگی کے ہر اہم مسئلہ کے متعلق جب بھی تم پوچھتے ہو کہ اس میں مجھے کیا کرنا چاہیے' خدا کی کتاب اس کا جواب دیتی ہے۔ یہ ہے جو جواب خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہر فرد اپنے طور پہ خدا کو پکارتا ہے' خدا اس کی پکار کا جواب اسے انفرادی طور پر دیتا ہے۔ اور ختمِ نبوت ﷺ کے بعد تو اب پھر نبی بھی کوئی نہیں ہے اس لیے کسی خاص نبی کو بھی اس طرح سے جواب نہیں دیتا' وہ سلسلہ ختم ہوا۔ اب اس کے بعد خدا نے جو جواب دینا تھا اس کا مجیب ہونا جو ہے وہ اس کی کتاب کا مجیب ہونا ہے۔ اب اس کے بعد یہ ہے جس چیز کی بھی تم احتیاج کرو زندگی کے دوراہے پہ کھڑے ہو کر' جو کچھ بھی تم پوچھنا چاہو' یہ پوچھنا چاہو گے نا کہ صحیح راستہ کونسا ہے' تو کہا کہ تم پوچھو اور تم دیکھو کہ کس طرح میری کتاب تمہیں اس کا جواب نہیں دیتی۔ یہ ہیں معنی عزیزانِ من! نہ کہ وہ جو ذہنوں میں ہمارے ہاں یہ ہے کہ خدا سے دعا کرو اور خدا ہر دعا کو قبول کرتا ہے۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ صاحب ہم تو گڑگڑا کر' روتے ہوئے' چیختے ہوئے اپنی اس قدر مصیبت کے اندر اس کو پکار پکار کے تھک گئے' نہ اس نے جواب دیا' نہ مصیبت ہی رفع ہوئی تو پھر یہ کیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ میں ہر پکارنے والی کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اس کا کوئی جواب نہیں ان کے پاس بن پڑتا' بس یہ کہہ کے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ میاں سمجھ لو کہ ٹھیک ہے اس کی مصلحت کا تقاضا کچھ ایسا ہی تھا۔ اگر مصلحت کے تقاضے کے مطابق اس نے کرنا ہے تو ہمارے پکارنے کا فائدہ کیا ہے' وہ اپنی مصلحت کے مطابق کرتا رہے۔ ہمیں جو کہا ہے کہ جب میرے بندے تجھ سے پوچھیں تو کہو میں قریب ہوں ہر پکارنے والی کی پکار کا جواب دیتا ہوں' جو ہمیں بتائے گی کیسے جواب ملتا ہے۔ تو جواب یوں ملتا ہے عزیزانِ من!۔ اس کی کتاب کو جب آپ کلام اس کا سمجھ لیتے ہیں اس کی باتیں اس میں ہیں' جب ایک عبدِ مؤمن اس قرآن کو پڑھتا ہے' وہ خدا اس سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔

ذاتِ خداوندی تو اپنے بندوں کے درمیان کسی مقرب کی شمولیت برداشت ہی نہیں کرتی

اب یہ جو آ جاتے ہیں مدعی مخاطبہ اور مکالمۂ خداوندی کے کہ خدا ان سے تو باتیں کرتا ہے الگ الگ اور باقی بندوں سے نہیں باتیں کرتا۔ اُس نے تو کہا تھا کہ ان سے میرے بندوں سے' جب وہ میرے متعلق پوچھے وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ (2:186) یہ سارے بندے جو ہیں میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں بہت قریب ہوں اور ان کی ہر پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اب ان کی پکار کا تو جواب نہیں ملتا اور درمیان میں یہ مدعی آ جاتے ہیں صاحب' ہم خدا کے مقرب ہیں۔ اس نے کہا تھا میں ہر بندے کے قریب ہوں' یہ کہتے ہیں نہیں! ہم مقرب ہیں تم بہت دور ہو۔ اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ میں ہر پکارنے والی کی پکار کا جواب دیتا ہوں' یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب' وہ ہم سے ہی صرف باتیں کرتا ہے' تم سے نہیں باتیں کرتا۔ تم نے اگر اس سے پوچھنا ہو' بات کرنی ہو تو ہم سے کہیے' ہم اس سے

بات کر کے پھر تمہیں جواب دیں گے۔ یہ جو تصور ہے نا خدا اور بندے کے درمیان ایک Intervener کا ہونا' درمیان میں ایک حاجب کا ہونا ایک دربان کا ہونا اسی کو پیشوائیت کہتے ہیں یہی Priest-hood ہوتی ہے۔ یہ عام انسانوں اور خدا کے درمیان ایک حاجب پھر سفارشی بن کے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہر انسان کی بات خدا نہیں سنتا' ان کے معرفت سنتا ہے ہر ایک کی بات کا جواب نہیں دیتا' انہیں جواب دیتا ہے۔ یہ جا کے Convey کرتے ہیں۔ یہ ہے خدا سے انسانوں کو دور رکھنے میں' درمیان میں' جو حائل ہوجاتے ہیں یہ ہے جسے Priest-hood کہتے ہیں۔

کوئی انسان' انسان اور خدا کے درمیان حائل نہیں ہوتا اور خدا جو ہے وہ اپنے کلام کے ذریعے سے انسانوں کے قریب ہوتا ہے۔ جو کوئی زندگی کے متعلق پوچھنا ہے' پوچھ کے دیکھئے اور یہ کتاب جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ (6:115) مکمل ہوگئی یہ ہر بات اس کے اندر آ گئی' غیر متبدل ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ آپ زندگی کے کسی مسئلہ کے متعلق پوچھ کے دیکھئے' یہ قرآن جواب دیتا ہے آپ کو' بولتا ہے باتیں کرتا ہے عزیزانِ من! گونگا نہیں ہوگیا۔ کہا کہ اِنَّ رَبِّیۡ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ (11:61) میں قریب بھی ہوں' جواب بھی دیتا ہوں۔ جو کچھ حضرتِ صالحؑ نے کہا' کہا یہ تھا کہ یہ جو تمہارے ہاں مروج نظام اور روش ہے' جس پہ تم چلے آ رہے ہو اسے چھوڑ دو' یہ تباہی کی طرف تمہیں لے جائے گی۔

مقام نبوت سے سرفراز ہونے والی شخصیت بلند ترین صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے

بڑی عجیب بات آگے آتی ہے۔ قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ ھٰذَاۤ (11:62) کہا کہ صالحؑ! ہم تو تم سے بڑی بڑی امیدیں باندھے بیٹھے تھے۔ تو نظر آتا ہے کہ یہ نبی جس کو بنایا جاتا تھا وہ قبیلے یا قوم کا بڑا امتاز فرد ہوتا تھا۔ نبوت سے پہلے ہی اس کے متعلق کتنا عجیب یہ لفظ ہے کہ ہماری تو بڑی امیدیں تمہارے ساتھ وابستہ تھیں تو کسی اونچے آدمی کے ساتھ ہی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں نا' بلند صلاحیتوں کا انسان' ان میں سے ابھرتا ہوا انسان جس کے ساتھ امیدیں وابستہ ہوں۔ ہونے والے نبی کی زندگی قبلِ نبوت بھی عزیزانِ من! ایسی پاکیزہ ہوتی ہے' ایسی بلند ہوتی ہے۔ وہ ذہنی اعتبار سے بھی بڑا اونچا ہوتا ہے' سیرت کے اعتبار سے بھی بڑا بلند ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے تمام قبائل نے امین کہہ دیا تھا نا' ہر شخص اپنی امانتیں حضور ﷺ کے پاس رکھ کے جاتا تھا' بینک تو اس زمانے میں ہوتے نہیں تھے۔ الامین جب کہا جاتا تھا اس سے مراد ہی آپ ﷺ ہوتے تھے' ابھی رسول اللہ ﷺ تو تھے نہیں آپ۔

نبی کی سیرت' اس کا کردار بذاتِ خود ایک معجزہ ہوتا ہے

اور یہی چیز ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے جب دعویٰ کیا نبوت کا۔ اُنہوں نے کہا نہیں! تم غلط کہتے' ہو جھوٹ کہتے ہو۔ اس کے

جواب میں آپ ﷺ نے جو پیش کی ہے آپ کو پتہ ہے کیا پیش کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اپنے اس دعویٰ رسالت کی تائید وتصدیق میں کوئی معجزہ دکھاؤ' آپ ﷺ نے کہا کہ میں بتاتا ہوں تمہیں اپنا معجزہ ایسا معجزہ جس سے تم انکار ہی نہ کرسکو۔ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10:16) میں نے دعویٰ نبوت سے پہلے ساری عمر تمہارے اندر گذاری ہے تم کہو چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کہ اس قسم کی عمر سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی عمر ہوتی ہے۔ دعویٰ نبوت سے پہلے کی عمر کو شہادت میں پیش کرتے ہیں اپنی صداقت اور سچائی کے اور ایک فرد سارے عرب میں ایسا نہیں کہ جو یہ کہے کہ نہیں! تم میں یہ ہم نے یہ عیب اور خرابی دیکھی۔ یہ ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ صبح نور کی طرح روشن اور سپیدہ سحر کی طرح بے داغ تھا

عزیزانِ من! جو دعویٰ کرتا ہے دوسروں کی زندگیوں کو پاکیزہ کرنے کا' پہلے اس کی اپنی زندگی اتنی پاکیزہ ہوتی ہے۔ دشمنوں کے نرغے میں کھڑا ہوا دھڑلے سے کہتا ہے' مجھ سے معجزہ مانگتے ہو آؤ میں تمہیں معجزہ دکھاؤں اور معجزہ وہ نہیں کہ جو وقتی معجزہ نہیں' معجزہ وہ ہے قیامت تک کے لیے معجزہ ہو۔ چودہ سو سال سے بڑے بڑے دشمن اسلام کے اور حضور ﷺ کے بڑے بڑے حریف' سب کچھ کر کے دیکھ لیا انہوں نے کہ حضور ﷺ کی زندگی کے اندر کہیں سے کوئی کسی قسم کا داغ کسی کو نظر آئے' کہیں نظر آیا سپیدۂ سحر کی طرح نمود ہے اس زندگی کی۔ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ (10:16)۔ دعویٰ کرنے کے بعد تو یہ جھوٹے جو ہوتے ہیں وہ بھی پھر اس قسم کی احتیاط برتتے ہیں کہ صاحب کچھ ایسی بات نہ ہونے پائے یہ کہیں کہ اس قسم کا ہے' دعوے سے پہلے خود نبی کو بھی ایک دن پہلے علم نہیں ہوتا کہ میں نبی ہونے والا ہوں۔ قرآن کہتا ہے تم اس سے پہلے جانتے ہی نہیں تھے ایمان کیا ہوتا ہے کتاب کس کو کہتے ہیں (42:52)۔ تو وہ یہ نہیں تھا کہ وہ بننے والا نبی اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا' اس لیے وہ بہت محتاط واقع ہوا تھا کہ نہ صاحب میں نے تو یہ کل کو کہنا ہے اس لیے مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے' اندر جو جی میں آئے کرے' باہر نہ یہ کچھ کہنا چاہیے۔ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ (10:16) میں نے اس دعوے سے پہلے جب کہ اس دعوے کا تصور تک بھی میرے ذہن میں نہیں تھا' تمہیں بھی پتہ ہے' تمہارے اندر میں نے اپنی زندگی بسر کی ہے' کہو یہ میری زندگی میری صداقت کی دلیل ہے یا نہیں۔ ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں جا کے بھی اس کی شہادت دی۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان کا بیان

حضور ﷺ کے خلاف مدد مانگنے کے لیے ہرقل سے' بھڑکانے گیا تھا اس کو یہ کہہ کے کہ ہم تو ایک طرف رہے وہ تو عیسائیت کے بھی خلاف ہے وہ تو حضرتِ عیسیٰؑ کو بھی وہ نہیں مانتا جو تم مانتے ہو تو اس لیے مشترکہ دشمن ہے تمہارا اور ہمارا۔ یہ کہنے کے لیے وہ گیا ہے وہاں اور وہ اس سے پوچھتا یہ ہے کہ میں تو اسے جانتا نہیں ہوں تم بتا رہے ہو کہ تمہارے اندر سے اس نے یہ دعویٰ کر دیا ہے' وہ کہاں کا رہنے والا تھا

کہیں باہر سے آیا تھا تمہارے ہاں' اُنہوں نے کہا نہیں! ہمارا اپنا ہی ہے بھائی بھتیجا' اپنی قوم سے' اپنے قبیلے سے۔ تو اس نے پوچھا یہ کہ تمہارے اندر وہ رہا ہے اس سے پہلے' اس کی زندگی کے متعلق تم کیا کہتے ہو۔ سوچئے عزیزانِ من! اور پھر عربوں کا کریکٹر بھی اس سے نظر آتا ہے۔ ان کے خلاف مدد لینے گیا ہے اس سے' وہ Direct Question کرتا ہے اور یہ ہے معجزہ کہ ہرقل کے دربار میں ابوسفیان کہتا ہے کہ اس کی زندگی میں تو ہم نے کوئی خرابی آج تک نہیں دیکھی۔ تو اس نے یہ کہا کہ یہ نفسیاتی طور پہ ناممکن ہے کہ ایک شخص چالیس سال ایسی سچائی میں گذارے اور ایک ہی رات کے بعد اتنا بڑا جھوٹا ہو جائے' نہیں ہوسکتا وہ جھوٹا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ اگر غائبانہ ایمان کوئی ہوتا ہے تو میں اس کی صداقت پر ایمان لاتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ سامنے آئے تو میں ویسے ہی ایمان لے آؤں' تم چلے جاؤ!! ایسے شخص کے خلاف میں نہیں مدد دے سکتا تمہیں۔ یہ ہوتی ہے پاکیزہ زندگی۔ ہر نبی کے متعلق یہ کہا قَالُوۡا یٰصٰلِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ هٰذَاۤ (11:62) صالح تمہارے ساتھ تو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں ہماری۔ امیدیں یہی تھیں نا کہ تم ہمارے اس مذہب کو بڑا کامیاب بناؤ گے' دور دور تک پھیلاؤ گے' ہمارے معبودوں کا بول بالا کرو گے' وہ جس قسم کی روش میں چلے آئے تھے۔ تو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے اَتَنۡهٰىنَاۤ اَنۡ نَّعۡبُدَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا (11:62) ارے تمہارے آباؤ اجداد' ہمارے آباؤ اجداد ان کی پرستش کرتے چلے آرہے تھے جس روش پہ چلے آرہے تھے' تم نے اسی کی مخالفت شروع کردی۔ ارے تم سے تو بڑی امیدیں وابستہ تھیں ہماری۔ دونوں پہلو سامنے آگئے' پہلی زندگی نبی کی کہ بڑی امیدیں وابستہ تھیں اگلی زندگی کہ اسلاف اور آباء کی جو روش چلی آتی ہے اس کے خلاف سب سے پہلا احتجاج اٹھ کے یہ کرتا ہے۔ حالانکہ جو اس سے پہلے اتنا امیدوں کا مرکز تھا اگر وہ اسلاف کے مسلک کے اوپر ہی چلتا رہتا تقلیداً تو وہ تو صاحبزادہ صاحب تو بچپن میں بن گیا تھا وہ۔ اور اس کے بعد تو پھر پیر جی کے بعد سب سے پہلے پیر کی مسند پہ بیٹھا ہوا ہوتا یہ شخص' تقلید میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ لیکن نہیں! جسے خدا کی طرف سے صداقت ملتی ہے اور بینات ملتی ہے اس کی روش یہ نہیں ہوتی۔

قوم کے دل میں پیدا ہونے والی اضطرابی کیفیت

اَنۡ نَّعۡبُدَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡهِ مُرِیۡبٍ (11:62) جو کچھ تم کہتے ہو ہمیں اس کے سچے ہونے میں بڑا ہی شک ہے اور شک ایسا ہے جس سے ہمارے دل میں بڑا اضطراب پیدا ہو گیا۔ اضطراب پیدا ہو گیا!! اس لیے کہ یہ اتنی بڑی صلاحیتوں کا انسان جو مخالفت کرے ان کی اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم میں اتنی قابلیت ہے نہیں کہ جو اس کا جواب دے سکیں' اس لیے شک بھی ہوا اور اضطراب بھی پیدا ہوا کہ صاحب یہ بات بڑی مشکل کی آپڑی ہے۔ اس سے پہلے سورۃ اعراف میں بھی یہ واقعہ آچکا ہے وہاں اس قوم کے متعلق بھی یہ کہا گیا ہے کہ بڑی خوشحال قوم تھی۔ بَوَّاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُهُوۡلِهَا قُصُوۡرًا وَّ تَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ

بُیُوۡتًا (7:74) کھلے میدانوں کے اندر محلات بناتے تھے پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کے اس میں قلعے بناتے تھے' یہ کیفیت تھی اس قوم کی۔ یہ قومیں ایسے ہی نہیں تھا جو ہمارے ذہن میں ہے کہ یونہی وحشی سی قومیں تھیں' جنگلی سی قومیں تھیں' اس دور کی بڑی مہذب قومیں تھیں۔ اور اب تو جوں جوں یہ آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ والے تحقیقات کرتے چلے جاتے ہیں کھدائیاں کر رہے ہیں' پرانی پرانی تہذیبوں کی دبی ہوئی بستیوں کو نکال رہے ہیں وہ بتا رہے ہیں کہ پہلے دور کے یہ انسان تہذیب میں بہت آگے چلے گئے ہوئے تھے۔ یہی ہیں وہ قومیں جن کا ذکر قرآن کرتا ہے' کوئی وحشی اور جنگلی قومیں نہیں ہیں' یہ کیفیت تھی۔ فَاذۡکُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰہِ (7:74) یہ خدا کی دی ہوئی نعمتیں اور قوتیں ان کو اپنے سامنے لاؤ۔ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ (7:74) ملک میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ فساد جسے کہتے ہیں وہ ناہمواری کو کہتے ہیں۔ فساد نہ برپا کرو ملک کے اندر۔ یہ تو Established Govrenment تھی حکومت تھی' فساد تو عوام برپا کیا کرتے تھے' حکومت کیا فساد برپا کرے گی۔

طبقاتی معاشرے کی تباہی ہمیشہ عوام پر اثر انداز ہوتی ہے

جس نظام کے اندر یہ چیز ہو کہ اس میں طبقات پیدا ہو رہے ہوں' اونچ اور نیچ پیدا ہو رہی ہو' وہ نظام فساد کا موجب ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن ہمیشہ یہ جو اربابِ اقتدار ہوتے ہیں' جن کے ہاتھ میں نظم ونسق ہوتا ہے' انہیں کہتا ہے کہ تم مفسد ہو' فساد تم برپا کرتے ہو۔ وہ تو تمہارے برپا کیے ہوئے فساد کا نتیجہ ہوتا ہے جو عوام کے سامنے نظر آجاتا ہے' فساد مت برپا کرو۔ اب یہاں لفظِ فساد آیا یہ دیکھنے کی بات ہے کہ وہ فساد کیا تھا۔ پہلی بات تو یہاں قرآن نے یہ بتادی اور جیسا کہ ہر رسول کے متعلق ہے رسول کی دعوت پر سب سے پہلے قوم کا کمزور اور مفلس طبقہ لبیک کہتا ہے۔ دیکھئے اسی میں ایک بڑی چیز آجاتی ہے کہ یہ داعیانِ انقلاب آتے اس لیے تھے کہ انسانوں کے غلط نظام میں انسانوں کو جو کچل کر رکھ دیا جاتا تھا اور وہ اس قسم کے طبقات بنا لیتے تھے کہ ان کو ہمیشہ نیچے رکھتے تھے اور کچلتے رہتے تھے' یہ ان ضعیفوں کو ابھارنے کے لیے آتا تھا یہ انقلاب۔ کہا یہ کہ قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ اَتَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ (7:75) حضرت صالحؑ سے بات کرتے تھے تو ان کے اعتراض کا تو جواب نہیں بن پڑتا تھا اب اس کے بعد وہی Technique جو ہر دور کا مستبد نظام کرتا ہے۔

مستبد نظام کی پیدا کردہ وسوسہ اندازیوں کے اثرات

تو یہ جو ان کے ساتھ جانے والی جماعت تھی' اس جماعت کے اندر کسی طرح سے وسوسے پیدا کرے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ادھر سے تو الگ ہو گئے۔ وہی الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ (7:75) یاد ہوگا آپ کو میں نے بتایا تھا ہر رسول کی مخالفت اس طبقے کی طرف سے ہوتی تھی وہ جن کے

برتن بھرے ہوئے ہوتے ''جناں دیاں کوٹھیاں اچ دانے ہوندے سن''۔ انہوں نے کیا کیا؟ حضرتِ صالحؑ کو تو چھوڑ دیا وہ جوان کی جماعت کے لوگ تھے نا ان کے اندر چلے گئے اب جا کے نہایت ناصح مشفق بن کے ان سے پوچھتے یہ ہیں کہ یار! ایمانداری سے بتاؤ کہ تم واقعی سچ مچ اسے سچا سمجھتے ہو جو اس کے ساتھ ہو رہے ہو یا کوئی اور اس میں بات ہے۔ آپ دیکھتے ہیں یہ وسوسہ اندازیاں کس قسم کی ہیں' ٹوہ لگا رہے ہیں' وسوسے پیدا کر رہے ہیں ان کے دلوں کے اندر' واقعی تم اس کو سچے دل سے سچا مانتے ہو تم جو اس کی طرف آ لیے۔ وہ سچا ماننے والے جو تھے وہ کون سی ایسی سازش تھی جو یہ نبی کرتا ہے' یہ تو کسی قسم کی چار سو بیسی نہیں کیا کرتا' ان کا کریکٹر اتنا اونچا ہے انہوں نے یہ کرنا کیوں ہے۔ سیدھی سیدھی کھلی کھلی بات ہوتی ہے اس لیے اس طرح در پردہ سازشیں کرنے سے بھی کچھ نہیں ہاتھ آتا تھا ان کے' وہ ان کو بتاتے تھے کہ ہاں بھئی ہم تو سچا ہی سمجھتے تھے' اب وہاں سے مایوس ہو جاتے تھے۔ بات کیا تھی جسے فساد کہا گیا ہے؟

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں تیسرا جرم زمین پر ذاتی ملکیت کے نظام کی حقیقت

اب آ گیا وہ تیسرا جرم یا وہ تیسری قوم جس کے جرم کبیرہ کے متعلق کہا کہ اس سے وہ قوم تباہ ہوگی' اور اس سے ہر وہ قوم تباہ ہوگی جس کے ہاں یہ نظام ہوگا۔ دیکھئے عزیزانِ من! وہ غلط نظام کیا تھا جسے فساد کہا گیا اور جس کا نتیجہ تباہی بتایا گیا۔ کہا یہ کہ ان لوگوں کی معیشت کا مدار گلہ بانی پہ تھا۔ یہ بھیڑیں پالنا' مویشی پالنا۔ اس دور میں ابھی انڈسٹری تو ہوتی نہیں تھی۔ زراعت میں بھی اتنی ترقی نہیں ہوئی ہوئی تھی' مویشی پالنا بہت بڑا معیشت کا مدار ہوتا تھا۔ مویشی پالنے کے لیے چراہ گاہوں کی ضرورت ہوتی ہے اس میں چشمے ہوتے ہیں' ان چشموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ جوان کے بڑے بڑے لوگ تھے وہ سردارانِ قوم جنہیں کہا جاتا ہے' انہوں نے تمام چراہ گاہوں اور ان کے اندر بہنے والے چشموں کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے رکھا تھا ان کے جانور وہاں چرتے تھے' وہی وہاں پانی پیتے تھے۔ غریبوں کے جانور ان کے ہاں کبھی کہیں بچا کھچا پانی کہیں آگے بہتا ہوا چلا جائے تو وہاں سے پی لیتے تھے۔ کہیں دور جا کے جنگلوں میں کہیں گھاس نظر پڑی تو وہاں اپنی بھیڑوں کو چرا لاتے تھے۔ یہ مالک بنے ہوئے تھے' کس چیز کے؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی زمین کے انسان مالک۔ سورۃ بقرہ میں یہ کہا ہے نا کہ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (2:22) خدا کی زمین پر اپنی ملکیت جتا کے تم خدا جیسے اپنے آپ کو خدا بنا لیتے ہو' یہ خدا بننا ہے۔ آپ غور کیجیے کس زمانے میں یہ بات ہو رہی ہے کم از کم چار ہزار سال پہلے کی بات ہو رہی ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ جو زمین پہ لکیریں مار کے یہ میری اور تیری کا قصہ تھا تو بڑا پرانا چلا آ رہا تھا۔ وہ تو چار ہزار سال پہلے کی بات تھی۔ آج بھی جب آپ یہ بات ان سے کہتے ہیں کہ صاحب ذرا معقول طریقے پہ بات تو کیجیے کہ یہ زمین جو انسانوں کی پیدائش سے بھی پہلے وجود میں آ چکی تھی اسی طرح سے بنی ہوئی تھی' انسان اس کے بعد یہ آئے۔ یہ ہوا پانی روشنی حرارت' جن چیزوں پر زندگی کا مدار تھا' وہ ساری

چیزیں انسانوں کو پیدا کرنے سے پہلے اس نے مہیا کر دی تھیں کیونکہ وہ رازق اور وہ رب ہے۔ اور یہ ساری چیزیں تمام انسانوں کے لیے تھیں جن کو یہاں پیدا کیا' انسانوں کے لیے بھی نہیں بلکہ سارے دآ بہ کے لیے وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزۡقُهَا (11:6) کوئی ذی حیات ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کا بندوبست خدا نے نہیں کر دیا ہوا۔ یہ تمام انسانوں اور تمام ذی حیات کے رزق کا ذریعہ تھا زمین' جس میں سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں یہ آ کیسے سکتی ہے۔ زمین جو کسی کے پاس ہے آج میرے پاس ہے یہی ہوگا کہ میں نے اس سے خریدی میری ملکیت ہوگئی' چوری کا مال اگر کسی سے خریدا جائے تو وہ ملکیت ہو جاتی ہے؟ وہ تو دونوں اندر ہو جاتے ہیں' غصب کا مال ڈاکو سے اگر کوئی شخص جا کے خریدے' اس کا تصرف جائز ہو جاتا ہے اس پہ؟ یہ جس نے بیچی ہے پوچھئے کہ اس کے اوپر اس کی ملکیت کیسی تھی؟ اس نے کہا کہ صاحب میں نے تو اپنے باپ سے وراثت میں لی تھی' یہ کہا کہ ٹھیک ہے چوری کا یا ڈاکے کا مال اگر وراثت میں آ جائے بیٹے کے پاس تو اس سے باز پرس نہیں ہوتی؟ کہ میں نے وراثت میں لیا ہے؟۔ آپ کے والدِ ماجد نے یہ زمین کیسے لی تھی صاحب؟ اس کو چلیے ذرا پیچھے کی طرف آپ دیکھیں گے کہ آخر میں سب سے پہلا مالک جو ہے وہ دھاندلی سے مالک بنا ہوتا ہے۔ اس نے نہ کسی سے خریدی ہوتی ہے' نہ ورثہ میں لی ہوئی ہوتی ہے' زمین خدا کی خدا کے ہاں سے تو اس نے پٹہ لگایا نہیں۔ بڑی صاف سی بات ذہن میں آ جاتی ہے کہ جو چیزیں تمام مخلوق کی پرورش کے لیے خدا نے مفت دی ہیں' ان کے اوپر کسی کا ذاتی قبضہ یا اسے کہنا میری ذاتی ملکیت ہے یہ کسی منطق کی رو سے جائز ہی نہیں ہو سکتا۔ تو تیسری قوم یہ آئی ہمارے سامنے' کہا کہ ان کی کیفیت یہ تھی چراہ گاہیں' وہ چشمے وہ ذاتی ملکیت میں لیے ہوئے تھے۔ غریبوں کے مویشیوں کو اس میں نہ پانی پینے دیتے تھے' نہ چرنے دیتے تھے۔ یہ تھا فساد فی الارض جسے قرآن نے کہا ہے۔ قرآن نے یہاں زیادہ تفصیل تو نہیں دی اور آگے چلیں گے آئیں گی تفاصیل۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ صالحؑ اچھی قوت کے انسان تھے' قبیلہ بڑا ہوگا یہی چیز اس زمانے میں قوت کی باتیں ہوتی تھیں۔ جماعت بھی اچھی خاصی بڑی ہوگی کیونکہ ان سرداروں کو بہر حال ان کے ساتھ مفاہمت کرنی پڑی Agreement کیا گیا' Agreement کیا تھا؟

حضرت صالح کا اس وقت کے سرداروں کے ساتھ کیے گئے ایک معاہدہ کی روئداد اور اس کا انجام

اب یہاں وہ بات آتی ہے دو لفظ ہیں عزیزانِ من! یہ سارا مسئلہ زمین پر ذاتی ملکیت کا دو لفظوں میں طے ہو جاتا ہے۔ Agreement میں لکھا کیا گیا؟ سوال تو یہ تھا نا کہ وہ کہتے یہ ہماری ملکیت کی زمین ہے یا تو یہ ہوتا کہ اس میں سے یہ کہتے کہ نہیں آدھی ہماری ملکیت میں آئے تو وہ تو پھر ملکیت کا ہی قصہ ہو گیا۔ جب تمہاری ملکیت ناجائز ہے تو ہماری ملکیت کیسے جائز ہو جائے گی۔

آپ دیکھتے ہیں نبی کا معاہدہ کیا ہورہا ہے' کیا الفاظ لکھے جارہے ہیں اس معاہدے میں۔ معاہدہ یہ ہورہا ہے کہ دیکھئے مویشیوں کے لیے چراگاہیں ہیں نا' ایک اونٹ یا اونٹنی تمہارے سامنے آتی ہے تم یہ کہتے ہو کہ یہ سردار فتح خاں کا اونٹ ہے' ٹھیک ہے جی یہ چلے گا' پھرے گا کھائے گا' اسی اونٹ کا بھائی نتھو کمہار کا' تم کہتے ہو کہ یہ نہیں آسکتا۔

خدا کے نام پر ایک آزاد اونٹنی کا قصہ

انہوں نے کہا کہ میاں یہ جو دو اونٹ ہیں یہ ان میں کیا فرق ہے جی' یعنی تم نے خود اس کی نسبت کردی' ایک کی خاں صاحب کی طرف' ایک کی بیچارے کمہار کی طرف اور شامت آگئی ان اونٹوں کی۔ کہا کہ یہ جو ذی حیات ہیں اس زمین کے اوپر' یہ نہ نتھو خاں کے ہوتے ہیں' نہ شریف کمہار کے ہوتے ہیں۔ معاہدے میں لکھا گیا ھٰذِہٖ نَاقَةُ اللّٰهِ (11:64) یہ خدا کا جانور ہے' خدا کی اونٹنی ہے۔ آپ نے دیکھا نسبتوں کے کاٹ دینے سے کہاں لے گئے اس کو' اب اس کی ذاتی پوزیشن جو ہے وہی رہ گئی۔ نسبت کی پوزیشن بالکل ختم ہوگئی۔ نہ کسی سردار کی اونٹنی نہ کسی کمی کی اونٹنی' کہا نَاقَةُ اللّٰهِ (11:64) خدا نے پیدا کیا تھا اس کو۔ کہا جی ٹھیک ہے نَاقَةُ اللّٰهِ کہا فَذَرُوْهَا (11:64) کھول دو اس کے بند اس کی رسیاں' چھوڑ دو اس کو' کاہے کے لیے؟ (تاکل فی ارض اللہ) (11:64) یہ خدا کی اونٹنی وہ خدا کی زمین ''تسی چاہے لگدے او درمیان اچ'' اللہ اکبر۔ دو دو لفظ ہیں عزیزانِ من! ناقۃ اللہ اور ارض اللہ' یہ زمین خدا کی' یہ خدا کی مخلوق' خدا کی مخلوق کو خدا کی زمین میں چرنے دو' تمہارا کیا لیتی ہے۔

خدا کا نظام ربوبیت خدا کی زمین خدا کی مخلوق کے لیے کھلی رکھو

کتنی اونچی بات ہے عزیزانِ من! جو قرآن کرجاتا ہے' کیا تھے یہ داعیانِ انقلاب جو آتے تھے!!! کہتا ہے آج بھی اگر یہ جتنا بھی آپ کے ہاں فساد مچتا ہے ملکیتوں کا' یہ سوال سامنے رکھ لیا جائے یہ خدا کے بندے یہ خدا کی زمین' خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے رہنے دو یہ ان میں سے تم کون ہوتے ہو کہ یہ زمین تمہارے قبضے میں تمہاری ملکیت میں آجائے' یہ تو خدا کی زمین ہے' یہ خدا کے بندے ہیں۔ یہاں انہوں نے ناقہ کے متعلق کہا تھا اُس دور کے اندر مویشیوں کے پالنے کی بات ہورہی تھی' نبی اکرم ﷺ کی جو حدیث مبارک ہے اس میں یہ ہے کہ عِبَادَ اللّٰهِ اور اَرْضِ اللّٰهِ حضور ﷺ نے کہا ہے خدا کی زمین اور یہ خدا کے بندے' خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے رہنے دو۔

دین خداوندی کے مقابلے میں وہ خودساختہ مذہب' جس نے قرآن حکیم کے تصورات کو ہی بدل دیا

یاد رکھئے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں یہ نظام آگیا تھا کہ جس میں زمین پہ ذاتی ملکیت نہیں باقی رہی تھی' ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک نبی

آئے اتنا بڑا انقلاب لے کے۔ تو پہلے نبی کے متعلق یہ قرآن میں موجود ہے کہ یہ بات تو چار ہزار سال پہلے سے شروع ہوگئی تھی' وہ تو جب نبی کا لایا ہوا دین' مذہب میں بدلتا ہے' یہ مذہبی سندیں ہیں جو آپ کو ذاتی ملکیت کی حد میں دی جاتی ہیں۔ یہ جو آج پیش کر رہے ہیں نا کہ زمین کی ملکیت اٹھانا تو ایک طرف' وہ تو کہتے ہیں نا کہ اس کی حد بندی کرنا ملکیت کی یہ بھی خلافِ شریعت ہے۔ دین کے خلاف نہیں کہہ سکتے' شریعت انسانوں کی بنائی ہوئی ہوتی ہے' دین تو یہ کہتا ہے ناقۃ اللہ' ارض اللہ۔ **وَ لَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ عَذَابٌ قَرِيۡبٌ** (11:64) یاد رکھو یہ عہد نامہ ہو گیا ہے' معاہدہ ہو گیا ہے' رسیاں کھول دی گئی ہیں ان جانوروں کی' اب اگر تم نے اپنی قوت کے نشے میں انہیں کوئی تکلیف پہنچائی تو وہ خدا جس کے یہ جانور ہیں' وہ تم سے پوچھ لے گا۔ کیا بات ہے!! ابھی تک تو یہ بات تھی نا کہ یہ بیچارے یہ جولاہے' کمہار چھوٹے چھوٹے زمیندار' کاشتکار یہ ان کے مویشی ہوتے تھے تو یہ تم سمجھتے تھے کہ یہ ان کے جانور آ گئے' مار مار ان کے ہنکا دیا۔ وہ غریب کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے تمہارا۔ ان سے حضرتِ صالحؑ کہہ رہے ہیں کہ میں نے تمہیں بتا دیا کہ جانور نہ فتح خاں صاحب کا ہوتا ہے' نہ تھو کمہار کا ہوتا ہے' یہ اللہ کی مخلوق ہے اور اگر اللہ کی مخلوق کو تم نے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی تو جس کی یہ مخلوق ہے وہ تم سے سمجھ لے گا۔ کہا اسے کہتے ہیں عذابِ خداوندی۔ یاد رکھو اس خدا کا عذاب گھیر لے گا۔

کرہ ارض پر عباد اللہ کی بجائے انسانوں کا عبد بننے کا نتیجہ

عزیزانِ من! وہ تو صرف وہ اونٹنیاں تھیں جن کو کہا گیا ہے خدا کی' کبھی انسانوں کو بھی عباد اللہ بنا دیا جائے نا اور پھر کوئی انہیں تکلیف دے تو پھر دیکھئے کہ وہ خدا کس طرح سے پکڑتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم خود بھی عباد اللہ تو نہیں بنتے ہم بھی تو کسی نہ کسی انسان کے عبد بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمیں تکلیف پہنچتی ہے تو کسی نہ کسی پارٹی کو جوائن کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ عبداللہ جو ہوتا ہے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہاں کا کوئی آقا اپنے نوکر کے متعلق جو کچھ کرتا ہے' کسی کے نوکر کو باہر کوئی گالی دے کے دیکھے کس طرح سے ہجوم کر کے وہ آ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! خدا کا عبد ہے اور اسے کوئی تکلیف پہنچائے اور خدا بیٹھا ہوا دیکھتا رہے اور کچھ نہ کہے وہ اس قابل ہی نہ جو ایسا کرے اور اس کو آقا کہا جا سکے' وہ بڑا اغیور واقع ہوا ہے۔

وہ بھی اگر اسے ناقۃ اللہ نہ کہتے ان انسانوں کے ہی معاہدے میں لکھا جاتا پھر بات انسانوں میں ہی رہتی۔ غور فرمایا آپ نے بات کہاں جا پہنچتی ہے۔ خدا کی حفاظت لینی ہے تو خدا کی حفاظت کے تلے تو آ ؤ پہلے۔ لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ پھر گئے اپنے وعدے سے اور یہ ہوتا ہی یہ ہے' سمجھ لیا ہوگا کہ کون پوچھنے والا ہے۔ **فَعَقَرُوۡهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِىۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ** (11:65) وہ وعدے سے پھر گئے انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔

حضرت صالحؑ کے ساتھ اونٹنی کے سلسلہ میں کیے گئے وعدے سے پھر جانے کا فطری نتیجہ اور عذاب کی نوعیت

حضرت صالحؑ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، دو تین دن تک اور مہلت کا وقفہ ہے اور اس کے بعد تم دیکھو کہ عذاب کیا آتا ہے۔ میں یہ چیزیں اس سے پیشتر بڑی شرح وبسط سے بیان کر چکا ہوں کہ یہ جسے ہم کہتے ہیں عذاب آتا ہے وہ کیا چیز ہوتی ہے اس کا ان اعمال سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تو جو غلط نظام ہوتے ہیں انسانوں کے، ان کے پیدا کردہ فطری نتائج ہوتے ہیں، جن کو ہم عذاب اور تباہی کہتے ہیں، آسمان سے پتھر نہیں برسا کرتے، یوں سیلاب ایسے نہیں آجایا کرتے بستیاں۔ خدا کا عذاب یہ اس وقت بنتا ہے جب انسانوں کے غلط نظام کے نتائج کی شکل میں یہ چیزیں آتی ہیں۔ بہرحال یہ چیز بڑی تفصیل سے آچکی ہوئی ہے آپ کے سامنے۔ یہاں تو اتنا ہی کہا ہے فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَ مِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ ؕ (11:66) جب وہ مہلت کا وقفہ گذر گیا وہ غلط نظام اس کے آنے والے غلط نتائج تباہ کن نتائج وعواقب اس درجے پہ پہنچ گئے کہ جہاں سے پھر واپس نہیں جاسکتے وہ آخری لمحہ جو مہلت کا ہوتا ہے، وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ تو اس کے بعد پھر خدا نے صالح اور ان کے ساتھ جو ان کی جماعت تھی ان کو محفوظ رکھا اس عذاب سے۔ اس عذاب میں ایک چیز یہ بھی آئی ہے خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ رسوائی اس دن کی۔ اب یہ دیکھئے کہ یہ قرآن نے عذابِ خداوندی کو رسوا کن عذاب کہا ہے اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (2:85) وہ جو آیت سورۃ بقرہ کی میں نے کہی تھی کہ کیا تم چاہتے ہو کہ اس نظام کے کسی ایک حصے کے اوپر تو عمل کرو اور دوسرے سے انکار کر دو جو کوئی بھی تم میں سے یہ کرے گا، ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ (2:85) اس دنیا کی زندگی میں ذلت اور خواری بھی ہوگی۔ تو خدا کا عذاب جو ہے جسے تباہی کہتے ہیں، بربادی کہتے ہیں ایک تو ٹھیک ہے، یہ طبعی طور پہ جسے استخلاف قومی اس نے کہا ہے، ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آجاتی ہے اس کے ساتھ خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (2:85) بھی ہے ذلت اور مسکنت جسے قرآن نے کہا ہے، ذلیل ہو جاتی ہے وہ قوم۔ سب سے بڑا عذاب خدا کا یہ ہے کوئی قوم ذلیل ہو اور اس سے بھی بڑا عذاب یہ کہ اپنی نگاہوں میں خود اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرنے لگ جائے۔ خدا نے انہیں اس ذلت سے بچالیا اس رسوائی سے بچالیا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ (11:66) بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے خدا کا مکافاتِ عمل کا قانون جو ہے۔ ابھی میں عرض کرونگا کن الفاظ میں بات کہی ہے قرآن نے۔ وَ اَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ (11:67) ان لوگوں کے اوپر وہ تباہی آئی بے حس وحرکت ان گھروں کے اندر پڑے رہ گئے۔ كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا (11:68) اور اس طرح سے وہ بستیاں اجڑیں گویا ان میں کبھی

کوئی رہا ہی نہیں تھا۔ اَلَآ (11:68) وہی پچھلی قومِ عاد کے سلسلے میں بھی آپ کو معلوم ہے نا آخر میں یہ کہا گیا تھا یہ ہم لوگوں کے متعلق کہا ہے جو بعد میں مخاطب ہیں' سننے والے ہیں کہ قصہ تم نے سن لیا اَلَآ خبردار ہو جاؤ تم' سن لیا انجام تم نے اس قوم کا۔ اَلَآ اِنَّ ثَمُوۡدَا كَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ ؕ (11:68) دیکھا تم نے ثمود نے خدا کے قوانین سے سرکشی برتی اَلَا (11:68) سن رکھو بُعۡدًا لِّثَمُوۡدَ (11:68) دنیا کی تمام خوشگواریوں سے محروم ہو گئی وہ قوم۔ اَلَا سن رکھو کان کھول کے سن لو ہم یہ کہانیاں راتوں کو سلانے کے لیے نہیں بیان کیا کرتے' سوتوں کو جگانے کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔ یہ اَ لَا دیکھتے ہیں ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کھٹکھٹا دینے والا اَ لَا ہے۔

اونٹنی کو مار دینے کی اصل وجہ طبقاتی تقسیم تھی

دوسرے مقام پہ اس عذاب کے متعلق ایک لفظ کہا ہے بات وہی ہے فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقۡيٰهَا (91:13) ان کے رسول نے ان سے کہا یہ خدا کی اونٹنی ہے' باریاں باندھ لو' اپنی باریوں پہ جا کے سب اونٹنیاں پانی بھی پئیں اور چریں۔ فَكَذَّبُوۡهُ فَعَقَرُوۡهَا (91:14) انہوں نے اس اپنے عہد نامے کی تکذیب کی اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ بات شروع کی تھی کہ انہوں نے فساد مچا رکھا تھا ناہمواریاں پیدا کر رکھی تھیں طبقات بنا رکھے تھے' پہلے انسانوں کے طبقات بنائے۔ حالانکہ انسانوں کے متعلق تو قرآن نے کہا ہے کہ وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ (17:70) تمام انسان یکساں طور پہ واجب التکریم ہیں۔ اب ان میں سے اس قسم کے طبقات بنانے کے یہ شرفا کی جماعت ہے' یہ صاحبِ عزت ہیں معاشرے میں' یہ ذلیل اور کمینے لوگ ہیں۔ سب سے بڑی ناہمواری تو یہی ہے۔

انسانوں کی تمدنی زندگی میں تقسیم کار مقصد باہمی تعاون کہلاتا ہے وہاں طبقاتی تقسیم نہیں ہوتی

یہ عزیزانِ من! معاشرے میں جو مختلف کام مختلف لوگ کرتے ہیں یہ ناہمواری نہیں ہوتی۔ یہ تو تقسیمِ عمل ہے معاشرے کا' تقسیمِ کار ہے مختلف قسم کے کام مختلف لوگ کرتے ہیں' اسے تعاون کہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ تقسیمِ کار ہی وجہ' عزت اور ذلت بن جائے کہ جو کدال ہاتھ میں لے کے زمین کو کھود رہا ہے اسے اس Overseer کے مقابلے میں ذلیل سمجھا جائے کہ جو وہ کھڑا Instruction دے رہا ہے یہ ہے طبقاتی تقسیم۔ یا ان کے معاشی نظام کے اندر' ان کی معاشی ضروریات کے اندر' یہ تفریق پیدا کی جائے کہ یہ شخص چونکہ کدال کا کام کرنے والا ہے اس کو تو تین ہی روپے روز کے ملیں گے خواہ ان کے بیوی بچے بھوکے کیوں نہ رہ جائیں۔ جھونپڑی میں ہی اس کو عمر بسر کرنی پڑے گی۔ پھٹے پرانے کپڑے ہی اس کو پہننے پڑیں گے اور یہ اس کے مقابلے میں جو ہے اس کو اعلیٰ درجے کی پوشاک بھی چاہیے نہایت اعلیٰ درجے کی کوٹھی بھی چاہیے' ایک موٹر بھی چاہیے' نوکر بھی چاہئیں۔

قرآنی معاشرے میں تقسیم کار کا اصل مقصد باہمی احترام کو درجات میں تقسیم کرنا نہیں ہوتا

تقسیمِ کار اگر انسانوں کے اندر وجہ عزت اور ذلت بن جاتی ہے یا اس میں معاشی تفاوت ایسا پیدا کر دیتی ہے کہ ایک کی ضروریات بھی پوری نہ ہوں اور دوسرا عیاشیاں کرتا پھرے' اسے کہتے ہیں طبقاتی تقسیم' یہ ہے چیز جس کو مٹانے کے لیے آسمانی انقلاب آتا ہے۔ تقسیمِ کار کو نہیں مٹایا جا سکتا۔ قرآن میں موجود ہے کہ یہ مختلف درجات جو تمہارے ہاں کام کے ہیں یہ اس لیے ہیں کہ تم ایک دوسرے سے کام لے سکو' باہمی تعاون معاشرے کے اندر تمہارا بڑھے (43:32)۔ لیکن یہ نہ تو یہ باعثِ تکریم و ذلت ہونا چاہیے نہ یہ چیز ہو جانی چاہیے کہ ایک کی تو ضروریاتِ زندگی بھی پوری نہ ہوں اور دوسرے کے ہاں کوٹھیاں بھری ہوئی ہوں جیسے قرآن کہتا ہے قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا (7:88)۔ یہ ہیں وہ تفاوت وہ ناہمواریاں' جن کو مٹانے کے لیے آیا۔

معاشرتی تفاوت اور ناہمواریوں کو قائم رکھنے کا نتیجہ یہ کہ غلط نظام پر روڈ رولر پھیر دیا گیا

میں نے کہا اس لیے کہ دیکھئے وہ جسے تباہی ہم کہتے ہیں اس تباہی کو قرآن نے کن الفاظ میں استعمال کیا' زمین کی بات ہو رہی ہے' قرآن کے الفاظ کا اعجاز ہوتا ہے عزیزانِ من! کہا یہ کہ انہوں نے وعدہ خلافی کی فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ (91:14) ان کے خدا نے ان پر روڈ رولر پھیر دیا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ طبقات کو مٹا کے ہمواریاں پیدا کرنے کے لیے محسوس مثال کس قسم کی دی جا رہی ہے'' پنجابی اچ ساڈے ایہہ کہندے ہوندے ہیگے' سہاگہ واہ دتا اوہدے تے' او جنیاں وڈیاں وڈیاں ڈھلاں ہوندیاں اوناں نوں پھے پھے کے باقیاں دے برابر کر دا ترا جاندا ہیگا''۔ بڑا درجہ ہو تو دمدمہ ہوتا ہے' کہا یہ کر دیا' کر کیسے دیا؟ بِذَنۡۢبِهِمۡ (91:14) یونہی نہیں کہ ہمارے من میں آ گیا ہم نے کہا کہ اچھا آج روڈ رولر ''ادھر لے جاؤ'' بِذَنۡۢبِهِمۡ (91:14) ان کے جرائم کی وجہ سے یہ چیز کی اور نتیجہ فَسَوّٰٮهَا (91:14) ہمواری پیدا کر دی ہم نے' لیول کر دیا جسے ہم کہتے ہیں یہ ہے اس کا ترجمہ۔ فساد کو مٹانے کے لیے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ صرف اس بستی کو تباہ کر دینا ہی مقصود نہیں تھا' اس نظام کو بدل دینا مقصود تھا اس نظام کے اوپر روڈ رولر پھیر دیا اور اس کے بعد فَسَوّٰٮهَا (91:14) ہموار کر دی اونچ نیچ وہاں۔ مساواتِ محمدی ﷺ کے الفاظ تو آپ نے بہت سنے ہونگے۔ یہ وہی ہے فَسَوّٰٮهَا (91:14) جسے کہا ہے وہ تو یہ صورت پیدا ہونی چاہیے جب مساوات وہ ہوتی ہے Levelling ہو جائے اونچ نیچ مٹ جائے' عزت و ذلت کے معیار اور ہو جائیں' معاشی ناہمواریاں مٹ جائیں اس کے بعد۔ یہ ہے قومِ ثمود کا وہ قصہ جو یہاں چند الفاظ میں بیان ہوا ہے کوئی چار پانچ ہزار سال پہلے کی بات۔

چار ہزار سال پیشتر سے رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کے تباہ کن اثرات کو مٹانے کے لیے حق و باطل کی جنگ

تو تیسرا جرم یہ تیسری قوم سامنے آئی اور تیسرا جرم آ گیا کہ خدا کا دیا ہوا رزق اور اس کے ذرائع جس میں سے رزق پیدا ہونا ہے' انہیں اگر ذاتی ملکیتوں کے اندر لے لیا جائے تو ظاہر ہے کہ جن کے پاس قوت زیادہ ہوتی چلی جائے گی' دولت بڑھتی چلی جائے گی وہ ان چیزوں پہ زیادہ سے زیادہ قابض ہوتے چلے جائیں گے اور دوسرے انسان ان سے محروم ہوتے چلے جائیں گے۔ پہلے اس طرح سے وہ اس پہ قبضہ کر لیں گے اور اس کے بعد پھر آپ کے ہاں کے قانونِ شریعت بنیں گے (انسانوں کے بنائے ہوئے قانونِ شریعت میں کہہ رہا ہوں) باپ سے بیٹے کی طرف آئے گی تو یہ ورثہ ہو گئی صاحب' بیچ دی دوسرے کے پاس' بیچ دی چیز' بیع جو ہے وہ تو حلال ہے۔ تو یہ جو اونچ نیچ تھی ناہمواری تھی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ یہ تھا وہ پیغامِ خداوندی جو چار ہزار سال پہلے حضرتِ صالحؑ کی زبان سے وہاں آیا اور یہ ہے وہ بنیادی اصول جو قرآن نے دیا ہے۔ پیدائشِ رزق کے متعلق جو ذرائع ہیں' جو چیزیں ہیں' ان کے متعلق کہ خدا کی اونٹنی خدا کی زمین' خدا کے بندے خدا کی زمین' سیدھی سی بات ہے یہ ان کے لیے مساوی طور پہ کھلی رہنی چاہیے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41:10) قرآن نے کہا ہے نا' وہاں بھی یہی چیز ہے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41:10) تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پہ اس کو کھلا رہنا چاہیے۔ میں کہہ یہ رہا تھا باتیں تو یہ چار ہزار پانچ ہزار سال پہلے کی ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ وہ ابدی حقائق ہیں کہ جن کی تکذیب باطل کا نظام قائم کرنے والے انسان ہمیشہ کرتے چلے آئے ہیں۔ خدا کے انقلاب لانے والے پیغامبر اس کو مٹاتے چلے گئے صحیح نظام کو قائم کرنے کی دعوت دیتے چلے گئے۔ آج آپ اپنے دور میں آ جائیے آپ دیکھتے ہیں کہ اس باطل نظام کو صحیح ثابت کرنے والی تمام کوششیں جتنی بھی تھیں خواہ وہ ان جاگیرداروں کی طرف سے تھیں' سرمایہ داروں کی طرف سے تھیں اور خواہ اس کی سند میں مذہبی پیشواؤں نے بھی اپنے فتوے دے رکھے تھے' انسانوں کا تجربہ اسے کس طرح سے باطل ثابت کرتا چلا جا رہا ہے۔

باطل کے نظام کو مٹانے کے لیے مذاہب پرست طبقہ سب سے بڑی رکاوٹ رہا ہے

انسان اس غلط نظام سے تنگ آ کر خود اس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے جو نظام چلا آ رہا ہے۔ یہ حصہٗ لا تو انسانوں کے اندر تو اپنے تجربے سے آ رہا ہے کہ یہ غلط ہے' وہ صحیح کیا ہے جسے الا اللہ آپ کہتے ہیں' یہ ہے نہیں ابھی نگاہوں کے سامنے۔ اس لیے یہ اس غلط سے نکل کے بھی صحیح پر ابھی نہیں آئے یوں کہیے کہ برزخ کے اندر ابھی تک یہ تڑپ رہی ہے انسانیت' ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں کہ کہیں سے صحیح راستہ مل جائے۔ یہ ذمہ داری تھی اس قوم کی کہ جو وارث تھی اس کتاب اللہ کی لیکن یہ عجیب تاریخ میں تماشا ہم نے دیکھا ہے کہ جب

بھی وہ باطل کے نظام کی تکذیب کرنے والے صحیح نظام کے دعوت دینے والے آتے ہیں ان کی سب سے زیادہ مخالفت وہ کرتے ہیں جو مذہب پرست طبقہ ہوتا ہے۔حضرتِ موسیٰؑ کا مذہب پرست طبقہ حضرتِ عیسیٰؑ کی مخالفت کررہا ہے' حضرتِ عیسیٰؑ کا مذہب پرست طبقہ محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کررہا ہے' محمد رسول اللہ ﷺ کا مذہب پرست طبقہ ہراس شخص کی مخالفت کررہا ہے' جو قرآن پیش کرتا ہے' یہ مفاد پرستی ہے۔اور مفاد پرستی کی سب سے پہلی ترین اور سب سے زیادہ گھناؤنی شکل' مذہبی پیشوائیت ہوتی ہے۔یہ باقی جتنے بھی ہیں زمیندار کتنا ہی بڑا ہو بڑے دھندے کرنے پڑتے ہیں اس کو' مقدمے بازیوں میں الجھا ہوا ہے' کوئی بیل کھول کے لے گیا' ہے وہاں دنگا فساد ہوگیا' یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے' کچھ نہ کچھ محنت کرنا پڑتی ہے' ساہوکار کو بھی اپنی اسامیوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔یہ مذہب پرست طبقہ ایسا ہوتا ہے کہ اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا اور سب سے زیادہ چوکھا کھاتا ہے' یہ سرمایے کے بغیر سرمایہ داری ہورہی ہے' سرمایہ کا ماحصل مل رہا ہے بغیر سرمایے کے' کچھ انوسٹ ہی نہیں کیا ''نالے اوگوڈے چمدے نیں آن کے''۔سیدھی سی بات ہے ان کی طرف سے تو مخالفت ہونی ہی تھی سب سے پہلے۔اور پھر وہ طبقہ جو ہے اس سے اس کی موج ہوجاتی ہے وہ خود سامنے نہیں آتا' ان کو آگے لے آتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ صاحب ہم تو کچھ نہیں کررہے' وہ بتارہے ہیں کہ صاحب شریعتِ حقہ کا فیصلہ یہ ہے۔

یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ نہیں مل سکتا

آپ حیران ہونگے جس زمانے میں یہ ہے نا یہ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے ورثہ نہیں ملتا' یتیم جو ہوگیا یعنی اس کا باپ چونکہ نہیں ہے' لاوارث اور یتیم ہے۔آپ کو پتہ ہے یہ آپ کی شریعتِ حقہ کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر کسی ایک بچے کا باپ فوت ہوجائے اس کی دادا کی زندگی میں تو وہ یتیم رہ جاتا ہے۔جب یہ دادا مرتا ہے اس کی لاکھوں روپے کی جائیداد ان کے حصے میں آجاتی ہے جن کا باپ زندہ ہے' یہ جس کا باپ مرگیا ہے اس کو کچھ نہیں ملتا اس میں سے۔

پوتے کو دادے کی وراثت سے حصہ دلانے والا پرویزؒ کافر ہے

آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی نظام خدا دینے والا ہے' بالکل قرآن کے خلاف ہے۔میں نے اس کے خلاف جس زمانے میں آواز اٹھائی' وہ عائلی قوانین جس زمانے میں بن رہے تھے میں تو اس زمانے کا سب سے بڑا کافر ہوا ہوں نا' اس میں یہ بھی تھا جو مجھ پہ کفر کا فتویٰ لگا ہوا ہے اس میں یہ بھی ہے' یتیم پوتے کو یہ حصہ دلاتا ہے۔ایک دفعہ ایک بہت بڑے زمیندار آئے میرے پاس' ان کے ان یتیم پوتوں کے متعلق مجھے معلوم ہوگیا تھا' ان کا باپ زندہ تھا تو ان پوتوں کی حالت یہ تھی کہ ایچی سن کالج میں وہ پڑھتے تھے۔باپ فوت ہوگیا اس کی اپنی جائیداد نہیں تھی' یہی تھی باپ کی جائیداد اس کی آمدنی بند ہوگئی' دادا فوت ہوگیا وہ بے گھر بے در ہوگئے وہ بچے' ساری

جائیداد چچا لے گیا اور اس کے بیٹے۔ وہ آئے بہرحال' اس زمانے میں بہت سے یہ آتے تھے میرے پاس' وہ جو دادا صاحب تھے انہیں بھی میں نے بلایا وہ خود آئے' عجیب منظر تھا یہ شریعت کیا کرتی ہے' وہ رو رہے تھے کہتے تھے کہ مجھ سے خود دیکھا نہیں جاتا ان کا حال ان بچوں کا' میں چاہتا ہوں ان کو حصہ دوں لیکن ڈرتا ہوں خدا رسول سے کہ شریعت کے خلاف ہے۔ اور وہ ایسا کہنے میں مجھے نظر آتا تھا مخلص تھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' کہنے لگا میں جب بھی یہ کرنے لگتا ہوں' فوراً آ جاتے ہیں وہ مولوی صاحب اور وہ مفتی صاحب۔ اب جو میں کچھ دینا چاہتا ہوں وہ خیرات کے طور پہ ہی ہے' کہنے لگا وہ میرے پوتے لیتے نہیں ہیں۔ وہ روتا تھا کہ کیا کروں' شریعت کے خلاف کیسے جاؤں۔

حضرت موسیٰ کو فرعون کے دربار میں مذہبی پیشوائیت کا سامنا اور پھر حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیاسی بھیڑوں کا قصہ

آپ نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ کہاں تک جاتے ہیں۔ تو سب سے پہلے مخالفت ان کی طرف سے ہوتی ہے۔ اسی لیے جب فرعون نے دیکھا کہ بات نہیں بنتی حضرتِ موسیٰؑ کے ساتھ' اس نے اس دن کی بحث ختم کر دی کہا کہ موسیٰؑ کسی اور دن پہ اسے اٹھا رکھتے ہیں۔ بہت بڑا ایک مباحثے کا میدان گرم کریں گے۔ اس کے بعد اس نے کیا کیا؟ قرآن بتاتا ہے نا جتنے مذہبی پیشواء تھے نا اپنے ہاں کے بڑے بڑے مندروں کے ان کو بلایا اور انہیں کہا کہ صاحب یہ بات مذہب کی کرتا ہے ہمارا یہ میدان نہیں' تمہارا میدان ہے تم آؤ اس کے ساتھ بھڑو۔ ہمیشہ ہامان کو سامنے کر دیا جاتا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے کا معاشرہ بھی جو تھا اس میں بھی یہی کیفیت تھی جو یہاں بتائی گئی ہے قومِ ثمود کی۔ مصر سے بھاگ کے جب یہ گئے ہیں' بھاگ کے گئے تھے جان بچا کے' انہی سینا کی وادیوں سے آگے گذرے' مدین کی بستی کے باہر ایک چشمہ تھا پیاؤ تھا' درختوں کے بھی کچھ جھنڈ تھے' ایک درخت کے نیچے جا کے بیٹھ گئے ستانے کے لیے' سوچ رہے ہونگے کہ فرعون کا وہ معاشرہ وہاں کا ماحول کس قدر استبدادِ ملوکیت تھا وہاں سے بچ کے یہاں آ کے بیٹھے۔ یہ سورۃ قصص جو ہے 28 ویں سورۃ' کہا کہ وہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے اپنی سوچ میں تو سامنے دیکھتے ہیں وہ پیاؤ پر کہ بھیڑیں آتی ہیں' پانی پی پی کے پیٹ بھر کے واپس چلی جا رہی ہیں' دو لڑکیاں ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ تَذُوْدٰنِ (28:23) ان کی بھیڑیں پیاس کی شدت سے جانا چاہتی ہیں پانی کی طرف دوڑ کے اور یہ ان کو زبردستی روک رہی ہیں پیچھے کی طرف۔ حضرتِ موسیٰؑ کی بات سمجھ میں نہ آئی کہ اور بھیڑیں بھی تو جاتی ہیں پانی پی رہی ہیں ان کی بھیڑیں یہ نہیں کہ انہیں پیاس نہیں ہے اس لیے یہ وہاں نہیں جانے دیتیں ان کو' وہ بھیڑیں پیاس کی شدت سے تنگ آ کے جا رہی ہیں اس کی طرف یہ روک رہی ہیں ان کو۔ یہ اٹھ کے گئے اور ان سے جا کے کہا کہ بیبیو کیا بات ہے یہ' تم اپنی بھیڑوں کو جانے کیوں

نہیں دیتیں پانی پینے کے لیے۔لڑکیاں کہنے لگیں کس طرح جانے دیں' گھر میں صرف ایک مرد ہے بوڑھا باپ کمزور نا تواں اور کوئی ہے نہیں' تو جن کے ہاں طاقتور مرد نہ ہوان کی بھیڑیں'ان لوگوں کی بھیڑوں کے ساتھ جا کے پانی کیسے پی لیں۔ہم تو انتظار کریں گی جب یہ آخری طاقتور لوگ اپنی بھیڑوں کو پانی پلا کے لے کے جائیں گے تو پھر جو تلچھٹ بچے گی اس میں ہم اپنی بھیڑوں کو بھیج دیں گے۔ہماری بھیڑیں ان کی موجودگی میں پانی کیسے پی سکیں۔میں تو ان کو سنبھال رہی ہوں کہ آگے جائیں گی تو بھیڑوں کو ماردیں گے۔اُنہوںؑ نے کہا کہ بہت اچھی بات ہے۔جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا خدا کا نبی اس کا ہوتا ہے' ابھی نبی وہ بھی نہیں تھے لیکن ہونے والے نبی کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے۔تھے تو قوی ہیکل' آگے بڑھے کس کی جرآت تھی جو سامنے آ جاتا''تگڑا کوئی وی ہووے اوہدے سامنے کوئی اوندا ای نئیں ہیگا''یہ گئے انہوں نے اس کو پانی پلایا۔وہ چلی گئیں اور اس کے بعد پھر یہ ایک چیز ہے فَسَقٰی لَھُمَا ثُمَّ تَوَلّٰی اِلَی الظِّلِّ (28:24) قرآن کا انداز ہے' پانی پلا کے آ کے سایے میں بیٹھ گئے اور سوچنے لگ گئے فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (28:24) کہا کہ یا اللہ مصر کو چھوڑا تھا کہ وہاں استبدادِ ملوکیت کی جو چیرہ دستیاں تھیں وہ دیکھی نہیں جاتی تھیں مجھ سے کہ غریبوں کے مظلوموں کے گلے کس طرح سے گھٹتے ہیں۔یہاں آیا تھا کہ یہاں کی فضا تو آزادی کی فضا ہو گی یہاں میں نے دیکھا کہ وہی استبداد ایک اور شکل کے اندر ہے اب اس کے بعد تو جو تیری درگاہ سے مجھے ملے میں اس کا محتاج ہوں میری سمجھ میں تو بات آتی نہیں کہ جاؤں کہاں بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیدا است''۔اب میری رہنمائی تیری طرف سے ہونی چاہیے' میں تو زمین کو چھوڑ سکتا تھا۔ایک سرزمین کو چھوڑ کے دوسری میں آیا ہوں۔وہاں آ کے دیکھا بس شکل بدلی ہوئی ہے استبداد وہی کا وہی ہے' اب تو میری رہنمائی کر کہ کیا کیا جائے۔یہ تھی پھر وہ جو راہنمائی ملی تھی اور اس کو لے کے پھر یہ وہاں گئے تھے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ وہ دور تھا جس میں کسی خاص مقام میں نہیں' عام روش ہی یہ تھی۔خدا کا نبی یہ کرنے کے لیے آتا ہے۔

ہمارے ہاں پیش کیے جانے والے وعظوں کی کیفیت اور ان حقائق سے دوری جن کا ذکر قوم نوحؑ قوم عاد اور قوم ثمود میں کیا ہے

عزیزانِ من! جسے دین کہتے ہیں وہ یہ ہوتا ہے۔تین قومیں تو آپ کے سامنے آ گئیں' آپ نے دیکھا کہ ان کی تباہی کے لیے قرآن نے کیا کچھ کہا ہے۔ہم بھی تو ایک وعظ سنتے ہیں نا ہمیشہ جمعہ میں اور بھی خطبوں میں کہ مسلمانو! ہم ذلیل وخوار اس لیے ہو گئے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا اور ہم نے دین کو چھوڑ دیا اور اس کے بعد جب آپ سنیں گے تو ان میں سے کوئی چیز نہیں آئے گی کہ یہ چیز ہم نے کر دی اس لیے تباہ ہو گئے' بس وہ چھوڑ دیا میں (معاف رکھیے گا یہ نہ کہیے میں نماز کی تنقیص کرتا ہوں) وہ بس یہاں تک صرف آ سکے

بات کہ نمازیں چھوڑ دیں، سوٹ پہن لیے، شیو کر لیے، بال اس قسم کے رکھ لیے، وضع قطع ایسی بنائی، یہ ان کی کیفیت ہوگئی ٹھیک ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کلبوں کا ذکر آئے گا۔ ٹھیک ہے معیوب چیزیں ہیں وہ لیکن آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم قوموں کی تباہی کے جرائم کو نسے گنا تا ہے ان میں سے کوئی ایک جرم بھی وہاں نہیں گنایا جائے گا کہ ہم اس لیے تباہ ہو رہے ہیں کہ جو ان قوموں نے، ایک ایک نے، الگ الگ کیا تھا وہ سارے جرائم ہماری قوم کے اندر آ گئے ہوئے ہیں۔ کیا قومِ نوحؑ کے وہ جرائم جو تھے کہ چھوٹے چھوٹے طبقے کے لوگوں کو وہ ذلیل سمجھتے تھے، کیا ہمارے ہاں یہ چیز نہیں ہے؟ کیا قومِ عاد کا وہ جو اتنا بڑا جرم تھا کہ جب وہ ہاتھ ڈالتے ہیں کسی کے اوپر تو ان کو کچل کے رکھ دیتے ہیں، کیا استبدادِ ملوکیت جس میں ہم جیتے ہیں وہی چیز نہیں ہے؟ کیا یہ قومِ ثمود کی کیفیت کہ خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے کھلی ہوئی نہ رکھی جائے، کیا یہی جرم نہیں ہے جو یہاں نہیں ہم کرتے؟ یا آج ساری دنیا کے اندر یہ ہمارے ہاں نہیں ہو رہا؟ جرائم یہ ہیں جس سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ اب تباہی کے لیے یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ نہیں صاحب! آسمان سے پتھر تو نہیں گرتے۔ وہ خِزْیٌ.

قرآن حکیم کے نزدیک قوموں کے لیے سب سے بڑا عذاب ذلت و مسکنت ہے، بھوک ہے، خوف و حزن ہے

قرآن کہتا ہے کہ ذلت اور مسکنت سب سے بڑا عذاب ہے جو آیا کرتا ہے۔ خدا نے **لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (16:112)** کہا تھا نا کہ سب سے بڑا عذاب ہمارا یہ ہوتا ہے کہ کوئی قوم ہر وقت ڈرتی رہے اور بھوک ہو اس کو۔ سوچئے تو سہی کہ یہ عذاب خدا کا آیا ہوا ہے یا نہیں اور اس کی وجوہات یہ ان قوموں کی جو داستان ہے وہ جو ہے قرآن بیان کرتا ہے یہ ہیں وہ اسباب عزیزانِ من! ہمارے زوال کے ہماری تباہی اور بربادی کے، یہ پرانی قوموں کی داستانیں نہیں ہیں یہ تو آج بھی اسی طرح سے تروتازہ ہے زندہ و پائندہ ہے، یہ جرائم ہیں جن کی وجہ سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ عزیزانِ من! اس تکلیف کے باوجود میں نے کچھ ہمت تو کر لی۔ قومِ ثمود کی داستان یہاں ختم ہوتی ہے سورۃ ھود کی آیت 68 تک ہم آ گئے ہیں 69 سے آگے لیں گے، وہاں پھر قومِ لوطؑ کی داستان شروع ہوگی ان مہمانوں کے قصے سے جو حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

گیارہواں باب: **سورۃ ھود** (آیت 69)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1974ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 69 سے ہو رہا ہے۔ (11:69)

مجھے افسوس ہے کہ پچھلی دو اتواریں میری بیماری کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا۔ تھی تو انتہائی معذوری لیکن کچھ ایسی کیفیت ہے میرے احساسات کی کہ اگر بیماری کی وجہ سے بھی درس میں ناغہ ہوتا ہے تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی گناہ کر رہا ہوں۔ اب میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی مقصد کے لیے وقف ہے۔ غالب کے الفاظ میں کہ

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگان یار تھا

آج بھی ابھی طبیعت میری بحال نہیں ہوئی لیکن جی نہیں چاہا کہ یہ ناغہ اتنا زیادہ مسلسل ہوتا چلا جائے۔ دیکھتا ہوں جتنے وقت تک کے لیے توانائی نے ساتھ دیا اتنے وقت کے لیے کچھ پیشِ خدمت کر سکوں گا۔

قرآن حکیم میں پیش کردہ داستانوں کا مقصد قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کو واضح تر انداز میں بیان کرنا ہے

سورۃ ھود میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے انبیائے سابقہؑ اور اقوامِ گذشتہ کی کشمکش کی داستانیں چلی آ رہی ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ جس قوم میں دیکھتا ہے کہ اخلاقی برائیاں انتہا تک پہنچ گئی ہیں، اس میں ایک نبی آتا تھا۔ تو قرآنِ کریم جو اس کشمکش کی داستان بتاتا ہے تو وہ تمام خرابیاں نہیں گنا تا بلکہ ان میں سے جو چیز سب سے بڑا بنیادی جرم ہوتا ہے اس قوم کا، اس کو ابھار کر سامنے لاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس قوم کی تباہی کی بنیادی وجہ ان کا یہ جرم تھا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا تھا اگر ان سابقہ اقوام کے ان کبیرہ جرائم کی فہرست مرتب کر لی جائے تو اس سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جس قوم میں ان جرائم میں سے کوئی

ایک جرم بھی نمایاں طور پر معاشرے میں عام ہوگیا' وہ قوم تباہ ہوکر رہے گی۔ یہ اس تاریخ کی داستانیں نہیں جو قرآن دہرا رہا ہے' یہ تاریخ کا فلسفہ ہے جو وہ بیان کر رہا ہے' تاریخ کا فلسفہ نہیں بلکہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ قوموں کے عروج اور زوال کے اٹل قوانین ہیں یہ کہ جب قوموں کے اندر اس قسم کا معاشرہ پیدا ہوجائے گا' اس قسم کا نظام وہ اپنے ہاں رائج کرلیں گی تو اس کا فطری نتیجہ اس قوم کی تباہی ہوگا۔ جب بھی ایسا ہوگا' جو قوم بھی ایسا کرے گی' اس کا نتیجہ یہی ہوگا۔ اور یہ ہے وہ چیز جو قیامت تک کے لیے ضابطۂ حیات بنتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے نا کہ قرآنِ کریم ایک مکمل ضابطہ پیش کرتا ہے' ایک نظام پیش کرتا ہے' اس نے ان ضوابط اور نظام کی کوئی فہرست مرتب کر کے نہیں دی بلکہ اس کے طریقے یہ ہیں کہنے کے کہ جب قوموں میں اس قسم کے احوال وظروف پیدا ہوجائیں' اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ اس کے برعکس اگر قوم اس قسم کا نظام اپنے ہاں متشکل کرلے تو اس کا نتیجہ سرفرازیاں اور خوشگواریاں ہوگا اور یہ ابدی اور غیر متبدل اٹل قوانین ہیں۔ یوں ایک ضابطہ بنتا ہے ان تمام چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے جو قرآن کا ضابطۂ زندگی جسے ہم کہتے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورۃ ھود میں قوم نوحؑ' عاد اور قوم ثمود کی داستانوں میں زندگی کے حقائق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے

سورۃ ھود میں یہ داستان مسلسل طور پر بیان ہوئی ہے۔ سب سے پہلے حضرتِ نوحؑ کا قصہ آیا قومِ نوحؑ میں قرآن نے گنایا یہ تھا کہ ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ انہوں نے معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا اور ان طبقات میں انہوں نے مختلف کام کاج کرنے والے لوگوں کو کمی کمین یا نچلے درجے کے لوگ شمار کر رکھا تھا۔ دولت کو عزت اور تکریم کا باعث بنایا ہوا تھا انہوں نے۔ حضرتِ نوحؑ نے مساواتِ انسانیہ کی تعلیم دی تو انہوں نے ان کی اس تعلیم کے خلاف اعتراض نہیں کیا' کیا یہ تھا اعتراض کہ اس کے تو معنی یہ ہونگے کہ یہ لوگ کہ جنہیں ہم آج تک کبھی اپنے برابر کھڑا نہیں ہونے دیتے' ہمیں بالکل ان کے برابر بیٹھنا پڑے گا۔ یہ ہمارے برابر ہوجائیں گے۔ ان میں اور ہم میں اونچ نیچ کی کوئی تفریق نہیں رہے گی' تمہاری تعلیم کا تو یہ مقصد ہوگا۔ آپؑ نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ انسانیت کے معیار سے اونچ اور نیچ ہوتی نہیں ہے۔ اونچ اور نیچ تو جوہرِ ذاتی کی بناء پر ہوتی ہے۔ انسان کا ذاتی کردار ہے جس کی بنیاد پہ معاشرے میں اس کا مقام متعین ہوگا' نہ یہ کہ وہ چھابڑی لگاتا ہے' خوانچہ فروش ہے' یہ کنجڑا ہے' موچی ہے' لوہار ہے اور تم اعلیٰ درجے کے سرمایہ دار بنے پھرتے ہو۔ یہ تقسیم انسانوں کی کی ہوئی تقسیم ہے' خدا کے ہاں یہ چیز وجۂ تفریق اور تمیز نہیں ہوتی' جوہرِ ذاتی ہے' کردار ہے' کریکٹر ہے۔ یہ چیز پیش کی' وہ اپنے اس معاشرے کے اوپر اڑے رہے۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر اس قسم کے معاشرے کا انجام سوائے اس کے کہ وہ تباہ ہو کے رہ جائے اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہے چیز جو قرآن نے گنائی ہے۔

پھر قومِ عاد وہ سامنے لاتا ہے۔ اس نے کہا کہ انہیں بڑی قوت حاصل تھی، علم تھا، بصیرت تھی، تمدن تھا، تہذیب تھی۔ لیکن وہ اپنی علم و بصیرت کو کمزوروں ناتوانوں ضعیفوں اور غریبوں کے معیار کو بلند کرنے کے لیے نہیں بلکہ الٹا انکی ہڈیاں توڑنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وہ ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کے اپنے محلوں کی آرائش و تزئین کا باعث بناتے تھے۔ اس طرح سے ان کے ہاں سے یہ دولت کو نچوڑتے تھے اور کیفیت یہ تھی کہ وہ اس خیال سے کہ ہمارا نام ہمیشہ تک کے لیے دنیا میں قائم رہے، بڑی بڑی یادگاریں بناتے تھے اور یادگاریں ایسی بناتے تھے کہ ان کا افادی پہلو کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی فائدہ ہی نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ چٹانیں تراش دیتے تھے مینار کھڑے کر دیتے تھے۔ کہتا ہے کہ اس طرح سے غریبوں کی محنت کا کمایا ہوا روپیہ اور یوں ان کے جذبات کی تسکین کا موجب بن جائے کہ جو کسی کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے، یہ جرم گنایا گیا تھا۔ آج جو قوم اس قسم کا معاشرہ متشکل کرتی ہے، وہ تباہ ہو کر رہتی ہے۔

رب العالمین کی طرف سے اس قدر رزق کی فراوانی کے باوجود انسانوں کے خودساختہ نظامِ معیشت کا نتیجہ

پھر آگے قومِ ثمود آتی ہے ہمارے سامنے۔ قرآن نے کہا کہ اس قوم کی کیفیت یہ تھی کہ خدا نے اپنی پوری مخلوق کا سامانِ رزق اس زمین کے دستر خوان پہ بچھا دیا اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہر ذی حیات اسے اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے، جو کچھ چاہیے وہ ہر جگہ میسر ہو اسے۔ خدا نے کہا ہے کہ ہمارے خالق ہونے کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہم رازق ہوں۔ کسی کو پیدا کر دینا اور اس کی زندگی جن چیزوں پہ منحصر ہے وہ سامان نہ دینا اس کو یہ تو بڑا ہی ظلم ہے اس کے اوپر۔ یہ جو آج بھی ہمارے ہاں بلکہ پوری دنیا میں یہ رو چلی ہوئی ہے کہ بھائی آبادی کو روکو وہ اتنی پیداوار نہیں ہو رہی جو اتنے منہ کو Feed کر سکے، کھلا سکے ان کی زندگی کا سامان دے سکے۔

خالق کائنات نے مخلوق خدا کی زندگی کو دوام بخشنے کے لیے خاطر خواہ انتظام کر رکھا ہے

گویا یہ تسلیم ہے دنیا کو آج کہ اس قسم کا نظام جس میں کھانے والے زیادہ ہوں اور ان کے لیے خوراک اتنی نہ ہو یہ نظام بڑا غلط ہے۔ یہ بات آج نہیں کہی گئی یہ بات تو پہلے دن سے خدا نے کہی تھی کہ خالق کے لیے یہ زیبا نہیں ہوتا کہ وہ مخلوق تو پیدا کرے اور اس مخلوق کی زندگی جن چیزوں پہ منحصر ہے، وہ سامان ان کے لیے میسر نہ کرے۔ ایسے جیسے آج کہتے ہیں نا کہ غریب آدمی ہو بھئی، کیوں اتنے بچے پیدا کیے جاتے ہو جن کو کھلانے کا جن کو پہنانے کا تمہارے پاس ذریعہ نہیں ہے وسیلہ نہیں ہے۔ بعینہٖ بڑے پیمانے پہ یہ دلیل تھی جو خدا نے دی اس نے کہا کہ خالق کے لیے ضروری ہے کہ رازق ہو، وہ رب العالمین ہونا چاہیے اس کو۔ اور اس ربوبیتِ عالمینی کے لیے اس نے کہا کہ ہم نے یہ رزق فراوانی سے دیا، انسانوں نے اس رزق کی تقسیم میں استبداد سے کام لیا۔ نتیجہ یہ کہ ایک جگہ تو وہ ضروریات سے کہیں زیادہ وافر اور بہتات میں جمع ہو گیا اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دوسروں کی ضروریات رک گئیں۔ پانی کی ندی اگر بہتی چلی جائے گی تو وہ ہر مقام

سے جہاں سے وہ گذرے گی وہاں وہ پانی دیتی چلی جائے گی۔لیکن اگر کہیں اس پانی کو ندی کو روک لیا جائے تو وہاں تو وہ حوض بن جائے گا وہاں تو وہ ڈیم بن جائے گا آگے وہ خشک ہو جائے گی۔قرآن نے کہا کہ تقسیم ہے یہ رزق کی جو غلط نظام کے ماتحت ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ تو دولت افراط سے جمع ہو جاتی ہے اور دوسری جگہ سامانِ پرورش بھی نہیں ملتا ان کو۔قومِ ثمود نے یہ کر رکھا تھا' چراہ گاہوں پر اور چشموں پر لکیریں کھینچ کے انہوں نے کہا کہ یہ ہماری ذاتی ملکیت ہیں قوم کے سرداروں نے یہ کہا' اس لیے یہ لوگ کمزور اور ناتواں جو غریب ہیں ان کے مویشی ان میں نہیں چر سکتے' ہاں کچھ فالتو بچے گا تو ان کو بھی دیدیا جائے گا۔حضرتِ صالحؑ اس نظام کے خلاف ایک داعئ انقلاب بن کے آئے تھے انہوں نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے اس نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا اور اس کا نتیجہ تباہی ہوا۔اب ہم آگے آتے ہیں یہاں سے قومِ لوطؑ کا قصہ شروع ہوتا ہے۔

جنسی معاملات کی سنگینی کو نظر انداز کرنے کا تصور قوموں کو صدیوں تک موت کی نیند سلا دیتا ہے

یہ ایک اور بنیادی جرم ہے جس کی طرف قرآن نے توجہ دلائی ہے اور وہ ہے جنسی معاملات' سیکس کے متعلق۔تاریخ میں آج کا دور یہ کہا جاتا ہے کہ واقعی علم و تہذیب کے انتہائی عروج پہ پہنچ چکا ہے اور اس میں پھر یورپ کی اقوام کا تو پوچھئے ہی نہیں کہاں پہنچی ہوئی ہیں سب سے آگے ہیں۔لیکن آپ دیکھئے کہ زندگی کے تصور کو بدلنے سے زندگی کا تصور ان کے ہاں یہ ہے کہ انسان بھی حیوانات ہی کی ایک شکل بڑھی ہوئی ہے' کچھ فرق نہیں اس میں۔حیوانی سطح کے اوپر انسان کے اندر جتنے جذبات ہیں ان کو جس طرح سے جی چاہے' ان کی تسکین کر لی جائے' ان پہ کوئی حدود مقرر نہیں کی جا سکتیں۔باقی معاملوں کو چھوڑ یئے' سیکس کے متعلق جو ان کے ہاں Traditional یا روایاتی طور پہ بھی کچھ پابندیاں چلی آتی تھیں' حیوانی سطح زندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ انہوں نے ان کو Relax کرنا شروع کر دیا۔وہ گرہیں کھولنی شروع کر دیں۔

افزائش نسل کے عمل کو وجہ تعیش تک پھیلا دینے کا نتیجہ لواطت تک پہنچ گیا

سیکس کے اختلاط کا مقصد تو افزائشِ نسل تھا لیکن اسے انہوں نے وجہ تعیش سمجھ لیا اور اس میں آگے بڑھتے چلے گئے۔پہلے تو یہ جو کم از کم میرج یا نکاح یا شادی کی ایک رسم ہی سہی' ان کے ہاں چلی آتی تھی' اسے پہلے تو یہ ختم کیا۔میری بیٹیاں بہنیں ہیں اس لیے میں کھلے الفاظ میں تو اس موضوع پہ گفتگو نہیں کر سکتا' اشارات ہی میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔انہوں نے کہا یہ کہ ایک جوان لڑکا اور جوان لڑکی اپنے جنسی جذبات کی تسکین اپنی مرضی سے کرتے ہیں تو اس میں سوسائٹی کو کیا ہے۔کہا یہ گیا کہ سوسائٹی کے نقطۂ نگاہ سے اس میں ایک خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب وہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ باپ اس کی ذمہ داری لیتا نہیں ہے۔ماں کے لیے بوجھ بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کچھ کمانے

کے قابل نہیں اس وقت کے لیے رہتی ۔ انہوں نے کہا کہ اتنی پرابلم ہے تو پھر ٹھیک ہے ان بچوں کی پرورش کا کوئی سامان کردیا جائے۔ بالآخر یتیم خانے بھی تو ہم کھولتے ہیں نا۔یعنی پرابلم صرف اتنی گنی گئی کہ ان بچوں کا کیا انتظام کیا جائے' وہ پہلی پرابلم کوئی نہیں ہے اس کی اجازت ہے کھلے بندوں ۔ اب اس سے جو آگے بڑھنا شروع ہوئے تو ایک ایسی چیز کہ جو اس میں سیکس میں انتہائی درجے کی Perversion بدنہادی جسے کہا جاتا ہے کہ جو حیوانات میں بھی نہیں ہوتی' یہ وہ چیز ہے جسے انگریزی زبان میں Sodomy کہا جاتا ہے ہمارے ہاں اس کے لیے لواطت کا لفظ ہے۔

قوم لوط کے سلسلہ میں صحبت ہم جنس کے الفاظ کی بجائے لواطت کا لفظ زیادہ مناسب نہیں ہے

عجیب بات ہے کہ یہ دونوں لفظ اس قوم لوط سے ہیں جن کا ذکر اب آتا ہے ہمارے سامنے۔ حضرتِ لوطؑ پیغمبر تھے لیکن جس طرح سے قرآن قوم نوحؑ قوم صالحؑ پیغمبروں کی نسبت سے قوم کا نام لیتا ہے اسی طرح اس قوم کا نام قوم لوطؑ قرار دیا۔ اور یہ جو ان کے ہاں فعلِ شنیع تھا صحبتِ ہم جنس جسے آپ کہتے ہیں' اس سے یہ لفظ لواطت آ گیا ہمارے ہاں۔ اور جیسا کہ ہم نے لکھا بھی تھا کچھ دن ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے نسبت حضرتِ لوطؑ کی طرف کچھ چلی جاتی ہے اور وہ تو خدا کے عظیم پیغمبر تھے۔ یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے ہمارے ہاں' اغلام کا لفظ ہے ہمارے ہاں آپ کی زبان کا۔ ان کی بستی کا نام تھا جہاں یہ رہتی تھی قوم اس کے دارالخلافہ یا مرکزی مقام جو تھا اس شہر کا نام Sodom تھا انگریزی میں بھی بائبل میں بھی یہ ہے تو اس شہر کی نسبت سے یہ Sodomy کا لفظ ہے۔ گویا یہ نظر آیا کہ ادھر Semitic Race میں بھی یہ لفظ جو انہوں نے لواطت لیا ہے تو اس کی Origin اس قوم لوط سے لی ہے اور خود مغرب میں یورپ میں بھی خاص طور پہ انگریزی زبان میں بھی لفظ اگر Sodom ہی آیا ہے تو سدوم سے آیا ہے تو وہی ایک ہی بات ہے۔ گویا نظر آیا کہ تاریخ میں یہ نہایت شنیع' قابلِ نفرت' گھناؤنا' حیوانی سطح سے بھی گرا ہوا جو جرم تھا یہ قومِ لوطؑ میں تھا۔ عجیب چیز ہے کہ آج تک یہ چیز جو تھی دنیا کی ہر قوم نے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور قومِ لوطؑ کے متعلق جب بھی ذہن میں آیا یا لکھا لکھنے والوں نے کہا کہ بڑی جہالت کی بات تھی' بربریت تھی' انسانیت نہیں تھی۔

تہذیب مغرب کے ہاں اتنی ترقی اور پھر اتنی پستی اور اس پستی کے تحفظ کے لیے قانون کی بالا دستی

انسانیت ترقی کرتی چلی گئی' کرتے کرتے وہ یورپ میں پہنچی اور اس میں پھر یہ ہمارے ہاں انگلستان کی انگریزوں کی قوم تو بہت ہی آگے چلی گئی اور اتنی بلندیوں پہ علم و تہذیب اور بصیرت اور عقل اور تمدن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد آپ کو معلوم ہے کہ انگریزوں نے کوئی دو سال ادھر قانون پاس کر دیا ہے کہ یہ قانوناً کوئی جرم نہیں ہے۔ کیا انتہاء ہے تہذیب کی!! یعنی پھر وہیں جا پہنچے۔ جس فعل کو جس

قوم کی نسبت سے بھی یہ اب تک ان کی تاریخ میں بھی اس کو نہایت ملعون اور قابلِ نفرت گنا جاتا ہے سارے ان کے لٹریچر میں' ان کے ہاں بھی تاریخ میں اکا دکا کہیں ایسے واقعات آتے تھے تو وہ ساری قوم اس کے خلاف نفرت کرتی تھی۔لیکن وہ قوم جب تہذیب کی انتہا پہ پہنچتی ہے تو وہ پستی کی اس انتہا پہ جا پہنچتی ہے جو خود ان کے نزدیک بھی قابلِ نفرت ہے۔اور یہ نہیں ہے کہ خیر معاشرے میں ہو رہا ہے کیا کریں صاحب اس کے لیے مجبوری یہ ہے' جی نہیں! با قاعدہ قانوناً اس چیز کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔

قرآن حکیم نے انسان کی اس حیوانی سطح کے لیے اسفل سافلین کے الفاظ استعمال کیے ہیں

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے جو کہا تھا نا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (95:4) کہ انسان کو ہم نے حسین ترین ہیئت ترکیبی میں پیدا کیا ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (95:5) اور یہ کم بخت اپنے کرتوتوں سے اپنے آپ کو پست ترین درجے پہ لے جاتا ہے۔یہ اسفل سافلین کیا ترکیب ہے صاحب!! پستی پہ جانے والوں سے بھی پست تر۔انسان پستی میں چلا جائے گا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ (7:179) قرآن نے کہا تھا کہ حیوانی سطح پہ چلا جائے گا اُس نے کہا ہے بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) اس سے بھی گمراہی کی سطح پہ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (95:5)۔کوئی تصور میں آ سکتا تھا کبھی اس پوری تاریخ کے اندر چھ ہزار سال کی تہذیب میں کسی انسان کے ذہن میں یہ آ سکتا تھا کہ اس قدر قابلِ شناعت اس فعل کو کوئی قوم قانوناً اپنے ہاں جائز قرار دے گی۔ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (95:5) انتہا ہے۔سبق یہ دیا جاتا ہے پھر اور یہ لٹریچر تو سیلاب کی طرح اب مغرب سے آ رہا ہے نا' تمام ممالک میں' ہمارے ہاں بھی۔آئندہ آنے والی نسلوں کی تعلیم کا تو ہم نے انتظام صحیح کیا ہی کچھ نہیں ہے' چھوڑ رکھا ہے' ان کی الماریاں ان کے دراز جہاں دیکھئے یہ لٹریچر جتنا بھی ہے اس قسم کے سیکس کا بھری ہوئی ہوتی ہیں یہ الماریاں ان بچوں کی۔

جنسی بدنہادی کی تسکین کے لیے مختلف افعال کا ذکر

کہا ان سے یہ جاتا ہے کہ یہ ایک صرف Biological Function ہے اس کو اخلاقیات سے کیا تعلق۔یہ دلیل دی جاتی ہے کہ یونہی انسانی جسم کے کچھ تقاضے ہیں' انسانی جذبات کے کچھ تقاضے ہیں۔پہلے ان کے ہاں قانون ہوتا تھا کہ اگر' جیسا میں نے ابھی کہا ہے' جوان لڑکا اور لڑکی جنسی اختلاط جیسے اپنے رضامندی سے پیدا کر لیں' اس میں یہ چیز قانوناً کوئی جرم نہیں تھی ان کے ہاں' ایک چیز آگے آتی تھی کہ شادی شدہ لڑکی عورت اس کے ساتھ کوئی دوسرا ناجائز تعلق پیدا کر لے' قانوناً یہ بھی جرم نہیں تھا۔جرم اتنا تھا اگر اس عورت کا خاوند یہ کہے کہ صاحب اس سے تو میری بڑی بے عزتی ہوگئی' یعنی وہ اگر یہ کہے کہ صاحب اس سے میری عزت پہ حرف آتا ہے تو وہ جو اس کا Damage ہوتا تھا نا یہ تو جرم تھا یہ اس عورت کا اور اس غیر مرد کا باہمی اختلاط' یہ جرم نہیں تھا۔یعنی کس طرح سے یہ بڑھتے چلے

گئے آگے۔

وحی کی روشنی میں اس بدنہادی کی فضا سے محفوظ رہنے کا طریق

جب پھر یہ چیزیں تو ایسی ہیں' اپنے مومنٹم سے تیزی سے آتی ہیں' پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر چھوڑ دیجیے ابتداء میں تو یونہی لڑھکتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے پھر اپنے ہی زور دروں سے وہ اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ نیچے آکے وہ توپ کے گولے کی طرح لگتا ہے پھر وہ کسی کے روکے رک نہیں سکتا۔ اسے تو قدمِ اول پہ روکنا ہوگا' یہ کہہ کے روکنا ہوگا کہ ٹھیک ہے مومن مرد اور معاشرے میں باہر تمہیں نکلنا ہوگا' کاروبار کرنا ہوگا' آنا جانا ہوگا' ملنا جلنا ہوگا لیکن یَغُضُّوا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ (24:30) اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دینا' یہاں گرفت کی اس نے صاحب۔ یہاں سے اس نے گرفت شروع کی ہے اور پھر چلا ایک ایک کڑی۔ میں نے کہا یہ ہے کہ وہاں سے جو لٹریچر آتا ہے ہمارے نوجوانوں کے ہاتھوں میں اس میں کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب یہ ایک Biological Function ہے اس میں سوسائٹی کو دخل دینے کا کیا واسطہ ہے صاحب' بالغ ہونا چاہیے کیونکہ بالغ اپنے فیصلے کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر دو خواہ وہ لڑکی اور لڑکا ہوں یا دونوں لڑکے ہی ہوں' باہمی رضامندی سے اپنے جسم کے جذبات کی تسکین کا سامان کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں' معاشرے کو اس میں دخل دینے کا کیا تعلق ہے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے صاحب اس کے لئے' معاشرے کا وہ لیتے کیا ہیں' دلیل ہے۔ اب ہم اگر اپنے ہاں کے ان بچوں سے یہ کہیں گے کہ صاحب بہر حال ہم اخلاق کی بات کریں گے' وہ کہیں گے کہ صاحب یہ عہدِ قدیم کی داستانیں ہیں یہ زمانہ لد گیا اب' پرانے زمانے کی باتیں ہیں اس زمانے کے لوگوں کی' زمانہ بدلتا رہتا ہے' بدلتے ہوئے حالات میں یہ سب چیزیں' بدلنی چاہئیں۔ مذہب کے نام پہ کہیں گے تو وہ تو مذہب گزیدہ پہلے ہی ہیں' ان کو بتایا ہوا ہے کہ یہ تو سارے توہمات ہیں' وہ خدا ہی کے منکر ہو جاتے ہیں تو خدا کی بنائی ہوئی اقدار کے کس طرح سے قائل رہیں گے۔

سیکس اینڈ کلچر پر محققین یورپ کی تحقیق اور J.D.Unwin کی سعی وکاوش

اس کو بھی چھوڑیے خود یورپ کے ہاں کے محققین جنھوں نے سیکس کے اوپر بڑی تحقیقات کی ہیں' وہ نہ مذہب کی بنیادوں پہ اسے لیتے ہیں' نہ اخلاق کی بنیادوں پہ۔ وہ خالص تحقیقات کی رو سے کسی نظریے کسی نتیجے کے اوپر پہنچتے ہیں۔ آپ حیران ہونگے کہ جہاں ایک طرف اس یورپ میں یہاں تک یہ قومیں پہنچی ہوئی ہیں' اسی یورپ کے محققین نے سیکس کے متعلق جو خالصتاً اپنی تحقیق کی ہے آپ کو یاد ہوگا میں نے اس موضوع کے اوپر کئی لیکچر بھی دیے تھے سیکس اینڈ کلچر کے اوپر۔ ایک پمفلٹ بھی شائع ہوا تھا میرا ایک خطاب کا۔

سیکس اینڈ کلچر ایک کتاب کا نام ہے کیمبرج یونیورسٹی کا ایک محقق ہے J.D.Unwin' اس شخص نے اپنی پوری عمر صرف کی یہ

جتنے جن کو ہم وحشی قبائل کہتے ہیں Primitive لوگ' آسٹریلیا میں بسنے والے' جنوبی امریکہ میں' قطبِ شمالی میں' ہمارے ہاں بھی یہ جن کو پکھی واسی وغیرہ کہتے ہیں یعنی اس قسم کے قبائل جو تہذیب اور تمدن سے دور ہیں ابھی۔ اور اس کے بعد پھر وہ مہذب دنیا کی طرف آیا اور مہذب اقوام کا تاریخی مطالعہ اس نے کیا۔ آپ دیکھئے یہ لوگ انہیں کہتے ہیں محقق' اسے کہتے ہیں ریسرچ۔

ہمارے ہاں کے محققین کی حالت

ایک ہمارے ہاں کے ریسرچ سکالر کہلاتے ہیں کسی موضوع پہ کہیے' لائبریری میں جا کے انسائیکلو پیڈیا لے لیتے ہیں اور وہاں سے نقل کر کے تھیسس لکھ دیتے ہیں صاحب۔ ایک یہ ہیں' یہ ہیں محقق' یہ تھا وہ اندازِ تحقیق جو قرآن نے کہا تھا کہ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ (30:42) جاؤ اس دنیا میں چلو پھرو اور پھر اقوامِ سابقہ کی جتنی باقیات یہ یاداشتیں رہ گئی ہیں ان کا مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ ان کا انجام کیا ہوا' یہ ہے وہاں کے محققین کا انداز۔

J.D.Unwin کی تحقیق یہ ہے کہ سیکس پر پابندی نہ کرنے والی قومیں زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ رہتی ہے

J.D.Unwin ایک ایشو اس نے لیا کہ دیکھنا مجھے یہ ہے کہ سیکس کے متعلق باہمی تعلقات کا قوموں کے عروج و زوال پہ کیا اثر پڑتا ہے۔ اور اس نے اپنی ساری تحقیق کا نچوڑ اس کتاب کے اندر یہ دیدیا اور ماحصل اس کا یہ تھا کہ میں نے دیکھا یہ ہے ان قبائل کے اندر' ان مہذب اقوام کے اندر تاریخِ عالم کی رو سے کہ جس جس قوم نے بھی شادی سے پہلے مرد اور عورت کی عصمت کے اوپر زور دیا ہے وہ قوم عروج کی ان بلندیوں تک پہنچی ہے جس کا تصور انسان نہیں کرسکتا۔ یہ جو کہنے والے ہیں کہ صاحب یونہی Biological سا Affection ہے اس کا کیا تعلق ہے قوموں کی تہذیب سے' میں کہتا ہوں وہ شخص مذہب اور اخلاق کی بنیاد پہ نہیں کہہ رہا' خالص تاریخی تحقیق کی رو سے کہہ رہا ہے اور اس نے ثابت کیا ہے تاریخ کی رو سے۔ اور اس کے بعد اس نے یہ کہا ہے کہ جو قوم سیکس کے معاملے کے اندر ان ضوابط کی پابندی نہیں کرتی ہے' اس نے لکھا ہے کہ تاریخ زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک تو اس کو زندگی دیتی ہے اس کے بعد اس کو کوئی زندگی نہیں مل سکتی۔

جنسیاتی بے راہ روی کی بنا پر کسی قوم کا سو سال تک زندہ رہنا بھی مشکل ہو جائے گا

یعنی یہ مملکت سلطنت تدبیر سیاست تمدن قوت سپاہ' یہ سب چیزیں ایک طرف صرف ایک ایشو کہ جنسیات کے متعلق اس قوم نے اپنا رویہ کیا اختیار کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر جنسی اختلاط میں وہ قوم بے پرواہ ہو جاتی ہے' ان گرہوں کو ڈھیلا کر دیتی ہے وہ کہتا ہے زیادہ سے

زیادہ تین نسل کو اس نے کہا ہے کہ میں سو سال اس کی مدت دیتا ہوں زیادہ سے زیادہ وہ قوم ان تمام اسباب وذرائع کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وہ قوم سو سال تک زندہ رہ سکتی ہے اس سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ ہے اہمیت اس جنسی اختلاط کی' ایک فرد کے اوپر کیا اثر پڑتا ہے اس کا یہ بھی اس نے دیا ہے۔قرآن نے تو اس کے متعلق یَلْقَ اَثَامًا (25:68) کہہ دیا ایک لفظ زنا کے متعلق۔

لفظ معصیت عصیان اور زنا کا وہ حقیقی مفہوم جو بڑا ہی غور طلب ہے

جو میں نے آپ سے عرض کیا تھا کئی دفعہ کہ قرآن میں یہ جو الفاظ آتے ہیں نا کہ معصیت کے اور عصیان کے اور زنا کے یہ جس کا ترجمہ ہم گناہ ہی کرتے چلے جاتے ہیں یہ مختلف الفاظ اس نے جو استعمال کیے ہیں ان سب کا ترجمہ گناہ نہیں ہے۔ان کے اندر ایک خصوصیت ہے۔اثم کو بھی ہم گناہ ہی کہتے ہیں عصیان کو بھی ہم گناہ ہی کہتے ہیں حالانکہ یہ بنیادی طور پر یہ دو متضاد چیزیں ہیں: عصیان ہوتا ہے سرکشی میں آگے بڑھتے چلے جانا' حدود فراموش ہوتے چلے جانا' اثم ہوتا ہے انسان کی ان قوتوں کا اس قدر مضمحل ہو جانا کہ وہ کاروانِ انسانیت سے پیچھے رہ جائے۔ان کے ہاں ناقۃ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو تھک کر اپنے کارواں سے پیچھے رہ جائے' چلا نہ جائے اس سے اب دوسروں کے ساتھ۔قرآن نے کہا ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط' زنا کی شکل اختیار کرتی ہے یَلْقَ اَثَامًا وہ کاروانِ انسانیت سے پیچھے رہ جاتی ہے' چودہ سو سال پیشتر عزیزانِ من! قرآن ایک لفظ میں بات کہہ گیا ہے۔ یہ ہے قرآن اور یوں ہے اس کو سمجھا جانا' کیوں یہاں اس نے یہ لفظ اثاما کیوں کہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہے اگر تو اس کی بھی کیفیت ہے کہ اس کے اندر تخلیقی صلاحیتیں جتنی بھی ہیں ان میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے یَلْقَ اَثَامًا سے اور قوم اگر ہے تو وہ اس طرح سے اپنے کارواں کے پیچھے رہ جاتی ہے جیسے ایک تھکی ماندی اونٹنی اپنی صفوں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔اور آج اس بیسویں صدی میں قرآن کا ماننے والا نہیں (اس نے تو شاید سنا بھی نہیں ہوگا) خالصتاً تاریخی نقطۂ نگاہ سے اور نفسیاتی تحقیق کرنے والا' انون ماحصل یہ بیان کرتا ہے کہ جو قوم اس جنسی اختلاط کے ضوابط سے لاپرواہ ہو جاتی ہے' تاریخ اس کو زیادہ سے زیادہ تین پشتوں تک کی زندگی کی مہلت دیتی ہے اس سے زیادہ مہلت نہیں دیتی اور اس میں بھی وہ کہتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ بتدریج اس قدر تھکی ماندی وہ قوم ہوتی ہے کہ گھسٹتی ہوئی چلتی رہتی ہے۔یَلْقَ اَثَامًا۔

سیکس کی بے راہ روی انسانوں کو اور قوم کو اعصابی بیماریوں کے علاوہ نفسیاتی طور پر کمزور کر دیتی ہے

اب ہمارے ان بچوں کو نوجوانوں کو کون یہ سبق جا کے سکھائے' انہیں بتائے کہ عزیزانِ من! یہ معاملہ صرف Biological Action نہیں ہے' Psychologically ایک انسان کے' فرد کے اوپر اس کا کتنا اثر پڑتا ہے' ان کو کوئی بتائے جا کے کہ جونگ اور ایڈلر نے اس کے اوپر انفرادی طور پہ کیا نتائج ہیں جو بہم پہنچائے ہیں انہوں نے۔ وہ انسانوں کی' فرد کی' بیسیوں قسم کی اعصابی بیماریوں کی

اولیں وجہ جو ہے وہ سیکس بتاتے ہیں۔ اور اجتماعی طور پہ میں نے عرض کیا ہے کہ یورپ کے یہ محقق کہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ایک سو سال کا عرصہ مل سکتا ہے اس قوم کو اس سے زیادہ وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتی قوم۔ اور اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن نے عصمت پہ کیوں اتنا زور دیا ہے' سنگین ترین جرم اس نے قرار دیا ہے نا اس کو۔ یہ روایتی بات نہیں ہے بڑا گہرا اثر ہے اس کا نفسیاتی اور تمدنی' بڑا اہم مسئلہ ہے یہ قوموں کا بھی اور افراد کا بھی۔

عصمت اور عفت کے الفاظ عورت اور مرد دونوں کے لیے ہیں' صرف عورت کے لیے نہیں

اور جب ہم کہتے ہیں عصمت پہ زور دیا ہے تو قوموں کے تصورات بھی عجیب ہیں یعنی عصمت ہم بولتے ہیں تو ہمیشہ عورت ہی سامنے آتی ہے' کبھی مرد کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ جسے ہم کہیں کہ بڑا باعصمت ہے؟ یعنی عفت اور عصمت کے لفظ ہمارے ہاں مخصوص ہی عورت کے لیے ہیں گویا یہ اس کے لیے تو ضروری ہے لیکن عصمت کی نگہداشت مرد کے لیے ضروری نہیں ہے۔ غور فرمایا آپ نے۔ ہمارے اس گئے گذرے معاشرے میں بھی جو بڑا ہی ماڈرن ہو چکا ہے' اب بھی یہ کیفیت ہے لڑکیوں کے متعلق احتیاط برتی جاتی ہے کہ صاحب کنواری لڑکیاں ہیں ان کے متعلق کوئی بات نہ باہر نکل جائے' رشتے کے معاملے میں بڑی دقت پیش آئے گی۔ یعنی اتنی احتیاط لڑکی کے معاملے میں' لڑکے کے معاملے کے متعلق تو بات ہی سیدھی سی ہوتی ہے صاحب وہ' لڑکے کی ماں اس کے باپ سے (اپنے میاں سے) سے کہتی ہے کہ ذرا کچھ احتیاط برتو' لڑکا پتہ نہیں آدھی آدھی رات تک کہاں رہتا ہے' آوارہ پھر رہا ہے' کچھ خیال رکھنا چاہیے' وہ کہتا ہے ''ایس عمرا چ سارے ای ایس طراں کردے ہوندے او چھڈ دو' بھولی ایں''۔ چل بھئی۔ یعنی وہ معاملہ ہی ایسا ہے ''سارے ای ایوں کردے ہوندے نیں' او آپ وی ایوں ای کردا ہونداسی''۔ میں کہہ رہا ہوں یہ اس قدر اس چیز کو سہل انگاری سے لیا جاتا ہے' کوئی معاملہ نہیں۔

اگر مرد باعصمت ہو تو عورت بے عصمت ہو ہی نہیں سکتی

لڑکی کے متعلق اب بھی یہ احتیاط ہوتی ہے اور جہاں بھی آپ رشتے میں جا کے دیکھیں جہاں ان چیزوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ لڑکی کے متعلق تو تحقیق ہوگی یہ' کالج سے پتہ لے لیا جائے اس کی سہیلیوں سے پتہ لے لیا جائے۔ لڑکے کے متعلق صرف اتنا ہی ہوگا کہ دیکھ لیا جائے صاحب تنخواہ کتنی ہے کہاں ملازم ہے بنک کہاں ہے' کبھی کسی نے آج تک دیکھا ہے کہ اس کے متعلق بھی یہ چیز ہو۔ اگر یہ انتہائی آوارگی بھی ہو تو ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس کی شادی کر دیجیے پھر وہ بچ جائے گا۔ یعنی عصمت کا لفظ عصمت اس کی قدر اس کی قیمت۔ یہ جو ہر مختص ہو کے رہ گیا ہمارے ہاں جنسِ نازک کے لیے' مردوں کے لیے نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر مرد باعصمت ہو تو

عورت تو بے عصمت ہو ہی نہیں سکتی۔غور فرمالیا آپ نے' میں نے کیا کہہ دیا ہے۔

عصمت فروشی کے سلسلہ میں تحقیقی مرحلہ کے دوران علامہ پرویزؒ سے کیے گئے سوال کا جواب

ایک دفعہ بڑی تحقیق ہوئی تھی' سوال نامہ بھی جاری ہوا تھا کہ یہ جو ہمارے ہاں عصمت فروشی کے یہ اڈے ہیں' یہ سارا کچھ ہے ان کی روک تھام کا کیا انتظام کیا جائے۔بہت بڑی پرابلم معاشرے کے لیے بن گئی ہے۔قانونی طور پہ بھی یہ چیز حکومت کی طرف سے آئی تھی کہ جو بھی ہم اس کا انتظام کرتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ 'چودر بندی رِوزن سر برارند' وہاں ایک محلے سے ان کو نکالتے ہیں دوسروں کے محلوں کے اندر' چوہوں کی طرح یہ گھس جاتی ہیں۔سارا عیب سارا زور ان کے اوپر دیا جاتا تھا جو وہاں بیٹھی ہوئی ہوتی تھیں کہ کوئی انتظام کوئی بھی تدبیر جو ہم نے کی ہے آج تک کارگر نہیں ہوئی۔سوال نامے کچھ ہوئے تھے' میرے پاس بھی بھیج دیتے ہیں لوگ' ان کی مت ماری جاتی ہے۔اُنہوں نے کہا تھا کہ اس کا کیا انتظام کیا جائے' میں نے لکھا یہ تھا کہ مردوں کو وہاں جانے سے روک دیا جائے مسئلہ حل ہو گیا صاحب۔عصمت فروشی جسے کہتے ہیں وہ تو گاہک کے ہاتھوں بکتی ہے نا' مرد ہیں اس کے لیے ذمہ دار۔یہ وجہ ہے کہ جب قرآن نے کہا تھا نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو۔پہلے مومن مردوں سے کہا تھا پھر مومن عورتوں سے کہا ہے اس نے (24:30-31)۔اور اس جرم کی سزا دونوں کے لیے یکساں رکھی ہے بلکہ جہاں بالجبر ہے' وہاں تو عورت کا قصور ہی نہیں ہوتا۔مرد کے کیس میں تو کہیں شاذ ایسا آئے گا جسے بالجبر آپ کہیں گے ورنہ اسی لیے اس نے سزا جو ہے پوری رکھی ہے یہ ہے ہی نہیں کہ باہمی رضامندی سے یہ چیز ہو جائے' کچھ سزا کی بات نہیں ہے۔باہمی رضامندی کا سوال نہیں ہے اس لیے کہ ان چیزوں کا اثر ان افراد کے علاوہ پوری قوم پہ جا کے پڑتا ہے۔بڑی اہمیت دی ہے قرآن نے صاحب اس چیز کو۔

J.D.Unwin کی کتاب کے آخری الفاظ

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اب اس دور کی جو آزادانہ تحقیقات ہو رہی ہیں سیکس کے متعلق' خود یورپ کے مفکرین اور محققین وہ بھی اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اس کا اثر تو قوموں کی زندگیوں پر بڑا گہرا پڑتا ہے۔وہ کتاب میرے پاس ہے' جہاں وہ ختم کرتا ہے صاحب وہ ختم کرتا ہے یہ کہہ کے جب بھی انسانوں نے یہ نقطہ سمجھ لیا عصمت کا اور انہوں نے مرد اور عورت دونوں کی عصمت کے اوپر زور دیا کہ کوئی ناجائز ذریعہ طریقہ جو ہے وہ رائج نہ ہونے پائے' اس نے کہا ہے کہ انسانیت ان بلندیوں پہ پہنچے گی جن کا ہم آج تصور نہیں کر سکتے۔Last Words ہیں اس کے اس کتاب کے اندر' صرف اس ایک چیز سے وہ کہتا ہے انسانیت ان بلندیوں پہ پہنچ جائے گی جن کا ہم آج تصور نہیں کر سکتے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم میں۔

قومِ لوط کا جرم جو بدترین شکل اختیار کر چکا تھا جس کا نتیجہ وہ Dead Sea جہاں کوئی زندہ ہی نہیں رہتا

اب یہ جو چوتھی قوم ہمارے سامنے آئی ہے قومِ نوحؑ اور قومِ عاد اور قومِ ثمود' ان کے جرائم جو گنائے تھے وہ ہم نے دیکھا تھا ان کے غلط نظام کے جرائم تھے۔ قومِ لوطؑ کی طرف آتا ہے اس میں ایک جنسی جذبہ اور اس کی جو بدترین شکل تھی Perversion کی اس کو سامنے لایا ہے قرآن اور بتایا یہ ہے کہ جو قوم یہاں پہنچ جاتی ہے پھر وہ تباہ ہوتی ہے اور وہ تباہ ایسی جگہ ہوتی ہے کہ جس کا نام پھر Dead Sea ہے بحرِ مردار ہے نا اس کا نام۔ یہی تھی نا قومِ لوطؑ کی آبادی فلسطین کا علاقہ جس کو آپ Dead Sea کہتے ہیں' کوئی جاندار وہاں باقی زندہ ہی نہیں رہتا' وہی ہے Sodom سدوم اس کا نام ہے اس شہر کا۔ ایک چیز یہاں اور آتی ہے۔ اس سے پہلے انبیائے کرامؑ کا جو ذکر آتا ہے پہلے یا بعد میں بھی سارے انبیائے کرامؑ کا ذکر اس میں ہر نبی خدا سے براہِ راست گویا اس کو پیغام ملتے ہیں ان کے مطابق پھر وہ پیغامات آگے پہنچاتا ہے۔ اس قصے میں ایک عجیب سی استثنٰی ہے وَ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ بِالۡبُشۡرٰى (11:69) پہلے یہ بتایا کہ ابراہیم کے پاس آئے تھے اور یہاں سے ان کو مل کے وہ حضرتِ لوطؑ کی طرف گئے۔ کہا ہے کہ ہم نے اپنے پیغامبر بھیجے حضرتِ ابراہیمؑ کی طرف۔ ابراہیمؑ تو خود رسول ہیں۔ پھر یہ پیغامبر آئے انہوں نے آ کے (پھر آگے سارا قصہ اب آتا ہے) انہیں بھی حضرتِ ابراہیمؑ کو بھی انہوں نے لڑکے کی بشارت دی' پھر انہوں نے کہا کہ ہم جا رہے ہیں قومِ لوطؑ کی طرف کہ وہ تباہی کے آخری کنارے پر پہنچی ہوئی ہے۔ وہاں حضرتِ لوطؑ موجود ہیں وہ خدا کے رسول ہیں۔ تو یہ جو چیز ہے کہ یہ خود ابراہیمؑ رسول ہیں' حضرتِ لوطؑ رسول ہیں وَ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ (11:69) ہم نے اپنے پیغامبروں کو ان کی طرف بھیجا' یہ بڑی استثنائی (Exception) سی صورت ہے یہ' یہ کیا چیز ہے؟ ہمارے ہاں کے متقدمین نے تو یہ کہہ دیا کہ یہ فرشتے تھے اصل میں یہ ان کی طرف یہ آئے تھے' بات بنتی نہیں ہے کچھ' اول تو یہ کہ بہر حال ہر رسول کی طرف جو پیغام لے کے آتا تھا' خدا نے کہا ہے وہ تو ہوتا ہی فرشتہ تھا' ان کے ہاں یہ وہ آتے ہیں کہ جو آدمیوں کی شکل میں ہیں۔

انسانوں کی شکل میں فرشتوں کا تصور تو قرآن حکیم کے ہی خلاف ہے

آگے بات آئے گی کھانے پینے کی بات ہو رہی ہے۔ آپس میں باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ وہاں جا رہے ہیں' آدمی تھے۔ ہمارے ہاں کے محققین نے کہا کہ یہ تھے فرشتے' انسانوں کی شکل میں تھے۔ میں نے کہا ہے نا کہ ان کی قرآن پہ نظر نہیں ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے دو مقام پہ یہ کہا ہے نبی اکرم ﷺ کو جنگِ احزاب میں بھی اور جنگِ حنین میں بھی کہ وہاں خدا نے ملائکہ سے ان کی مدد کی' بالتصریح یہ ذکر ہے اور دونوں جگہ یہ ہے کہ لَّمۡ تَرَوۡهَا (33:9،9:26) تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ تو ملائکہ اگر انسانوں کے پیکر میں دنیا میں آئیں تو یہ تو

سوال ہی نہیں کہ انہیں دیکھ نہ سکے کوئی' ان کے لیے تو بتایا یہ ہے کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ملائکہ انسانوں کی شکل کے اندر دنیا میں نہیں آتے اس لیے یہ بات نہیں تھی کہ یہ ملائکہ تھے' انسان ہی تھے لیکن یہ ایک عجیب قسم کا انداز ہمیں نظر آتا ہے کہ خدا کا ایک پیغام ان کی طرف آرہا ہے اور وہ خدا کہتا ہے کہ رُسُلُنَآ ہمارے بھیجے ہوئے تھے۔

وحی کی کنہ حقیقت کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا

میں نے کئی دفعہ یہ بات کہی ہے کہ حضراتِ انبیائے کرامؑ نے جو پیغام دیا ہے انسانوں کو وہ پیغام تو ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن مقامِ نبوت کوئی غیر از نبی سمجھ نہیں سکتا' ہم نہیں جان سکتے خدا سے انہیں پیغام کیسے ملا کرتا تھا' وحی کی نوعیت کیفیت اور کنہ کیا ہوتی تھی۔ وحی محض خیالات کا نام تو نہیں تھا اسے تو خدا کلام اللہ کہتا ہے' وحی بالفاظہٖ وحی ہے۔ غیر از نبی تو ان کے زمانے کا ان کے ساتھ بیٹھا ہوا بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ آج جبکہ نبوت کا دروازہ ہی بند ہو چکا ہے' ہم آج کیا ساری دنیا کے انسان بھی' اس کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ وحی کی تو کیفیت بہت اونچی ہے جسے ہم اپنا خیال تصور کہہ سکتے ہیں' دوسرا انسان تو اسے نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیسے ہوتا ہے' میرے ذہن کے فکر' میرے تخیلات' میری Imagination میرے تصورات' میری Intuition میرا وجدان جسے ہم کہتے ہیں کوئی دوسرا انسان اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتا۔ یہ تو میں کس طرح سے فوراً اس نتیجے پہ پہنچ سکتا ہوں' دوسرا حیرت میں گم ہو جاتا ہے' اسے نہیں معلوم ہو سکتا' چھوٹی سطح پہ میں کہتا ہوں وہ چیزیں جو عام انسانوں میں مشترک ہیں۔ وحی جو صرف خاصۂ نبوت تھا اس کی کنہ اور حقیقت کیا تھی یہ نہیں ہم جان سکتے' ہم تو ایک طرف رہے قرآن تو یہ رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے کہ تو کل تک نہیں جانتا تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں کتاب کیا ہوتی ہے۔ خود نبی کو بھی اس سے پہلے یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کیفیت کیا ہے' اس لیے ان مقامات پر ہم اس طرح سے گفتگو نہیں کر سکتے کہ یہ کیسے تھا کس طرح سے ہوا۔ اصل میں ہمارا تعلق تو اس پیغام اور ہدایت سے ہے کہ جو ان کے ذریعے سے ہمیں ملی' وہ ایسی ہے کہ عقل وفکر اور علم وبصیرت کی رو سے سمجھ میں آسکتی ہے' ساری سمجھ میں آجاتی ہے صاحب۔ تو قرآن نے کہا یہ ہے کہ ہم نے اپنے فرستادہ ابراہیمؑ کی طرف بھیجے ایک بشارت دے کر۔ میں نے اس واقعہ کی تمہید ہی آج عرض کی ہے عام طور پہ تو وقت تو ڈیڑھ گھنٹے ہوتا ہے لیکن میں نے آج عرض کیا تھا کہ طبیعت میری اب بھی بحال نہیں' محض اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے میں نے یہ ہمت آج کی تھی اب میں محسوس کر رہا ہوں میں تھک گیا ہوں' کھانسی پھر اٹھ رہی ہے اس لیے میں معذرت چاہتا ہوں آدھا گھنٹہ پہلے ختم کرنے کا' مجھے امید ہے کہ آئندہ ہفتے تک اتنا قابل ہو جاؤں گا کہ پھر وہ ڈیڑھ گھنٹے کا درس جاری رہے' آج اسی پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ سورۃ ھود کی آیت 69 اسی سے ہم آگے شروع کریں گے اس کے سمجھنے کے لیے اس تمہید کی بھی بڑی ضرورت تھی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

بارہواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 69 تا 83)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1974ء کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 69 سے ہو رہا ہے۔ (11:69)

مقام نبوت ہو یا مقامِ وحی کوئی شخص بھی اس کی ماہیت کو نہیں جان سکتا

سابقہ درس میں بھی درس کا آغاز اسی آیت سے ہو رہا تھا لیکن اس میں اس کی تمہید ہی بیان ہو سکی تھی آیات پر ہم نہیں آ سکے تھے۔ اتنا اور دہرادوں کہ قرآنِ کریم میں یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو رسول آتے تھے' خدا سے ان کو وحی ملتی تھی اور اس وحی کو وہ دوسرے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ حضرتِ ابراہیمؑ بھی رسول تھے حضرتِ لوطؑ بھی رسول تھے جن کا ذکر ان آیات میں آ رہا ہے۔ لیکن یہاں ایک چیز استثنائی ہمارے سامنے آتی ہے' ایک Exception کی آتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى (11:69) ابراہیمؑ کی طرف ہمارے بھیجے ہوئے رسول قاصد پیامبر کچھ بھی کہہ لیجیے' کہا کہ ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیمؑ کی طرف گئے۔ یہ بھیجے ہوئے ویسے تو عام انسان بھی ہو سکتے ہیں عربی زبان میں ضروری نہیں کہ وہ جو اصطلاحی رسول ہے اسی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہو' عام قاصد کے لیے یہ استعمال ہوتا ہے لفظ' اس زمانے میں بھی ہوتا تھا' آج کی عربی زبان میں بھی یہ ہوتا ہے۔ عربوں کے ہاں آج بھی قاصد کو رسول ہی کہتے ہیں' عام پیامبر جو ایک دوسرے کی طرف جاتے ہیں۔ خود قرآنِ کریم نے بھی یہ خدا کی طرف سے بھیجنا جسے کہا جاتا ہے ہر مقام پہ وہ اصطلاحی رسول ہی اس سے مفہوم نہیں ہوتا مثلاً وہاں تو یہ بھی ہے وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (105:3) ہم نے ان کی طرف ابابیل وہ طیر بھیجے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ لفظ جو ہے رسول یا یہ ارسل کا لفظ ضروری نہیں کہ اصطلاحی معنوں میں رسولوں کے لیے آیا ہو۔ یا حضرتِ صالحؑ کے متعلق ہے اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ (54:27)۔ اس لیے عام معنی تو اس کے ہو سکتے تھے کہ کوئی انسان جو پیغام لے کے آئے ہوں لیکن آگے چل کے ان کے متعلق جو کچھ تفصیل آئی ہے اس سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ خدا کا پیغام لائے تھے۔ تو گویا پیغامبر تھے' رسول تھے انہی معنوں میں جن معنوں میں اصطلاحی رسول کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بھیجے گئے تھے قومِ لوطؑ کی طرف ان کی تباہی کے لیے آخری حجت بننے کی خاطر۔ تو میں نے جو عرض کیا ہے نا کہ یہ ایک استثنیٰ ہے اور وہ یہ کہ خود رسول ہیں یہ حضرتِ ابراہیمؑ' ان کی طرف یہ خدا کے پیغامبر آتے ہیں۔ تو بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا کی طرف سے براہِ راست یہ چیز وحی کے ذریعے سے خود حضرتِ ابراہیمؑ یا حضرتِ لوطؑ کی طرف کیوں نہ آئی' یہ دوسرے رسول ان کی طرف بھیجے گئے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ نبوت ایک ایسی چیز ہے جسے کہ ہم غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اس کی کنہ اور حقیقت کیا تھی۔ ہم اسی حقیقت پر ایمان لانے

کے لیے مکلّف ہیں کہ خدا کی طرف سے انہیں وحی ملتی تھی' کیسے ملتی تھی کیا کیفیت اس وحی کی ہوتی تھی' ہم نہیں جان سکتے۔اور پھر حضورِ خاتم النبین ﷺ کے بعد تو اس کی ضرورت بھی نہیں رہتی' آخری وحی حضورﷺ پر آ گئی' وہ وحی جو قرآن کے اندر اب محفوظ ہے۔اس وحی کو ہم سمجھ سکتے ہیں' ایک ایک بات اس وحی کی۔لیکن یہ کہ وحی ہوتی کیا تھی کیسے ملتی' اس کی حقیقت کیا تھی' نبی کیا ہوتا تھا' اس کی اپنی کیفیت کیا ہوتی تھی' ہمیں نہیں معلوم ہوسکتا۔نہ ہی ہمیں اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا تعلق اس وحی خداوندی سے ہے جو قرآن کے اندر ہے۔اس کے باہر پھر وحی کا تصور ہی اب ختم ہوگیا۔یہ وجہ ہے کہ قرآن بھی اس حقیقت کو بیان نہیں کرتا اور نہ ہمیں اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت ہے۔

وحی کی صرف ایک ہی شکل تھی جو آج قرآن حکیم میں محفوظ ہے اور اسی کا نام ختم نبوت ہے

یاد رکھئے وحی کے معنی ہیں خدا کی طرف سے براہِ راست کسی شخص کو کوئی علم ملنا اور وحی کی کوئی قسمیں نہیں ہوتیں اور وحی کے علاوہ کوئی شکل ہی نہیں ہے خدا کی طرف سے کسی کو اس طرح براہِ راست علم ملے۔یہ سب چیزیں غلط فہمیوں پہ مبنی ہیں یا مغالطہ آفرینیوں پہ مبنی ہیں۔بہر حال قرآن کے خلاف ہے جو یہ کہا جاتا ہے کہ ایک وحی ہوتی ہے وہ تو رسولوں اور نبیوں کے لیے مختص تھی' پھر الہام ہوتے ہیں' پھر کشف ہوتے ہیں' پھر مامور من اللہ آتے ہیں' یہ سب چیزیں ختمِ نبوتﷺ کی مہر کو توڑنے کے حربے ہیں یاد رکھیے صاحب۔ختمِ نبوتﷺ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم جو کسی انسان کو ملتا تھا' وہ ختم ہوا اب اس کے بعد کسی انسان کو خدا کی طرف سے کوئی علم براہِ راست نہیں مل سکتا۔جو دعویٰ کرتا ہے' وہ مدعیٔ نبوت ہے' خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ وہ رکھ لے۔خدا کی طرف سے ملی ہوئی وحی' آخری مکمل غیر متبدل' محفوظ قرآن کے اندر محفوظ ہے۔اور کتاب کی حفاظت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے بعد اب ضرورت نہیں ہے خدا کی طرف سے کچھ اور دینے کی تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط(6:115) مکمل ہوگئی خدا کی بات۔مکمل بھی ہوئی لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ(6:34) اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ(15:9) ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔مکمل غیر متبدل محفوظ کتاب اور وحی جب ہو تو پھر کسی کے آنے کی ضرورت کیا ہے اور کسی کو کسی قسم کا خدا کی طرف سے اور علم ملنے کے معنی کیا ہیں' بڑی غلط بات ہے۔

الہام اور کشف یہ سارے خود ساختہ تصورات ہیں

پہلے منوا لیا جاتا ہے کہ الہام ہوتا ہے' کشف ہوتے ہیں' خدا کی طرف سے بشارتیں ہوتی ہیں اور یہ پھر وہ سارے مسلمان اس کو مان لیتے ہیں' ہاں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔اور اسی کے اوپر اگلا رداجب رکھا جاتا ہے کہ صاحب جب یہ ملتا ہے تو ٹھیک ہے' وہ نبی ہوتا ہے اور یہاں آ کے کھٹکتے تھے۔ارے! شروع میں ہی تم پہلی اینٹ کیوں رکھنے دیتے ہو۔بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بات صرف نبیوں

تک مختص تھی۔ یہاں ایک چیز آئی ہے کہ خدا کے ایک رسول کی طرف اور رسول آتے ہیں‘ آگے باتیں انکی ہوتی ہیں۔ہم نہیں جان سکتے کہ یہ کیسے تھا۔اور یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ نبوت کا‘ الہام یا وحی جسے کہتے ہیں یہ Intuition وغیرہ جسے آج کل کہتے ہیں‘ وجدان جسے کہتے ہیں بالکل اس سے الگ چیز تھی یہ۔وَ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ بِالۡبُشۡرٰى قَالُوۡا سَلٰمًا ؕ (11:69) ہمارے فرستادہ پیغامبر‘ قاصد ابراہیمؑ کی طرف گئے اور ان سے جا کے کہا کہ سلامتی ہو تم پر۔

السلام علیکم کے الفاظ بڑے پُر معنی مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہیں

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ بڑی چیز ہے جسے السلام علیکم کہتے ہیں۔یہ یہی معنی نہیں ہیں کہ تم محفوظ رہو میری طرف سے‘ یہ بھی بڑی چیز ہے اپنی طرف سے Assurance دلا دینا کسی کو کہ میرے ہاتھوں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا‘ تم محفوظ رہو گے۔لیکن یہ پھر Negative Aspect ہے‘ ایک منفی صفت ہے حفاظت‘ اس میں کوئی Achievement نہیں ہے۔سلام کے معنی صرف سلامتی نہیں ہیں اس میں صرف Security نہیں‘ امن ہی نہیں‘ اس کے معنی کسی کو مکمل کرنا بھی ہیں‘ مسلم کے معنی ہی وہ ہوتا ہے جس کی تکمیل ہو چکی‘ ہو مکمل ہو گیا ہو۔تو جب یہ کہا جاتا ہے سلام تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم محفوظ بھی ہو میرے ہاتھوں اور میں تمہاری تکمیلِ ذات کا ذریعہ بھی بنونگا‘ یوں یہ منفی اور مثبت دونوں پہلو اس کے اندر ہوتے ہیں۔سلام۔قَالَ سَلٰمٌ (11:69) اُنہوںؑ نے بھی جواب میں کہا کہ میرا بھی تمہارے ساتھ یہی برتاؤ رہے گا۔عزیزانِ من! جو بات ہزار بار کہی گئی‘ ہزار بار اور کہونگا اتنی سی چیز کہ دو فرد‘ دو انسان آپس میں ملیں جس وقت اور ان کا ایک دوسرے کے متعلق ری ایکشن اور Behaviour یہ ہو کہ میری طرف سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ جو کمی تم میں کوئی ہے میں اس کو بھی پورا کرونگا اور وہ مقابل سے کہیں گے کہ اسی طرح سے میرے ہاتھوں سے بھی تمہیں تکلیف نہیں پہنچے گی اور میں بھی تمہاری تکمیلِ ذات کا ذریعہ بنونگا۔میں کہتا ہوں کہ اسی ابتداء سے آپ دیکھ لیجیے کہ مسلم معاشرہ ہوتا کیا ہے اس میں ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ تعلق کیا ہوتا ہے۔صرف اتنی سی چیز سے کہ جب وہ ملیں سو بار ملیں دن میں سو بار یہ Assurance ایک دوسرے کو ضمانت دیدیں السلام علیکم اور وعلیکم السلام۔فَمَا لَبِثَ اَنۡ جَآءَ بِعِجۡلٍ حَنِيۡذٍ (11:69) وہ مہمانداری تو ویسے بھی عام عربوں کے ہاں ہی نہیں Semitic Race میں ان کے ہاں کا معمول تھا اور پھر حضرتِ ابراہیمؑ تو ان چیزوں میں بہت آگے تھے‘ گھر میں مہمان آئے اور فوراً گئے اور وہاں سے گوشت کا ایک ٹکڑا بھنا ہوا بچھڑا جسے کہتے ہیں وہ لے آئے کھانے کے لیے۔

ملائکہ کے متعلق ہمارے ہاں پائے جانے والے تصورات کی نوعیت

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيۡدِيَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَيۡهِ نَكِرَهُمۡ وَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ (11:70) انہوں نے دیکھا کہ کھانا رکھا ہے ان کے سامنے

لا کر لیکن ان مہمانوں کا ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتا۔ یہاں سے عام طور پہ ہمارے ہاں کہتے ہیں یہ' یہ ان رسولوں کے متعلق ہمارے ہاں بہت سی روایتیں ہیں عام طور پہ کہا یہ گیا ہے کہ یہ ملائکہ تھے تو اسی لیے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے کہ ملائکہ کھایا نہیں کرتے۔ اُنہوں نے نہیں سوچا کہ ملائکہ انسان کا روپ دھار لیتے ہیں' بشکلِ انسان آجاتے ہیں' بشریت کے پیکر میں تو آجاتے ہیں وہ' چلتے پھرتے سانس لیتے ہیں' کھاتے نہیں ہیں۔ کہتے ہیں ملائکہ ہوتے ہیں یہ غلط چیز ہے۔ ملائکہ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ وہ نظر ہی نہیں آتے کسی کو' ہم آپ تو ایک طرف رہے قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق' صحابہؓ کے متعلق دومرتبہ دو جنگوں میں خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم نے ملائکہ سے ان کی مدد کی تھی اور دونوں جگہ تصریحاً کہا ہے لَّمۡ تَرَوۡهَا (9:26,33:9) تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ تو جب ملائکہ کو جو اتنی تعداد میں آئے تھے' ہزاروں کی تعداد میں جنہیں کہا جاتا ہے تو قرآن نے تصریح کی ہے کہ تم دیکھ نہیں سکتے تھے انہیں۔ اس لیے یہ بات غلط ہے کہ ملائکہ انسانوں کے جسم میں پیکر میں سامنے آتے تھے یا یہ ملائکہ تھے' ملائکہ کی بات نہیں ہے۔ اور دور از کار بات ہے۔ اتنے سے یہ کہنا کہ چونکہ انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اس لیے سمجھ لیا جائے کہ وہ انسان نہیں تھے' ملائکہ تھے۔ بیسیوں مرتبہ آپ دوستوں کے گھر جاتے ہیں وہ کئی چیزیں پیش کرتے ہیں آپ کہتے ہیں کہ نہیں نہیں میں نے کچھ نہیں کھانا آج' آپ نہیں ہاتھ بڑھاتے تو آپ فرشتے ہوتے ہیں کیا۔ یہ ایک معمول کی سی بات ہے ٹھیک ہے انہوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا کھانے کے لیے' نہیں جی چاہتے' روزے سے ہونگے کچھ بھی ہوگا۔ نَكِرَهُمۡ (11:70) یہاں سے بات واضح ہوگئی۔

باہمی میل جول کے دوران دوسروں کے اطوار کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوتا

یہ بات ضرور ہے اور عربوں کے ہاں تو اب تک بھی یہ چیز ہے کہ کسی کے ہاں کوئی جائے اور اس کے ہاں اگر وہ پانی تک بھی نہ پئے' اسے دوست نہیں سمجھا جاتا اپنوں میں سے نہیں سمجھا جاتا' یہ پہچان ہے وہاں کی۔ کچھ بھی نہ کھاؤ' پانی کا گھونٹ پی لیجیے سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ اپنوں میں سے ہے۔ لیکن اگر دشمن ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ اس گھر کا کچھ چکھے گا نہیں' اس گئے گذرے زمانے میں بھی کیفیت یہ ہے۔ دوست دشمن کی کچھ تو پہچان ہوجاتی ہے۔ ہمارے ہاں صبح سے شام تک اکٹھے کھاتے پیتے ہیں اور پیتے ہیں کے اوپر اور زور دید یجیے اور خنجر آستیں میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی وہاں کم از کم آنے والے کے متعلق اتنا تو پتہ ہے یعنی دشمن بھی وہاں آتا ہے تو کم از کم منافق بن کے تو نہیں آتا۔ اس کا نہ کھانا یہ تو اسے بتا دیتا ہے گھر والوں کو کہ اپنوں میں سے نہیں ہے۔ اتنی سی بات تو ہے' ہمارے ہاں تو یہ بات بھی ختم ہوگئی صاحب۔ یہ خود نَكِرَهُمۡ جو ہے اس نے بات واضح کر دی' اُنہوں نے سمجھ لیا کہ اپنوں میں سے نہیں۔ اور اسی وجہ سے وَ اَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ (11:70) انہوں نے کچھ خدشہ سا محسوس کیا۔ دیکھا نا وہی بات آ گئی نا جو میں نے کہا تھا کہ گھر میں کوئی مہمان آئے اور

جو کچھ آپ پیش کریں، اگر وہ اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے تو ان کے ہاں کی Tradition کے مطابق روایت کے مطابق یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ یہ دوست نہیں ہے۔اس لیے انہیں کچھ خطرہ سا محسوس ہوا۔

آواز جو سنائی نہ دے' کے الفاظ اپنے اندر ایک گہرا مفہوم لیے ہوئے ہیں

عربی زبان جاننے والے اس کو Appreciate کریں گے قرآن عجیب الفاظ استعمال کرتا ہے' ایک تو اس زبان کے الفاظ عجیب سے اور قرآن پھر جو استعمال کرتا ہے۔اَوۡجَسَ (11:70) یعنی یہ چیز ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ معنی کیا ہیں' ایسی آواز جو سنائی نہ دے۔کیا بات ہے اس آواز کی جو سنائی نہ دے' جسے ہم کہتے ہیں Intuitionally کچھ اندر محسوس کیا اس کی وجہ تو وہ نہیں بیان کر سکتے تھے۔آواز جو سنائی نہ دے' اندر سے دل سے ایک آواز ابھری' آواز ایسی تھی جو سنائی نہ دے' دوسرے کی آواز تو سنائی دیتی ہے نا۔آواز اپنے دل کی آواز اندر سے' تو یہ جو ہے نا' محسوس کیا اس کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا کہ ایک ایسی آواز جو سنائی نہ دی۔اس آواز نے کہا کہ کچھ خطرہ ہے۔بڑا لطیف انداز ہوتا ہے عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ کا بھی۔خِیۡفَۃً ؕ (11:70) محسوس کیا اس طرح کہ آواز بھی سنائی نہیں دی۔آواز سنائی نہیں دی قَالُوۡا لَا تَخَفۡ (11:70) انہوں نے چہرے سے پہچان لیا۔دیکھا اُدھر اَوۡجَسَ ہے ایسی آواز جو سنائی نہ دے' اس نے کہا خطرہ ہے۔سامنے وہ بھی تو اسی قسم کی فطانت لیے ہوئے تھے' انہوں نے کہا کوئی بات نہیں' زبان سے تم نے کچھ نہیں کہا' وہ چہرے سے بھانپ گئے کہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔یہ چہرے سے بھانپ لینے والی چیزیں جو ہیں اس کو کون چھپا سکتا تھا۔

دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج

نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

'دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج' اندر سے آواز آتی ہے جو سنائی نہیں دیتی کہ کچھ خطرہ ہے' چہرہ غمازی کرتا ہے اور دوسرا سامنے سے پڑھ لیتا ہے اور کہتا ہے لَا تَخَفۡ (11:70) ڈرنے کی بات نہیں ہے۔اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمِ لُوۡطٍ (11:70) ہم قومِ لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

حضرت اسماعیل کے بعد حضرت سائرہ کے ہاں حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کا ذکر جس میں کوئی مافوق الفطرت بات نہ تھی

یہاں اتنی سی بات ہی کی ہے آگے بات جو ہے وہ حضرتِ ابراہیمؑ کے گھر کے متعلق شروع ہوگئی۔وَ امۡرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ فَضَحِکَتۡ (11:71) بیوی بھی پاس کھڑی تھیں وہ مطمئن ہوئیں کہ خیر خطرے کی بات کوئی نہیں ہے۔فَبَشَّرۡنٰہَا بِاِسۡحٰقَ ۙ (11:71) اُنہوں

نے ایک بیٹے کی بشارت دی۔نظر آتا ہے کہ حضرتِ ہاجرہ کے بطن سے تو حضرتِ اسماعیلؑ کی پیدائش ہو چکی تھی وہ بڑے تھے' اس کے بعد ان کے ہاں پھر اور اولاد نہیں تھی یہ جو تھی حضرتِ سائرہ' ان کے بطن سے اولاد نہیں تھی' یہ وہاں بشارت مل رہی ہے حضرتِ اسحٰقؑ کی۔وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ (11:71) اور یہ بھی کہ اس کی نسل بھی آگے چلے گی۔اتنا کہنے سے آپ نے دیکھا وہ جو عورت کے جذبات ہوتے ہیں وہ کیسے ابھر کے سامنے آ رہے ہیں۔حضرتِ ابراہیمؑ کے تو اولاد تھی حضرتِ اسماعیلؑ تھے' یہ جوان کی بیوی تھی سارہ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی' عورت کو تو اس کا غم کھائے جا رہا ہوتا ہے نا کہ آگے اولاد نہیں چلی' آگے نسل نہیں چلی۔اسحاقؑ کی بشارت دی اور اس کے بعد پوتے کی بھی بشارت دی یعقوبؑ کی بھی بشارت دی۔بڑھاپا تھا۔قَالَتۡ یٰوَیۡلَتٰٓی ءَ اَلِدُ وَ اَنَا عَجُوۡزٌ وَّ ھٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا ؕ (11:72) کہا کیا کہا تم نے! میرے ہاں بچہ پیدا ہوگا' یہ عمر میری' خاوند کی بھی یہ عمر بوڑھا اور تم کہتے ہو کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔اِنَّ ھٰذَا لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ (11:72) یہ تو کچھ بڑی تعجب انگیز سی بات تم نے کہی۔قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ (11:73) انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں خدا کی اس بات پہ تعجب آ رہا ہے کہ وہ اپنی رحمت سے اپنی برکت سے تمہیں اولاد دے' اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ (11:73) وہ بہت کثرت سے دینے والا ہے صاحبِ حمد و ستائش ہے۔ان باتوں سے بھی عام ہمارے ہاں ذہن چلا جاتا ہے پھر وہی معجزات ہی کی طرف' کرامات ہی کی طرف۔بات تو اتنی سی ہی کہی ہے نا کہ میں بڑھیا ہو گئی ہوں' عام طور پہ ایک عمر میں جا کر سمجھ لیا جاتا ہے کہ عورتیں اب اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہیں۔حضرتِ ابراہیمؑ کی اس بیوی کے متعلق تو نہیں لیکن حضرتِ ذکریاؑ کی بیوی کے متعلق جو قرآن نے کہا ہے' وہاں بھی یہ قصہ تھا کہ ان کے ہاں بھی اولاد نہیں تھی اور ان کو بھی خوشخبری دی گئی وہ بوڑھے بھی ہو گئے ہوئے تھے۔ان کے متعلق قرآن نے جب کہا ہے نا کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا تو اس میں کہا ہے وَ اَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ ؕ (21:90) کہ ہم نے اس کی بیوی کو ایسا کر دیا کہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا ہو گئی۔اور پھر اَصۡلَحۡنَا لَہٗ ؕ (21:90) میں آپ دیکھئے کتنی خوبصورت بات ہے کہ وہ مرد جو تھا اس میں تو تھی صلاحیت پیدا کرنے کی' اس مرد کے لیے اس بیوی میں صلاحیت پیدا کر دی اولاد پیدا کرنے کی۔تو نظر آتا ہے کہ یہ عام ایک کوئی علاج ہے جس سے یہ ہو سکتا ہے اور علاج سے یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں کوئی فوق الفطرت بات نہیں ہے۔اَصۡلَحۡنَا ؕ (21:90) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جانا یہ ہے جو کچھ قرآن نے کہا ہے۔بہرحال یہاں اتنی سی چیز ہی ہے کہ انہوں نے اس کی بشارت دی۔فَلَمَّا ذَھَبَ عَنۡ اِبۡرٰھِیۡمَ الرَّوۡعُ وَ جَآءَتۡہُ الۡبُشۡرٰی (11:74) جب گھبراہٹ دور ہوئی حضرتِ ابراہیمؑ اور پھر خوشخبری بھی دوسری طرف سے ملی تو اطمینان ہوا بات سنی۔اُنہوں نے کہا ہوگا کہ ہم جا رہے ہیں قومِ لوطؑ کی طرف کہ وہ تباہ ہونے والی ہے۔یہاں بڑا عجیب فقرہ یہاں آتا ہے۔

قوم لوطؑ کی بدنہادی پر حضرت ابراہیمؑ کی وساطت سے وحی کا پیغام

یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ (11:74) حضرتِ ابراہیمؑ نے جھگڑا شروع کر دیا ہمارے ساتھ اس قومِ لوطؑ کے معاملے میں۔ حضرتِ ابراہیمؑ کی ہستی بڑی عجیب وغریب ایک ہستی' بزرگ خاندان جیسے ہوتے ہیں کچھ اس قسم کے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ معلوم جب کہا کہ اس قوم کی تباہی آنے والی ہے تو انہوں نے بحث کرنی شروع کر دی کہ صاحب کیوں تباہی آئے ان لوگوں کی' اصلاح کی صورت پیدا کی جائے۔ اب جو میں نے کہا تھا نا کہ وہ جو آئے تھے رسول پیغامبر' عام لوگ نہیں تھے خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے تھے یہاں سے وہ بات شروع ہوتی ہے۔ باتیں تو حضرتِ ابراہیمؑ ان سے کر رہے ہیں نا کہ کیوں بھئی کیوں تباہی تک پہنچ چکے کچھ تھوڑا سا اور انتظار کرو' تھوڑی سی مہلت ان کو دینی چاہیے' ممکن ہے اصلاح کی کوئی شکل نکل آئے' بچ ہی جائیں وہ۔ لیکن کہا ہے یُجَادِلُنَا (11:74) وہ ابراہیمؑ ہم سے جھگڑ رہے تھے' خدا کہتا ہے۔ جھگڑ تو رہے تھے ان سے وہ جو آئے تھے تو اب اس سے نظر آیا نا کہ وہ خود اپنی طرف سے یہ کچھ نہیں کہہ رہے تھے' خدا کی بات تھی جسے پہنچانے کے لیے آئے تھے۔ اسی لیے کہا یہ یُجَادِلُنَا (11:74) میں نے عرض کیا نا کہ حضرتِ ابراہیمؑ کی شخصیت عجیب نظر آتی ہے بھاری بھر کم سی' یہی تھے جو کہنے والے تھے اَرِنِیۡ كَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ (2:260) مجھے دکھایئے کہ طریقہ کیا ہے اس مردہ قوم کو زندہ کرنے کا۔ کہا گیا تھا کہ کیا تم ایمان نہیں لائے' اُنہوں نے کہا کہ ایمان تو لایا ہوں وَ لٰكِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ؕ (2:260) میں اطمینان کرنا چاہتا ہوں اپنے دل کا کہ وہ طریق معلوم ہو جائے کہ جس سے مردہ قومیں زندہ ہوا کرتی ہیں۔ دیکھتے ہیں نا یہ انداز جو ہے بڑا چھپتا سا ایک انداز ہے یہ۔ یہاں بھی وہی بات کہی ہے یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ (11:74) قومِ لوطؑ کے بارے میں ہم سے انہوں نے کچھ بات شروع کی۔ اور وہ ہے جو میں نے کہا تھا بڑا عجیب ٹکڑا آ گیا اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ لَحَلِیۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیۡبٌ (11:75) کیا بات ہے قرآن کی عزیزانِ من!!! جیسا کہ برسوں سے کہتا چلا آ رہا ہوں' اتنی سی عربی زبان ضرور سیکھ لیجیے جس سے قرآن سمجھ میں آ جائے' کچھ مشکل نہیں ہے۔ اور اس کے بعد ایک لغت لے لیجیے' میں نے یہ محنت کر دی ہے اس لغت کے اندر کہ ان الفاظ کے مادوں کے اعتبار سے معنی متعین کر دیے ہیں اور اس کے بعد خود سمجھئے قرآن کو' یہ بات سمجھ ہی میں آنے کی نہیں ہے' اس میں لذت بڑی ملے گی آپ کو' ایک کیف حاصل ہوگا آپ کو' جب آپ دیکھیں گے کیا الفاظ استعمال کئے۔ ابراہیمؑ نے ہم سے جھگڑنا شروع کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی حلیم الطبع شخصیت کی خصوصیات کی حقیقی شکل وصورت

کیا بات ہے ابراہیمؑ کی!! اَلۡحَلِیۡمُ (11:75)۔ تین صفتیں یہاں بیان ہو رہی ہیں' پہلی چیز تو ہے حلیم' ہمارے ہاں تو حلیم الطبع کے معنی ہوتا ہے نا منکسر المزاج بہت ہی نرم طبیعت کا' کوئی دو طمانچے بھی مار جائے' تو کچھ نہیں کہنے والا۔ اسی حلیم سے ہے نا وہ جو حلیم پکا

کرتی ہے' پکا کرتی تھی اب تو ہے والی بات مدت ہوگئی۔ اب تو ہمارے ہاں کی لڑکیاں یہ بھی نہیں جانتیں ''دال گل کے حلیم ہوگئی اے'' وہ حلیم جو پکتی تھی ست اناجا' اس کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ کوئی دانہ رڑکتا نہیں تھا اس میں۔ یہ ہمارے ہاں کی حلیم ہے' قرآن کی' نہیں عربی زبان کی نہیں ہے۔ یہ صفت جو ہے یہ عیسائیت کی صفت ہے یہ تصور جو ہے' رہبانیت کا ہے وہی ''ہو جا ککھ میست دا جنوں کیندے نیں'' کسی کے پاؤں کے نیچے رڑکے ہی نہیں۔ یہ آپ کے ہاں کا پھر تصوف کا تصور ہے قرآن کے مومن کا تصور نہیں ہے۔ وہ تو اگر رحماء بینھم ہے تو اشداء علی الکفار بھی ہے دونوں چیزیں ہیں (48:29)۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔ میں نے کہا کہ یہ تصور اگر آپ لیں گے حلیم کا' یہ تصور جو ہے یہ تو عیسائیت کا تصور ہے ایک گال پہ طمانچہ کھا کے دوسرا گال سامنے کر دینا۔

عربی زبان میں حلیم کے لفظ کا استعمال اور مومن کی سیرت کا بیان

عربی زبان میں حلیم کہتے ہیں کہ جو ایسے ہی چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر یونہی بھڑک نہ اٹھے۔ عجیب لفظ ان کے ہاں یہ استعمال ہوتا تھا۔ کمزور قسم کے یہ مویشی وغیرہ ان کی تو کیفیت ہوتی ہے اپنے ڈر کے مارے کوئی پاس سے بھی یوں گذر جائے تو یونہی' سر یونہی کر دیتے ہیں اپنے اندر کا ڈر ہوتا ہے انہیں۔ اور ان کے ہاں ایسا اونٹ نہایت قوی الجثہ' صحت مند وہ بیٹھا ہوا ہے' بچے آ رہے ہیں کوئی اس کی گردن پہ سوار ہو رہا ہے کوئی کان مروڑ رہا ہے' کوئی اتر رہا ہے اور وہ یہ نہیں ہے' ورنہ وہ ذرا یوں کرے وہ جائیں سارے بچے' وہ نہایت اطمینان سے جگالی کرتا رہتا ہے بیٹھا ہوا کہ ان باتوں سے کیا بگڑتا ہے ہمارا۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر جو بھڑک نہ اٹھے وہ اس قسم کے اس اونٹ کو حلیم کو کہتے تھے' تو حلم جو ہے حلیم ہونا چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ جو بھڑک نہ اٹھے۔ عجیب لفظ یہاں لائے۔ انہوں نے کہا ہوگا نا کہ وہ قوم لوطؑ میں یہ خرابی آ گئی یہ خرابی آ گئی' اب حلیم الطبع ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ پھر اتنی سی بات کے اوپر تباہ کر دینے والی بات جو ہے' وہ ٹھہرو ذرا اطمینان کرتے ہیں دیکھتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک بات چھوٹی سی تھی اتنی سی بات پہ بھڑک نہیں اٹھا ابراہیمؑ کہ واقعی مار دینا چاہیے' مسل دینا چاہیے۔ کیا کیا بات قرآن لاتا ہے ایک لفظ بیان کیا ہے۔ اس کے بعد یہ جو چیز تھی وہ جو **یجادلنا** ایک تو یہ تھی کہ چھوٹی سی بات پہ بھڑک نہیں اٹھتا تھا **اَوَّاہٌ** بڑا ہی ہمدرد واقع ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم اپنے سینے میں بڑا دردمند قلب رکھتے تھے۔ اب ایک طرف سے قوی ہے' بھاری بھرکم بھی ہے' ذرا ذرا سی بات پہ بھڑک نہیں اٹھتا' اور سینے میں ایک قلب ہے دردمند۔ دو صفتیں بڑی عمدہ تھیں ان کے لے یہ بات صاف ہو جاتی تھی لیکن یہ تو قرآن ہے مومن کی صفت بیان ہو رہی ہے عزیزانِ من! ۔ یہ دونوں صفات ایسی تھیں جو قابلِ ستائش ہیں' بہت اچھی ہیں لیکن کیا ہر حالت میں یہ اچھی ہیں۔ اگر یہ ہر حالت میں اچھی ہیں تو **اَشِـدَّآءُ عَـلَـی الْکُفَّارِ** (48:29) تو یہ ہو نہیں سکتا' اگر ہر حالت میں اچھی ہیں تو نبی اکرم ﷺ سے متعلق ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی رحمت تھی

کہ تو بڑا نرم دل واقع ہوا تھا' غلیظ القلب نہیں تھا' سنگدل نہیں تھا درد مند دل تھا تمہارے سینے میں' اسی لیے اتنی بڑی جماعت وہ پیدا ہوئی۔ اور اسی رسول ﷺ سے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ کفار اور منافقین وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ (9:73,66:9) نہایت سختی سے گرفت کروان کی۔ اسی رسول ﷺ کے متعلق ایک طرف ان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ خدا کی یہ رحمت اور برکت تھی کہ تو بڑا نرم دل تھا غلیظ القلب یہ نہیں تھا (3:159)' یہ کن کے متعلق ہے؟ یہ جو رفقاء ہیں یہ جو ساتھی ہیں یہ جو خدا کے قانون کے سامنے جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ یہ کیفیت۔ وہی رسول ﷺ جس کے متعلق کہا ہے کہ یہ خدا کی رحمت تھی کہ تو غلیظ القلب نہیں تھا اس کے متعلق حکم دیا جاتا ہے وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ (9:73-66:9) وہی لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ تو اگر کوئی حَلِیۡمٌ (11:75) اور اَوَّاہٌ (11:75) ہو اور وہ ہر مقام کے اوپر نرمی ہی شو کرے تو پھر دین تو قائم نہیں ہوسکتا۔

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

کانٹے اگر ریشم کے بنے ہوئے ہوں تو پھول کی حفاظت نہیں کر سکتے پھول کی حفاظت کے لیے کانٹوں کا سخت ہونا ضروری ہے۔

عیسائیت کے ہاں صفات خداوندی کا ذکر اور پھر قرآن حکیم کا بیان

اب صفت بیان ہو رہی ہے حَلِیۡمٌ (11:75) سے اَوَّاہٌ (11:75) سے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے تو عیسائیت سے پوچھئے تو ان کے ہاں ایک ہی صفت ہے God is Love , God is mercy , Mercy خدا رحم ہے محبت ہے کوئی دوسری صفت خدا کی نہیں ہے۔ قرآن کا خدا بھی جو ہے وہ ارحم الرحمین ہے (21:83) بہت زیادہ رحم کرنے والا' وہاں تو صرف Mercy کہا تھا یہاں تو ارحم الرحمین کہا جا رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کو شدید العقاب بھی کہا جا رہا ہے' بڑی سختی سے پکڑنے والا۔ سختی سے پکڑنے والا اگر نہ ہو عزیزانِ من! تو پھر شر کی مدافعت ہی نہیں ہوسکتی دنیا میں' فساد انگیز قوتیں بیباک ہو جاتی ہیں۔ خود عیسائیوں کی دنیا کی تاریخ بتا رہی ہے کہ ایک گال پہ طمانچہ کھا کے دوسرا گال سامنے کر دینے سے' دو دن بھی نہیں چل سکتے' ان کو اسلحے بنانے پڑتے ہیں' ان کو فوجیں رکھنی پڑی ہیں۔ اور Crusade میں تو خود یہ اتنے اتنے بڑے یہ پوپ اور پادری ان کو Lead کیا کرتے تھے فوجوں کو۔ عیسائیت کا وہ تصور رحم اور Mercy کا دھرے کا دھرا رہ گیا۔ انسانوں کا خود ساختہ تصور تھا نا نہیں چل سکا۔ تصور مومن کا تو یہی ہوگا کہ نہایت رحم دل بھی ہوگا لیکن جہاں عدل کا تقاضا ہوگا وہاں پھر وہ بڑا سخت گیر ہو جائے گا۔ اب یہ جو ابراہیمؑ کی یہ دو صفتیں ہیں حلیم الطبع اور اواہ کی صفت جو ہے' بڑا درد مند قلب پایا ہوا تھا تو اگر ہر مقام کے اوپر یہی صفت ہوتی تو یہ خدا کے اولوا العزم رسول تو ایک طرف ایک مومن بھی نہیں ہوسکتے

تھے۔ایک ہی صفت اگر ہوتی تو راہب تو ہوسکتے تھے یہ' تکیوں اور گوشوں میں بیٹھنے والا فقیر تو ہوسکتا تھا مردِ مومن نہیں ہوسکتا تھا۔اگلی بات ہے عزیزانِ من! جس کے لیے میں نے اتنی تمہید دہرائی ہے قرآن ہے لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ (11:75) لیکن مُّنِيْبٌ (11:75)

مومن اپنے قلب ونظر میں ایک سرجن کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتا ہے

اپنی دردمندی میں بھی فیصلہ ہمارے ہاں سے لیتا تھا۔یہ بات ہے عزیزانِ من! مُّنِيْبٌ ' ہماری طرف رجوع کرتا تھا وہ۔دل تو بڑا دردمند پایا تھا لیکن یہ کہ کیا یہ مقام ایسا ہے کہ جہاں میں دردمندی کا اظہار کروں اور یہاں مرہم لگاؤں' ہم سے پوچھتا تھا کہ کیا فرمان ہے۔طبعًا اور مزاج کے طور پہ بھی جو دردمند دل رکھنے والا ہے'اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ جو موقعہ سامنے آئے از خود فیصلہ نہ کرے پوچھے قانونِ خداوندی سے۔عزیزانِ من! سرجن نشتر بھی چلاتا ہے سرجن اس کے بعد مرہم بھی رکھتا ہے اگر سرجن کے پاس صرف مرہم ہی کا ڈبہ ہو اور اس کے پاس وہ نشتر نہ ہو وہ چاقو نہ ہو' ہو تو وہ ڈبے میں ہی رکھا ہوا ہو' وہ علاج نہیں کرسکتا۔کیا کرتا ہے وہ' مریض سامنے آتا ہے تو وہ اپنی وہ جو اس کی ڈاکٹری کا کوڈ ہے اس سے پوچھتا ہے کہ کاٹ دوں یا صرف مرہم سے ہی علاج کردوں' ہوسکتا ہے کہ مرہم سے علاج ہوجائے۔اور اگر ایسی صورت نہیں ہے اس کا وہ علم بتا رہا ہے کہ نہیں نشتر کی ضرورت ہے تو وہاں نشتر لگانا پڑتا ہے' کاٹنے کے بعد پھر وہاں وہ کہتے ہیں اب مرہم لگاؤ۔اس کے ڈبے میں نشتر اور مرہم دونوں ضروری ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کب نشتر چلے گا' کب مرہم لگے گی' یہ فیصلہ کسی قاعدے اور قانون کے تابع ہوگا جذبات کے تابع نہیں ہوگا۔

لفظ منیب کا قرآنی مفہوم اور اس کے استعمال کا طریق

منیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ نشتر بھی رکھتا تھا' مرہم بھی رکھتا تھا لیکن جب مریض سامنے آتا تھا تو وہ پھر قانونِ خداوندی سے پوچھتا تھا کہ کون سی چیز استعمال کروں۔اور جس کے پاس نشتر ہے ہی نہیں' مرہم ہی مرہم ہے اس کو تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔وہ مرہم ہی لگاتا چلا جائے گا۔اب آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن دو لفظوں کے اندر کس طرح پورا تصور جو ہے عیسائیت کا' اس کی تردید کر گیا اور دوسری طرف ہلاکو اور چنگیز جو ہیں ان کے مسلک کو بھی باطل قرار دیدیا۔عیسائیت کے سینٹ کے پاس صرف مرہم ہوتی ہے' ہلاکو کے پاس صرف تلوار ہوتی ہے' مومن کے پاس تلوار بھی ہوتی ہے مرہم بھی ہوتی ہے۔اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (11:75) ۔جج ہمارا جب عدالت کی کرسی پہ بیٹھا ہوا موت کی سزا کا حکم سنا دیتا ہے تو یہ نہیں کہ وہ سنگدل ہوتا ہے' ہوسکتا ہے کہ وہ قاتل کو' ملزم کو' موت کی سزا کا حکم سنائے اور پھر اس کے بچوں کی عمر بھر کے لیے دادرسی بھی کرتا رہے' یہ دونوں صفتیں ہونی چاہئیں۔رحم کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اگر بچے یتیم ہوجاتے ہیں تو ان کے سر پہ ہاتھ رکھے' اس کی مدد کرے' عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ قتل کا مجرم ثابت ہوگیا ہے تو سزائے موت کا حکم سنا دے۔اس

مقام پہ اگر وہ اواہ دردمند دل رکھنے والا جج ہوگا تو وہ جج نہیں بن سکتا اور جب اس کے یتیم اس کے پاس آئیں گے' اسے وہ طمانچہ مار دے گا جیسے اس کو حکم سنا دیا تھا پھانسی کا' یہ انسان نہیں ہوسکتا۔

جج اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ

پھر دہرادوں اس واقعہ کو کہ جو عظیم واقعہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا آتا ہے آپ کئی دفعہ سن چکے ہیں لیکن بار بار سنانا پڑتا ہے۔

یہی دو صفتیں اکٹھی جو ہیں حضور ﷺ کے سامنے وہ مجرم آیا یہودی قاتل' قتل کی سزا کا حکم سنا دیا تھا قاعدے کے مطابق۔ سزا سامنے دی جایا کرتی تھی۔ سزا کے لیے وہ جھکا تھا جلاد سر پہ تلوار لیے کھڑا تھا' انتظار میں تھا حضور ﷺ کی طرف سے' جج کی طرف سے اشارہ پانے کا کہ اتنے میں اس مجرم کی بچی چھوٹی سی چیختی چلاتی روتی دھاڑیں مارتی آئی حضور ﷺ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی کہ میرے بابا کو چھوڑ دو مجھے یتیم نہ کرو میرا کوئی دنیا میں نہیں رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ اب آپ ﷺ معاف کر دیں گے اسے' آنسو جاری ہوگئے آپ ﷺ نے انگلی سے جلاد کو حکم دیا کہ قتل کردو' جلاد نے قتل کر دیا اُسے۔ صحابہؓ نے بعد میں پوچھا کہ حضور ﷺ! آپ ﷺ کی تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے ہم سمجھے تھے کہ آپ ﷺ اس وقت چھوڑ دیں گے تو آپ ﷺ کی انگلی نے تو پھر اس کو جلاد کو حکم دیا یہ دو متضاد کیفیتیں کیا تھیں۔ عزیزانِ من! ایک فقرہ رسالت مآب ﷺ کا جو ہے اس تمام مسائل کو حل کر کے رکھ دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی انگلی اشارہ کرتی تھی قتل کا' محمد ابنِ عبداللہ کی آنکھیں رو رہی تھیں رحم کے لیے۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور محمد ابن عبداللہ کے اندر فرق ہے دونوں جذبے جو ہیں موجود ہیں۔ کہاں کس جذبے کا اظہار ہونا ہے یہ ہے اصلِ دین۔ کیا معلوم اس جج کا اندر سے دل کتنا رو رہا ہوتا ہوگا جب وہ دیکھتا ہے کہ میں کیا حکم دے رہا ہوں لیکن یہ آنکھیں اس انسان کی رو رہی ہیں' سزا کا حکم وہ جج سنا رہا ہے وہ قانون ہے' یہ جذبہ ہے۔ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ (11:75) آہاہاہا!!! بڑا ہمدرد تھا لیکن یہ جذبۂ ہمدردی کے اظہار و استعمال کے لیے بھی ہماری طرف دیکھتا تھا کہ کیا ارشاد ہے آپ کا۔

علامہ پرویزؒ کے نزدیک قرآن حکیم تو ایک ایسی کتاب ہدایت ہے کہ جسے درساً درساً پڑھنا چاہیے

عزیزانِ من! کیا عرض کروں قرآن تو یہ نصاب میں درساً درساً پڑھانے کی کتاب ہے۔ مُّنِيۡبٌ اس طرح سے لوٹ کے آنا۔

عربوں کے ہاں لفظ منیب کا استعمال جو بڑا روح پرور ہے

میں نے عرض کیا ہے نا کہ ان عربوں کا تو بہت احسان تھا' انہی کی زبان قرآن کے حقائق کی متحمل ہوسکتی تھی' اس طرح لوٹ کے آنا یہ استعمال کرتے تھے اس لفظ کو' شہد کی مکھی کو آپ نے دیکھا ہے صبح کے وقت وہ نکل جاتی ہیں سینکڑوں میل دور چلی جاتی ہیں پھول

کے رس کے ایک قطرے کی تلاش میں۔ پتہ نہیں کدھر کدھر نکل جاتی ہیں۔لیکن اس کے بعد جب وہاں وہ قطرہ لے لیتی ہیں اس لینے کے بعد کہیں وہ کتنی دور پہ ہوں سیدھی اپنے اس چھتے کے اندر آتی ہیں کوئی مکھی کہیں نہ بھٹکتی ہے' نہ دوسری جگہ جاتی ہے' نہ کسی اور رخ کی طرف سمت کرتی ہے' جہاں بھی ہوتی ہے (معلوم نہیں اندر کیا حس ہے) سیدھی اس چھتے کی طرف آتی ہے۔ یہ مکھیاں جس انداز سے سینکڑوں میل کی دوری کے باوجود اپنے ہی چھتے کی طرف لوٹ کے وہ آتی ہیں اس کیفیت کو وہ منیب کہا کرتے تھے' انابت کہا کرتے تھے۔مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ کہیں چلا جائے' دنیا کے کسی گوشے میں کائنات کے ہو کہیں کاروبار ہو' یہ سب کچھ کرتا ہوا جب وہاں سے فارغ ہو سیدھا بارگاہِ خداوندی کی طرف آئے' سیدھا خدا کے قانونِ مکافات کی طرف آئے وہاں سے اپنا فیصلہ لے' اسے منیب ہونا کہتے ہیں اسے انابت الی اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ عربوں کی زبان تھی۔

اقبال کے نزدیک مردِ مومن کی کیفیت تو میدان زندگی میں یگانہ ہوتی ہے' اعلون ہوتی ہے' منیب ہوتی ہے

ہمارے دور میں اقبالؒ نے ان چیزوں کو پھر بیان کیا ہے یہی جو منیب کی صفت ہے وہ شہد کی مکھی سے تشبیہ دی تھی' اقبالؒ یہ کہتا ہے کہ اس مومن کی کیفیت اس پرندے کی طرح ہوتی ہے کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

فضا کی پہنائیوں کے اندر وہ یگانہ کوئی اس کا ہمدوش بھی نہیں ہوتا' ہمسر ہونا تو ایک طرف

مومنے بالائے ہر بالا ترے

غیرتِ او بر نہ تابد ہمسرے

اعلون جو قرآن نے کہا ہے تو Superlative Degree ہے وہ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سے اونچے اور سب سے زیادہ غالب مومن۔ اس لیے اقبالؒ یہ کہتا ہے کہ مومن تو وہ ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا اس سے آگے بڑھ جائے یہ تو بات ہی نہیں ہے' کوئی اس کے ہمدوش بھی نہیں جا سکتا اس کی غیرت اس کو بھی نہیں برداشت کر سکتی۔

پرد در وسعتِ گروں یگانہ

اس یگانہ کے لفظ نے دیکھا کیا کہہ دیا ہے' یوں جاتا ہے لیکن

نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

سینکڑوں میل کے فاصلے پہ بھی ہو تو نظر اس کی آشیانے کے اوپر ہوتی ہے اپنے۔ یہ ہے مومن عزیزانِ من!۔ اسے عربی زبان میں

قبلہ کہتے ہیں جس کی طرف ہر وقت نگاہ رہے۔ یہ ہے اس کا نظام یہ ہے خدا کا اور اس کے قانون کا مقام' مردِ مؤمن کی زندگی کہ دنیا کے کسی گوشے کے اندر وہ ہو وہ منیب ہوتا ہے' شہد کی مکھی کی طرح وہیں آتا ہے اس کی نگاہ آشیانے کے اوپر ہمیشہ رہتی ہے۔ **اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ لَحَلِیۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیۡبٌ** (11:75) ۔**یٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ ۚ وَ اِنَّهُمۡ اٰتِیۡهِمۡ عَذَابٌ غَیۡرُ مَرۡدُوۡدٍ** (11:76) ہم نے کہا کہ ابراہیمؑ! بات سمجھ لی تم نے' اس لیے جانے دو اس بات کو' کیا انداز ہے یہ بھی کہنے کا' جانے دو اس بات کو۔ تیرے خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے قانونِ مکافات کی رو سے وہ وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں قوموں کی تباہی ہو کر رہا کرتی ہے۔ ان کے اوپر وہ تباہی آئے گی **غَیۡرُ مَرۡدُوۡدٍ** (11:76) جو آ کر پلٹ نہیں سکتی۔ آخری تباہی یوں آتی ہے قوموں کے اوپر جو آ کر پھر پلٹ نہیں سکتی۔ **وَ لَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَ ضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّ قَالَ هٰذَا یَوۡمٌ عَصِیۡبٌ** (11:77) اب اس کے بعد یہی مہمان حضرتِ لوطؑ کی طرف آ گئے۔ **وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَکُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ** (29:28) اے لوطؑ!۔ وہ اس قسم کے فعلِ شنیع کے مرتکب ہوتے تھے۔

قوم لوط کے دو بڑے جرائم کا ذکر

جیسا میں نے عرض کیا تھا لواطت جسے کہتے ہیں انگریزی میں جسے وہ Sodomy کہتے ہیں صدوم ان کا شہر تھا نااس کی نسبت سے یہ لفظ بنا ہوا ہے۔ تو ایک تو یہ چیز کہی کہ وہ ایسی فحاشی ایسی بے حیائی کہ اس سے پہلے کبھی دیکھی سنی نہیں تھی کسی نے' یوں کہتا ہے قرآن۔ قرآن کی بھی حیاء کا یہ تقاضا ہوتا ہے وہ ہمیشہ ایمائیت میں ایسے مواقع پر بات کرتا ہے' اشارے سے بات کرتا ہے' یہ باتیں ہوتی ایسی ہیں۔ **اَئِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ** (29:29) یہ بات جو تھی یہ بتا دی کہ یہ تھا ان کا جرم Homosexuality۔ یہاں ایک لفظ ہے **وَ تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِیۡلَ** (29:29) اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ جو اس فعل کا نتیجہ یہ ہے کہ افزائشِ نسل کے راستے منقطع ہو جاتے ہیں' یہ بھی معنی اس کے ہوتے ہیں' راستہ کاٹ دینے کے۔ اور اگر اس کے علاوہ دوسرا جرم ان کا تھا تو راہزنی کے لیے لفظ یہ آتا ہے راستہ کاٹ دینا' ہائی وے کی جو Robery ہوتی ہے اس کو عام طور پہ یہ کہتے ہیں یہ شاہراہوں کے اوپر اب ڈاکے پڑ رہے ہیں نا آپ کے ہاں یہ قطع سبیل کہلاتا ہے' راستہ روک دینا' راستہ کاٹ دینا' کسی کو آگے نہ جانے دینا۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ پہلا ہی جو جرم تھا یہ اس کا نتیجہ بتایا ہو کہ نسلِ انسانی کے آگے بڑھنے کا راستہ کاٹ دینا یا ہو سکتا ہے کہ یہ دوسری چیز بھی ان کے اندر ہو کہ وہ رہزنی اور قزاقی بھی کرتے ہوں۔ **وَ تَاۡتُوۡنَ فِیۡ نَادِیۡکُمُ الۡمُنۡکَرَ ؕ** (29:29) بڑی چیز یہ کہ عام اتنی ہو گئی تھی بے حیائی کی باتیں کہ وہ اپنی مجلسوں میں محفلوں میں کھلے بندوں یہ باتیں کیا کرتے تھے۔ اور واقعی بے حیائی ایسی چیز ہے کہ یہ شریف انسان کسی دوسرے کے ساتھ اونچا لفظ بھی

نہیں کہتا' میں نے کہا ہے نا کہ اس کا تو ذکر بھی اشاروں میں کیا جاتا ہے۔لیکن جب بے حیائی اور فحاشی اس طرح عام ہو جائے جیسی کہ پوری فضا آج بھری ہوئی ہے تو پھر محفلوں میں بڑے فخر سے یہ باتیں ہوتی ہیں۔تو قرآن نے کہا ہے کہ اس حد تک بڑھ گئی ہوئی تھی بے حیائی ان کے اندر کہ اپنی مجلسوں میں یہ باتیں کھلے بندوں کیا کرتے تھے۔بہرحال یہ ہے ان کا جرم سیکس کے اختلاط میں یہ کیفیت تھی۔

پریشانی کے عالم میں حضرت لوط کے پاس کچھ مہمانوں کا آنا

وہ آئے حضرتِ لوطؑ کے پاس وہ مہمان تو انہوں نے کہا کہ یہ قوم کے یہ لوگ دوڑتے ہوئے آئے ان کی طرف۔وَ مِنۡ قَبۡلُ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ (11:78) حضرتِ لوطؑ کو پتہ تھا کہ یہ بے حیاء کیا کیا کرتے ہیں۔قَالَ یٰقَوۡمِ ہٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیۡ ہُنَّ اَطۡہَرُ لَکُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ لَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ ؕ (11:78) عام معنی یہی ہیں کہ حضرتِ لوطؑ نے یہ کہا کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو۔یہ الفاظ جو ہیں ناھٰٓؤلآء بناتی دیکھو تو سہی یہ میری بیٹیاں ہیں فطرت کا صحیح طریقہ یہی ہے تم یہ غیر فطری طریقے کیوں اختیار کیے ہوئے ہو۔

ہمارے ہاں بیان کردہ تفسیروں کی زبوں حالی

اب ہمارے ہاں عام طور پر تفسیروں میں یہ کہا جاتا ہے اور اس پہ پھر پہلے کہا جاتا ہے پھر اس پہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) کہ حضرتِ لوطؑ نے اپنی بیٹیاں پیش کر دی تھیں وہاں۔کیا بات کرتے ہیں صاحب!! کہتے ہوئے ذرا سی کرک نہیں آتی۔بات نہیں سمجھ رہے۔بزرگِ قوم بڑا بوڑھا جو قوم کا ہے اس کے نزدیک قوم کی ساری لڑکیاں بیٹیاں ہوتی ہیں' اس بستی میں حضرتِ لوطؑ کی یہ کیفیت تھی' بستی کی عورتیں انہیں یہ خود بیٹیاں ہی کہتے تھے۔وہ تو خیر ایک پیغمبر تھے ہمارے ہاں بھی شریف انسان جو ذرا بڑے بوڑھے ہوتے ہیں وہ بیٹیاں ہی کہتے ہیں قوم کی عورتوں کو' ہر لڑکی جو آتی ہے ان کے پاس وہ کہتے ہیں آؤ بیٹا آؤ بیٹی یہاں بیٹھو۔یہ عام محاورے کی اور روزمرہ کی گفتگو ہے یہ بزرگ کہے گا ہی یہ' یہ میری بیٹیاں ہیں۔تو انہوں نے بستی کی عورتوں کے متعلق کہا تھا۔

ہمارے ہاں کی بھولی بسری باوقار یادوں کا تذکرہ

پتہ نہیں عزیزانِ من! یہ باتیں بھی اب آگے ختم ہو جائیں گی ہر لڑکی کو بیٹی کہنے والے شاید اب یہ بھی پرانے زمانے کے ہی لوگ ہو جائیں۔جیسے ہمارے ہاں کی ایک بات چلی آتی تھی ہمارے ہاں پنجابی میں بھی' اب وہ بھی داستانِ پارینہ ہوتی چلی جاتی ہے۔کبھی آپ نے غور کیا ہمارے ہاں کی عورتیں جو کہتی تھیں ''میں اوتھے گئی تے کنے ای بھائی سن اوتھے یا اندراو کہندی اے ماں نوں ماں! باہر اک بھائی کھلوتا ہویا ہیگا'' کبھی نہیں آپ نے غور کیا ہوگا کیا معنی ہیں۔ہمارے ہاں کی ہر لڑکی ہر غیر مرد کو بھائی کہتی تھی۔یعنی ہم نے کبھی غور نہیں کیا ان چیزوں پہ عزیزانِ من! یہ الفاظ بڑے غور طلب ہوتے ہیں جو معاشرے میں عام ہوتے ہیں ''نی باہر کون ہے'' جس اجنبی کے متعلق

معلوم نہ ہو' اگر معلوم ہے تو وہ تو پھر کہیں گی نا کہ وہ چاچا فلاں ہے تے ماما فلاں ہے' جو اجنبی ہے اس کے متعلق ہمارے گھر کی لڑکی اندر جا کے کہتی ہے ''نی اماں باہر اک بھائی کھلوتا ہویا ہیگا''۔ ہماری زبان میں ''بھائی دا لفظ ایوں سی جس طراں کسی مرد نما لفظ ہو جاندا اے'' کیوں لفظ یہ آیا تھا ''بھائی کھلوتا ہویا اے'' اور اس کی میں نے کہا نا پھر جہاں باہر کے بہت سے مرد جہاں ہوں ہم یہ کہیں گے کہ بہت سے لوگ یا بہت سے مرد' ہمارے ہاں کی بیٹیاں کبھی یہ نہیں کہتی تھیں کہ میں وہاں گئی تو دیکھا بہت سے مرد تھے وہاں ''او تھے گئی تے او تھے بڑے بھائی سن جمع ہوئے ہوئے''۔ ہر غیر مرد اجنبی جو تھا ہماری بیٹیاں اس کو بھائی کہتی تھیں اور جس معاشرے کے اندر ہر جوان لڑکا ہر لڑکی کو بہن کہے اور ہر جوان لڑکی ہر اجنبی کو بھائی کہے عزیزانِ من! عصمت وہاں قائم رہتی ہے۔ یہ غیر محسوس طور پر آئینہ ہوتے ہیں یہ الفاظ اور محاورے کسی معاشرے کے عام انداز کے' بھائی کہتی ہے وہ'۔ اسی طرح سے ہمارے ہاں جو بزرگ ہو جاتے تھے برابر کے تو بہن کہتے تھے' بزرگ جو تھے ان کے نزدیک معاشرے کی ہر لڑکی بیٹی ہوتی تھی۔ حضرتِ لوطؑ نے اس روزمرہ کی گفتگو کے مطابق یہ بات کہی تھی' یہ میری بیٹیاں ہیں'۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ ؕ (11:78) خدا سے ڈرو قانونِ خداوندی سے ڈرو اور کم از کم میرے مہمانوں کے معاملے میں تو مجھے رسوا نہ کرو۔

لوط کی طرف سے جذبات کے اندھوں سے بات کرنے کے لیے رجل رشید کے الفاظ کا استعمال

قرآن دوسرے مقام پہ عجیب چیز کہتا ہے۔ اُن کی کیفیت قرآن بتا رہا ہے یہ اُنہیں نصیحت کر رہے ہیں یہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں وہاں ہے قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیۡۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ (15:71) میری بیٹیاں جو ہیں۔ اور قرآن کا بیچ میں ذرا سے ہٹ کے انداز ہے لَعَمۡرُکَ (15:72) یہ انداز یہ ہوتا ہے جسے کہتے ہیں ''تیرے سر دی سوں' تیری جان دی قسم'' جسے ہم کہتے ہیں' قرآن کہہ رہا ہے تیری جان کی قسم وہ ان کو تو نصیحت کر رہا تھا' کن کو نصیحت کر رہا تھا؟ اِنَّهُمۡ لَفِیۡ سَکۡرَتِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ (15:72) وہ جذبات کے دنیا میں اندھے ہوئے ہوئے بدمست ہو رہے تھے یہ انہیں وعظ کہہ رہے ہیں۔ اِنَّهُمۡ لَفِیۡ سَکۡرَتِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ (15:72)۔ لَعَمۡرُکَ (15:72) آ ہاہا۔ وہ انہیں یہ نصیحت کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تیری جان کی قسم! وہ بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے۔ اور ایسے عالم میں جب وہ پورا معاشرہ بدمستیوں میں اندھا ہو گیا ہو' ایک فقرہ عزیزانِ من! جسے میں اکثر اپنی تحریروں میں دہرایا کرتا ہوں قرآن نے کہا کہ اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ (11:78) او میں پوچھتا یہ ہوں او اس ساری بھری بستی میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا ہے جو عقل و فکر رکھتا ہو او ایک رجل بھی تم ایسا باقی نہیں رہا۔ رجلِ رشید' کیا لفظ ہے یہاں!! رشادت ہوتی ہے جس میں دماغ بھی صحیح کام کر رہا ہو اور دل بھی صحیح کام کر رہا ہو اسے کہتے ہیں رشید۔ اور جو اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ جو ہے نا کہ صاحب ارشاد فرمایئے تو کبھی غور فرمایا یہ ارشاد جو ہے اس کے معنی

کیا ہیں کہ دل اور دماغ دونوں کی قوتوں کو یکجا کر کے پھر کہیے میں کیا کروں، عقلی طور پہ بھی صحیح ہو جذبات کے طور پہ بھی صحیح ہو دونوں کا امتزاج کیجیے اور اس کے بعد ارشاد فرمائیے۔

قرآن حکیم نے خدا کو مرشد کے الفاظ سے بھی پکارا ہے

خدا کو قرآن نے مرشد کہا ہے، کتنی گہری چیز ہے، وہ جس کے فیصلے انسان کے فکر اور قوت اور جذبات دونوں کی تسکین کر سکیں۔ اور ضمناً یہ کہ اس نے صرف خدا کو مرشد کہا ہے ''ساڈے ہر سائیں لسوڑی شاہ مرشد ہوندا اے''۔ اور وہ اتنا زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ جسے سب سے بڑی گالی دینی ہوتی ہے اسے کہتے ہیں بے پیرا بے مرشدا یعنی اب ہر ایک کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مرشد بھی ہو۔ وہ خدا صرف اپنے متعلق کہتا ہے۔ یہاں وہ کہتے ہیں اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ (11:78) معاشرہ یہاں تک عزیزانِ من! جب پہنچ جائے تو اسے یہ کہنا پڑے کہ کیا تم میں کوئی بھی ایک رشید آدمی نہیں۔ رجلِ رشید کہا اس لیے دوسری جگہ کہا تھا نا کہ وہ جذبات کے نشے کی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے جب یہ ہو جائے تو پھر رشید تو رہتا ہی کوئی نہیں ہے اس کے اندر۔

حضرت لوط کو قوم کی طرف سے ملنے والا جواب

قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِیۡ بَنٰتِکَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّکَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِیۡدُ (11:79) انہوں نے کہا کہ زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں پتہ ہے کہ ہمارا مسلک کیا ہے ہم کیا چاہتے ہیں اور تم ہمیں خوامخوہ کے لیے وعظ کر رہے ہو، نصیحتیں کر رہے ہو، جانتے بوجھتے ہوئے اس کے باوجود یہ کچھ کہہ رہے ہو۔ ہے نا بدمستی میں اندھے ہوئے ہوئے۔ دوسرے مقام پہ قرآن نے اور بات کہی ہے اور وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ انہیں کہتے تھے نا کہ اس قسم کی بے حیائیاں بداخلاقیاں بری چیز ہیں۔ سنیے عزیزانِ من! چار ہزار سال پہلے کی بات چودہ سو سال پہلے لکھی ہوئی آج کے زمانے کے اوپر اس کا اطلاق۔ وَ مَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا (7:82) مقابلے میں جواب کیا ملا ان کو اَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ قَرۡیَتِکُمۡ ۚ (7:82) کہا کہ انہیں نکال باہر کرو گاؤں سے، کیوں نکال باہر کرو؟ اِنَّہُمۡ اُنَاسٌ یَّتَطَہَّرُوۡنَ (7:82) یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں ملاحظہ فرماؤ، پاکباز انسانوں کا ہمارے ہاں کیا کام، نکال باہر کرو معاشرے سے۔ آج عزیزانِ من! آپ کے معاشرے میں اگر کوئی شخص پاکباز اور دیانتدار رہنا چاہتا ہے، معاشرے والا اس کو نکال باہر کرتا ہے اس لیے کہ انہیں ہر وقت اس سے ڈر رہتا ہے۔ کوشش یہ کرتے ہیں کہ یہ بھی انہی جیسا ہو جائے، کئی پاکباز آپ نے بھی دیکھے ہونگے ہم نے بھی سنے ہونگے، اچھے بھلے ان کے ہاں گئے اور چند دنوں کے بعد وہی کچھ ہو گئے جو وہاں ہوتا تھا۔ اور اگر وہ اس پہ راضی نہیں ہوئے، نکال باہر کرو۔

آج کے دور میں دیانتدار انسان کے ساتھ ہونے والا سلوک

میں یہ کہہ رہا تھا چار ہزار سال پہلے کی بات نہیں ہو رہی آج بھی اس کا ٹھکانہ نہیں ہے جو اس قسم کے مفسدین کے معاشرے میں اگر کوئی شخص دیانتدار بن کے رہنا چاہے یا تو پہلی کوشش یہ ہوگی' اس کو مجبور کیا جائے گا کہ انہی جیسا وہ بھی کچھ ہو جائے۔ دفتر میں کوئی شخص جو رشوت نہیں لیتا' ایک ایک کی آنکھ کا کانٹا ہوتا ہے کھٹک رہا ہے' ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے وہ بھی ویسا ہی بن جائے اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر اس کے بعد کوشش یہ ہوتی ہے کہ نکال باہر کرو۔ کیا پتہ کتنے نکال باہر کیے۔ کیا یہ وہی نہیں کہ جنہوں یہ کہا تھا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ج اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (7:82) او ہو بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں نکالو باہر ان کو ان کا کیا کام ہمارے ہاں۔ آج دیانتدار انسان کے لیے بڑی مشکل ہے عزیزانِ من! اس معاشرے کے اندر رہنا' اگر وہ اپنے اصول پہ کہیں جما ہوا رہتا ہے تو نکال باہر کرو' تو ہر وقت آواز آتی رہتی ہے ایک دوسرے کے کانوں میں کہا جاتا ہے' نکال باہر کرو' نکال باہر کرو۔ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (11:80) اس نے کہا کہ میں کیا کروں چھوٹی سی جماعت ہے میری' طاقت کوئی ہے نہیں' اگر کہیں میرے پاس کوئی طاقت ہوتی یا کوئی ادھر اُدھر ایسے ہوتے جن کا سہارا مضبوط ہوتا تو اس کا جواب میں تمہیں یہاں دیتا کہ کس کو کون نکال کے باہر کرتا ہے۔ ٹھیک ہے حالات ایسے ہیں۔

حضرت لوط کو اپنے اہل کے ساتھ وہاں سے ہجرت کر جانے کا مشورہ

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ط (11:81) قرآن یہاں بات مختصر کرتا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا جو پیغامبر آئے تھے' حضرتِ لوطؑ سے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا فیصلہ ہو چکا ہوا ہے' یہ قوم تباہ ہو جائے گی تم یہاں سے نکل جاؤ بِاَهْلِكَ (11:81) اپنے اہل کو ساتھ لے کر۔ آپ کو یاد ہے حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں واقعہ میں بھی یہی لفظ آیا تھا حضرتِ نوحؑ نے یہ کہا تھا کہ یا اللہ! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے اہل کو بچا لونگا تو یہ میرا بیٹا کیوں ڈوب رہا ہے' بیٹا تو سب سے پہلے اہل ہوتا ہے۔ تو خدا نے یہ کہا تھا نا کہ نہیں نوحؑ! یہ تیری غلط نگہی ہے یہاں اہل اور غیرِ اہل خون کے رشتوں سے نہیں بنا کرتے' اہل وہ ہے جو تیرے مسلک میں تیرے ساتھ شریک ہے' یہاں تعلقات اور رشتہ داریاں ایمان کی بناء پہ ہوتی ہیں' بیٹا بھی اہل میں سے نہیں ہو سکتا اگر وہ تیرا ہم مسلک نہیں ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک اہل ہونے کا معیار صرف ہم مسلک ہے

دیکھا اہل کا لفظ جو ہے اس کے معنی کیا ہیں عربی زبان میں۔ یہاں کہا کہ اپنے اہل کو لے کے نکل جاؤ اِلَّا امْرَاَتَكَ ط (11:81)

بیوی نہیں ۔یعنی بیوی کے لیے تو اہلِ خانہ سب سے پہلے لفظ آتا ہے ہمارے ہاں ۔کہا نہیں بیوی نہیں' اس لیے کہ وہ تمہارے ساتھ ہم مسلک نہیں ہے' بیٹا بھی اہل میں سے نہیں اگر وہ ہم مسلک نہیں' بیوی بھی اہل میں سے نہیں اگر وہ ہم مسلک نہیں ہے تو' یہ ہے اپنے اور بیگانے کا معیار قرآن کی رو سے۔ یہاں مسلمان اور غیر مسلم کو ملا کے ایک قوم بناتے ہیں وہاں باپ بیٹا ایک قوم نہیں بنتے وہاں میاں بیوی ایک قوم نہیں بنتے' وہاں محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کا داماد ایک قوم نہیں بنتے جب تک وہ ایمان نہیں لے آتا وہ اہل میں سے نہیں ہوتا۔

تورات کے علاوہ حضرت لوط کی بیوی کے متعلق ہمارے ہاں کی تفسیری داستان کی نوعیت

اصول ہی وہ ہے جو حضرتِ ابراہیمؑ نے کہا تھا فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ ؕ (14:36) جو میرے پیچھے چلتا ہے وہ میرا ہے' بات ختم ہوگئی۔کہا کہ نہیں وَ لَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ (11:81) سیدھی سی بات ہے جاؤ اور اس کے بعد پھر مڑ کے بھی نہ دیکھو اس بستی کی طرف' عام گفتگو ہے۔لیکن یہ کہا گیا تھا ان کو کہ ہاں پیچھے مڑ کے دیکھنا نہیں' یہ گئے بیوی بھی ساتھ گئی تھی تو اس بیوی نے مڑ کے دیکھ لیا تو وہ نمک کا کھمبا بن گئی' یہ تورات کا بیان ہے کتاب پیدائش میں' لیکن آپ کے ہاں کی تفسیروں میں بھی آیا ہوا ہے۔ یہ زیبِ داستاں ہوتی ہے نا' کہانی میں لطف نہیں پیدا ہوتا جب تک یہ نہ ہو جائے۔ بات سیدھی ہے وہ ہمارے ہاں وہ جو کہتے ہیں مسلک یہ ہے کہ 'از گوشۂ بام کہ پریدیم' جس چھت پہ ہم ایک دفعہ اڑ گئے' اڑ گئے پھر وہاں سے' جسے ایک دفعہ چھوڑ دیا اس سے ہمارا واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے۔کوئی مڑ کے بھی نہ دیکھے' گھر بار چھوڑ رہے ہیں' اپنے چھوڑ رہے ہیں' رشتے دار عزیز چھوڑ رہے ہیں' چھوڑنے کے لیے یہ فقرہ استعمال کرنا بڑی عجیب چیز ہے کہ چھوڑنے کے بعد مڑ کے ان کے پاس واپس آنا تو ایک طرف رہا چھوڑو تو یوں چھوڑو کہ ان کی طرف پھر مڑ کے بھی نہ دیکھو۔تمہاری بیوی جو ہے وہ یہاں پیچھے رہ جائے گی اِنَّہٗ مُصِیۡبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمۡ (11:81) اور جو ان پہ گذرنے والی ہے وہی اس کے اوپر بیتے گی۔اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ (11:81) صبح تک ہی دیکھو گے یہ تباہ ہو جائیں گے یہ لوگ۔

قانونِ مکافات کے تحت قوموں کی تباہی کی نوعیت

میں نے عرض کیا ہوا ہے کئی دفعہ کہ یہ جو آفات آتے تھے حادثات ہوتے تھے ان کی وجہ سے قوموں کی تباہی ہوتی تھی ان میں اور قوموں کے ان جرائم میں کیا تعلق ہوتا تھا' وہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے تباہیاں ہمیشہ انسانوں کی' انسانوں کے ہاتھوں سے ہی آتی ہیں ان حادثات کی وجہ سے ہی آتی ہیں۔ جرائم کا اثر کس طرح سے ہوتا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا جو سیلاب کے زمانے میں میں نے کئی درس دیے تھے' یہ سیلاب کی وجہ سے جو آپ کے ہاں اتنی تباہیاں آئیں اور اس سے زیادہ بڑے بڑے سیلاب ان ملکوں میں بھی آتے ہیں جنہوں نے اپنے ہاں اس طرح بند لگا کے انتظام کیے ہوئے ہیں کہ ایک قطرہ پانی کا بھی باہر نہیں نکلتا' یہ آپ کے ہاں کس طرح سے

وہ بند اور نہر کے پل اور ساحل توڑ کے ادھر اُدھر ہو گئے۔ بعد میں انکوائری کمیٹی بیٹھی تھی نا کہ وہ جو پتہ نہیں چار کروڑ روپیہ لگ کے سڑک بنی تھی آپ کے ہاں وہ ایک ہی پانی بارش کا آیا تھا' وہ ساری کی ساری بہہ گئی۔ دیکھا جرائم کا تعلق ان کے ساتھ' رشوت خور تھے نا وہ' بد دیانت تھے وہ بنانے والے۔تو قرآن کا انداز یہ ہے کہ جب قوم میں رشوت عام ہو گئی تو اس کے بعد پھر ہم نے کہا کہ ایک سیلاب آئے گا اور ساری قوم بہہ جائے گی' سیلاب آیا اور ساری قوم بہہ گئی۔ بظاہر نظر نہیں آتا کہ اس جرم میں اور اس سیلاب کا تباہی میں تعلق کیا ہے' تعلق یہ ہے کہ جب قوم اس طرح کے جرائم میں یوں غرق ہو کے اندھی ہو جاتی ہے تو جتنی بھی چیزیں انہوں نے اپنے ہاں معاشرے کے اندر حفاظت کی' خوشگواری کی' صلاحیت کی' کرنی ہوتی ہیں ان کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتی ہے۔ پھر چھوٹے سے چھوٹا حادثہ بھی ان کو تباہ کر دیتا ہے۔فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ مَّنۡضُوۡدٍ (11:82)

قوم لوط کی تباہ ہونے والی بستی Dead Sea کی نوعیت

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قومِ لوط بستی تھی یہ جو Dead Sea ہے ہمارے ہاں آج کل کہلاتی ہے بحرِ مردار یہ اس کے اردگرد بستی تھی اس کے کناروں پہ۔ وہاں آتش فشاں پہاڑ بہت ہیں اور آتش فشاں پہاڑ میں کبھی تو لاوا اگلتا ہے آگ کا ایک سیلاب اور لاوے سے پہلے یا عام طور پہ اس میں سے بعض اوقات دھواں اٹھتا ہے آگ جیسا' راکھ اٹھتی ہے پتھر اڑتے ہیں اور یہ چیزیں سینکڑوں میل تک دور دور تک چلی جاتی ہیں۔ یہ پومپیائی کی جو تباہی ہوئی تھی وہ یہی راکھ اڑی تھی نا اس آتش فشاں پہاڑ کی۔تو قرآن نے بتایا یہ ہے کہ ان آتش فشاں پہاڑوں سے اس قسم کے وہ آگ کے پتھر جو تھے وہ برسے۔ وہ ہمارے ہاں والے افسانہ نویس بیچارے وہ یہی کہتے تھے کہ آسمان سے فرشتے اس قسم کے پتھر برساتے تھے۔ بہر حال یہ ملائکہ وہی قوتیں ہیں خدا کی' آتش فشاں پہاڑوں کے اندر بھی وہی کارفرما ہوتی ہیں۔سیلابوں کے اندر بھی وہی کارفرما ہوتی ہیں۔تو وہ بڑے بڑے پتھر گرے۔مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ ؕ (11:83) خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے ان کے ایک ایک کے اوپر یہ ٹھپہ لکھا ہوا تھا ان کی موت کی تباہی کا کہ جاؤ اس کو مارو۔انداز بڑا عجیب کہنے کا ہے۔

کوئی اگر جہنم کو نہ بھی سمجھے مگر جہنم تو اسے ہر آن دیکھ رہی ہوتی ہے

وَ مَا هِىَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ (11:83) یہاں یہ ایک فقرہ آیا ہے جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں کہ اس قسم کا عذاب نظر تو نہیں آتا ظالمین کو لیکن اس سے دور بھی نہیں ہوا کرتا۔ بڑی عجیب چیز ہے' بالکل ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے لیکن نظر نہیں آتا اندھوں کو' جکڑتا ہے جب آگے تو یہ پتہ چلتا ہے اچانک آ گیا۔قرآن کہتا ہے یہ اچانک نہیں آیا کرتا' بڑی دیر سے ان کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے یہ۔عِقاب یا عاقبت تو اسی کو کہتے ہیں جو پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے' ذنب اسی کو کہتے ہیں جو پیچھے چپکا ہوا ہوتا ہے۔تو لگا ہوا تو دیر سے تھا ان کے پیچھے' نظر نہیں انہیں

آتا تھا تو اس لیے یہ ظالموں سے بعید نہیں ہے۔ اور یہ تو یہاں عذاب کہا ہے جہنم کے متعلق یہ ہے کہ کوئی سمجھے بھی جہنم' تم تو اسے نہیں دیکھ رہے لیکن جہنم تمہیں ہر وقت دیکھ رہا ہے (82:16)۔ ہم نے تو وہاں اٹھا رکھا ہے نا صرف کہ وہیں جا کے وہ چیز ہوگی' یہاں قرآن کہتا ہے یہاں جہنم تمہیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ تو یہ وہ عذاب ہوتے ہیں جو قوموں کے اس قسم کے جرائم کے فطری نتیجے کے طور پہ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ (11:83) اور دوسرے معنی ظالمین کے اگر لیے جائیں عام معنی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بات صرف قومِ لوطؑ تک ہی محدود نہیں' دنیا میں جہاں اور جب بھی ظالم ہونگے ان سے اس قسم کا عذاب کوئی دور نہیں ہوگا ان کو بھی اسی طرح سے جھپٹ لے گا۔ قومِ لوطؑ کی داستان اس آیت پہ ختم ہوگئی (11:83) پہ (11:84) سے قومِ مدین کی داستان شروع ہوتی ہے حضرتِ شعیبؑ کا قصہ یہ ہم آئندہ لیں گے۔

تورات کو یہودی کتاب مقدس سمجھتے ہیں جب کہ یہ اپنی اصل شکل میں کہیں موجود نہیں

یہاں میں اتنا سا عرض کر دوں کہ یہ تورات اسے یہودیوں کی کتابِ مقدس سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے یہی ہیں کہ وہ ان کے نبیوں کی کتابیں ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ یہ بالکل محرف ہو چکی ہیں یہ کتابیں' تحریف ہو چکی ہے ان کے اندر یہ اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں۔ قومِ لوطؑ کا قصہ آپ نے دیکھ لیا حضرتِ لوطؑ کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ بے حیائی کو روکنے کے لیے انہوں نے یہ انقلاب برپا کیا۔

تورات کے اندر حضرت لوط کے متعلق معاذ اللہ معاذ اللہ ان کی بیٹوں کا بیان

آپ کو معلوم ہے؟ کہ تورات میں کیا لکھا ہے ان کے متعلق (معاذ اللہ معاذ اللہ) یعنی یہ یہودی انہیں اپنا نبی بھی مانتے ہیں' کتابِ پیدائش تورات کی پہلی کتاب ہے اس میں حضرتِ لوطؑ کے قصے میں لکھا ہے غالباً باب اس کا اٹھارواں یا انیسواں ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) کہ وہ حضرتِ لوطؑ اور ان کی دو بیٹیاں جوان تھیں وہ باہر کہیں غار میں رہتے تھے ان کی بیٹیوں نے کہا کہ یہ اس طرح سے باپ یہاں لے آیا ہم کو اور ہماری تو آگے نسل ہی نہیں چلے گی' تورات کا یہ بیان لفظ بہ لفظ میں بیان کر رہا ہوں عزیزانِ من! صرف اس لیے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ باقی مذاہب جن کتابوں کو یہ آسمانی کہتے ہیں اور سینے سے لگائے پھرتے ہیں' ان کتابوں میں لکھا کیا ہے' اپنے نبی کے متعلق یہ کہتے ہیں۔ تو انہوں نے آپس میں دونوں بیٹیوں نے سازش کی' پہلے بڑی بیٹی نے باپ کو شراب پلائی' شراب کے نشے میں وہ بدمست ہو گیا اس سے جنسی اختلاط کیا' سن رہے ہیں تورات کا بیان' نبی اس کی بیٹی' اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اور دوسری شب پھر دوسری بیٹی نے بھی اسی طرح سے شراب پلائی' اختلاط کیا اور اس سے بیٹا پیدا ہوا اور کہا کہ اس طرح سے ان کی نسل آگے چلی۔ یہ تورات میں لکھا ہوا ہے حضرتِ لوطؑ کے متعلق (معاذ اللہ معاذ اللہ) اور وہ کتاب اب تک چلی جا رہی ہے یہ سب کچھ آج بھی

موجود ہے اس کے اندر' یہ ان کے نبیوں کی مبینہ آسمانی کتابیں ہیں۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا کرنے کے لیے آیا تھا۔ ان کے نبی میں کہہ رہا ہوں اب بھی وہ ان کو اپنے ہی نبی کہہ رہے ہیں۔ ان کے نبیوں کے قصے قرآن میں دیکھئے اور ان کے نبیوں کے قصے ان کی آسمانی کتابوں میں دیکھئے پتہ چل جائے گا کہ خالص آسمانی کتاب کونسی ہے اور محرف کس قسم کی کتاب ہوتی ہے' حضرتِ لوطؑ کے متعلق اس میں یہ لکھا ہوا ہے۔ سورۃ ھود کی آیت 83 تک ہم آ گئے جیسا میں نے کہا ہے 84 سے آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

تیرہواں باب: **سورۃ هود** (آیات 84 تا 95)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1974ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ هود کی آیت 84 سے ہو رہا ہے۔ (11:84)

سورۃ هود میں اقوام سابقہ کی داستانوں کو بیان کرنے کا بنیادی مقصد

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے سورۃ هود میں انبیائے سابقہؑ اور اقوامِ گذشتہ کی داستانیں مسلسل بیان ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ قرآنِ کریم ان اقوام کا ذکر کرتا ہے تو اس معاشرے میں تمام خرابیوں کا ذکر نہیں کرتا بلکہ جو بنیادی خرابی تھی کہ جو ان کی تباہی کا باعث بنی، اسے ابھار کر سامنے لاتا ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ ہر قوم اپنے ہاں کا جائزہ لے لے اور یہ دیکھ لے کہ اگر ان کے ہاں بھی ان کے نظام

میں اسی قسم کی کوئی خرابی پائی جاتی ہے تو وہ اس کی اصلاح کر لے۔ کیونکہ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اٹل غیر متبدل اور ابدی ہے اس نے جو نتائج پہلے کسی زمانے میں‘ کسی قوم میں‘ کسی ملک میں پیدا کیے تھے‘ جہاں بھی وہ چیز دہرائی جائے گی‘ اس کے یہی نتائج مرتب ہونگے‘ یہ ہے مقصدان داستانوں سے۔ قومِ نوحؑ سب سے پہلے ہمارے سامنے آئی‘ پھر قومِ عاد آئی‘ قومِ ثمود آئی اور اب قومِ مدین یا قومِ شعیبؑ ہمارے سامنے آتی ہے۔ شعیبؑ اس پیغمبر کا نام تھا جو ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مدین وہ مقام تھا جہاں وہ قوم رہتی تھی۔ ان کو اصحاب الایکہ بھی قرآن میں کہا گیا ہے۔ اس اعتبار سے وہاں نظر آتا ہے کہ وہاں جنگلات کثرت سے تھے۔ سورۃ اعراف میں بھی ان کا ذکر آ چکا ہے اور اب جو دہرایا جا رہا ہے تو الفاظ ہیں وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ (11:84) قومِ مدین کی طرف ان کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ آئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس قوم کا بھی ذکر کیا ہے ان کی طرف جو نبی مبعوث ہوا تھا اسے یہ کہا گیا ہے اس کے بھائی بندوں میں سے۔ نبی انہیں میں سے آتا تھا اسی قوم میں سے ہوتا تھا اور ان کی وہ اصلاح کی آواز بلند کرتا تھا۔ سب سے پہلے وہی آواز جو ہر رسول نے آ کر پہنچائی اور جو دین کا عروۃ الوثقٰی ہے‘ بنیادی ہے اساس ہے‘ یعنی قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ (11:84)

انسانی زندگی کا پہلا غیر متبدل اصول صرف خدا کی محکومیت ہے

اے میری قوم! صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کرو اس کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جس کے اختیار کے سامنے جھکا جائے۔ پہلا انقلابی اعلان جو ہر رسول ہر قوم کی طرف پہنچاتا رہا اور یہی ہے بنیاد اس انقلاب کی کہ محکومیت خدا کے سوا کسی اور کی جائز نہیں انسان کے لیے۔ اب وہ آیا جرم ان کا جو نمایاں طور پہ وہاں عام ہو رہا تھا جس کی طرف توجہ دلائی حضرتِ شعیبؑ نے‘ انہوں نے اس سے اعراض برتا تو وہ ان کا جو جرم عام ہو رہا تھا ان کی تباہی کا باعث بنا۔ دیکھئے کہ وہ جرم کیا تھا؟ آپ اسے دیکھیں گے کہ قرآن جو جرائم گناتا ہے وہ نہ تو وہ چھوٹی چھوٹی بداخلاقیاں ہیں جنہیں ہم عام طور پہ معیوب سمجھتے ہیں نہ ہی کوئی مذہب کی رسومات ہیں یا معتقدات ہیں جو اتنی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں مذہب میں۔ دین میں آپ دیکھئے کہ کون سی چیزیں ہیں جو اہمیت اختیار کرتی ہیں اور جن کے نتیجے میں تباہیاں قوم کی آتی ہے۔ قومِ نوحؑ کے متعلق بتایا گیا کہ انہوں نے قوم کو طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا اور وہاں مدارج تکریم اور تعظیم کا معیار دولت ہوئی‘ جوہرِ ذاتی نہیں تھے۔ یہ تھا بنیادی جرم اس قوم کا جس کی وجہ سے وہ غرق ہوئی۔ قومِ عاد کے متعلق کہا تھا کہ بڑی مہذب قوم تھی علم و بصیرت رکھتی تھی تہذیب کی بلندیوں پر بھی تھی لیکن وہ دنیا میں استکبار چاہتی تھی‘ غلبہ اقتدار چاہتی تھی بغیر الحق‘ حق کے بغیر دنیا میں اپنا غلبہ حکومت چاہتی تھی۔ اور کیفیت یہ تھی کہ جب وہ غریبوں کے گلے پہ ہاتھ ڈالتے تھے تو فولادی پنجے سے ہاتھ ڈالتے تھے کہ بچ ہی نہ کوئی سکے۔ ان

کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے تھے' یہ قومِ عاد کا جرم تھا۔ پہلے ثمود کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے خدا کے دیے ہوئے وسائل ورزق پر ذاتی ملکیت کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ وہ ذاتی ملکیت میں لے رکھی تھیں چراہ گاہیں اور چشمے جس کی وجہ سے غریبوں کے جانوروں کو وہاں پانی پینے تک کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس طرح سے وسائل ورزق کو ذاتی ملکیت میں لے لینا یہ وہ جرم تھا جو قومِ ثمود میں عام تھا اور جس کی وجہ سے ان کی تباہی ہوئی ہے۔ قومِ لوطؑ میں دیکھا ہے کہ وہ جنسی بدنہادی تھی Preversion تھی سیکس کی جس کی وجہ سے ان کی تباہی ہوئی۔ اب قومِ شعیبؑ کی طرف ہم آتے ہیں۔

قومِ نوح' قومِ عاد' قومِ ثمود' قومِ لوط کے بعد قومِ شعیب کی داستان یعنی ناپ تول کے اندر بدنظمی کا جرم

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کاروبار کرتی تھی بزنس کرتی تھی کامرس ان کے ہاں تھی' تجارت ان کے ہاں تھی اور اس تجارت میں ان کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ وہ کبھی کسی کو جو کچھ اس سے لیتے تھے' اس کے معاوضے میں پورا پورا صحیح صحیح نہیں دیتے تھے۔ اصول کی بات تو یہی کی قرآن نے' کہا ان سے کہ وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِكۡيَالَ وَ الۡمِيۡزَانَ (11:84) الفاظ تو یہی ہیں کہ ناپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس کے معنی صرف یہ نہیں کہ تمہارے باٹ اور ترازو جو ہیں وہ بالکل ٹھیک ہونے چاہئیں بلکہ یہ بنیاد ہے اکنامکس کی۔ معاشیات کی بنیاد یہ ہے کہ معاشرے کے اندر لین دین کا تو معاملہ رہے گا ہر معاشرے میں' اس کا اصول یہ ہے کہ جو کسی سے لو اس کے برابر اس کو دو۔ کسی سے محنت اگر لو تو اس کی محنت کا پورا معاوضہ دو' خریدار سے اگر قیمت لو کسی شے کی تو وہ شے اس کے برابر پوری پوری' صحیح صحیح خالص طور پر اس کو دو۔ یعنی یہ معاشی عدل جسے آپ کہتے ہیں Economic Justice جسے آپ کہتے ہیں یہ اس کا اصول بیان ہو رہا ہے محض دوکانداری کا اصول نہیں ہے کہ تول باٹ اور میزان تمہارا جو ہے' تکڑی اور ترازو جو ہے وہ صحیح ہونے چاہئیں بلکہ یہ ہے کہ معاشرے کے اندر اکنامکس وسوشل جسٹس ہونی چاہیے تمہارے ہاں۔ تو سوشل جسٹس کا قانون ہے جو یہ بتایا گیا ہے۔ تو بتایا یہ گیا ہے کہ اس قوم کے اندر یہ بنیادی خرابی تھی کہ وہاں سوشل جسٹس نہیں تھا۔ تو کہا یہ گیا ہے کہ تم عدل برتو لین دین کے معاملات کے اندر' سوشل جسٹس میں۔ بڑی عجیب چیز اس میں آئی۔ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ (11:84) کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے میں دیکھ رہا ہوں اور تم بھی یہ جواب میں کہو گے کہ نہیں ہماری تجارت تو بڑی پنپ رہی ہے' بڑھ رہی ہے' پھول رہی ہے' پھل رہی ہے۔ کہا کہ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم بڑے دولتمند ہو رہے ہو اس بددیانتی کی تجارت کے نتیجے میں۔ یہ ٹھیک ہے Overnight Millionaire ہو جاتے ہیں ہمارے سامنے ہیں۔ وہ کہا کہ میں بھی دیکھتا ہوں کہ یہ بات ٹھیک ہے' تم یہی کہو گے نا کہ تم دیکھو تو سہی کتنا مال ودولت ہمارے پاس اس سے جمع ہو گیا ہے تو اسے تم کہتے ہو کہ غلط ہے' یہ غلط کیسے ہے اس سے تو نقصان نہیں ہو رہا۔ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ (11:84)

نتیجتاً تباہ و برباد ہونے کے خدشات کے باوجود غلط فہمی میں مبتلا قوم کی سوچ

کہا لیکن اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ (11:84)

تم نہیں دیکھ رہے میں دیکھ رہا ہوں وہ تباہی جو تمہارے اوپر چھائی ہوئی ہے تمہیں گھیرے ہوئے ہے چاروں طرف سے۔ تم نہیں دیکھ رہے میں اسے دیکھ رہا ہوں' میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم اس بددیانتی سے' غلط نظام جو ہے تمہارے ہاں معیشت کا اس کی بناء پہ' دولت مند کتنے ہوتے چلے جاتے ہو' یہ بھی میں دیکھ رہا ہوں یہ تو وہ چیز ہے جو تم بھی دیکھ رہے ہو اور میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن ایک چیز ایسی ہے جسے تم نہیں دیکھ سکتے اور میں دیکھ رہا ہوں اور وہ دوسری چیز یہ ہے کہ آنے والی تباہی نے چاروں طرف سے تمہیں گھیر رکھا ہے' نکلنے کا راستہ کوئی نہیں ہے اس میں سے' احاطہ کیے ہوئے ہے وہ تمہارا۔ کیسی عجیب چیز ہے' عین اس زمانے میں جب ایک قوم پوری طرح سے نہایت مرفع الحال ہو رہی ہو دولت مند ہو رہی ہو' اس وقت ان سے یہ کہنا یہ ٹھیک ہے تم یہ کہو گے کہ ہماری یہ روش تو اس قدر ہمیں دولت فراہم کر رہی ہے' تم اس کے خلاف ہمیں یہ کیوں کہتے ہو کہ روش چھوڑ دیں' اس وقت یہ کہنا کہ یہ ٹھیک ہے تم بڑے خوشحال ہو' مرفع الحال ہو لیکن میں ایک چیز دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے اور وہ یہ ہے کہ یہی مرفع الحالی تمہیں لے ڈوبے گی' تباہ ہو جاؤ گے' طریق جو تمہارا یہ ہے یہ بے حد غلط ہے۔ دیکھا دونوں چیزیں کیسی ہیں' وہ صرف اتنی سی بات دیکھ رہے ہیں' یہ اس آنے والی تباہی کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ وَ یٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ (11:85) پہلے یہ کہا تھا کہ ماپ اور تول کے پیمانے جو ہیں ان کو غلط نہ رکھو (لا تنقصوا) یعنی یہ اس کالا تھا کہ ایسا' یوں نہ کرو' اسی پہ نہیں چھوڑ رہا یہ انقلابی پیغمبر جو ہے اس کو بتا رہا ہے کرو کیا اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ (11:85)

اپنے ماپ اور تول کے پیمانے' سوشل جسٹس لین دین کے اصول تمہارے ہاں کے' تجارت کے کاروبار کی بنیادیں جو ہیں' وہ ہمیشہ یاد رکھو' عدل کے اوپر رکھو' صحیح صحیح ماپ تول دو' ہر ایک محنت پوری پوری اسے چکاؤ' جس سے جتنا لو' اس کے برابر اس جیسی چیز اس کو واپس دو۔ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ (11:85) اور وضاحت کر دی کہ لوگوں کی چیزیں جو ہیں ان میں ڈنڈی نہ مارو۔ یہ لفظ جو ہمارے ہاں محاورہ ہے نا' یہ ڈنڈی مارنا ہوتا ہے۔

سوشل جسٹس کے اندر معاشی عدل کو ملحوظ نہ رکھنا جرم ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ صرف ترازو کا تول نہیں ہے جس کی بات ہو رہی ہے' معاشرے میں سوشل جسٹس کی گفتگو ہو رہی ہے کہ اِسمیں ڈنڈی نہ مارو۔ اب یہ جو ہے نا اَشۡیَآءَهُمۡ (11:85) بڑا عمدہ لطیف اس کے اندر ایک راز ہے' لوگوں کی چیزیں' وہ چیزیں تو اس

دوکاندار کے پاس ہوتی ہیں اس کی لیکن جب وہ کسی سے اس کے دام لے لیتا ہے تو وہ اُس کی چیز ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ چیزیں جوان کے ہاں، اپنے ہاں ابھی دوکان کے اندر رکھی تھیں، جو اِن کی تھیں، ان کے متعلق نہیں بات کر رہا، وہ چیز جو کسی دوسرے کی ہو جاتی ہے پھر تو کہا کہ جب وہ چیز دوسرے کی ہوگئی تو دوسروں کی چیزوں کے اندر کمی کرنے کا تو تمہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے، اپنی چیزوں کو جو جی میں آئے کرو، جاؤ آگ لگا دو۔ بڑی عجیب چیزیں ہیں، ذرا ذرا سی ایک چیز قرآن بڑھاتا ہے نقطہ اور اس میں بہت بڑی چیز واضح کر دیتا ہے۔ وہ جو چیز ہے نا ہمارے ہاں ہم کہتے ہیں کہ صاحب نہیں ''ساڈا مال ہیگا جس طراں مرضی تہانوں دیئے'' وہ کہتا ہے جب تک وہ تمہارا مال ہے وہ تو ٹھیک ہے جو مرضی کرو اس کے ساتھ، جب تم نے اس سے بات کر کے معاملہ طے کر لیا اس وقت اس سے کہ اتنے میں یہ چیزیوں دی جائے گی، تو اس کے بعد کہا کہ یہ چیز تمہاری نہیں رہتی، یہ اس کی ہو جاتی ہے۔ تو اس کی چیزیں جو اب تمہارے پاس امانت کی ہیں، جس کی قیمت وہ دے رہا ہے یا دے گا اس تمہارے اصول کے مطابق، اُن میں تو تمہیں کمی کرنے کا حق حاصل نہیں، ہے ان میں تو ملاوٹ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں اس میں آ جاتی ہیں تَبْخَسُوا (11:85) کسی قسم کی بھی کوئی کمی، ملاوٹ یہ کچھ کرنا ان کی چیزوں میں جس کا معاملہ انہوں نے تم سے طے کر لیا ہے، اب تمہیں اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کی کمی کرو۔ جو کہہ کے تم نے اس سے معاملہ طے کیا ہے، اس کے مطابق اب تمہیں دینا ہوگا۔ یہ ہے جو اتنا بڑا جرم گنا رہے ہیں، وہ ان کی روش جو اس وقت کی تھی کہ کاروبار میں وہ معاشی عدل کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔ کہا کہ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (11:85) ملک میں فساد برپا نہ کرتے چلے جاؤ۔ اب ہمارے ہاں فساد تو صرف دنگا فساد کو ہی کہتے ہیں، فساد انگیزیاں اس وقت ہمارے ہاں کہی جاتی ہیں جب وہ توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے، کوئی آگ لگاتے ہیں، ہنگامے برپا کرتے ہیں۔

معاشی عدل کے معاملے میں ناہمواری سب سے بڑا فساد ہے

ایک دوسرے پہ حملہ کرتے ہیں، فساد اسی کو کہتے ہیں ہمارے ہاں۔ لیکن آپ دیکھئے کہ قرآن کن چیزوں کو فساد کہہ رہا ہے، امن امان قائم ہے معاشرے کے اندر لڑائی جھگڑا ابھی نہیں ہو رہا، بظاہر وہ نظر آ رہا ہے کہ کوئی تخریبی کاروائی نہیں ہو رہی، ٹھیک ٹھیک بازار ہیں، ٹھیک ٹھیک چیزیں ان کے اندر ہیں، آرام سے لین دین ہو رہا ہے۔ لیکن قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر اس لین دین میں معاشی عدل ملحوظ نہیں رکھا جائے گا، یہ فساد ہے ملک کے اندر جو تم برپا کر رہے ہو۔ اس لیے کہ مادے کے اعتبار سے بھی فساد تو ناہمواری کو کہتے ہیں کہ کسی قسم کی ناہمواریاں پیدا کرنا جو ہے معاشرے کے اندر یہ ہے فساد۔ اب ہم جب کہتے ہیں فساد تو فساد کی صرف ایک ہی شکل ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن قرآن تو ان تمام چیزوں کو فساد کہہ کے پکارتا ہے اور انہی کی اصلاح کے لیے وہ آتا ہے۔ اصلاح کے معنی ہی ہوتا ہے ہمواریاں

پیدا کر دینا۔ وہ کہتا ہے کہ لین دین میں خرید وفروخت میں' تجارت میں' کامرس میں' بزنس میں' معیشت کے اندر' عدل کو ملحوظ نہ رکھنا یہ فساد ہے معاشرے کے اندر اور فساد کا نتیجہ تو تباہی ہوتا ہے۔ یہاں یہی چیز اس سے کہی ہے کہ یہ فساد ہے۔ سورۃ اعراف میں پہلے جہاں یہ ذکر آیا ہے' وہاں دو لفظ ایسے آتے ہیں وہ بھی بڑے غور طلب ہیں۔ یہ کچھ کہہ کے جن کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے یہی الفاظ سورۃ اعراف میں ہیں وہاں یہی الفاظ دہرا کے کہ عدل ملحوظ رکھو ماپ تول کے پیمانے صحیح رکھو' لوگوں سے جو لو اس کے مقابل میں عدل کی بنیادوں کے اوپر انہیں دو پورا پورا۔ یہ کہنے کے بعد آگے یہ ہے وَ لَا تَقۡعُدُوۡا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ (7:86) عام اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر راستے کے اوپر بیٹھ کر لوگوں کو ڈراؤ دھمکاؤ مت۔ عام طور پر نگاہ اس طرف گئی ہے کہ یہ ڈاکہ زنی ہے یہ کہا گیا ہے ہائی وے کے اوپر جو بیٹھ کے یہ ڈاکے مارتے ہیں۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کے تراجم کے تحت راستوں میں ڈاکہ زنی سمجھا گیا ہے

کہا گیا ہے کہ یہ چیز ہے اصل میں جو کہا گیا ہے تو جرم ہیں اس قوم کے' ایک تو وہ یہ کہ لین دین کے معاملات کے اندر اس طرح سے وہ ظلم کر کے ناہمواریاں پیدا کرتی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ بڑی بڑی شاہراہوں پر بیٹھ کے ڈاکے مارتی تھی۔ اگلے الفاظ جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ یہ اس قسم کا ڈاکہ نہیں' یہ اور چیزیں ہیں جن کے اوپر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ وہ جو راہزنِ ایمان و آگہی کہا ہے اقبالؒ نے جن کو' وہ یہیں سے لیتا ہے وہ یہ اپنے الفاظ بھی۔ دیکھیے قرآن کہتا کیا ہے کہ راستوں کے اوپر بیٹھ کے لوگوں کو ڈرا دھمکا کے تم دوسری طرف لے جانا چاہتے ہو' اگلے الفاظ ہیں وَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (7:86) اور تم خدا کی طرف جانے والے راستوں سے روکتے ہو لوگوں کو' یہ ہے بات یہاں۔ یہ ڈاکہ زنی نہیں ہے مسافروں کو راستے میں سڑک پر روک کے ان کی چیزیں چھیننا نہیں ہے' ڈاکہ وہ ہے جو اس طرح سے ڈاکہ مارا جا رہا ہے کہ جس کو کوئی ڈاکہ سمجھتا نہیں ہے۔ نہ قانون کی گرفت ہو رہی ہے ان پہ نہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ دیکھو پکڑنا دیکھنا کیسے لوٹ لیا اس نے' یہ نہیں ہو رہا۔ یہ ڈاکے یہ ہیں خدا کی طرف جانے والے راستے جو ہیں ان کے اوپر تم بیٹھے ہوئے ہو اور ڈاکہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان راستوں کے اوپر چلنے نہیں دیتے تم۔ کن لوگوں کو نہیں چلنے دیتے؟

نظام سرمایہ داری میں تو سوشل سسٹم کی اقدار کو ہی بدل دیا جاتا ہے

آگے بات آ گئی مَنۡ اٰمَنَ بِهٖ (7:86) جو ان صداقتوں کے اوپر' ان اقدار کے اوپر ایمان لائے ہوئے ہیں' جو چاہتے ہیں کہ معاشرے میں معاشی عدل قائم ہو۔ ہر چیز ٹھیک ٹھیک ملے' امانت اور دیانت سے کاروبار ہوں' تو کہا تم ان کے راستے میں بیٹھ جاتے ہو۔ اور راستے میں بیٹھنے کی جو شکلیں ہیں وہ تو معلوم ہیں ہمیں اب' اس دور سے زیادہ آج کے دور میں یہ چیز جو ہو رہی ہے نظر آ رہا ہے جیسا

میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' اس معاشرے کے اندر ایک معمولی دوکاندار ہی اگر مارکیٹ میں بیٹھ کر یہ چاہے کہ نہ بھئی! یہ اصول تو میں نہیں اختیار کرونگا' ماپ تول بھی پورا ہوگا' چیز کی قیمت بھی صحیح صحیح ہوگی' ملاوٹ بھی نہیں ہوگی۔ دیانتداری سے' امانتداری سے میں یہ کرونگا۔ اور آپ دیکھیں گے ساری منڈی والے اس کے خلاف ایکا کرلیں گے۔ آٹھویں دن اس کو منڈی چھوڑنی پڑے گی۔ یعنی وہ اسے وہاں پہنچنے نہیں دیں گے' بیٹھنے نہیں دیں گے کہ دیانتدار رہے۔

معاشرے کے اصل ڈاکوؤں کی پہچان' انکا خرید وفروخت کا طریق ہے

یہاں آتی ہے وہ بات کہ یہ لوگ پھر کیا کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جو کہا ہے کہ وہ تم راستوں پہ بیٹھ جاتے تھے رہزنی کے لیۓ تو یہ رہزنی یہ نہیں تھی یہ تو ہمارے ہاں کے ڈاکو ہیں بیچارے جو وہ لٹھ لے کے راستے میں بیٹھ جاتے ہیں اور آنے جانے والوں کی گٹھڑیاں لوٹ لیتے ہیں' اصل قزاق' اصل ڈاکو تو یہ ہیں جو معاشرے کے اندر بیٹھے ہوئے نہایت امن سے' نہایت چین سے' بڑے مہذب بڑے شریف' نمازی پرہیزگار بڑی عزت' کبھی ساری عمر میں کسی سے اونچا نہیں بول بولے' کسی کو گالی نہیں دی' تھپڑ نہیں مارا' دنگا نہیں کیا' فساد نہیں کیا' بڑے پرامن رہتے ہیں۔ اور یہ بزنس مین کا تو عام طور پہ طریق بھی یہ ہے کہ وہ پرامن رہے' گالی تک نہ دے' ہنستا چلا جائے' خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔ کاریگر محنت کش جو کچھ بنا کے لائے' کبھی دیکھنا چاہیے وہ دوکان پہ بیٹھا ہوا سرمایہ دار اس سے وہ چیز لیتا کیسے ہے۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اس نے اس کے پیسے لے کے آٹا لینا ہے اور بچوں نے روٹی کھانی ہے بس یہ پتہ ہوتا ہے' یا پیشگی دیا ہوا ہوتا ہے کہ یہ نکل ہی نہیں سکتا اس سے' مجال ہے اسے تاؤ آجائے' مجال ہے غصہ آجائے' ہنس رہے ہیں' میاں جی میاں جی کررہے ہیں' آخری قطرہ نچوڑ رہے ہیں۔ اور وہی چیز لینے کے بعد جب گاہک آتا ہے اس کو دینے کے لیے ہوتے ہیں تو سیدھی سی بات ہے صاحب قرآن اٹھا لیتے ہیں کہ صاحب میری تو خرید ہے یہ دو روپے۔ اور آپ کو معلوم ہے نا کہ وہ خریداری پھر کس طرح سے ہوتی ہے۔ یہ لیا ہوا جوتا وہ گھر لے جاتے ہیں' بیوی کے پاس بیچ دیتے ہیں یعنی روپے میں خرید اڈیڑھ میں بیوی کے پاس بیچا' بیوی نے صبح اٹھ کے میاں کے پاس دو روپے میں بیچ دیا۔ اب آ کے یہاں قرآن اٹھا رہے ہیں' اول تو اس جزدان کے اندر ہیر وارث شاہ ہوتی ہے لیکن اگر قرآن ایک رکھا بھی ہوا ہے تو بالکل سچی قسم کھاتے ہیں کہ میں ابھی ابھی دو روپے میں خرید کے لایا ہوں' میاں کیسے دیدوں تمہیں' میرا منافع تو نہ دو' چھوڑ دوارے لگتے دام تو مجھے دو' ہنستے ہوئے یہ سب کچھ کہیں گے تو فساد جسے آپ کہتے ہیں راہزنی یا ڈاکہ کہتے ہیں وہ تو یہ نہیں ہے۔ اور میں تو یہ ایک معمولی مثال دو روپے پہ اس دوکاندار کی دے رہا ہوں' کروڑوں روپے کے بزنس اسی طرح سے ہوتے ہیں' سوشل جسٹس معاشرے میں نہیں رہتا' اسے کہا ہے قرآن نے کہ ان راہوں کے اوپر تم بیٹھ جاتے ہو۔

سوشل جسٹس کے بغیر کروڑوں روپے کا بزنس

کیا بات ہے قرآن کی!! یہی نہیں کہ دوکان پہ بیٹھ جاتے ہو' اپنا اپنا ہی کاروبار ایسا کرتے ہو' جو بزنس کے راستے ہیں ان کے اوپر اس طرح سے بیٹھتے ہو کہ جو شخص بھی امانت اور دیانت سے کام کرنا چاہے' وہ کر ہی نہ سکے۔ کہتے ہیں تم راستے روک لیتے ہو ان لوگوں کے بھی' اتنا ہی نہیں کہ خود یہ کچھ کرتے ہو جو یہ نہ کرنا چاہے' ان کے راستے روک کے بیٹھ جاتے ہو۔ تو پھر کرتے کیا ہو اور اسے سکھاتے کیا ہو؟ وَتَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا (7:86) وہ کہتا ہے کہ پیچ خم کی راہیں تم بتاتے رہتے ہو ان کو۔ ساری بات اس میں ہے عزیزانِ من! اس بزنس میں' اس تجارت میں' جس میں خدا ساتھ نہیں ہوتا' سیدھی بات ہے ایک تو وہ سیدھا راستہ ہے' کہا یہ جو صراط ہے اس کے اوپر تو بیٹھ جاتے ہو ڈاکہ ڈالنے کے لیے' نہیں! سیدھے راستے پہ نہیں چلنے دینا۔ بھئی کاروبار تو اب کرنا ہے تو کیا کیا جائے؟ کہنے لگے صاحب! بیسیوں راستے ہیں ان کے لیے تو۔ وَتَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا (7:86) اس سیدھے راستے میں تم پیچ و خم ڈالتے ہو اور یہ سکھاتے ہو اسے۔ آ جائے تمہارے ساتھ تو بسم اللہ! برادری میں شریک ہو گیا نہ آئے تو صاحب! وہ اکھیڑ کے رکھتے ہیں صاحب! عمر بھر اس کے کہیں پاؤں نہیں لگنے دیتے۔ یہ ہے ڈاکہ زنی جو وہ کرتے ہیں۔

حضرت شعیب کی حق گوئی پر وہاں کے بڑے بڑے چوہدریوں کی طرف سے حضرت شعیب کو بستی سے نکال دینے کی دھمکی

کہا پھر اس کے بعد تم کرتے کیا ہو؟ جو ذرا بھی اپنے اس اصول پر قائم رہنا چاہتا ہے وہ اٰمَنَ جس کو کہا ہے کہ نہیں بھئی! یہ ٹیڑھ میڑھ کے طریقے میں نہیں اختیار کرونگا' میں تو سچا سیدھا طریقہ جو ہے اسی پہ چلونگا' اسی سے میں تجارت کرونگا' اس سے کاروبار کرونگا۔ ہوں۔ قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ (7:88) یہ کہا انہوں نے اور وہ جو تھے بڑے بڑے وہاں منڈی کے چوہدری' انہوں نے کہا شعیب! سن لو بڑے دیانتدار بنتے ہوئے آ رہے ہو۔ لَنُخۡرِجَنَّكَ يٰشُعَيۡبُ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَكَ مِنۡ قَرۡيَتِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا ؕ(7:88) یا تو یہی مسلک اختیار کرنا ہوگا تمہیں جو ہم اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اور اگر یہ چیز تم نہیں کرو گے' تمہیں بستی سے نکال باہر کریں گے۔ منڈی میں بیٹھنے نہیں دیں گے' دوکان کرایے پہ نہیں مل سکے گی۔ رات کو یہاں مٹ جائے گی' بجلی کا شارٹ ہو جائے گا' صبح صبح دیکھو گے آ کے راکھ کا ڈھیر ہو گئی ہوئی ہے۔ یہ ساری چیزیں اس میں آ جاتی ہیں۔ نکال باہر کریں گے۔ عزیزانِ من! چار ہزار سال پہلے کی بات نہیں ہو رہی' قرآن کی تو ابدی حقیقتیں ہیں۔ وہی مرجبی وہی عنتری' بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ چھوٹی موٹی دوکان داری ہوتی ہوگی' چھوٹی چھوٹی تجارتیں ہوتی تھیں آج تو پوچھو نہیں صاحب! سلطنتیں چلتی ہیں تجارت کے زور پہ۔

آج سرمایہ داری کی بنیاد پرہی یہودیوں کی چابک دستی نے پورے یورپ کو اپنے ہاتھ میں کیا ہوا ہے

آج تو اتفاق سے ان یہودیوں کے پاس ایک مملکت اپنی آ گئی ہے۔ جتنی چھوٹی سی سہی' پچیس سال پیشتر تو دنیا میں ان کے ہاں کوئی ایک خطۂ زمین ایسا نہیں تھا جن پہ ان کا اقتدار ہو لیکن تمام یورپ اور امریکہ کی قوموں کی حکومتیں جو تھیں ان کی زنجیروں یہودیوں کے ہاتھ میں تھیں۔ آج بھی دنیا کی مملکتوں کی زنجیریں انہیں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ تو یونہی بظاہر وہ یہ لوگ تھے اور بہت کچھ اور یہ وہاں حکومتیں کر رہے ہیں تمام حکومتیں جو ہیں جتنی بھی ہیں ان کے ہاتھ میں ہیں کیونکہ دنیا کی دولت انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھ رکھی ہے۔ کوئی ذرا ان سے بگڑا نکال باہر کیا لَنُخرِجَنَّکَ یٰشُعَیبُ(7:88) وہی بات ہے نہیں آ ؤ گے ہمارے راستے پہ' نکال باہر کریں گے۔ یہ اس زمانے کا شعیبؑ ہو یا آج کے لوگ ہوں ہمارے راستے پہ نہیں چلو گے تو نکال باہر کریں گے۔ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَاط (7:88) شرط یہ ہے یا تو پلٹ کے آجاؤ وہیں جہاں ہم ہیں۔ یہ بہت بڑے ایماندار اور دیانتدار بنے پھرتے ہو!!! اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر یہ تو نہیں بات ہو سکے گی کہ تمہیں ہم رہنے دیں اور اس طرح سے جو کچھ تم کرتے ہو اس سے ہمارے بزنس کے اوپر جو اثر پڑے' خاموشی سے دیکھتے رہیں ۔پھر دوسری بات یہی ہے کہ تمہیں نکال باہر کریں گے۔قَالَ اَوَ لَوۡ کُنَّا کٰرِھِیۡنَ (7:88) کہا کہ خواہ یہ بات ہمیں دل سے ناپسندیدہ ہی کیوں نہ ہو یہ بے ایمانیاں یا اس طرح سے کرنا' پھر بھی۔ انہوں نے کہا کہ ہاں صاحب! سوال یہ نہیں ہے یا تو ہمارے جیسا بن کے رہنا ہوگا اور یا یہ بستی چھوڑنی پڑے گی بتاؤ کیا کہتے ہو۔

قوم شعیب کی داستان اور آج ہماری داستان میں کیا فرق ہے؟

عزیزانِ من! آج کے بھی بزنس کرنے والے جو ہیں وہ ذرا دھیان ڈالیں کہ قرآن' کیا یہ قومِ شعیب کی داستان بیان کر رہا ہے یا اکبری منڈی کی بیان کر رہا ہے۔ میں نے ویسے ہی یہ نام لیا ہے اکبری منڈی کا کہ آج کا بزنس جو ہے اس کی بات یہ کر رہا ہے' ساری دنیا کے بزنس کی بات کر رہا ہے۔ یا ہمارے جیسے ہو جاؤ' نہیں تو نکال باہر کریں گے۔ اور پھر یہ دیکھیے یہ اپنے ہاں کی مثالوں میں بھی کتنے تھے کہ جو یہ عہد لے کے آئے تھے کہ نہیں صاحب! ہم بتائیں گے تمہیں ایمانداری سے دوکان داری کر کے' بزنس کر کے اور پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ کہ یا تو وہ مجبور ہو گئے اسی ملت کا ساتھ دینے میں جو وہاں پہلے بیٹھی تھی۔ یہ ملت کا لفظ عجیب ہے یہاں۔ ایک برادری ہوتی ہے کاروباری برادری' یہ ہے وہ ملت کا لفظ ہے یہاں۔ یا تو وہ اس ملت کا فرد بن گئے اور اگر ایسے نہیں ہیں تو پھر انہوں نے نکال باہر کیا۔ یہ تھی وہ چیز جسے قرآن نے فساد کہا ہے۔ ان سے کہا تھا کہ فساد برپا کرتے ہو تم معاشرے کے اندر۔ جو شخص دیانت اور امانت سے رہنا چاہتا ہے اس کے راستے روک کے کھڑے ہو جاتے ہو۔ اسے کہتے ہو کہ سیدھے راستے پہ نہیں تمہیں چلنے دیں گے وَتَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ج(7:86)

پیچ وخم کے راستے جو ہیں ٹیڑھے میڑھے راستے جو ہم نے اختیار کیے ہیں' اس پہ تمہیں چلنا پڑے گا۔ اگر وہ اپنے اصول کا پکا ہے وہ کہتا ہے کہ میں تو نہیں یہ اختیار کروں گا انہوں نے کہا نہیں اختیار کرو گے' نہ کرو اس کو اکھیڑ کے پھینک دیتے ہیں' باہر نکال دیتے ہیں' نہیں چلنے دیتے ان کو وہ۔ یہ تھا جرم قومِ شعیب کا۔ فرمایے یہ کہ جرم' یہ اسی قوم کا تھا یا آج کا؟ جیسا میں نے عرض کیا ہے ساری دنیا یہ AGE OF ECONOMICS کہلاتی ہے ہمارا دور ہی عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ یہاں ہر چیز کے فیصلے معاشیات سے ہوتے ہیں' اکنامکس سے ہوتے ہیں اور اکنامکس کا تو نام ہی یہ ناپ اور تول ہے۔ ساری دنیا میں یہ جرم پھیلا ہوا ہے کہ جس کا تذکرہ یہاں قومِ شعیبؑ کے ریفرنس سے بالخصوص ہو رہا ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ اصول جو ہر دور کے لیے اور ہر قوم کے لیے ہیں وہ دعاؤں سے نہیں بدلا کرتے

اب اگلی بات جو ہے وہ ہے یا تو ان چیزوں کو ہم وعظ کی طرح' درس کی طرح سن لیں اور یہ کہیں کہ ہاں صاحب! خوب بات کہتا ہے صاحب! قرآن' اس کی شاعری کی ہم داد دے دیں یا اس کے بعد دعا کریں یا اللہ عاقبت بخیر کر دے ہماری' اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں تو ہمیں کرنے دے جو کچھ ہم کر رہے ہیں' تو عاقبت بخیر کر دینا۔ یا اس کو تلاوت کر لو اس سے ثواب حاصل کر لو۔

انسانی زندگی کے ابدی قوانین ہمیشہ ایک ہی نتیجہ مرتب کرتے ہیں

قرآن حکیم کہتا یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' یہ ابدی قوانین ہیں جنہوں نے جو نتیجہ چار ہزار سال پیشتر شعیبؑ کی قوم میں نکالا تھا' وہی نتیجہ ہر دور میں' ہر قوم میں یہ نکالیں گے۔ وہ کہتا ہے اس سے سوچ لو یہ بات۔ یہ قرآن پڑھنا یا قرآن جو سمجھنا ہے اس کے معنی یہ ہیں۔ یہ محض ذہنی تقدس کی بات نہیں ہے یہ۔ صرف ثواب حاصل کرنے والی بات نہیں ہے۔ یہ تو اٹل اصول دیے ہیں جو وہ آپ کے سامنے لاتا ہے تمہارا جی چاہے مان لو' نہ مانو گے تو وہی حشر ہوگا جو کچھ قومِ شعیبؑ کا ہوا ہر قوم کا جو ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آگے ایک بات سمجھائی۔ میں نے کہا ہے نا کہ یہ پیغمبرانہ دعوت کا طریق یہ ہوتا ہے لا اله اور الا الله دونوں چیزیں وہ بتاتے ہیں۔ اس غلط معاشرے کا نتیجہ یہ ہوگا وہ اتنا ہی نہیں بتاتے کہ یہ ان کے نقائص وہ ایک ایک کر کے بیان کرتے چلے جائیں اور پھر اس کے بعد کہیں کہ بھئی! اب جو تمہارا جی چاہے کرو۔ نہیں صاحب! اس کے بعد یہ بھی بتاتے ہیں کہ تم پھر کرو کیا؟ یہ ہے اِلَّا اللّٰہُ ۔ ایک بڑا جامع لفظ ہے قرآن کا اور بڑا ہی سمجھنے والا ہے۔ یاد رکھو! بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (11:86) اگر تم ان صداقتوں پر ان اصولوں پر ایمان رکھو' یقین رکھو تو یاد رکھو!

آیت نمبر 11:86 کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تراجم کی نوعیت

اب یہ جو ترجمہ ہے بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ (11:86) عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ جو اللہ کے پاس باقی رہتا ہے' وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ یہ ہوا ترجمہ ''اللہ کے پاس رہتا ہے'' آگے تفسیر سیدھی بات ہے کہ وہ ثواب ہے بھئی وہ تمہارا اعمال نامہ ہے۔ بس وہ ثواب والی بات جو ہے بس وہ ہے بہتر تمہارے لیے۔ تو یہاں تو یہ سارے کاروبار' دھندے دنیا کے یہ سارے چھوڑ' صرف ثواب پہ آجاؤ یا یہ کہ اس میں تو یہ کچھ کرتے رہو اور کارِثواب کے کام بھی ساتھ کرتے رہو۔ وہ کارِثواب کے کام آپ کو معلوم ہیں؟ مسجد میں قالین بچھاؤ' وہاں جھاڑ بچھاؤ' دیگیں چڑھادو' نذرانہ دے دو' حضرت صاحب کے جا کے کچھ منت مان لاؤ' داتا صاحب کا وہ دروازہ بنادو سونے اور چاندی کا' یہ ہیں کارِثواب کے کام۔ یہ بَقِیَّتُ اللّٰهِ (11:86) کی تفسیر یہ کی جاتی ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ جو اللہ کے پاس رہتا ہے وہ بہتر ہے یہ کیا کرو۔ بڑی عجیب چیز ہے۔ اصل میں تو یہ بنیاد جو ہے ہمارے ہاں اس آیت کے ترجمے کی اور مفہوم کی یہ فنا اور بقا کے الفاظ: فنا کے معنی ہمارے ہاں کیے جاتے ہیں معدوم ہو جانا' جو رہے ہی نہ اور بقا ہوتی ہے جو باقی ہوتی ہے۔ یہاں ہمارے ہاں حساب کتاب کے اندر باقی ہوتا ہے جو کچھ کہ یہ حساب کر لیا جو بیلنس اور نکلا باقی رہا۔ یہ ہوتے ہیں ہمارے ہاں تو تصورات جو ہیں۔ عربی زبان میں بنیادی طور پہ یہ معنی نہیں ہوتے' وہاں معنی یہ ہوتے ہیں۔

لغت کے تحت لفظ فنا اور تغیر کا مفہوم

ان چیزوں کے وَّیَبۡقٰی وَجۡهُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ (55:27) یہ قرآن میں آئیں گے یہ الفاظ اور وہ کُلُّ شَیۡءٍ هَالِکٌ اِلَّا (28:88) بھی یہ چیز آئے گی۔ یَبۡقٰی (55:27) وہیں ہے بقا کا باقی رہے گا' جسے ہم کہتے ہیں۔ فنا ہو جائیں گے یہی معنی نہیں وہاں فنا کے معنی ہوتے ہیں ہر وہ شے جس میں تغیر آتا رہے' تبدیلیاں آتی رہیں۔ بقا کے معنی ہوتا ہے جو غیر متغیر ہو جس کے اندر کوئی CHANGE واقع نہ ہو جس میں تبدیلی نہ آئے۔ لفظِ دولت کے تو لفظی معنی دول کے ہیں' جس کے معنی ہی گردش کرنا ہیں۔ کاروبار' اس کے منافع' اس کے نقصان' اس کی اونچائی' اس کی نیچائی' یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں یہ بدلتے رہنے والی چیزی ہیں۔ ''آتا ہے دھن جاتا ہے دھن''۔

وحی کے غیر متبدل اصولوں کے تحت کیا گیا کاروبار کبھی تغیر پذیر نہیں ہوتا

ہر شخص اسے مانتا ہے کہ میاں! یہ چیزیں جو ہیں یہ ادلتی بدلتی رہنے والی ہیں' تمہارے ان غلط اصولوں کے تابع جو تم تجارت کرتے ہو' یہ دولت کماتے ہو' یہ مال کماتے ہو یاد رکھو! یہ تو تغیر پذیر ہے اور جو چیزیں تم خدا کے قوانین کے مطابق کرو گے وہ بَقِیَّتُ

اللّٰہِ (11:86) غیر متغیر ہوں گی حقیقت میں' اس میں تغیر نہیں ہوگا۔اس میں جتنا جی چاہے کرلو۔اور یہ تو مانا ہوا اصول تجارت کے اندر ہوتا ہے کہ صاحب! اس میں تو ہوتا ہی یہی ہے آج ادھر وہ ایک شخص جو ہے وہ MILLIONAIRE بنا ہوا ہے دوسرے ہی دن ایک سودا اس نے ایسا کیا ہے خاک نشین ہو جاتا ہے صاحب! کہا کہ یہ چیز تم اپنے اصولوں کے تابع دیکھ لو کاروبار کے اندر جس طریق سے تم کاروبار کرتے ہو اس طریق میں تو یہ چیز ہے' یہ تو تغیر پذیر ہے یہ جو کچھ تم کرتے ہو لیکن خدا کی بتائی ہوئی اقدار اور اصولوں کے مطابق یہی تجارت تم کرو تو یاد رکھو! اس کی کیفیت یہ نہیں ہو جائے گی کہ آج تم لاکھوں پتی ہو اور کل خاک نشین ہو کے بیٹھ جاؤ بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ (11:86)۔اس نظام' ان اقدار کے مطابق جو تم کرو گے' وہ غیر متغیر ہوگا۔اسی لیے قرآنِ کریم نے جو وہ بتائے ہیں اصول وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17)

بہترین تجارت کا بہترین اصول

کہا تم یہ کہتے ہو کہ غیر متغیر طور پہ کوئی چیز نفع رساں ہو' ایسی منفعت بخش ہو جس میں تبدیلی نہ آئے' وہ منفعت ہی منفعت ہو۔کہا کہ یاد رکھو! اس کا اصول ہم تمہیں بتاتے ہیں' بنیاد اس کی ہم تمہیں بتاتے ہیں اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) جو چیز تم اپنے فائدے کے لیے کرو گے' وہ تو تغیر پذیر ہوگی اور جو چیز پورے نوعِ انسانی کی منفعت کو سامنے رکھ کے کرو گے' وہ تغیر پذیر نہیں ہوگی۔قرآن بتاتا یہ ہے اور یہی وجہ ہے دوسری جگہ اس نے جنت کے متعلق بھی یہی چیز کہی ہے' جنت کے متعلق نہیں بلکہ تقابل کیا ہے اَلۡمَالُ وَ الۡبَنُوۡنَ زِیۡنَۃُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (18:46) کہا یہ ٹھیک ہے یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ فرزند' یہ ساری چیزیں قابلِ نفرت نہیں ہیں زِیۡنَۃُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (18:46) دنیاوی زندگی میں وجۂ کشش ہیں۔ٹھیک ہے انہیں حاصل کرنا چاہیے لیکن یاد رکھو! یہ منتہا نہیں ہے زندگی کا' یہ آنے جانے والی چیزیں ہیں۔زندگی میں تمہارے ایک ہی بات ہونی چاہئیں کہ جو آئیں تو جائیں نہیں۔یاد رکھو! وَ الۡبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیۡرٌ عِنۡدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّ خَیۡرٌ اَمَلًا (18:46) جو چیزیں خدا کے بتائے ہوئے قوانین اور اصول اور اقدار کے مطابق تم خاص کرو گے' وہ ہیں جو غیر متغیر ہونگی' وہی چیزیں ہیں۔ثواب کے لفظ کے معنی ہی اور ہوتے ہیں: وہ بہترین بدلا ہے تمہاری کاوشوں اور نتیجوں کا۔اور کیا بات ہے خَیۡرٌ اَمَلًا !! وہی آرزوئیں لے کر ہم زندہ ہیں کہ جن آرزوؤں کے نتائج میں جو کچھ ملے وہ تبدیل ہونے والا نہ ہو۔آرزوئیں بھی تم کرو تو ان چیزوں کی کرو' حاصل بھی کرو تو ان چیزوں کو حاصل کرو کہ جو آئیں تو پھر جائیں نہیں۔

حضرت شعیبؑ کا اپنی قوم سے خطاب

اور یہ جو چیزیں ہونگی الصّٰلِحٰتُ (18:46) خدا کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام کے مطابق جو کچھ تم حاصل کرو گے' وہ

ہے جس میں تغیر نہیں ہوگا‘ جس میں بقا ہوگی‘ جو رہنے والی چیز ہوگی۔ تو حضرتِ شعیبؑ نے ان سے یہ کہا کہ یہ جس طریقے سے تم یہ کچھ کرتے ہو یہ ٹھیک ہے میں نے جو کہا اِنِّیٓ اَرٰکُمۡ بِخَیۡرٍ (11:84) تو ٹھیک ہے بڑے خوشحال ہو تم‘ میں دیکھ رہا ہوں اور مجھے پتہ ہے لیکن یہی ہم دلیل دے سکتے تھے کہ ہماری روش نے تو ہمیں اتنا خوشحال بنا دیا۔ کہنے لگے ٹھیک ہے لیکن یہ ساری خوشحالیاں‘ مرفع الحالیاں بیک گردش چرخِ نیلوفری‘ اکبر کے الفاظ میں نہ انجن بماند نہ انجینئری‘ ختم ہو جاتا ہے یہ تو قصہ۔ آؤ تمہیں ہم وہ سودا بتاتے ہیں کہ جس سودے میں خسارا نہیں ہو سکتا۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔ کہا وَ مَآ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ (11:86) میں تم پہ داروغہ نہیں مقرر کیا گیا کہ مار مار کے تمہیں اس چیز پہ لاؤں گا تم خود صاحبِ عقل و شعور ہو‘ پاگل نہیں ہو اب خود سوچ کے فیصلہ کرو کہ کونسی روش اختیار کرنی ہے۔ صحیح روش پہ نہیں آؤ گے‘ تباہ ہو جاؤ گے میرا کیا بگڑے گا‘ صحیح روش اختیار کر لو گے بچ جاؤ گے۔

کسی نہ کسی شکل میں خدا کا تصور تو روز اول سے انسانی ذہن میں موجود ہے

اب آگے وہ چیز آتی ہے جو دین اور مذہب میں تفریق کر کے بتاتی ہے۔ متعدد بار یہ چیز آئی ہے‘ میں سینکڑوں بار اسے لکھ بھی چکا ہوں‘ آیت وہ یہاں آئی ہے۔ جیسا جو ہوتا ہے‘ جو قومیں مذہب پرست تھیں‘ مذہب کے اوپر ہر قوم ہوتی ہے۔ چھ ہزار سال پیشتر بھی خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے ذہن کے اندر سے ہر قوم خدا کو مانتی ہے۔ ابتدائی دور کا غاروں میں رہنے والا انسان اس کے متعلق بھی جب تحقیقات ہوئی ہیں‘ اس نے بھی کسی نہ کسی ایسی ہستی کو مان رکھا تھا جو مافوق الفطرت تھی‘ جس کی طرف رجوع کرتے تھے اپنی مصیبتوں میں۔ یہ الگ بات ہے کسی نے اس کو پتھر کا بت تصور کر رکھا تھا‘ کسی نے کوئی دیوتا بنا رکھا تھا‘ کسی نے کوئی درخت ہی بنا رکھا تھا‘ درختوں والے جو ہیں جانوروں میں حیوانوں میں یہ سمجھتے تھے کہ یہ دیوتا ہوتے ہیں‘ یہ خدا ہوتے ہیں۔ کچھ بھی ہو‘ ہر قوم نے کوئی نہ کوئی مذہب ضرور اختیار کر رکھا تھا۔ یہ پیغامبر آتے تھے اس مذہب کی جگہ دین دینے کے لیے۔ ہر مذہب کے اندر پرستش کی کوئی نہ کوئی رسم رسوم ہوتی ہے کسی شکل میں بھی وہ کیوں نہ ہو۔ پرستش لازمی ہے‘ وابستگی ہے مذہب کے ساتھ‘ لازمہ ہے مذہب کا۔

حضرت شعیب کی مخالفت کی بنیادی وجہ مذہب کی جگہ دین کو پیش کرنا تھا

بات یہاں سے یوں چلتی ہے کہ حضرتِ شعیبؑ آئے تو بہرحال ان کی اس روش کی جو مخالفت تھی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ کچھ اپنے طریقے پہ کچھ پرستش عبادت وہ کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا ٹھیک ہے ہم اپنے طریقے کی پرستش کرتے ہیں تم اپنے طریقے کی پرستش کرو۔ اسے مذہبی آزادی کہا جاتا ہے۔ یہ آزادی مستبد سے مستبد بادشاہوں کے دورِ حکومت میں بھی ملتی ہے۔ انگریزوں نے یہاں آ کے حکومت جب کی تو جنگِ آزادی جسے غدر کہا جاتا ہے اتنی بڑی آزادی کی جنگ لڑی اس کے بعد انہوں نے ان کی آزادی سلب کی غلامی کی

زنجیروں میں جکڑا لیکن پہلا اعلان جو حکومت کی طرف سے ہوا تھا وہ یہ تھا کہ مذہب کی آزادی تمہیں حاصل ہوگی۔ چنانچہ یہ مذہبی آزادی ہمارے بچپن میں گنائی جاتی تھیں برکاتِ عہدِ انگلشیا' ہمیں بھی گنائی جاتی تھیں آج سے پچاس سال پہلے برکاتِ عہدِ انگلشیا۔ اور اس میں بڑی برکت یہ تھی اب تک یاد ہے وہ حاجی کا شعر کہ

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا

سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

برکاتِ عہدِ انگلشیا۔ مذہبی آزادی اور اس کا تقاضا بھی اس قسم کا پھر جو اس کا بدل ہے جو ہمارے حکمران ہے ان کے مذہب کی پرستش کا اعلان تو کہی آٹھ دن اور جا کر ہوتا ہے اور یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سنکھ اور اذان روز گونجتے ہیں بلکہ مسلمانوں کے تو پانچ دفعہ گونجتے ہیں صاحب! مذہبی آزادی۔ جتنی سیکولر گورنمنٹیں آج دنیا کے اندر ہیں' ان سب میں مذہبی آزادی ہے صاحب۔ سب سے بڑا اعتراض کیا گیا تھا جو دہریا قوم آپ کے ہاں ہے ''رشیا'' وہ تو خدا کو بھی نہیں مانتے' اعتراض تھا کہ محض مسلمانوں کو مذہبی آزادی ہے۔ انہوں نے ان کے وفد اپنے خرچ سے بلا کے دکھایا کہ صاحب! یہ ہیں ان کی مسجدیں دیکھیے جمعہ ہو رہا ہے' مولوی خطبہ دے رہا ہے' یہ نماز پڑھ رہے ہیں' کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ سیکولر ہی نہیں بلکہ پوری دہریوں کی حکومتوں کے اندر بھی تو امپلیمنٹ ہو گیا ہوگا۔ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی ہوگی۔ اس پہ علامہؒ نے ان سے کہا تھا کہ مولانا! میرا سینہ شق ہو گیا ایک عامی آدمی یہ بات کرتا تو برداشت بھی میں کر لیتا' زندگی کی آخری سانسوں میں میں یہ چیزیں دیکھ رہا ہوں دیوبند جیسا دارالعلوم اور وہاں کا شیخ الحدیث اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ہندوؤں کی حکومت میں مذہبی آزادی ہمیں حاصل ہوگی اس کے بعد ہمیں اور کیا چاہیے' تم مطالبہ یہ کیا کرتے ہو۔ سر پیٹ کے بیٹھ گئے کہ اب تمہیں کیا سمجھائیں۔ ہندو اعتراض کرتا ہے اسے بھی سمجھا دیتا اسی پہ تو وہ چیخے تھے کہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ۔ ز دیوبند حسین احمد' ایں چہ بوالعجبیت۔

اقبالؒ کہتا ہے میں دین کی بات کسے سمجھاؤں۔ عجم آج تک نہیں سمجھ سکا اس بات کو' دیوبند کے دارالعلوم کا شیخ الحدیث وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مذہبی آزادی تمہیں مل رہی ہے۔

حضرت شعیب کی صلوٰۃ پر اعتراض اور پھر قرآن حکیم کی روشنی میں تصورِ صلوٰۃ اور نماز میں فرق کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ ہے فرق۔ انہوں نے بھی یہ کہا ہوگا اور اس کے بعد جب انہوں نے تو لفظِ صلوٰۃ' لفظ آیا ہے۔ جی یہاں صلوٰۃ کا' صلوٰۃ کی آزادی مانگی ہوگی انہوں نے تو کہہ دیا تھا کہ اب آگے وہ کہتے ہیں عزیزانِ من! لکھ رکھ رکھیے قرآن کی بڑی اہم آیت ہے جو دین اور مذہب میں فرق کرتی ہے۔ کہا کہ شعیب! ہم نے AGREE کیا تھا تم سے کہ تمہیں صلوٰۃ کی اجازت ہے قَالُوا

یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11:87) لیکن ہم تو حیران ہو گئے کہ یہ تمہاری صلوٰۃ کیا ہے؟ تمہاری صلوٰۃ جو ہے ہمیں یہ حکم دیتی ہے کہ اسلاف کی جس روش کے اوپر ہم چلے آ رہے ہیں یہ سارا کاروبار' دھندہ کرتے ہیں یعنی وہ سارے غلط' ہمارے بزرگ بھی غلط وہ سارے جہنمی۔ یہ اور اگلی بات یہ کہ تمہاری یہ کس قسم کی صلوٰۃ ہے کہ جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال جس طرح جی چاہے حاصل کریں' جس طرح سے جی چاہے خرچ کریں۔ یہ صلوٰۃ کیا ہے؟ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں صلوٰۃ اور نماز میں فرق کیا ہوا۔ نماز آپ کے کاروباری معاملات میں تو دخل نہیں دیتی۔ دوکان پہ یہاں بیٹھے ہوئے جو جی میں آئے روز کرتے رہیں' اذان ہوئی اور آپ یہاں آئے اور یہاں آنے کے بعد جو نماز میں آپ کھڑے ہوئے اگر آپ نے وضو صحیح نہیں کیا اس پہ تو ٹوکیں کے کہ ''تیرا وضو نئیں ہویا ہیگا'' اب وہ اٹھے' اوئے تمہارے پاؤں کے درمیان فاصلہ نہیں ہے پورا ' فاصلہ پورا کر دیا ٹھیک ہے' وہ ہاتھ جو ہیں یہ چھاتی پہ نہیں بندھے یا زیرِ ناف نہیں بندھے' اس نے یہ کیا ٹھیک ہے' ''اوئے اللہ اکبر کہن ڈیا ہیگاں اے تے ہتھ بنھ وہابیاں وانگوں'' ساری چیزیں تو یہ دیکھی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ کر لیا تو اس نے کہا الحمدللہ نماز تمہاری ٹھیک ہو گئی اور اگر اس میں فرق آ گیا' اس کی نماز صحیح نہیں ہوئی۔ وہ وہاں دوکان پہ یہ کیا کرتا تھا اس کو اس سے تعلق نہیں وہ کچھ وہاں جا کے جو کچھ کرے گا' اس سے تعلق نہیں۔

نماز کے بعد کیے گئے سودے میں رپھڑ پا دینے کی یقین دہانی

وہ تو آپ کو یاد ہو گا دوکاندار والا قصہ۔ پھر مجھ سے ہمارے ہاں کے سامعین کہتے ہیں کہ ''جدوں گل اوندی ہیگی اے او ہندوں دوکانداراں دے پیچھے پے جاندا ہیگاں' تیری اپنی ہٹی نئیں نہ ہیگی''۔ وہ جو سودا کر آیا تھا بیٹے نے پوچھا کیا سودا کر آئے۔ کہنے لگا ''ابا جی کہن لگے کی سودا کر دتا تسی اے گل سوچی نئیں ہیگی' کہن لگا ہاں یار سوچی تے نئیں ہیگی' کہن لگا فیر اے نے؟ کہن لگا کوئی گل نئیں ہو جائے گا' کہن لگا جی او ہو کیس طراں جائے گا؟ کہن لگا اسی رپھڑ پا دیاں گے۔ کہن لگا چلو فیر اٹھو چلیے' کہن لگا نئیں! کل فیر چلاں گے ہُن عصر دا ویلھا تنگ ہوندا جاندا ہیگا''۔ بڑی TYPICAL بات ہے۔

حضرت شعیب کی صلوٰۃ تو کاروبار کی نگہ بان ہوتی ہے

اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ (11:87) کیا تمہاری صلوٰۃ یہ ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق کاروبار بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ اکبر۔ عزیزانِ من! یہ ہے فرق نماز اور صلوٰۃ کے اندر۔ نماز کو اس سے دخل نہیں ہے کہ تم کاروبار کس طرح سے کرتے ہو۔ جس طرح سے جو جی میں آئے وہاں کرو بلکہ وہاں سے آ کے اگر یہاں تم قالین یا دریاں بچھا دو' سارے نمازی تمہارے کاروبار میں برکت کی دعائیں

دیں گے۔ کاروبار میں برکت کی دعائیں!! جس کی وجہ سے یہ دریاں آئیں۔ نماز نہیں دخل دیتی۔ عزیزانِ من! چار ہزار سال پہلے کی بات ہے وہاں بھی جھگڑا نماز اور صلوٰۃ ہی کا تھا۔ کہا تھا ہم نے تو سمجھا ہے نماز پڑھنی ہے "تسی جیس طراں مرضی پڑھو" لیکن یہاں تو قصہ ہی اور نکلا۔ کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس بات کے لیے بھی حکم دیتی ہے کہ ہم کاروبار بھی اپنی مرضی کے مطابق نہ کریں' خدا کے قوانین مطابق کریں۔

نماز کی حدود اور صلوٰۃ کی وسعت میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! صلوٰۃ تو یہ کہتی ہے کہ زندگی کا ہر سانس خدا کی اقدار کے مطابق چلے' یہ ہے صلوٰۃ۔ یہ مسجد کی چار دیواری کے اندر تک جو محدود ہے وہ نماز ہے وہیں شروع ہوتی ہے' وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تو پہلے سانس سے شروع ہوتی ہے فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132) آخری سانس تک پہنچ جاتی ہے۔ صلوٰۃ کے تو معنی ہی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے چلے جانا جب تک اگلا دوڑتا ہے پیچھے چلے جانا اور اگلے کے متعلق کہا ہے اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (11:56) میرا رب صراطِ مستقیم پہ آگے آگے ہے یہ ہے صلوٰۃ۔ اس کے لفظی معنی ہیں۔ یہ نماز تو لفظ ہی عربی کا نہیں ہے یہ تو لفظ بھی مجوسیوں کا ہے لیکن چار ہزار سال پہلے تھا وہی فرق مذہب جہاں بھی ہوگا ایک ہی ہوگا۔ دین جہاں بھی ہوگا ایک ہی ہوگا۔ تو انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! عجیب بات ہے معاہدہ ہمارا یہ تھا کہ تمہیں آزادی ہوگی نماز کی اور تم کہہ رہے ہو کہ میری صلوٰۃ جو ہے مجھ سے یہ کہتی ہے کہ تم اپنا کاروبار بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر سکتے' خدا کے احکام کے مطابق یہ کرنا ہوگا۔ باقی رہا یہ کہ تم جو بار بار کہتے ہو کہ اوبابا! کیوں غریبوں کا خون نچوڑتے ہو کیوں لوگوں کے ساتھ بددیانتی کرتے ہو تمہیں کیا پتہ اس غریب مزدور نے کس محنت سے یہ چار پیسے کمائے ہیں اور جو تمہارے ہاں لینے آیا ہے یہ آٹا' یہ نمک اور دال او! جو لیتے ہو اس کے مطابق تو اس غریب کو دو۔ کہا کہ تم روز یہ کچھ ہم سے کہتے ہو۔ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (11:87) دنیا میں سب سے بڑے غمگسار اور سب سے بڑے ہمدردِ انسانیت تم ہی ایک رہ گئے ہو بس اور نہیں کوئی رہ گیا۔ آج بھی جو کسی کو یہ کہتا ہے صاحب! یہی جواب ملتا ہے کہ "جی! معاشرے اچ صرف ایماندار تسی ہو' سارے بے ایمان وسدے نیں تہاڈے نزدیک تے۔ بہت وڈے آ گئے مقدس صاحب" وہی مرجبی وہی عنتری' وہی الفاظ آج بھی دہرائے جاتے ہیں۔ الفاظ عربی جاننے والے جانیں گے کہ یہ یہاں کیوں دیا ہے؟ کہ جی ہاں! بالکل ٹھیک یہ حقیقت ہے ساری دنیا میں تو صرف یہ ایک آپ رہ گئے سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے "اسی سارے بے ایمان وی تے سنگ دل وی تے بے رحم وی تے ظالم وی تے بڑے غمگسار تے بڑے حلیم تے بڑے رشید اک تسی رہ گئے ہو"۔ اِنَّكَ لَاَنْتَ (11:87) عزیزانِ من! اتنی سی عربی تو ضرور سیکھ چھوڑیے اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ اور پھر الحلیم اور الرشید آہاہاہا! "اکو جنوں کیندے نیں بھئی کلا توں ای رہ گیا ایں"۔ اور کچھ نہیں رہا یہ سارا کچھ وہ کہہ دیتا ہے۔

دلیل و براہین پر مبنی بات کو جذبات کی نظر نہیں کیا جا سکتا

حلیم ورشید ہے چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ بھڑک نہیں اٹھتا یہ پیغامبر جو ہے۔قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ رَزَقَنِىْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ط (11:88) کہا کہ اے قوم! تمہاری باتیں یہ ساری جذباتی ہیں لیکن میں کیا کروں؟ میں تو ہر بات دلیل و براہان کی رو سے بصیرت کی رو سے کہتا ہوں۔جو بات بصیرت کی رو سے کہی جائے گی جذبات کی بنا پہ تو وہ نہیں بدلی جا سکتی اور بڑی بات یہ ہے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔

خدا کے قانون کے مطابق حاصل کردہ رزق اور کسی دوسرے طریق سے پیدا کیے جانے والے رزق کے نتائج میں فرق

وَرَزَقَنِىْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ط رزق تو ہر ایک کو یہاں ملتا ہی ہے رزق اور رزق کے اندر جو فرق ہے مجھے وہ بتایا گیا ہے۔میں جو رزق تمہیں بتا رہا ہوں، وہ رزقِ حسنا ہے وہ بڑا حسین رزق ہے اس کے اندر حسنِ سیرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے، حسنِ کائنات میں بھی اضافہ ہوتا ہے ایک یہ رزق بھی ہے۔اور ایک وہ رزق ہے جو تولنے کے اعتبار سے، گننے کے اعتبار سے تو یقیناً بہت بڑا ہے لیکن اس رزق کے اندر انسانیت کا گلا گھٹ جاتا ہے وہ رزقِ حسنا نہیں ہوتا۔یاد رکھو! پھر وہی اقبالؒ کے الفاظ میں کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

وَرَزَقَنِىْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ط (11:88) میں یہ نہیں کہتا کہ جوگی، بیراگی اور سنیاسی بن کے جنگلوں میں نکل جاؤ، سب کاروبار کرو، رزق کماؤ، رزقِ حسنہ کماؤ اتنی سی بات ہی ہے جو میں تم سے کہتا ہوں۔وَ مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ ط (11:88) اور پھر اگلی بات یہ ہے تم اور باتوں کے عادی تھے، تم واعظوں کے وعظ سننے کے عادی تھے جن کی کیفیت یہ تھی کہ مجلسوں کے اندر تو وہ یہ وعظیں کہتے ہیں اور چوں بہ خلوت می روند، کارِ دیگری کنند، ان کی اپنی زندگی اس کے مطابق نہیں تھی لیکن میری کیفیت یہ نہیں ہوگی۔

ہر رسول اپنی تمام زندگی قانون خداوندی کے مطابق ہی بسر کرتا ہے

تم کیا چاہتے ہو کہ میں دن تو تمہیں یہ کہتا رہوں کہ دیانت اور امانت سے کاروبار کرو اور جب میں خود دوکان پہ آ کے بیٹھوں تو میں بھی اسی طرح سے ڈنڈی ماروں جیسے تم مارتے ہو؟ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔اگلی بات یہ آ گئی صاحب! کہ جو دوسرے سے کہنے والا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود اس کے اوپر عمل کرے جو دوسرے سے وہ کہہ رہا ہے۔اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط (11:88)

اور میرے پیشِ نظر کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے' میں تو تمہاری اصلاح چاہتا ہوں۔ وہ فساد کے مقابلے میں اصلاح آ گئی ہے۔ ہمواریاں پیدا کرنا چاہتا ہوں تمہارے راستے کے اندر۔ جتنی بھی استطاعت مجھ میں ہے میں اس کے مطابق یہ چاہتا ہوں کہ یہ کرتا چلا جاؤں۔

قرآن حکیم کا لفظ توفیق کے معنی' حصول منزل کے لیے ذرائع کا طلب گار ہونے کے ہیں

وَ مَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ (11:88) یہاں بھی یہ عام لفظ ہے توفیق کا لفظ تو ہم روز بولتے ہیں ''اچھا بھئی! اللہ تینوں ایہدی توفیق دیوے'' مجھے اس کی توفیق ہی نہیں تھی۔ آپ دیکھتے ہیں اس کے معنی ذہن میں کچھ اور آتے ہیں۔ بنیادی معنی کے اعتبار سے قرآن میں جو یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں بڑے غور طلب ہیں۔ ایک چیز تو یہ ہے اُرِیۡدُ میں یہ ارادہ کرتا ہوں' میں چاہتا ہوں' میرا نصب العین یہ ہے' میرا مقصد یہ ہے۔ اب اس مقصد کے حصول کے لیے اسباب بھی تو ملنے چاہئیں۔ یہ جو ''وف ق'' ہے اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کہ کسی چیز کے مطابق اسباب اور سامان حاصل ہونا۔ جو مقصد ہے' ارادہ تو میرا یہ ہے' منشا بھی میرا یہ ہے' منتہا میرا یہ ہے' منزل میری یہ ہے لیکن اب اس مقصد کے حصول' اس منزل تک پہنچنے کے لیے جو اسباب مجھے چاہئیں یہ ٹھیک ہے تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے پاس تو یہ اسباب ہی نہیں ہیں میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنا بڑا اصلاح کا کام جو معاشرے میں میں لے کے اٹھا ہوں' سرِ دست تو یہ نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں خدا کے بتائے ہوئے راستے پہ چلوں گا تو مجھے اس کے مطابق وہ اسباب بھی مل جائیں گے کہ جو حصولِ مقصد کے لیے ضروری ہیں' اسے کہتے ہیں توفیق۔ وَ مَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ (11:88)۔

خدا کے بتائے ہوئے راستے ذرائع کی کمی کو پورا کر دیتے ہیں

تم جو اعتراض کرتے ہو کہ تمہارے پاس وہ سامان اور وہ ساز کہاں ہے جو تمہارے مقصد کے لیے ضروری ہیں؟ اس نے کہا ٹھیک ہے نہیں ہیں اس وقت' مجھے یقین ہے کہ اگر میں اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ (11:88) خدا کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق کام کروں گا تو مقصد کے حصول کے لیے جن اسباب و وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے وہ بھی ملتے ہی چلے جائیں گے۔ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ (11:88) اس لیے کہ مجھے اس کے قوانین کی ثمر خیزی پر پورا پورا بھروسہ ہے' یقین ہے مجھے اس پہ۔ اس لیے جب بھی راستے میں کہیں کوئی رکاوٹ آئے گی' کوئی مشکل آئے گی' کوئی پریشانی آئے گی وَ اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ (11:88) میں اسی کے قانون کی طرف رجوع کروں گا۔ یہ ہے میرا ساز و براق' یہ ہے وہ ساز و سامان جس کے بھروسے کے اوپر میں اٹھ کے چلا ہوں سن لو۔ وَ یٰقَوۡمِ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شِقَاقِیۡۤ اَنۡ یُّصِیۡبَکُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ ہُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ (11:89) اے قوم! تمہیں میرے خلاف دشمنی ہے' ٹھیک ہے میری مخالفت کرنا چاہتے ہو تو کرو ضرور لیکن اتنا تو سوچ لو کہ میری مخالفت میں تمہارا حشر کہیں وہ نہ ہو جائے جو ان قوموں کا حشر ہوا تھا اس سے پہلے جنہوں

نے رسولوں کی مخالفت کی تھی۔ میرا تو نہیں کچھ بگڑتا لیکن یہ سوچ لو کہ اس مخالفت میں تمہارا بھی کہیں وہ حشر نہ ہو جائے جو ان قوموں کا ہوا تھا۔ وَ مَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡکُمۡ بِبَعِیۡدٍ (11:89) یہ قومیں تو پھر بھی شاید تم سے دور ہوں' فاصلہ بھی شاید زیادہ ہو ان بستیوں کا' تاریخی اعتبار سے بھی شاید وقت بھی بہت پیچھے گذر گیا ہو تو قوم لوطؑ تو تمہارے پاس تھی۔ کل کی بات ہے تم نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا اور یہ اس کی بستیاں ہیں جن سے تم دن رات گذرتے چلے جاتے ہو۔ اس لیے وَ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ ؕ (11:90) اس تباہی سے بچنے کے لیے خدا سے سامانِ حفاظت مانگ لو اور وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ غلط روش جو ہے اپنے ہاں کی اس معیشت کی' اسے چھوڑ دو تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ ؕ اس کی طرف جاؤ اور کہو کہ آپ بتائیے کہ ہم کیا روش اختیار کریں۔ دیکھا استغفار اور توبہ کے معنی کیا ہیں۔ اِنَّ رَبِّیۡ رَحِیۡمٌ وَّ دُوۡدٌ (11:90) یاد رکھو! وہ ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے اس وقت تک کیا ہے' بڑے سخت جرائم تھے کہ وہ اس کے بعد کہے کہ ''تسی کون ہوندے ہیگے' پکڑ لو ایہناں نوں''

تباہی سے محفوظ رہنے کا طریق قانون خداوندی کی طرف دل وجان سے رجوع کرنا ہوگا

کہنے لگے نہیں! یہ روش اختیار کر کے اگر اس کے قانون کی طرف رجوع کرو گے' وہ مرحمت عطا کرنے والا ہے' وہ تو بڑا شفقت والا ہے' وہ مستبد حاکم نہیں ہے رجوع کر کے تو دیکھو اس کی طرف کہیں۔ قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ مَا نَفۡقَہُ کَثِیۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡنَا ضَعِیۡفًا ۚ (11:91) پتہ ہے انہوں نے جواب کیا دیا؟ حضرتِ شعیبؑ اسی قوم سے ہیں' شروع میں کہا ہے کہ ان کا بھائی' ان کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ وہاں' وہی بولی بولتے ہیں' وہی زبان بول رہے ہیں۔ وہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ شعیبؑ! یہ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے تو بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ''سمجھ میں نہیں آتیں'' زبان کا اختلاف نہیں ہے یہ کیا بات ہے سمجھ میں نہیں باتیں آتیں؟ یہ بات جو ہے کہ یہ راستہ غلط ہے اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' یہ راستہ صحیح ہے جو میں کہہ رہا ہوں یہی بات آج نہیں ہو رہی ہے؟ کہ پتہ نہیں! ''ایس معاشرے اچ اے توں گلاں کی لئی پھرنا ہیگا ایس ساڈی سمجھ اچ نئیں اے گل اوندی ہیگی اے جا توں اپنا کم کر'' ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ عزیزانِ من! سوال صرف زبان کا نہیں ہے صرف زبان ہی کا سوال ہوتا تو یہ کم از کم ساٹھ ستر کروڑ عرب جن کی مادری زبان عربی ہے وہ قرآن کو کیوں نہ سمجھ لیتے۔

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
حرفِ غریب جب تک تیرا دل نہ گواہی

قوانین خداوندی کو عملی شکل دینے کے راستے میں کسی پارٹی کی طاقت کوئی کام نہیں دیتی

وہ کہتے ہیں کہ شعیبؑ ! تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور ہم نے یہ دیکھ لیا کہ تمہارا کوئی جتھہ وتھہ بھی مضبوط نہیں ہے تم کمزور آدمی ہو لیکن ایک مشکل ہے ہماری' تم اگر کہیں اکیلے ہوتے تو چباڑالتے تمہیں۔ وَ لَوۡ لَا رَهۡطُكَ لَرَجَمۡنٰكَ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡنَا بِعَزِيۡزٍ (11:91) اگر تمہاری برادری اتنی بڑی نہ ہوتی تو پھر تم دیکھتے اس وقت تک تمہارا کیا حشر ہوتا۔ دیکھا وہ جتھے اور برادری کا اثر جو ہے کہاں تک جاتا تھا اس دور میں بھی آج کے دور میں بھی لیکن آج کے دور میں یہ ذرا ماڈرن ہوجاتا ہے۔ وہ پرانے زمانے کی یہ جو برادریاں ہیں وہ جاٹ اور ارائیاں اور راجپوت' آج اس کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ جی ! یہ ابھی تک وہیں الجھے ہوئے ہیں برادریوں کے پھیر میں پھر رہے ہیں۔ برادری نہیں اب اس کا نام پارٹی ہوتا ہے' اس زمانے میں قبیلہ کہتے تھے' پھر انہوں نے برادریاں کہنا شروع کیا۔ کہا تمہاری برادری کا ڈر ہے۔ قَالَ يٰقَوۡمِ (11:92) جواب سنیے آہاہا! پیغمبروں کی باتیں ہیں۔ قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَهۡطِىۡۤ اَعَزُّ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ (11:92) کیا بھول ہے تمہاری' میری برادری کو زیادہ طاقتور سمجھتے ہو اللہ کے مقابلے میں' تمہیں اللہ کے قانونِ مکافات کا ڈر نہیں ستا رہا' میری برادری کا ڈر ہے۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ برادریاں' یہ جتھے اور یہ پارٹیاں اور یہ قومیں کچھ حیثیت نہیں رکھتی ہیں خدا کے قانون کے مقابلے میں۔ تو تمہاری بھول ہے میری برادری کا تمہیں زیادہ ڈر آرہا ہے خدا کے مقابلے میں۔

معاشرے کی درستگی میں اصل رکاوٹ افسانوں کا خودساختہ مذہب ہوتا ہے

وَ اتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ ظِهۡرِيًّا ؕ (11:92) لیجیے ایک اور لفظ بھی آ گیا اور وقت ہے تھوڑا۔ اب پھر وہی دین اور مذہب آ گیا۔ انہوں نے کہا ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا کی پرستش ہم بھی کرتے ہیں تم بھی خدا ہی کی طرف دعوت دے رہے ہو' پھر یہ اتنا بڑا فرق کیوں کہ الگ جماعت بنائی ہوئی ہے' الگ دین لے کے آ رہے ہو' ہمیں جہنم رسید کر رہے ہو کہہ رہے ہو' تباہی آ جائے گی۔ او ٹھیک ہے کیا ہم نہیں خدا کو پوجتے؟ خدا تو ہے ہمارے پاس بھی۔ عزیزانِ من! یہ ایک لفظ آیا ہے بڑی گہری چیز ہے۔ مذہب نے بھی خدا کو رکھا ہوا ہوتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ سارے معاملات' سارے کاروبار جو کچھ ہیں وہ تو سارے اپنے اصولوں' اپنی منشا اپنے ارادے اپنے پیمانوں کے مطابق ہوتے ہیں لیکن جہاں کہیں کوئی ایسی مصیبت آ جاتی ہے جہاں یہ چیزیں کام نہیں آتی ہیں پھر وہ ''اللہ یاد آ جاندا ہیگا اے او تھے''۔

مذہب کی پیدا کردہ سوچ تو انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے حتیٰ کہ خدا کی یاد ایک سٹپنی کے طور پر رہ جاتی ہے

آپ نے دیکھا ہے جب معاملہ بگڑتا ہے ان تاجروں کا سوداگروں کا تو پھر کس طرح وہ خدا یاد آتا ہے اس کے بعد۔ وہ بڑا خدا تو ایک طرف یہ پتھروں میں لیٹے ہوئے جو ہیں' ان کے ہاں جا کے کیسے گڑگڑاتے ہیں' کیسے نذریں دیتے ہیں اور خدا تو بڑا یاد آجاتا ہے اس وقت' ایسے وقت میں خدا یاد آتا ہے۔ انہوں نے کہا حضرتِ شعیبؑ نے قوم سے کہ ٹھیک ہے تم ٹھیک کہتے ہو کہ خدا کو تم بھی مانتے ہو لیکن پوزیشن ذرا مختلف دے رکھی ہے تم نے خدا کی۔ عزیزانِ من! یہاں ہے وہ لفظ جو سنیئے اور جھوم جایئے کیا کہہ گیا ہے قرآن۔ عرب اپنے ہاں قافلوں میں سفر کرتے تھے' وہ اونٹ ساتھ لے جاتے تھے۔ سینکڑوں میل کا سفر ریگستان کا سفر' نہ راستے میں کوئی آبادیاں نہ کوئی دوسرے انسان بسنے والے' نہ کوئی مدد کرنے والا۔ وہ کرتے کیا تھے؟ آج بھی ہمارے ہاں حالانکہ سڑکیں نہایت اچھی ہوتی ہیں نئی موٹر بھی آپ نے خریدی ہوئی ہو تو اس کے پیچھے آپ سٹپنی لگا لیتے ہیں ایک فالتو ٹائر۔ یہ جو باقی ٹائر ہیں ان کو اگر سارے سفر میں کچھ نہ ہو تو فالتو کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یاد بھی نہیں آتا کہ رکھا ہوا ہے یا نہیں پیچھے۔ کب یاد آتا ہے؟ جب ایک ٹائر پھٹتا ہے تو۔ جب وہ پھٹتا ہے تو وہ جو رکھا ہوا ہوتا ہے پیچھے EXTRA ' پھر اس وقت وہ یاد آجاتا ہے اس سے اس وقت کام لیتے ہیں۔ جب تک گاڑی چلتی رہتی ہے اس وقت تک اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ عرب کے ہاں اس زمانے میں موٹریں تو نہیں تھیں' وہ اونٹوں پہ سفر کرتے تھے۔ ایک آدھ اونٹ اپنے ساتھ فالتو رکھ لیتے تھے سٹپنی کے طور پر کہ راستے میں کسی جانور کو کچھ ہو جائے تو پھر کیا کریں اس وقت جنگل میں صحرا میں کیا کریں اس وقت' اس کا سامان کیا کریں' سواریوں کو کیا کریں؟ تو وہ ضرور ساتھ فالتو رکھتے تھے کہ جب تک تو کام ان سے چلتا رہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ آج کی مثال جو ہے چار ٹائروں کی اور سٹپنی کی یہ زیادہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اس وقت تک بالکل وہ یاد نہیں آتا جب کہیں ٹائر پھٹ جاتا ہے تو اس وقت وہ یہ جو فالتو اونٹ یا آپ کی سٹپنی تھی کام آتی۔ عربی زبان میں اسے ظِهْرِيًّا (11:92) کہتے تھے۔

خدا تعالیٰ کے صحیح تصور کے سلسلہ میں حضرت شعیب کا اپنی قوم سے خطاب

حضرتِ شعیبؑ نے کہ اے قوم! میں جانتا ہوں کہ خدا کو تو تم بھی پوجتے ہو' خدا کو تم نے تو ایکسٹرا رکھا ہوا ہے۔ کاروبار تم اپنے ٹائروں سے چلاتے ہو جب یہ پھٹ جاتے ہیں تو پھر تمہیں سٹپنی یاد آتی ہے۔ عزیزانِ من! مذہب کا خدا اور دین کا خدا: دین کا خدا چار ٹائروں کی حیثیت نہیں رکھتا گاڑی کے انجن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کے بل بوتے کے اوپر گاڑی چلتی ہے۔ مذہب کا خدا ایکسٹرا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ اور EXTRAS سے تو ہمارے نوجوانوں کا دھیان کہیں اور بھی گیا ہوگا۔ ایکسٹرا رکھا ہوا ہوتا ہے مذہب کا خدا۔ سارا کاروبار

اپنے ٹائروں پہ چلتا ہے کبھی وہ یاد نہیں آتا وہ سٹپنی' جب کبھی یہ ٹائر پھٹتا ہے تو اس وقت پھر یاد آتا ہے۔ جب کیا جو ربتوں نے' تو خدا یاد آیا۔ کہا تمہارے ہاں خدا کو مانتے تم بھی ہو میں تو نہیں انکار کرتا بس فرق صرف اتنا ہی ہے کہ میرے ہاں کا خدا جو ہے وہ اصل قوت اور توانائی ہے اس زندگی کے موٹر کی' تمہارے ہاں کا خدا تم نے سٹپنی رکھا ہوا ہے کہ جب ان سے کام نہ چلے تو پھر اس کو تم یاد کرو' یہ ہے فرق تمہارا اور ہمارا۔ اِنَّ رَبِّـیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ (11:92) لیکن تم مجھے تو دھوکہ دے سکتے ہو عام انسانوں کو دھوکہ دے سکتے ہو' اس خدا کو تو دھوکہ نہیں دے سکتے کہ جس کو یہ سمجھ رکھا ہے کہ کم بختو! گاڑیاں اپنی تو چلاتے ہو اپنے ٹائروں سے اور مجھے تم نے اس طرح ایکسٹرا بنا کے رکھ رکھا ہے۔ جانتا ہے وہ ان چیزوں کو۔

مذہبی تصورات کی جگہ دین خداوندی کی اہمیت اور اس کے عملی نتائج

اب اس کے بعد کہا کہ باتیں بہت ہو گئیں۔ لمبی چوڑی وعظ کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آخری بات یہ ہے یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ ؕ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَمَنۡ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ رَقِيۡبٌ (11:93) اب آخری بات وہی PRAGMATIC TEST جسے میں کہتا ہوں۔ دین اپنے دعوے کی صداقت' اپنے نتائج سے پیش کرتا ہے وہ' ایک نظام ہے وہ قائم ہوتا ہے۔ اس کے جو نتائج سامنے آتے ہیں' وہ اس کے دعوے کی شہادت بنتے ہیں۔ دین کا دعویٰ ہوتا ہے کہ میرے نظام کے اندر کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوئے گا۔ مذہب میں یہ وعظ ہوتا ہے خدا رازق ہے۔ آدھی دنیا رات کو بھوکی سوتی ہے ''خدا رازق ہے'' کہے چلے جاتے ہیں۔ دین جب کہتا ہے خدا رازق ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ معاشرے میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ سرکار! اس کا ثبوت کیا ہے' وہ جو کہتے ہیں خدا رازق ہے تم یہ بات کہتے ہو ثبوت کیا ہے اس کا؟ مذہب کا ثبوت تو صرف ذہنی ایمان ہوتا ہے' دین کا ثبوت یہ ہے کہ جو نظام میں کہتا ہوں اس کو تم رائج کر کے دیکھ لو اور پھر اس کے بعد دیکھو اگر اس کے بعد کوئی شخص رات کو بھوکا سو گیا تو میرا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اور اس کے بعد اگر یہ صورت ہو کہ سب کچھ کھائے اور پھر بھی فالتو بچ جائے آنے والے کسی کے لیے بھی تو پھر تو مانو گے کہ میرا دعویٰ سچا ہے۔

قرآنی نظام کے عملی نتائج قیامت کا انتظار نہیں کرتے

عزیزانِ من! یہ فرق ہے دین اور مذہب میں۔ انہوں نے کہا کہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں' آخری منزل یہ آ گئی۔ تم کاروبار کا جو طریق اختیار کیے ہوئے ہو تم اس پہ چلو میں جو چاہتا ہوں میرے راستے میں ڈاکو بن کے نہ بیٹھ جاؤ کہ مجھے اس راستے پہ چلنے نہ دو۔ میرا راستہ چھوڑ دو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا تم مجھے کچھ نہ کہو۔ تم اپنے مسلک پہ کاروبار کرتے رہو مجھے میرے راستے پہ چلنے دو میں اپنے طریقے

پہ اپنا نظام جو ہے اپنے ہاں چھوٹے پیمانے پہ سہی قائم کرتا ہوں سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ (11:93) عربی جاننے والے جانتے ہیں جلدی فوراً نظر آ جائے گی یہ بات' میں تو تاریخ لمبی ہائی کورٹ والی' دیتا ہی نہیں کہ قیامت میں جا کے دیکھ لیں گے' یہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا نتیجہ کیا ہے۔ ابھی تم دیکھ لو گے کہ کس کے اوپر یہ عذاب آتا ہے' تباہی آتی ہے۔ عزیزانِ من! تباہی ایک لفظ کے اندر بتایا کہ تباہی وہ کس قسم کی۔ یُّخۡزِیۡهِ (11:93) یہ MILLIONAIRE کاروبار والے' بڑے بڑے INDUSTRIALIST اور دولت کی بنا پہ جن کی معاشرے میں عزت ہوتی ہے' جب ان کو ایک چکر آتا ہے اور دیوالیہ ہوتا ہے' پیسہ پاس نہیں ہوتا' سب سے بڑا عذاب یہ ہوتا ہے جس معاشرے میں اتنی بڑی عزت ہوتی ہے وہاں وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ کہا وہ عذاب آنے والا ہے تم پہ کہ تم ذلیل ہو جاؤ گے یاد رکھو یُخۡزِیۡهِ (11:93)۔ ہم تو اس عذاب کو یوں ہی ذہنوں میں رکھتے ہیں۔ پتھر پڑے تھے' آندھی چلی تھی' پانی آ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب! وہ تو عذاب وہ ہے جو رسوا کر دے گا تمہیں وَ مَنۡ هُوَ کَاذِبٌ ؕ (11:93) پھر پتہ چلے گا کہ پھر جھوٹا کون تھا سچا کون تھا۔ وَ ارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَکُمۡ رَقِیۡبٌ (11:93) بس ٹھیک ہے تم بھی انتظار کرو مجھے بھی انتظار کرنے دو بلکہ یہاں لفظ رقیب ہے 'رقب' تم اپنے کاروبار کی SUPERVISION کرو مجھے اپنے اس نظام کی SUPERVISION کرنے دیجیے اس کے بعد پتہ چل جائے گا نتائج کیا نکلتے ہیں۔ بہی کھاتہ سال کے بعد دیکھ لیں گے صاحب۔

نظامِ خداوندی کو عملی طور پر رائج نہ کرنے کا نتیجہ کہ انسانوں کی بستیاں کھنڈرات میں بدل گئیں

[93:11] وَ لَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا شُعَیۡبًا وَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا الصَّیۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دِیَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ ۔ کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡهَا ؕ (11:94-95) پھر جب اس تباہی کا وقت آیا تو اس کے بعد ہم نے شعیبؑ اور اس کے ساتھیوں کو تو اس تباہی سے بچا لیا اور وہ جو قوم تھی اس کے اوپر ایک شعلہ دینے والا زلزلہ آیا' نیست و نابود ہو کے رہ گئی اور پھر ایسی اجڑی وہ قوم کہ ان کی بستیوں میں آج جاؤ تو معلوم یہ ہوتا ہے جیسے کبھی کوئی ان میں بسا ہی نہیں تھا۔ یہ تھی جو اس زمانے میں قومی تباہی آیا کرتی تھی۔ اَلَا بُعۡدًا لِّمَدۡیَنَ کَمَا بَعِدَتۡ ثَمُوۡدُ (11:95) ہاں! سننے والو اسے پڑھنے والو! الا سن کے یوں نہ چلے جاؤ کہ ایک داستان کہانی تھی سنانے کے لیے' اَ لَا کے معنی ہوتا ہے کھٹکھٹا دینا کسی کو' آگاہ رہو' سن رکھو' دیکھا تم نے مدین کا کیا حشر ہوا ویسے ہی ہوا جیسا قومِ ثمود کا ہوا تھا۔ ان کی معیشت زرعی تھی AGRICULTURE ECONOMY تھی اس کو غلط نظام پہ رکھا ذاتی ملکیت انہوں نے بنا لی اور وسائلِ رزق تباہ ہوئے۔ ان کی اکانومی TRADE کی تھی کامرس کی تھی' کاروبار کی تھی' بزنس کی تھی' انڈسٹری کی تھی۔ انہوں نے غلط پیمانوں کے اوپر اس کو چلایا' ان کا بھی حشر یہی ہوا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ وہ زرعی معیشت ہے یا ٹریڈ کی معیشت ہے تمہارے ہاں کی' سوال تو یہی ہے کہ وہ خدا کی اقدار کے مطابق معیشت ہے یا اس کو چھوڑ کے معیشت ہے۔ جہاں اسے

چھوڑو گے تباہی مقدر ہے۔ یہ ہے جو چیز کہنے والی تھی۔ قومِ مدین یا قومِ شعیبؑ کی داستان یہاں ختم ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! سورۃ ھود کی آیت 95 تک ہم آ گئے 96 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(2:127)

❀......❀......❀

چودھواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 96 تا 109)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1974ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 96 سے ہو رہا ہے (11:96)۔

سورۃ ھود میں گزشتہ سے پیوستہ دروس میں سابقہ اقوام کی کبائرالاثم خرابیوں کا ذکر

پچھلے اتوار یومِ اقبالؒ کی تقاریب کی وجہ سے ناغہ رہا تھا اس لیے تجدیدِ یاداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سورۃ ھود کا موضوع مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اس میں تمام بڑی بڑی اقوامِ سابقہ کی سرگذشتیں بیان ہوئی ہیں اور ان کی طرف جو آسمانی انقلاب کے پیغامبران تشریف لائے تھے ان کی تعلیم کے نقطۂ ماسکہ' اس کے اثرات اور اس کے نتائج یہ ایک ایک کر کے بیان کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ میں ہر درس میں

عرض کرتا چلا آ رہا ہوں‘ ان اقوام میں خرابیاں تو بہت سی تھیں اور ہر معاشرے میں مختلف قسم کی خرابیاں ہوتی ہیں لیکن بعض خرابیاں بڑی نمایاں ہوتی ہیں جنہیں قرآن کبائرالاثم کہہ کر پکارتا ہے۔تو وہ کبائرالاثم ایسی ہوتی ہیں کہ جس کے زور سے یعنی وہ آخری پانی کا چھلاوہ کہ جس سے کشتی ڈوب جاتی ہے۔اصل میں قوموں کی تباہی کا سبب تو جسے ACCUMULATIVE کہتے ہیں آہستہ آہستہ یہ تمام خرابیاں تباہیوں کا موجب بنتی چلی جاتی ہیں اور وہ جو قرآنِ کریم کا اصول ہے مکافاتِ عمل کا کہ مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ . فَهُوَ فِیۡ عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ .وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُهٗ . فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (101:6-7-8-9) تعمیری اعمال کا پلڑا اور تخریبی اعمال کا پلڑا اگر جب تک تعمیری اعمال کا پلڑا بھاری رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس دور میں بھی تخریبی اعمال کے پلڑے میں بھی کچھ نہ کچھ تو پڑ چیاں پڑتی چلی جاتی ہیں تو جب تک یہ پلڑا بھاری رہتا ہے اس کی اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے۔اصلاح کے لیے قرآن نے یہ اصول بتایا کہ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ(11:114) کہ تعمیری کام تخریبی کاموں کا ازالہ کر دیتے ہیں یعنی اس کا طریقہ یہ ہے کہ اور زیادہ تعمیری کام کیے جائیں۔یہ ہے تخریبی امور کی تباہیوں سے بچنے کا طریقہ جسے توبہ کہا جاتا ہے۔توبہ ”یا اللہ میری توبہ“ نہیں ہے بلکہ جہاں کوئی کوتاہی ہوئی‘ سہو ہوا‘ غلطی ہوئی‘ بدپرہیزی سے صحت بگڑی پھر اس کے بعد اس کے ازالے کے لیے اس سے زیادہ تعمیری‘ حسنات کے کام کیے جائیں تو ان کے جو نتائج ہیں وہ ان تخریبی اعمال کے نتائج کا ازالہ کر دیتے ہیں۔تو ان قوموں کے متعلق یہ بتایا گیا کہ یہ جب تک ان کے تعمیری اعمال کے نتائج کا پلڑا بھاری رہا وہ قوم ڈوبی نہیں‘ تباہ نہیں ہوئی۔یہ انبیائے کرامؑ آتے رہے اور انہیں آ کے آگاہ کرتے رہے کہ یاد رکھو! تمہارا تخریبی اعمال کا یہ پلڑا جھکتا چلا جا رہا ہے اب بھی وقت ہے کہ تم اس کی اصلاح کر لو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

سابقہ اقوام کی تمام وہ خباثتیں جو ہمارے اس دور میں یک جا ہو چکی ہیں

تو ان اقوام کے متعلق جو قرآن نے بتایا ہے اگر وہ ایک فہرست مرتب کی جائے اس سے تو آپ دیکھیں گے کہ وہی اہم تخریبی اعمال اس دور میں قوموں کے اندر اکٹھے ہو کے آ گئے ہیں۔قومِ حضرتِ نوحؑ کے متعلق کونسا سب سے بڑا جرم ان کا گنایا گیا تھا؟ طبقاتی تقسیم‘ اونچ نیچ کی تفریق اور عزت اور تکریم کا معیار دولت‘ کام کاج کو کمینہ پن سمجھنا یعنی کام کرنے والا وہ کمی کمین ہو جائے۔یہ تھا اس دور میں اس معاشرے کا معیار کہ جتنے وہ لوگ تھے ”اَلۡـمَلَاُ“ جن کے گھروں میں کوٹھیاں دانوں سے بھری ہوئی تھیں‘ وہ سمجھتے تھے کہ عزت و تکریم کے بھی واحد مالک وہی ہیں اور علم و دانشوری بھی انہی کے حصے میں آئی ہے۔ان کا اعتراض ہی یہ تھا حضرتِ نوحؑ سے کہ تمہاری تعلیم کے خلاف ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ جو تم مساوات کا سبق دیتے ہو کہ ہم آئیں اور یہ جو ہماری گلی محلے کے یہ کنجڑے اور یہ حجام اور دھوبی (میں نام لیتا ہوں آج کی اصطلاح میں) یہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے لوگ ہم آ کے ان کے برابر بیٹھیں یا یہ ہمارے برابر بیٹھ

جائیں' یہ چیز ہمیں منظور نہیں ہے۔ اور پھر اگر تم یہ کہتے ہو کہ دیکھو! میری تعلیم جو ہے ان کے اثرات' یہ لوگ انہوں نے مانا ہے۔ تو وہ اس کا جواب دیتے تھے کہ ان کی عقل وفکر کیا ہے۔ یہ چھوٹے طبقے کے لوگ ان کا ماننا نہ ماننا کیا معنی رکھتا ہے' بادی الرائے وہی سطحی سی رائے ان لوگوں کی ہوتی ہے' رائے تو ہماری رائے ہے۔ یعنی یہ ہے وہ بڑا جرم جس کی بنا پہ وہ قوم تباہ ہوئی ہے۔ گنتے چلے جایئے آپ۔

قوم عاد کی کیفیت جو سمع اور بصر کے باوجود لقمۂ اجل بنی

قومِ عاد کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ تہذیب وتمدن میں بڑی اونچی سطح پر تھے' قوانینِ فطرت کا علم بھی انہیں بڑا حاصل تھا' وہ سمع اور بصر اور فواد رکھتے تھے۔ یہ تمام چیزیں وہ رکھتے تھے' مہذب تھے اس زمانے کے' متمدن تھے' صاحبِ علم وبصیرت تھے لیکن کیفیت ان کی یہ تھی کہ غریب اقوام کے گلے پہ ہاتھ ڈالتے تھے تو اتنی شدت سے ہاتھ ڈالتے تھے کہ ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے تھے بطشِ شدید ہڈیاں توڑ دینے والی گرفت۔ ان سے کہا گیا کہ یہ تمہارا علم اور بصیرت یہ آسمان تک پہنچ کے' چاند تک کی تصویریں اتار لینا اور اسے پامال کر کے چلے آنا یہ چیز تمہیں بچا نہیں سکتی۔ اس جرم کی مکافاتِ عمل سے کہ تم غریبوں کے خون کے قطرے کی رنگینیوں سے اپنے محلات کی عیش کا سامان بہم پہنچاتے ہو' نہیں بچ سکتے تم اس سے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب وہ پھر پلڑا جھکا ہے تو یہ ان کا علم وبصیرت یہ ان کا تہذیب وتمدن یہ انہیں بچا ہی نہیں سکا ان کی اس جرم کے نتائج کی تباہی سے۔

فطرت کی قوتوں کو مسخر نہ کرنے والی قوم کو مقام انسانیت تو کجا مقام آدم بھی حاصل نہیں ہوتا

تو گویا علم وبصیرت یہ ٹھیک ہے قوانینِ فطرت کے متعلق علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کیا جا سکتا ہے لیکن صرف فطرت کی قوتوں کو اپنے قابو میں کر کے تو کوئی قوم تباہی سے نہیں بچ سکتی۔ تباہی اور مرفع الحالی کی بنیاد اخلاقی قوانین ہیں۔ اعمالِ حسنات جسے قرآن کہتا ہے یہ چیزیں حاصل ہوں اور اس کے ساتھ فطرت کی قوتیں اس کے ساتھ ہوں' یہ قوم ہے جنہیں عیشِ دوام نصیب ہوتا ہے۔ اگر فطرت کی قوتیں بھی پاس ہیں۔ یعنی اب پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر فطرت کی قوتیں کسی قوم کے پاس نہیں تو وہ تو مقامِ آدم پہ ہی نہیں آ سکتی یعنی آدمی ہی نہیں بن سکتیں۔ آدم کا تعارف کرایا گیا تھا یہ کہہ کے عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّھَا (2:31) اور ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا ہے وہ ابھی مومن نہیں ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ اور اگر یہ چیز نہیں ہے کسی قوم کے پاس تو وہ تو آدمی کے مقام کے اوپر بھی نہیں ہے۔ یہ چیز اگر کسی قوم کے پاس ہے تو وہ مقامِ آدمی پہ تو آ جائے گی' انسانیت کے مقام کے اوپر نہیں آ سکتی۔ انسانیت کا مقام یہ ہے کہ ان قوتوں کو پھر تم صرف کس طرح سے کرتے ہو' استعمال میں کس کے لیے لاتے ہو؟ اگر اصول یہ ہے کہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (13:17) اگر انہیں نوعِ انسان کی منفعت کے لیے صرف کرتے ہو تو پھر بقا تمہارے حصے میں آ سکتی ہے' ورنہ تباہی آئے

گی۔ یہ اگلی جو چیز ہے کہ فطرت کی قوتیں ہوں اور انہیں قوانینِ خداوندی کے تابع نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کیا جائے تو یہ ہوگا مقامِ مومن۔ یہ ہے جو قرآن کہتا چلا آرہا ہے۔

قومِ ثمود کی مجرمانہ نوعیت کا تذکرہ

قومِ عاد کے بعد قومِ ثمود آتی ہے اور اس میں بتایا یہ ہے کہ کیفیت ان کی معاشی زندگی یا معاشی نظام کے متعلق بتایا ہے کہ بڑے بڑے جاگیردار، بڑے بڑے زمیندار، بڑے بڑے سردار انہوں نے چراگاہوں پر اور چشموں پر ذاتی ملکیت جتا رکھی تھی، قبضہ کر رکھا تھا، غریبوں کے مویشی اگر ان امیروں کے مویشی جو تھے وہ چر چُر جائیں کچھ باقی رہ جائے تو ان کی باری آجاتی تھی وہ پانی پی جائیں کچھ کیچڑ کا گدلا سا پانی چشمے میں رہ جائے باقی تو ان کے حصے میں آسکتا تھا ورنہ ان کے مویشیوں کو پینے کا پانی بھی نہیں ملتا تھا۔ فطرت کی طرف سے مفت عطا کردہ ذرائع رزق کو ذاتی ملکیت میں لے لینا یہ تھا جرم قومِ ثمود کا۔ اصول اس کا بتایا۔ یہ پیغمبر تو کوئی ہنگامی قوانین لے کر نہیں آتے تھے وہ تو ابدی قوانین اور ابدی اصول لے کر آتے تھے۔ اصول یہ تھا کہ خدا کی پیدا کردہ مخلوق اور خدا کی زمین اَرْضُ اللّٰہِ جو ہے نَاقَةُ اللّٰہِ کے لیے رہنی چاہیے خدا کی زمین خدا کی مخلوق کے لیے کھلی ہو ہر ایک کو اس میں سے پیٹ بھر کر کھانے کو ملنا چاہیے۔ انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی، تباہ ہوگئی۔

قومِ لوط کی انسانیت سوز حرکات جو آخر کار اس کی تباہی کا باعث بنی

قومِ لوطؑ آئے اس نے جنسی بدنہادی کا قرآن نے یہ بتایا کہ جسے آج دیکھ رہے ہیں تاریخ میں کوئی دور ایسا نظر نہیں آتا جس میں یہ SEX PERVERTION اس قدر طول اور عرض دونوں میں اتنی عام ہو چکی ہوئی ہو جیسی اس دور کے اندر ہوئی ہے۔ قومِ لوطؑ کا یہ جرم گنایا گیا۔ اس کے بعد قومِ شعیبؑ آئی وہ ان کے متعلق کہا کہ وہ تجارت پیشہ لوگ تھے INDUSTRIALIST کا تو لفظ ابھی نہیں آسکتا تھا، کاروباری لوگ جنہیں آپ کہتے ہیں۔ کیفیت یہ تھی کہ جب وہ کسی کاریگر سے لیتے تھے، چیز بنواتے تھے تو وہ کم از کم قیمت اسے دیتے تھے جب وہ دوسرے کے ہاتھ بیچتے تھے تو زیادہ سے زیادہ قیمت لیتے تھے اور اس میں بھی ڈنڈی مار جاتے تھے۔ یہ تول بھی کم اور طبقة الناس چیزیں بھی پوری پوری صحیح صحیح نہیں دیتے تھے۔ گویا جسے آج کہیں گے کہ ملاوٹ بھی ہوتی تھی، کم تولا بھی جاتا تھا، بلیک میلنگ بھی اس میں ہوتی تھی، یہ ساری چیزیں ہیں جو قومِ شعیبؑ کے ضمن میں قرآن نے بتائیں اور کہا کہ قوم نہیں بچ سکتی جس میں یہ بھی جرم عام ہو جائے۔ یہ کہتے ہوئے قرآن چلا آرہا ہے۔

انسانیت کے سینے پر کابوس بن کر سوار ہونے والی تین لعنتیں تین شقوں میں تقسیم ہیں

اب ہم آ کے حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش پر آتے ہیں۔

یہاں قرآن نے تفصیل سے یہ نہیں بتایا اس لیے کہ یہ کشمکش اس سے پہلے بھی سورۃ اعراف میں ہے اور مختلف سورتوں میں آگے چل کے بھی سورۃ قصص میں، سورۃ شعرا میں بڑی تفصیل سے یہ آئے گی۔ جتنی تفصیل سے یہ داستان آئی ہے کسی اور قوم کی داستان اتنی تفصیل کے ساتھ قرآن میں بیان نہیں ہوئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ایک ہی دور میں ایک ہی نظام میں ایک ہی قوم کے ساتھ وہ کچھ ہو رہا تھا جس کا پورا نقشہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اگر آپ انسانیت کے سینے پہ جو کابوس بن کے قوتیں سوار ہوتی ہیں، جو لعنتیں ہیں انسانیت کی ان کو اگر آپ گنائیں تو وہ تین شقوں کے اندر تقسیم ہو جاتی ہیں: ایک تو استبدادِ ملوکیت ہوتا ہے۔ وہ ملوکیت کے تو ہمارے ذہن میں معنی ہیں کہ ایک بادشاہ ہوتا ہے۔ اس بادشاہ کی رعایا وہ بناتا ہے، دوسروں کو غلامی میں رکھتا ہے۔ یہ ملوکیت صرف ایک بادشاہ کی بات نہیں "ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر" سیدھی سی بات ہے۔ یہ تو FORM OF GOVERNMENT ہے یہ تو حکومت کی ہیئتِ ترکیبی ہے جو بدلتی ہے۔ وہ ملوکیت نام اس کا بادشاہت رکھ لیجئے، موروثی بادشاہت رکھ لیجئے، ڈکٹیٹرشپ رکھ لیجیے یا آج کی ڈیموکریسی کہہ لیجئے، جمہوریت کہہ لیجئے، یہ سب ملوکیت ہے۔ ملوکیت کے معنی ہیں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق حکومت قائم کرنا خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں جو استخلاف ہے صرف خدا کے دیے ہوئے قوانین کو رائج کرنا حکومت کرنا، وہاں بھی نہیں ہے۔ حکومت کا تو لفظ ہی نہیں آ سکتا اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط (12:40) حکومت کا لفظ صرف خدا کے لیے ہے دوسرے کے لیے آ ہی نہیں سکتا۔ قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا۔

فرعون اور ہامان کی محتاجی کو بغیر سمجھے کامیابی نہیں ہو سکتی

تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ جو داستان ہے حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی تو وہ داستان ایک تو ملوکیت کا استبداد ہے اس کے اندر۔ ایک قومِ بنی اسرائیل ہے، انہیں ملوکیت کے استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے۔ دوسری لعنت ملوکیت یا انسانوں کا یہ جو استبداد ہے یہ تنہا کبھی بھی کام نہیں دے سکتا، ہمیشہ اس کے ساتھ وہ خداوندی سند رکھتے ہیں۔ انسانوں کی وضع کردہ خداوندی سند۔ سند ان کی یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے کبھی تو وہ انہیں خدا کا اوتار بنا لیتی ہے کبھی ان کے لیے DIVINE RIGHTS OF THE KING (بادشاہ کے آسمانی حقوق) یعنی آسمانی نہیں خداوندی حقوق۔ وہی چیز جو پھر اس کو ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْاَرْضِ آپ کے ہاں کہا گیا، زمین پر خدا کا سایہ۔ یہ جتنا کام ہے یہ مذہبی پیشوائیت کرتی ہے فرعون کے ساتھ، ہامان کا ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ فرعونیت چل نہیں سکتی۔ کوئی

شخص برادشت نہیں کرسکتا اس چیز کو کہ اس جیسا ایک انسان اور وہ اس پہ من مانی ایسی کرے کہ اس کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے اس دور کے اندر' کبھی تو غیرت ابھرے گی' کبھی تو حمیت میں جوش آئے گا۔ اس چیز کو ٹھنڈا کرتی ہیں یہ مذہبی پیشوائیت کی عقیدت مندیاں۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

مذہبی پیشوائیت قوم کی سوچ کو دین کے پیش کردہ لازوال نظام حیات کی طرف آنے ہی نہیں دیتی

آدھی آدھی رات تک آپ دیکھیں گے آوازیں آتی ہیں ھوحق کی اور یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے اور چلی ہوئی ہے قوم اس کے اندر۔ توجہ ہی قوم کی دوسری طرف نہیں آنے دیتے کہ جب توجہ آئی تو وہاں نہایت مقدس پاکیزہ وعظ آ گیا کہ رازق خدا کی ذات ہے رزق اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے جسے چاہے وہ خاک نشیں کردے' جسے چاہے وہ بادشاہ کردے۔ کسی کو اس میں شکایت کی مجال نہیں ہونی چاہئے۔ یہ خدا کے خلاف جنگ ہے اگر یہ کہا جائے کہ اسے اتنا کیوں ملا اور مجھے یہ کیوں نہیں ملا۔ اور پھر یہ کہ جو یہاں کا غریب اور فقیر ہے وہ آخرت کا امیر ہے۔ جنت تو آنی ان کے حصے میں ہے۔ یہ برفانی سلیں ان کے سر کے اوپر رکھتے چلے جاتے ہیں تاکہ کبھی بھی سرسام نہ وہاں پیدا ہونے پائے۔ بہت بڑا کام ہے یہ جو کرتی ہے مذہبی پیشوائیت۔ اور تیسری چیز اس کے بعد نظامِ سرمایہ داری جس کا نمائندہ قارون وہاں نظر آتا ہے۔ میں نے جیسا پہلے بھی ایک درس میں کہا تھا قرآن ایک بڑے لطیف سے نقطے میں بات کر گیا ہے۔ وہ کہتا ہے فرعون تو پھر بھی دوسری قوم کا فرد تھا' بنی اسرائیل یہ دوسری قوم تھی وہ اس قوم کو اپنے شکنجۂ استبداد میں جکڑے ہوئے تھا' قومی فرق ہی سہی۔ وہ کہتا ہے قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی (28:76) یہ سرمایہ دار کم بخت اسی قوم میں سے ہوتا ہے اور ان کا خون چوستا چلا جاتا ہے۔ وہی جو حضرتِ داؤدؑ کے قصے میں قرآن نے پھر ایک لفظ میں کہا ہے کہ وہ مقدمہ لے کے آ گئے۔

نظامِ سرمایہ داری کی چابک دستی کی ایک جھلک اور اس کا طرزِ گفتگو

مقدمہ کیا لے کے آ گئے؟ وہ نظام ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اپنے تمثیلی انداز میں کہ وہ آ کے کہہ رہا ہے کہ صاحب مقدمہ کیا ہے' بات بڑی صاف سی ہے یہ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں (اس زمانے میں یہ مویشی پالنا یا مویشی جو تھے یہی دولت ہوتی تھی) میں غریب آدمی ہوں میرے پاس ایک ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دیدے۔ اور اس کے بعد ہے یہ اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ (38:23) یہ کہتا یہ ہے کہ میں تیرا بھائی ہوں' بھائی بن رہا ہے۔

فرعون کے ساتھ صاحبِ ضربِ کلیم کی کشمکش کے ٹکراؤ کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ کی طرف سے اپنے بھائی کا مطالبہ

اس سے آگے یہ کہ وہ کہتے یہ ہیں کہ چونکہ اس کے پاس ننانوے ہیں وہ سارے اس کے طرف دار ہیں بات مجھے کرنے نہیں دیتا جن میں بیٹھ کے میں بات کرتا ہوں وہ بھی اس کی طرف داری کرتے ہیں اور قدم قدم پہ سانس سانس میں کہتا چلا جاتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ قرآن کس انداز میں کیا باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ تو یہ تین ہی تو ہیں یہ جسے میں نے کابوس کہا تھا انسانیت کے سینے کے اوپر بیٹھے ہوئے: ملوکیت کا استبداد' برہمنیت یا مذہبی پیشوائیت کا خودساختہ تقدس اور قارونیت کی یہ خون چوسنے والی چیز اپنی قوم اور اپنا بھائی بن کر۔ اور یہ تینوں اکٹھی تھیں فرعون کے دور میں ان کے خلاف صاحبِ ضربِ کلیم۔ یہ کوئی چھوٹی کشمکش نہیں تھی بہت بڑا ٹکراؤ تھا۔ یہ محکوم قوم کا ایک فرد وہاں سے بھاگا ہوا' بارہ سال تک تو یہ بھیڑیں چراتے رہے۔ انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ جاؤ فرعون کی طرف اِنَّـهٗ طَغٰى وہ اب حد سے بڑھ گیا ہے جاؤ انسانیت کو اس کے پنجے سے چھڑاؤ۔ عزیزانِ من! کتنی بڑی عظیم ذمہ داری کا یہ کام تھا۔ بہر حال یہ داستان تو اپنے وقت پہ آئے گی جہاں قرآن یہ بتائے گا۔ اتنی عظیم ذمہ داری تھی کہ جس کے لیے حضرتِ موسیٰؑ کو یہ کہنا پڑا کہ یا اللہ! یہ تنہا شاید میں اس سے عہدہ برآ نہ ہوسکوں' میرے بھائی کو بھی میرے ساتھ دیدے۔ دو نبی اور اگر وہ روایت صحیح ہے' حضرتِ شعیبؑ جن کے ہاں ان کی شادی ہوئی تھی وہ تو وہاں نبیؑ تھے ہی' اگر یہ صحیح ہے تو پھر اگر سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل آئے ہیں تو وہاں تو نبیؑ ہمیں نظر آتے ہیں۔ تو یہ بہر حال کشمکش فرعون اور صاحبِ ضربِ کلیمؑ کی بڑی عظیم تھی۔ قرآن نے یہاں اس کی تفصیل نہیں دی ہے۔ میں نے اس تفصیل کے نمایاں خط و خال آپ کے سامنے پیش کیے کہ یہ پس منظر سامنے آجائے۔

حضرت موسیٰ کو قانون کی حکمران کے لیے اتھارٹی کا ملکہ بھی عطا کیا گیا تھا

وَ لَقَـدْ اَرْسَـلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (11:96) موسیٰؑ کو ہم نے اپنے قوانین دے کر بھیجا۔ کیا بات ہے قرآن کی!! سلطان کے معنی ہوتا ہے اتھارٹی' اقتدار۔ قانون تو حروف اور نقوش میں ہوتا ہے' کاغذوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے' زبانوں کے الفاظ کی شکل میں ہی ہوتا ہے اس کو ENFORCE کرنے والی ایک اتھارٹی ہونی چاہئے۔ یہ اتھارٹی اگر ساتھ نہیں ہے اس کو ENFORCE کرنے والی' نافذ کرنے والی تو قانون مذہب بن کے رہ جاتا ہے' وعظ بن کے رہ جاتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ قوتِ نافذہ ہے ENFORCE کرنے والی اتھارٹی ہے تو پھر یہی قانون نظام یا حکومت کا قانون بن کے نافذ ہوتا ہے۔ اسے دین کہتے ہیں۔ تو کہا کہ یہ قانون بھیجا اور قانون کے ساتھ وہ اتھارٹی بنا کے بھیجا حضرتِ موسیٰؑ کو کہ ایسی صورت پیدا کرو کہ تم ان قوانین کو

ENFORCE کرسکو یہاں۔عزیزانِ من! یہ دو چیزیں نہایت ضروری ہیں۔اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَائِہٖ (11:97) فرعون کی طرف۔فرعون کسی بادشاہ کا نام نہیں بلکہ وہاں کے جو بادشاہ اس دور میں مصر کے تھے ان کا لقب فرعون ہوا کرتا تھا' اس کی طرف۔اور پھر لفظ ملائہٖ یہاں آ گیا وہ عام ترجمے کے اعتبار سے اراکینِ حکومت یا سردارانِ قوم کہا جائے گا ان کو لیکن بات وہی جو قرآنِ کریم نے لفظی اعتبار سے یہ کہا ہے کہ وہ جن کے گھر بھرے ہوئے تھے دانوں سے ان کی طرف بھیجا لیکن انہوں نے فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ (11:97) انہوں نے ان کی بات نہیں مانی فرعون ہی کی پیروی کرتے چلے گئے۔

اس قدر وسیع کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ عناد یا مخاصمت سے بالاتر ہستی

وَ مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (11:97) کیا بات ہے قرآن کی! نہایت لطیف پیرائے میں ایک بات کہہ گیا ہے کہ ہمیں تو فرعون سے ضد نہیں تھی کہ صاحب! اس کا اتباع یہ انہوں نے کیوں کیا' ہمارے بھیجے ہوئے کا کیوں نہیں کیا' ہائے تمہاری ایسی کی تیسی۔یہاں یہ کہا ہے کہ انہوں نے اُن کا اتباع نہ کیا بلکہ فرعون کا اتباع کیا وہیں یہ بات بتائی کہ پھر ہمیں وجہِ مخاصمت کیا ہوئی کہ اس کا کیا پھر کیا' نہ۔وَ مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (11:97) ہم اس لیے مخالفت کر رہے ہیں فرعون جو کچھ کہہ رہا تھا۔

حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کی مخالفت اس لیے تھی کہ وہ رشید نہ تھا

اب یہ لفظِ رشید میں نے پچھلی دفعہ آپ سے کہا تھا بڑا ہی جامع لفظ ہے صاحب۔یہ رشد جو ہے آتا تو ہے یہ ہدایت کے مقابلے میں' صحیح راہنمائی غلط راستہ لیکن اس کے اندر رشادت کے اندر عقل و فہم اور بصیرت یہ ساری چیزیں آ جاتی ہیں تو ان چیزوں پہ مبنی ایک صحیح راستہ۔کہا کہ وہ فرعون کے جو احکام تھے جن کا وہ اتباع کرتے تھے وہ رشید نہیں تھے' رشد نہیں تھا اس کے اندر' یہ وجہ تھی مخالفت کی۔بڑی بات یہاں سے ایک آتی ہے کہ اسلام میں کسی کی مخالفت کسی کی موافقت شخصیتوں کی بنا پہ نہیں ہوسکتی۔نہ تو وہاں موسیٰؑ کا اتباع اس لیے تھا کہ وہ حضرتِ موسیٰؑ تھے' نہ فرعون کی مخالفت اس لیے تھی کہ وہ فرعون تھا۔شخصیتیں نہیں' بات کیا کہتا ہے وہ کہنے والا۔موسیٰؑ کے متعلق کہا باٰیٰتِنَا (11:97) وہ احکامِ خداوندی لے کے آیا تھا' فرعون کے متعلق کہا کہ جو کچھ وہ حکم دیتا تھا اس میں رشادت نہیں تھی' اس میں رشد نہیں تھا۔یہ تھا آپس میں تصادم کی بنیاد۔اس (فرعون) کے احکام بھی اگر اٰیٰتِنَا (11:97) کے مطابق ہوتے تو سوال ہی نہیں تھا اس کی مخالفت کا۔لہٰذا سوال شخصیتوں کا نہیں ہے سوال یہ ہے کہ وہ شخصیتیں کہتی کیا ہیں۔حکومت کس کے پاس ہے' یہ سوال نہیں ہے۔وہ حکومت کرتی کیا ہے حکومت قانون کیا نافذ کرتی ہے سوال ان چیزوں کے اوپر ہے۔

قرآن حکیم کے الفاظ کی اہمیت بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے آنکھ کے تل کے اندر آسمان پوشیدہ ہو

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے الفاظ سے یونہی آگے نہیں گذر جانا چاہئے یہاں تو ایک ایک لفظ کے آنکھ کے تل میں جیسے وہ آسمان پوشیدہ ہوتا ہے یہاں تو یہ کیفیت ہے۔ کہا رشید نہیں تھا' اس کے امر میں رشد نہیں تھا۔ کرتا کیا تھا؟ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ (11:98) یہ اس قسم کا لیڈر تھا کہ جو اپنی قوم کو لیے جا رہا تھا جہنم کی طرف۔ اور یہیں نار کہا اور کہا وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (11:98) کتنی بری ہے وہ گھاٹ جس کی طرف یہ اپنے مویشیوں کو لیے چلا جا رہا ہے۔ کیا بات ہے! گڈریے کا کام یہ ہے کہ اپنے مویشیوں کو (اور رعایا تو کہتے ہی مویشیوں کو ہیں' راعی کہتے ہی گڈریے کو ہیں) اس طرف لے کے جائے جہاں انہیں پانی ملے' چارہ ملے' حفاظت ملے یہ ہونا چاہیے نہ کہ اس گھاٹ کی طرف لے جائے کہ جہاں کی تلاطم خیزیاں آئیں اور وہ ہاتھی مع ہودا غائب۔ نہ گڈریا نظر آئے نہ وہاں وہ بھیڑیں نظر آئیں۔ کہا کس قدر بری گھاٹ تھی جس کی طرف وہ اپنی بھیڑوں کو لیے چلا جا رہا تھا۔ یہ کہ بری گھاٹ ہے اس کے متعلق قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے' بڑی عجیب چیز ہے۔ یہاں تو یہ کہا صرف فرعون کے ضمن میں' وہاں کہا ہے (14:28) عزیزانِ من! بڑی اضطراب انگیز آیت ہے پوچھئے نہیں میں تو جب بھی پڑھتا ہوں کانپ اٹھتا ہوں۔

نعمائے خداوندی کی قدر و منزلت کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ زندگی کے ہر قدم پر ذلت و رسوائی کی شکل اختیار کرنا ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا (14:28) تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا کہ خدا نے ان کو مفت اتنے سامانِ نعمت عطا کیے تھے بلا مزد و معاوضہ' ایک پوری مملکت کا مالک بنا دیا' مملکت بھی ایسی کہ اس کے اندر چھپے ہوئے خزانے تھے' ہر قسم کی آسائشیں' آرائشیں' زیبائشیں' اقوامِ عالم میں سرفرازیاں' عزت' تکریم' یہ سارا کچھ قرآن نے اس کو نعمت گنایا ہے کہ یہ ساری چیزیں حاصل تھیں انہوں نے ان انعاماتِ خداوندی کو کفر سے بدل دیا۔ عام ترجمہ تو اس کا ناسپاس گذاری کیا کرتے ہیں' شکر کے مقابل میں کفر آتا ہے لیکن ہمارے ہاں تو نہ شکر کا مفہوم معلوم ہے کسی کو اور نہ ہی ناشکرے کا مفہوم کسی کو معلوم ہے۔ شکر تو ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ روٹی کھائی کھانا کھایا ''یا اللہ تیرا شکر ہے'' یا مصیبتیں آئیں اور اس پہ پھر یہ ہے کہ میاں صبر شکر کرو اس کے سوا کوئی چارا نہیں ہے۔

ہماری طرف سے قرآن حکیم کے ساتھ سب سے بڑی تحریف ہی یہ ہے کہ ہم نے ان الفاظ کے معنی بدل دیئے ہیں

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ سب سے بڑی تباہی الفاظ لاتے ہیں' الفاظ کے مفہوم لاتے ہیں۔ بات جو ہے کلام اللہ ہے' کلام جو ہوتی ہے وہ تو الفاظ ہی کا مجموعہ ہے۔ خدا نے تو الفاظ ہی میں ساری کلام کی ہے۔ الفاظ معنی رکھتے ہیں اور اگر اس لفظ کے معنی ہی آپ کے ہاں بدل جائیں تو سارا کلام بدل جاتا ہے۔ اس سے بڑی تحریف کوئی نہیں ہے قرآنِ کریم کی کہ اس کے الفاظ کے معنی بدل دیے گئے ہیں۔ انہیں تو چھوڑیے جنہوں نے کہا کہ یہ سارا کچھ جو کچھ ہے یہ تو ہڈیاں ہیں کتے کے آگے پھینکنے کی (معاذ اللہ) وہ تو ان کے اندر ایک مغز ہے وہ چھپا ہوا ہے وہ اس طرح سے نظر نہیں آ رہا۔ قرآن شروع سے آخر تک کہتا چلا جاتا ہے کہ تدبر کرو' تفکر کرو' تعقل کرو' سوچو' غور کرو' لسانِ عربی مبین میں ہم نے نازل کیا ہے اس زبان میں نازل کیا ہے یہ سب کچھ ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ سب کچھ ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ)'' پئی اینوں کی پتہ ہیگا تسی نازل کیتا ہیگا ساہنوں پوچھو' یہ لفظوں وفظوں میں کچھ نہیں۔ جو یہ نہیں کہنے والے' الفاظ کو لینے والے ہیں انہوں نے کسی دور میں الفاظ کے معنی اپنے متعین کر کے اور رکھ لیے اب وہ الفاظ ہی ہیں' جو قرآن کا بدل بن گئے ہیں آپ کے ہاں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ''شکر'' آپ سوچئے اس کے معنی آپ کے ہاں کیا ہوتے ہیں ''صبر'' وہ خدا کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (2:153) ہم صابر کے ساتھ ہیں۔ اف! جس کے ساتھ خدا ہو آپ سوچئے تو سہی۔ یہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ''سیاں بنے کوتوال اب ڈر کاہے کا'' یہ تھانیدار کسی کا دوست ہو جائے تو وہ کہتا ہے کہ اب کسی کا ڈر نہیں' خدا یہ کہتا ہے کہ میں ساتھ ہوں ان کے' اتنی بڑی کائنات کا مقتدرِ اعلیٰ جس کے ساتھ ہو۔

لفظ شکر کا لغوی مفہوم چھپی ہوئی چیز کا باہر آ جانا تا کہ ہر ضرورت مند اسے اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کر سکے

لیکن آپ کے ہاں ''شکر'' کس کو کہتے ہیں؟ جب کچھ نہ ہو سکتا ہو تو ''میاں صبر شکر کرنا چاہیدا ہیگا ہور کی ہوسکدا ہیگا'' لفظ کے معنی بدل دیے۔ شکر کے معنی ہوتا ہے کہ چیزیں تو ہوتی ہیں' کیا عرض کروں کہ آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا جب تک یہ الفاظ نہ سامنے لائے جائیں۔ بھینس' گائے' بکری دودھ تو ان کے اندر کہیں ہوتا ہے لیکن کہیں چھپا ہوا ہوتا ہے جب اس دودھ کی کیفیت یہ ہو جائے کہ پہلے تھن بھر جائیں پورے اور ایسے بھر جائیں کہ از خود دودھ ٹپکنا شروع ہو جائے EFFORT بھی نہ کرنی پڑے اس میں سے دودھ نکالنے کی۔ جب کسی گائے' بھینس' بکری کی دودھ دینے والے مویشی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ ہوا نہ بھر جائے (معاف رکھئے گا پنجابی کا لفظ

ہے مجھے اس کا اردو نہیں پتہ کیا ہوتا ہے) تو وہ بھر جائے اس کا اور پھر وہ تھن یوں بھر جائیں کہ اس میں سے نظر آ جائے کتنا ہے دودھ' پھر معلوم ہو جائے کہ وہ کس طرح سے خود ٹپک رہا ہے اس میں سے لینے والے کے لیے۔ جب کیفیت کسی چھپی ہوئی چیز کی یہ ہو جائے تو اسے شکر کہتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں وہ چیزیں جن کو کھلا رہنا چاہیے جب ان کو چھپا دیا جائے اسے عربی میں کفر کہتے ہیں۔ اب بات سمجھ میں آئے گی کہ یہاں قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ اتنی نعما ہم نے دیں اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ (14:28) تَرَ کا لفظ وہاں آتا ہے جہاں محسوس طور پہ وہ کہتا ہے' فکری چیز صرف نہیں ہوتی' آنکھوں سے دیکھنے والی چیز ہوتی ہے۔ تو کیا تم نے دیکھا ان لوگوں کا حال کہ جن کو ہم نے اتنی نعمتیں دیں بجائے اس کے کہ وہ ان نعمتوں کی کیفیت کرتے کہ وہ شکر کی کیفیت اختیار کر لیتیں ہر ایک کے سامنے ابھری ہوئی ہوتیں خود ٹپک پڑتیں جس کا جی چاہتا نیچے گلاس رکھ کے اس میں سے دودھ لے لیتا بجائے اس کے کہ یہ ہو بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا (14:28) انہوں نے چھپا چھپا کے ان کو رکھ لیا۔

شکر کے عمل کو نظروں سے اوجھل کرنے کے باعث وہ قوم ایسی جنس میں بدل گئی کہ جس کا تو خریدار ہی نہ تھا

عزیزانِ من! یہ ہے جرم۔ نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ چار لفظوں میں سنیے اور کہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ (14:28) اور اپنی قوم کے کاروان کو جا کر انہوں نے اس منڈی میں اتارا جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں ہے "کوئی ذات ای نئیں پچھدا آ کے کہ تسی کیتھوں آئے ہوتے کی لیائے ہو ایس قافلے دے وچ"۔ اف ہو! عزیزانِ من! قرآن ہے۔ جنہوں نے اپنی قوم کے کاروان کو ایسی منڈی میں جا کے اتارا کہ جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں' پوچھنے والا ہی نہیں۔ کہتا ہے سننا چاہتے ہو یہ کیا ہے؟ جَهَنَّمَ (14:29) اس کو جہنم کہیں گے۔ جَهَنَّمَ يَصۡلَوۡنَهَا (14:29) یہاں ان کو داخل کر دیا گیا۔ دیکھئے کون داخل کر رہے ہیں؟ یہ قوم کے قائد جو لیے جا رہے تھے جسے کارواں سالار آپ کہتے ہیں لیے جا رہا ہے۔

تجارت کی خاطر پانچ پانچ سو میل کا سفر کرنے والی قوم کے لیے قرآن حکیم سمجھانے کی ایک موثر ترین مثال

عزیزانِ من! کیا تشبیہ ہے!! اس دور میں تو وہ لوگ جب ان کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا میں سمجھتا ہوں ایک اتنی سی مثال سے اتنا کچھ وہ سمجھ گئے ہوں گے۔ جن قوموں کا دارومدار تجارت پہ ہو اور وہ پانچ پانچ سو میل کے کارواں چلیں۔ قافلہ چلے سامانِ تجارت لاد کر' چھ چھ مہینے لگ جاتے تھے ایک جگہ سے سامانِ تجارت لے کے آنا۔ اور وہ کونسی ویگنیں بھری ہوئی ہوتی تھیں' زیادہ سے زیادہ اونٹ ہی تھے کتنا ایک اونٹ کے اوپر لادا ہو گا جس اونٹ نے پانچ چھ سو میل پھر چلنا ہو صحراؤں میں' کتنا ہو گا وہ سامان' کتنے ہوں گے وہ اونٹ' آدھا سال جانے میں آدھا سال آنے میں لگ جاتا ہو گا' ایک ہی پھیرا ہوتا ہو گا سال میں۔ سوچئے تو سہی کہ کارواں ایک ایک اپنا اپنا

اونٹ لوگوں نے ساتھ کیا اور آ کے سالارِ کارواں کو دیا کہ ہاں صاحب! یہ تجربہ کار ہے اس معاملے میں کہ وہ جائے اور وہ لے جا کے اس کارواں کو اس منڈی میں اتار دے کہ جہاں کوئی آ کے پوچھے ہی نہیں کہ تم کیا لے کے آئے ہو' کیا بیتے گی اس کارواں کے لوگوں پر۔ میں نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال سے سوچئے کہ وہ جو پہلے مخاطب تھے عرب وہ کس طرح سے بات وہ سمجھے ہوں گے' انہوں نے تو سر پیٹ لیا ہوگا کہ صاحب! یہ کیفیت کہ پوچھے ہی کوئی نہ۔ مثال اس کی ہے اس مثال کے معنی قیامت تک کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ سامانِ تجارت اونٹوں پہ لدا ہوا نہ سہی انسانوں کی زندگیاں' ان کی عزت' ان کی تکریم' ان کے اثاثے' ان کی سرفرازیاں' قوموں کی نگاہوں میں ان کے مقامات' یہ ہیں وہ سامان جو لے کے یہ چلے۔ چلا لے کے اس کارواں کو اتار دیا آ کے اس منڈی میں جہاں کوئی ان کی ''پنجابی اچ ذات کیندے نیں او بات نالوں زیادہ جامع گل ہوندی ہیگی اے' جتھے اوناں دی کوئی ذات ای نہ پوچھے'' یہ ترجمہ ہو سکتا ہے۔ جہنم' توبہ توبہ۔ اب سوچ لیا آپ نے جہنم کسے کہتے ہیں۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَاط وَ بِئْسَ الْقَرَارُ (14:29) قرار: کارواں کی مثال دی ہوئی تھی' قرار ہمیشہ اس چیز کے لیے وہ بولتے تھے۔ جو شروع سے ہی ساکن ہو اس کے لیے قرار کا لفظ نہیں آتا۔ جو حرکت میں رہنے والی چیز ہو اس کو اگر بے حرکت کر دیا جائے' وہاں قرار آتا ہے۔ حرکت ختم کر دی' کارواں کی آگے منزل ہی کوئی نہیں تھی وہ تو منزل یہ تھی جہاں لے آیا وہ اس کو۔ حرکت تو یوں ختم کر دی صاحب! اس کی' بٹھا دیا لا کے یہاں اور پھر وَّاَحَلُّوْا (14:28) رسیاں کھول دیں اونٹوں کی' سامان اتار دیا۔ بظاہر کس قدر خوشی کا مقام ہوگا افرادِ کارواں کے لیے یہ کہ منزل پہ پہنچ گئے' سامان بھی اتر گیا' رسیاں کھل گئیں' اب آئیں گے صاحب! خریدار اور پھر دیکھئے کس قدر خوشی خوشی واپس لوٹیں گے۔ اور وہ بیٹھے ہیں صاحب! خریدار آتے ہیں' جاتے ہیں' کوئی پوچھتا ہی نہیں ''ذات ای نئیں کوئی پچھدا ہیگا او ہناں دی'' جہنم۔

خدا کے مقابلے میں کسی دوسرے کو خدا بنا لینے کا نتیجہ

عزیزانِ من! جہنم وَ بِئْسَ الْقَرَارُ (14:29)۔ کیا کیا تھا انہوں نے؟ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (14:30) خدا کے مقابلے میں خدا کھڑے کر دیئے یہ کیا تھا انہوں نے۔ بات ہو رہی تھی حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی۔ کہا یہ کہ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (11:98) اپنی قوم کی قیادت کرتا ہوا' یہ وہاں لے گیا اس کو جہنم میں۔ کتنی بری گھاٹ تھی جہاں اس نے جا کے اس گڈریے نے اپنے مویشیوں کو اتار دیا۔ بری گھاٹ تھی جہنم تھا کیا ہوا؟

لفظ لعنت کا مفہوم ہے خوشگواریوں سے محروم رہ جانا

وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً (11:99) پھر وہ آ گیا ایک اور لفظ ''لعنت'' ہمارے ہاں تو آپ جانتے ہی ہیں ''دُر لعنت' پنجابی اچ

جنوں فٹے منہ کیندے نیں'' ''لعنت'' گالی بن کے رہ گئی ہے بات۔ لعن کے معنی ہوتا ہے خوشگواریوں سے محرومیت' کسی شے سے محروم رہ جانا' اس سے دور رہ جانا' وہ پرے ہو دور کھڑا ہو تک رہا ہو' اس کی طرف پہنچ نہ پائے' حاصل نہ وہ ہو سکے اتنی دوری اور اتنا بُعد جو ہے اسے کہتے ہیں لعن۔ چیزیں ساری وہیں موجود ہوتی ہیں ان سے دور ہٹا دیا جاتا ہے قوم کو۔ کہا کہ سب کچھ ہوتے ساتے بھی قوم کی کیفیت یہ کہ وہ ان چیزوں سے دور تھی' مہجور تھی' محروم تھی یہاں بھی وَّ یَـوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ(11:99) اس کے بعد کی زندگی آنے والی جو ہے اس کے اندر بھی یہ کیفیت ہوگی لیکن پہلے سب سے وَ اُتۡبِـعُوۡا فِىۡ هٰذِهٖ لَعۡنَةً (11:99) کہیں ذہن کے اندر یہ بات نہ آئے کہ یہاں نہیں یہاں تو بالکل مرفع الحالی ہو اور آخرت کے متعلق تو دیکھ ہی نہیں سکتا' معلوم ہی نہ ہو سکے کیا ہے؟ اس نے کہا کہ پہلے یہاں شروع ہوتی ہے یہ لعنت' یہاں محرومیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! محرومیاں کسی قوم کے افراد کی سب کچھ ہوتے ساتے۔ یہ پہلے کہا ہے کہ ان کو نعماء دی ہوئی ہوتی ہیں سب کچھ ہوتے ساتے قوم کی محرومیاں۔ کہا یہاں یہ کیفیت اور جو قوم یہاں اس قسم کی زندگی بسر کر رہی ہو وَّيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ(11:99) وہ محروم رہتی ہے وہاں بھی۔

نعمائے خداوندی سے محروم رہنا قربِ خداوندی کی نشانی نہیں ہوتی

یہ یہ نہیں ہے کہ یہاں اگر وہ بدحالیاں ہیں' فاقے ہیں' مفلسی ہے' محکومیت ہے' ذلت ہے' خواری ہے اور ذہن میں یہ کہ کوئی بات نہیں یہاں چار دن کی ذلت اور خواری ہی سہی' قیامت میں تو سرفرازیوں کے مالک ہم ہی ہونگے۔ یہ تو جتنے کافر ہیں' وہ سارے جہنم میں جائیں گے' ہم جنت میں چلے جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے وَمَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى(17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا اندھا ہی ہوگا۔ پہلا ٹیسٹ اس دنیا میں رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) اس لیے یہ جو تھی محرومی اس زندگی میں بھی محرومی وَّيَـوۡمَ الۡقِيٰمَةِ (11:99) اور مکافاتِ عمل کے دن بھی وہی محرومی ان کے حصے میں وَ بِـئۡسَ الرِّفۡدُ الۡمَـرۡفُوۡدُ (11:99) ہر قوم کا کوئی نہ کوئی اثاثہ ہوتا ہے کہتا ہے پوچھو اس قسم کی قوم کہ کیا اثاثہ ہے جناب کا اور جو وہ ان کی حالت بتا رہی ہو کہ کس قدر برا اثاثہ ہے جس کی مالک ہو یہ قوم۔ ان تمام اقوام کی داستانیں بیان کر کے ان کے جرائم' جرائم کے فطری نتائج' ان کی تباہیاں یہ وہ قومیں تھیں کہ جن سے یہ عرب قرآن کی پہلی مخاطب قوم تھی وہ متعارف تھے جانتے تھے۔ یہ انہی علاقے میں بسنے والی قومیں تھیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی ہر قوم کی طرف انبیائے کرام کو بھیجا گیا تھا جو اب صفحہ ارض سے ہی مٹ چکی ہیں

قرآن نے بتایا ہے کہ ان شاہراہوں پہ تم جاتے ہو' قافلے لے کے تو ان کے ادھر اُدھر تم کھنڈرات دیکھتے ہو ان کے' یہ انہی قوموں

کے کھنڈرات ہیں۔ جیسا کہ عام طور پہ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ صاحب! قرآنِ کریم میں تو وہ سامی اقوام جو ہیں انہی کا ذکر آیا ہے اور انبیاؑ کا بھی انہی کا ذکر آیا ہے باقی دنیا میں کیا نبی نہیں آئے تھے؟ وہاں یہ ہوا ہی نہیں تھا؟ سوال یہ نہیں ہے کہ نہیں آئے تھے قرآن نے تو کہا ہے کہ ہر دور میں نبی' ہر قوم میں نبی' ہر قریے میں نبی لیکن سیدھی سی بات ہے کہ جو سب سے پہلی قوم تھی جب ان کے سامنے پیش کرنی تھی کوئی قوم اور اس کا مآل اور اس کا انجام تو وہی کرنی چاہئے تھی جن سے متعارف ہوتے۔ اگر وہ عربوں سے کہا جاتا کہ جا کے دیکھئے تو سہی کہ وہ تائیوان میں چینیوں کے ساتھ کیا ہوا اور کنفیوشس نے آن کے ان سے کیا کہا' وہ پوچھتے کہ سرکار یہ کس دیس کی بولی بول رہے ہیں آپ اور پھر اس کا ثبوت کیا ہے کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ کہا یہ کہ یہاں سے تو تم مدینے سے نکلتے پہلے پڑاؤ پہ جاتے ہو' جو کھنڈرات نظر آتے ہیں تم خود بتاتے ہو کہ یہ کس قوم کے کھنڈرات ہیں۔ اور جو قومیں اس طرح سے سیاحت کرنے والی ہوں ان کے راستے میں جو کھنڈرات پڑتے ہیں' وہ تو زباں زد ہو جاتی ہیں ان کی داستانیں' پھر ان کے یہ لوک گیت ہوتے ہیں ان کے ہاں کے' ان کی شاعری کے اندر ان کے قصے تھے۔ وہ ایک ایک سے واقف تھے۔ ان کے کھنڈرات سے واقف تھے اسی لیے کہا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ (11:100) یہ ہیں وہ قومیں جن کی بابت تمہیں بتایا گیا ہے۔ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ (11:100) قوموں کے تباہ ہونے کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ قوم ہی کسی ایک حادثے سے یا رفتہ رفتہ صفحۂ ارض سے ہی مٹ جائے' ان کا نام ونشان ہی باقی نہ رہے۔ تو تاریخ میں بہت سی قومیں ایسی آتی ہیں کہ جن کے صرف نام باقی ہیں۔ قرآن نے ان قوموں کے متعلق کہا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ (23:44) پھر ہم نے انہیں داستانیں بنا دیا وہ قومیں داستان بن کر رہ گئیں۔

طبعی طور پر زندہ رہ جانے والی قوموں کی حالتِ زار کہ جو اپنی لاشوں کو اٹھانے پھر رہی ہیں اور جن کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

دوسری قومیں وہ ہوتی ہیں کہ جو طبعی طور پہ تو زندہ رہتی ہیں لیکن زندہ اقوام کی صف میں وہ کھڑی نہیں ہوتیں۔ سانس لینے کے باوجود وہ مردہ ہوتی ہیں وہ اپنے لاشوں کو اپنے کندھوں پہ اٹھائے اٹھائے پھرتی ہیں یہ ان کی لاشیں ان کے ماضی کے افسانے ہوتے ہیں جن میں پھر وہ فخر محسوس کرتی ہیں جن کے سہارے وہ زندہ ہوتی ہیں۔ یہ وہ لاشیں جیسے میں نے کہا ہے یہ قومیں ان لاشوں کو اٹھائے پھرتی ہیں ماضی کی داستانیں دہرا دہرا کے کہ صاحب! کیا ہوا اگر انہوں نے آج یہ ایجاد کر لیا' ہمارے ہاں وہ دیکھئے فلاں شخص نے یہ ایجاد کیا۔ یہ سمجھنے کی بات ہے بڑی خوبصورت ترکیب ہے یہ۔ YESTERDAY تو وہ ہے کہ جو گذشتہ کل جو ہے وہ ہوا اور گذر گیا' آج آ گیا ہے ایک نیا دن لیکن اگر وہ جو کل ہے گذرا ہوا اس کو ابدیت ہو جائے وہ مستقل طور پہ وہی رہے تو اس قوم کی سرزمین پہ تو نیا سورج طلوع ہی نہیں

ہوسکتا ETERNAL YESTERDAY ۔ تباہ شدہ قومیں جو سانس لیتی ہیں کہتا ہے کہ ان کے ہاں ETERNAL YESTERDAY ہوتا ہے اس کے سہارے کے اوپر وہ جیتی ہیں بس اس کی پرستش کرتی رہتی ہیں۔ نیا سورج اس قوم کی سرزمین پہ طلوع نہیں ہوتا' ابدیت اور دوام حاصل ہوجاتا ہے اس کے YESTERDAY کو' اس کی ماضی کو اس قوم میں' نہ اس کا حال درخشندہ ہوتا ہے نہ مستقبل میں امید کی شعاعیں ہوتی ہیں۔ اور اسی لیے قرآنِ کریم نے پہلے ہی صفحے میں جو اس نئی انقلاب بردوش کا تعارف کرایا تھا' تعارف یہ تھا وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) مستقبل کے اوپر وہ دھیان رکھنے والی قوم ہوتی ہے۔ ''ہوگیا ترجمہ صاحب! ایہہ اوی ایمان رکھن والے دن قیامت تے' دن فیر دیہاڑا ہوگیا'' سوچا نہیں قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ETERNAL YESTERDAY اس سے نکالتا ہے وہ قوموں کو۔ قومیں زندہ اسی صورت میں ہوسکتی ہیں کہ ان کی نگاہ مستقبل کے اوپر ہو۔ اور جب مستقبل پہ نگاہ ہے وہ تو اسی قوم کی ہوسکتی ہے جس کا آج درخشندہ ہے۔ آج کی تباہ حال قوم جو ہے وہ مستقبل درخشندہ اسی صورت میں ہوگا کہ اپنا حال (PRESENT) کو درخشندہ وہ بنائے۔ اسی لیے یہ بھی بڑی ضروری چیز ہے کہ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201) آج کی زندگی کے اندر ورنہ

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اور امروز اس قوم کی تقدیر میں آسکتا ہے جو فردا کو ابدیت در کنار نہ بنالے۔ اگر وہی جامد ہوگیا اس کا جو ماضی ہے اسی نے ہمیشہ کے لیے اس کے اوپر مسلط رہنا ہے' وہ آج کی درخشندگی کا سوال ہی نہیں' جس کی آج کی درخشندگی نہیں ہے' مستقبل کی طرف توجہ ہی نہیں جاسکتی۔ عزیزانِ من! قرآن نے لپیٹ کے رکھ دیا آج اور مستقبل کو وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْن (2:4) اور اصول یہ دے دیا کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) جو آج کا اندھا ہے جس کا آج درخشندہ نہیں ہے اس کا آنے والا کل بھی درخشندہ نہیں ہوسکتا۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں دو پژمردہ قوموں کا تعارف

میں نے کہا تھا مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ (11:100) قوموں میں دو قسم کی قومیں ہوتی ہیں کچھ قومیں تو ہیں کہ وہ طبعی طور پہ تو زندہ ہوتی ہیں ان کو کہا قائم یہ قومیں ایسی ہیں جو تمہیں نظر آئیں گی کہ یہ ان قبیلوں میں سے ہیں یہ ان قوموں میں سے ہیں۔ وَّ حَصِيْدٌ (11:100) کیا بات ہے قرآن کی! حَصِيْدٌ (11:100) ہوتا ہے کبھی آپ نے یہ کٹا ہوا کھیت دیکھا ہے جو اس کی فصل اوپر سے ساری کاٹ لی

جائے اوراس کے نیچے جو وہ اس کے جڑیں سی باقی رہ جاتی ہیں وہ جڑیں بتا رہی ہوتی ہیں کہ یہاں کبھی فصل تھی اور آج جو وہ ہوتی ہیں نہ صرف یہ کہ وہ خود کسی کام کی نہیں ہوتیں، جب تک وہ موجود ہوتی ہیں، وہ زمین کسی کام کی نہیں ہوتی ''پہلاں منڈھ کڈنے پیندے نیں اوہدے وچوں''۔ حَصِيْدٌ (11:100) کہتے ہیں اس کھیت کو جو کٹا ہوا ہو اور اس کی جڑیں وہاں باقی رہ گئی ہوں۔ توبہ توبہ! ان کی حالت پھر یہ ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا قوموں کی تباہی و بربادی خدا کے غیر متبدل اصولوں کو نظر انداز ہونے کا نتیجہ نہیں

اب اتنی اقوام کی تباہیاں، بربادیاں ہمارے سامنے آ گئیں۔ حضرتِ نوحؑ سے لے کے اور یہاں تک ہم پہنچ گئے اور ہر جگہ یہ ہوا کہ خدا نے اسے یہ کر دیا، خدا نے یہ کر دیا، خدا نے یہ کر دیا۔ تو ذہن میں یہ چیز آئی کہ صاحب! یہ خدا بس ان قوموں کو تباہ کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک پہنچ کے جو یہ تھا ذہن میں وہ تو ہمارے دلوں میں گذرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ ہمارے ہی نہیں گویا قیامت تک کے انسانوں کے۔ تو یہ تھا کہ یہاں سے یہ خیال دل میں گذر سکتا ہے یہاں کہہ کے یہ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ . وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ (11:100-101) ارے بابا! ہم نے نہیں ان کے ساتھ کچھ زیادتی کی، ہم نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ ارے بھئی! پھر کس نے زیادتی کی؟ تو چلو جی! پھر توجہ کا رخ پھیر دیا جائے گا کہ ہندو نے زیادتی کی، سکھوں نے زیادتی کی، روس نے زیادتی کی، امریکہ نے زیادتی کی، چلو خدا کی طرف سے رخ پھیرا ان کی طرف موڑ دیا۔ وہ تو قرآن ہے جب کہا ہے مَا ظَلَمْنٰهُمْ (11:101) ہم نے نہیں ان کے اوپر زیادتی کی وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (11:101) انہوں نے اپنے آپ پہ خود زیادتی کی۔ وہ تو کہیں باہر میں دشمن کو ڈھونڈنے ہی نہیں دیتا ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (11:101) اپنے آپ پہ خود زیادتی کی۔ ورنہ اصول تو اس کا وہ ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) ہم تو کسی قوم کو دی ہوئی چیزیں چھینتے ہی اس سے نہیں ہیں تاوقتیکہ خود وہ اپنے اندر ایک تبدیلی نہ پیدا کر لے۔ عزیزانِ من! یہ تو جو کچھ خارج میں ہوتا ہے وہ تو انسانوں کے اپنے اندر کے خیالات، فکر، جذبے، ارادے، عزائم ان کے تابع ہوتا ہے سارا کچھ۔ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (11:101) اپنے آپ پہ زیادتی کی۔

قوموں کی تباہی کی بنیادی وجہ تعمیری سوچ کی اجتماعی روش کو نظر انداز کرنا ہے

بات قوموں کی ہو رہی ہے ایک ایک فرد کتنی ہی بڑی خرابی کے اندر کیوں نہ ہو جائے قوم اس سے تباہ نہیں ہوتی۔ ایک فرد کی کسی خرابی سے ہوتا کیا ہے؟ وہ اجتماعی طور پہ کچھ غلط راستے ہیں جو اختیار کرتے ہیں۔ اجتماعیت پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ آپ اوپر ایک اپنا لیڈر نہ بنا لیں ''اے بُہاری دا بندھن ہوندا ہیگا اے جنوں لیڈر کیندے نیں''۔ یہ جو اگلی بات ہے کہ ''اے بہاری جیہڑی ہیگی اے اے باہر دی

غلاظت صاف کردے یا گھرنوں جھاڑ و پھیر دے جنوں کیندے ہیگے نیں'' لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ ایک وہ ایسا مرکز ہو جس کے تابع یہ افراد جو ہیں ایک اجتماعیت ان میں پیدا ہو۔ کہتا ہے یہ جو تھا اپنے آپ پہ زیادتی کرنا' تو میں اس کا کیا طریق اختیار کرتی ہیں؟ فَمَآ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیۡ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ (11:101) یہ افراد پھر گروہ بناتے ہیں اور اپنا اپنا خدا الگ الگ تجویز کر لیتے ہیں اور جب پھر ان کی غلط روش کے نتائج سامنے آتے ہیں تو پھر اکبر کے الفاظ میں

بیک گردشِ چرخِ نیلو فری
نہ انجن بماند نہ انجینئری

مکافاتِ عمل کے تحت ظہورِ نتائج کے وقت اہل جہنم کے باہمی مکالمات بڑے سبق آموز ہیں

وہ پھر اس وقت نہ وہ خدا باقی رہتا ہے نہ اس کے یہ پرستار باقی رہتے ہیں فَمَآ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیۡ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ ؕ (11:101) جب خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی بنا پہ وہ نتیجہ آتا ہے تو پھر اس وقت نہ ان کی جتھے بازی اور نہ ان کے ذہن کے تراشیدہ خدا ان کے کسی کام آ سکتے ہیں۔ اَغۡنَتۡ (11:101) کسی کام نہیں آ سکتے' کام آنا تو کیا وہ تو پہلے اپنی جان بچا کے بھاگے بھاگے پھر رہے ہوتے ہیں۔ وہ قرآن میں جہاں جہنم کے اندر قوم اور لیڈروں کے جو مکالمات دیے ہیں وہ بڑے ہی عجیب و غریب ہیں۔ میں پیش کر چکا ہوں کئی دفعہ' آؤں گا تو پھر بھی پیش کروں گا۔ وہ بڑی ہی سبق آموز' وہ عبرت انگیز چیزیں ہیں کہ جہنم کے اندر دونوں گھر چکے ہوئے ہیں وہاں پھر مکالمے کیا ہوتے ہیں لیڈرز کے اور ان کے جو FOLLOWERS ہیں ان کے جو مکالمے ہوتے ہیں۔ جب خدا کا امر آیا تو کوئی خدا ان کے کام نہ آ سکا۔ وہ ٹھیک ہے ایک انداز میں کہہ گیا ہے وہ غالب لیکن وہ ایک گوشہ ہی ہے کہ

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

وہ بات نہیں وہ سمجھا اس کی بندگی ہی تو تھی جس نے تباہ کیا تھا اگر سرکشی اختیار کر لیتا تو تباہ کیوں ہوتا۔ زیادہ گہرا نہیں جاتا یہ۔

وَ مَا زَادُوۡهُمۡ غَیۡرَ تَتۡبِیۡبٍ (11:101) وہ خدا ان کو بالکل بچا نہ سکے' ان کے کسی کام ہی نہ آ سکے۔ کام آئے تو اتنا ہی کہ اور زیادہ تباہیاں بڑھتی گئیں ان کی۔ مرتے مرتے بھی اگر انہی کی طرف انہوں نے دیکھا اور انہی کا دامن پکڑا مَا زَادُوۡهُمۡ غَیۡرَ تَتۡبِیۡبٍ (11:101) تو تباہیاں اور بڑھتی چلی گئیں۔ وَ کَذٰلِکَ اَخۡذُ رَبِّکَ اِذَآ اَخَذَ الۡقُرٰی وَ هِیَ ظَالِمَةٌ (11:102)

حضرت نوح سے لے کر قوم عادؑ قوم ثمودؑ قومِ مدینؑ اور قوم شعیب کی بیان کردہ داستانیں قوموں کی موت وحیات کے واضح تر اصول اپنے اندر لیے ہوئے ہیں

کہا کہ دیکھ لیں تم نے داستانیں حضرتِ نوحؑ سے لے کے اس وقت تک کی۔ وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ (11:102) یوں پکڑا کرتا ہے تیرا رب جب پکڑتا ہے وہ کسی قوم کو کس کو؟ وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ط (11:102) ظالم قوم کو پکڑتا ہے۔ اور میں نے عرض کیا ہوا ہے کہ عربی زبان میں ظلم کا لفظ جو ہے ہمارے ہاں تو صرف بے انصافی کے معنوں میں آ جاتا ہے زیادتی کے معنیٰ بڑا جامع لفظ ہے ظلم کے معنی ہوتا ہے کسی شے کا وہاں نہ ہونا جہاں اسے حقیقت میں ہونا چاہئے۔ جسے وہاں ہونا چاہئے وہ وہاں نہ ہو وہاں سے اتار دیا جائے۔ جو وہاں ہونے کے قابل نہ ہو اس کو وہاں رکھ دیا جائے۔ کیا بنیادی چیزیں ہیں صاحب! اس قوم کے ہاں۔ اگلی جتنی چیزیں آتی ہیں وہ اسی بوئے ہوئے بیج کے برگ وبار ہوتے ہیں۔ سارا ظلم اس کا ہوتا ہے کہ جس کو جہاں ہونا چاہئے وہ نہ وہاں ہو۔ اَخَذَ الۡقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ط (11:102) وہ ظالم قومیں تھیں۔ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ (11:102) اس کی گرفت ایک تو یہ ہے کہ شدید ہے۔ یہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر وہ چھڑا کے کوئی بھاگ جائے یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اور بڑی دردانگیز ہوتی ہے الیم ہوتی ہے۔ یہ جو الیم ہے یہ یہاں آ کے ایک پھر خیال آتا تھا وہ GOD IS MERCY, GOD IS LOVE خدا رحم ہے۔ رحم کہا تو رحمدل ہو گیا اب جب رحمدل ہوا تو یہاں ہے الیم وہ گرفت ایسی ہے دردانگیز۔ جب کسی کو درد ہو کسی کے پکڑنے سے اور یہ واقع ہو رحمدل تو پھر ہوتا کیا ہے؟ اگلی چیز جو ہے شدید پھر وہ نہیں رہتی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کیا کر رہا ہے یہ قرآن۔ پھر کہیں گے وہ بات یاد آ گئی۔ صبح اٹھا تو وہ تھا بڑا تنگڑا گاؤں میں مشہور تھا مارنے والا بھی تنگڑا بھی گرفت بھی بڑی تھی (عیسائیت کا خدا) ''سویا اٹھیا تے بیٹھا رون ڈیا ہویا' کہن لگا اوئے کی ہویا اے' کہن لگا رات اتے او چور آیا آن کے گھر اچ ایناں کچھ ہیگا سی اولے کے نٹھا۔ او کہن لگا کہ توں ستا ای رہیا ایں؟ کہن لگا ستا کیوں رہیا ایں میں جاگیاں' کہن لگا جاگیاں تے او تیرے سامنے لے اونٹھیا؟ کہن لگا ہاں' کہن لگا او توں دھوم اپنی اپنی پائی ہوئی ہیگی سی کہ میرے اگے کوئی نٹھ نئیں سکدا' فیر کی ہویا؟ کہن لگا میں گیا اوہدے پیچھے نٹھا' کہن لگا فیر؟ کہن لگا میں پھڑ لیا' کہن لگا فیر تے توں ساہنوں کہنا آں پئی میں جینوں ہتھ پاواں کوئی چھڑا نئیں سکدا ہویا فیر کی؟ کہن لگا میں ہتھ پایا اوہدی وینی نئیں او چھڑا سکدا اسی! تے فیر ہویا کی؟ کہن لگا میں ہتھ پایا تے او ہنے کیا او چھڈ دئیں پھوڑا ای ایتھے' میں چھڈ دتا''۔ یہ ہے عیسائیت کا خدا۔

عیسائیت کی پیش کردہ تعلیم کے برعکس خدا تعالیٰ کے نزدیک مکافات عمل کے نتیجے کی نوعیت

عزیزانِ من! عجیب چیزیں قرآن کہہ جاتا ہے میں نے جب اس پہ غور کیا۔ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ (11:102) اور ایسا ہی قومِ ثمود کے

قصے میں جب اس نے کہا ہے کہ یہ جو خدا کے دئے ہوئے رزق کو ذاتی ملکیتوں میں لا کے غریبوں' کمزوروں کو محروم رکھتے ہیں' اس کے بعد جب پھر دمدما ہے' دمدما روڈ رولر کو کہتے ہیں۔ کہا کہ اس کے بعد پھر خدا کا روڈ رولر آتا ہے تو پھر اس کے بعد وہ ہموار کر کے رکھ دیتا ہے اور اس کرنے کے بعد وہ کہتا ہے وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (91:15) یہ چیز اس کے دل میں رحم نہیں پیدا کرتی کہ اس کے ساتھ کیا ہو جائے گا' 'اور ایہناں دے بچے مرجان گے' ' وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (91:15) اس لیے کہ وہ جتنے اس کے CONSEQUENCES ہوتے ہیں عُقْبٰهَا (91:15)' بعد میں آنے والی چیزیں وہ خدا کے سامنے پہلے ہوتی ہیں۔ اس کے سامنے پہلے ہوتی ہیں اس لیے یہ بات تو اس کو ہو کہ جس کو اسی وقت کوئی چیز سامنے آئے تو اس کے بعد پھر دل کی کیفیت یہ ہو GOD IS MERCY ۔ وہاں عدل کا تصور ہی نہیں ہے ان کے ہاں' عیسائیت میں قانون ہی کوئی نہیں ہے۔ عجیب چیزیں ہیں یہ دونوں مذہب' یہودیوں کے اندر توبہ کوئی نہیں ہے۔ باز آفرینی کے لیے کوئی مہلت ہی نہیں ہے۔ ایک دفعہ لغزش ہوئی' ہمیشہ کے لیے CONDEMN تاوقتیکہ پھر ان کے بڑے آ کے ان کو چھڑا کے نہ لے جائیں۔ وہ تو دوسری بات تھی پہلے اب یہ جھک ماری کہ اس کے بعد کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ صاحب! اس کے بعد تو پھر ہمیشہ کے لیے یہ کیا کریں؟ پھر بڑے بھیجے سفارش کے لیے وہ چھڑا کے لے آئیں گے۔

خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا لغوی مفہوم

عیسائیت آئی ان کے ہاں قانون ہی کوئی نہیں تھا۔ قانون ہی نہیں تھا تو عدل کا تصور ہی نہیں۔ جب عدل نہیں ہے تو پھر رحم ہی ہو سکتا ہے صاحب۔ یہ جو خالص رحم نے جو تباہیاں مچائی ہیں وہ گیلن سے پوچھئے کیا کہتا ہے وہ۔ خدا وہ ہے کہ جو رحیم بھی ہے اور اس کے بعد گرفت اس کی شدید ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے رحم ہے اس کا' رحم یہ ہے اس کا کہ ایک ہی لغزش کے اوپر ہمیشہ کے لیے وہ CONDEMN نہیں کر دیتا ہے' باز آفرینی کے مواقع اس نے مہیا کر رکھے ہیں اور یہ ہے رحم' خدا کا رحم لیکن یہ نہیں کہ جب کوئی امر اپنے آخری نتیجے تک پہنچ جائے وہ سامنے آ جائے گرفت آ جائے ''ہتھ پا لئے چور نیں'' اور اس وقت اگر وہ یہ چیز کہے کہ پھوڑا دکھ گیا ہے ''تے اوہدے بعد اوچھڈ دیوے تے فیر بعد اچ بیٹھ کے رون لگ پئے''۔ آپ غور کیجئے اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ (11:102)۔ عزیزانِ من! آج کتنے پھوڑے ہمارے دکھ رہے ہیں تباہی کا ہی پھوڑا نہیں سینہ تمام داغ داغ' پنبہ کجا کجا نہم اور خدا کی اس گرفت نے پکڑا ہوا ہے کون ہے جو چیخ نہیں رہا اس درد کے مارے۔ دیکھتے ہیں کہ یہ عذابِ خداوندی جو ہمارے اپنے اعمال کے نتیجے میں آیا ہوا ہے' اس قدر الیم واقع ہوا ہے یہ صاحب! اس قدر دردانگیز واقع ہوا ہے لیکن وہ ہماری خالی چیخوں کے اوپر تو اس کا دل نہیں پسیجتا' گرفت بڑی شدید ہے۔ اس کے لیے اس نے ابھی تک نظر آتا ہے کہ اس نے موقع رکھا ہوا ہے باز آفرینی کا۔ وہ ابھی یہ کہتا ہے' وہ کہتا ہے کہ آخری تباہی

جب قوم ختم ہو رہی ہوتی ہے' اس وقت تو باز آفرینی نہیں ہوتی اس سے پہلے مواقع ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے طریقہ تو یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) یہ جو ناہمواریاں ان کو مٹانے کا طریقہ تو یہ ہے کہ حسنات (تعمیر اور ہمواریوں) کے کام زیادہ سے زیادہ کرو' پھر یہ مٹ سکتی ہے۔ الیم ہے اس کی گرفت' خالی ہماری چیخوں سے نہیں وہ چھوڑتا' گرفت بڑی شدید ہے لیکن رحم کا اس کے اندر جذبہ موجود ہے کہ یہ کرو ٹھیک ہے۔ پھوڑا نکل آیا ہے' اس کے اوپر ایک مرہم بھی خدا ہی کی بھیجی ہوئی ہوتی ہے وہ بوٹیاں' وہ جڑیاں' وہ دوائیاں جن میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ پھوڑے کو شفا دے دیتی ہیں وہ بھی اسی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں' یہ رحم ہے خدا کا۔ پکڑے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا دے کے چھڑانے کی کوشش نہ کرو اور پھوڑا دکھ جائے گا۔ اس کے اوپر مرہم لگانے کی کوشش کرو جو خدا ہی کی پیدا کردہ ہے یہ اس کا علاج ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ (11:103)

قرآن حکیم کے اندر قوموں کے حالات زندگی کی یاداشتیں پیش کرنے کا مقصدِ عظیم اور مذہب کی بنیاد پر بنی اسرائیل کی طرف سے سونے کا بچھڑا بنانے کا قصہ

کہا کہ یہ نہ کہیں سوچ لینا کہ وہ نانی اماں جو کہانیاں سنایا کرتی ہے' سونے سے پہلے کہ اس کے بعد نیند آ جائے' یہ وہ کہانیاں نہیں ہیں۔ سن لی ہیں ساری قوموں کی داستانیں۔ میں نے کہا ہے' ایک کہانی تو وہ ہوتی ہے کہ جس سے سلانے کا کام لیا جاتا ہے۔ کیا بات قرآن نے کہی ہے! مذہبی پیشوائیت کے لیے اس نے لفظ سامری کا استعمال کیا ہے وہی حضرتِ موسیٰؑ کے قصے میں وہ جو آیا تھا جس نے بچھڑا بنا کے رکھ دیا تھا وہ سونے کا بچھڑا جس کی سب پرستش کرتی ہے آج دنیا' نماز بھی پڑھتی ہے اس کی پرستش بھی ہو رہی ہے۔ آہاہا! پھر کہیں گے کہاں چلا گیا یہ' قرآن کہتا ہے ارے! سونا اگر کسی اور جگہ سے لا کے اس کا ایک بچھڑا بنایا ہوتا' اس کا معبود بنایا ہوتا' اس کی پرستش کرتے چلو پھر بھی یہ تھا کہ سونا تو کہیں سے آیا ہوا ہے۔ وہ قرآن کہتا ہے کہ اسی بنی اسرائیل کا سونا لے کے اس سے اس نے معبود بنا دیا تھا اور اس سے اس کی پرستش کرا رہا تھا۔ ''او کم بختو! سونا تے کتھوں باہروں لیا کے بناندے''۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان میں سے قوم میں سے کسی کے پاس چھلا تک نہیں رہا کسی کے پاس' وہ تو سارے کے سارے یوں ہو گئے اور معبود کی پرستش ہو رہی ہے۔ کیا کہتا ہے معبود؟ کہتا ہے کچھ آوازیں نکالتا ہے جس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ آج ان کو اصطلاحات کہتے ہیں مہذب زبان میں' اصطلاح ہے کبھی اس کا متعین مفہوم نہیں آئے گا۔

قرآن حکیم نے ان مذہبی پیشواؤں کو تو سامری کے لقب سے پکارا ہے

قرآن نے کہا تھا کہ بچھڑے کی آواز تو نکلتی ہے' معنی نہیں سمجھ میں آتے ''اوراے واجاں تے لگے ہوئے ایہدی پوجا کر دے تر ے

جاندے نیں'۔ تو میں نے کہا تھا کہ اس کا نام سامری تھا۔ سامری کہتے ہیں اس داستان گو کو جو رات کو پھر صحرا میں چاندنی کی چادروں کے اوپر بیٹھا ہوا تھکے ماندے ہوئے' وہ جو قافلے والے ہوتے ہیں' ان کو پھر داستانیں سناتا ہے تاکہ وہ سو جائیں۔ مذہبی پیشوائیت کو اس نے سامری کہا ہے۔ بڑی دلکش وہ داستانیں' کہانیاں: سبز پری کی کہانی' ایک جزیرہ جس کے اندر دنیا کی نعمتیں ہیں' اڑنے والا ایک قالین جس پہ لئے چلا جا رہا ہے' چلی ہوئی ہے قوم خوابوں کی دنیا میں' سامری کا وعظ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد یہ سو جاتے ہیں یہ سارے کے سارے۔ ایک وہ وعظ تھا ایک یہ وعظ تھا جس کو سنانے کے بعد کہا اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّمَنۡ خَافَ عَذَابَ الۡاٰخِرَۃِ (11:103) جو قوم بھی مستقبل کی تباہی سے ڈرنا چاہتی ہے اس کے لیے ان داستانوں میں بڑی نشانیاں ہیں عبرت کی' صحیح راستے اختیار کر لینے کی۔ کہتا ہے اس کا ٹیسٹ؟

انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے ایک عالم گیر سطح پر ٹکراؤ کی ضرورت ہوگی

اس کا ٹیسٹ ہوگا ذٰلِکَ یَوۡمٌ مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّہُ النَّاسُ وَ ذٰلِکَ یَوۡمٌ مَّشۡہُوۡدٌ (11:103) یہ چیزیں جو ہیں جو قوم بھی ان داستانوں سے صحیح سبق لے کے اٹھے گی' ٹکراؤ ہوگا انسانی اجتماعات کے ساتھ۔ اور وہ کہا ہے کہ ٹکراؤ ہی تو وہ چیز ہے کہ جس میں چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھر کے سامنے آیا کرتی ہیں' ٹکراؤ کے بغیر نہیں آتیں۔ یہ POTENTIALITIES (مضمر صلاحیتوں) کا چھپے کا چھپا رہنا یہ کچھ کام نہیں دیتا' نغمہ تو کہلاتا ہی اس وقت ہے جب کہ وہ رگِ ساز سے باہر آئے لیکن باہر تو مضراب کے ٹکراؤ کے بغیر نہیں آتا۔ عمر بھر ستار کو رکھے رکھئے' باہر نہیں آتا ٹکراؤ کی ضرورت ہے۔ تو کہا کہ یہ ٹھیک ہے (اب دیکھئے پلاننگ) وہ قوم کہ جو مستقبل کی تباہی سے ڈرتی ہو کہ ایسا نہ ہو جائے' اسے سمجھ رکھنا چاہئے کہ ان داستانوں میں ان کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے' انہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ باتیں جو ہیں یہ مصلوں اور تسبیح کے دانوں کے اوپر کی باتیں نہیں ہیں' مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّہُ النَّاسُ (11:103) پوری انسانیت کھڑی ہو جائے گی ان کے سامنے اٹھ کے۔ لاؤ تو سہی یہ جو جرائم گنائے گئے ہیں وہ جرائم اور کسی ایک دور میں وہ سارے اکٹھے ہو گئے ہوں اور ان کے خلاف آواز اٹھانے والا ہو مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّہُ النَّاسُ (11:103) کہتا ہے' پوری عالمگیر انسانیت کھڑی ہوگی اس کے خلاف۔ لیکن وَ ذٰلِکَ یَوۡمٌ مَّشۡہُوۡدٌ (11:103) اور یہی تو وہ دن ہوگا کہ جس میں تمہاری چھپی ہوئی صلاحیتیں مشہود بن کے سامنے آئیں گی۔ یہ ہے ٹیسٹ' تصادم ٹیسٹ ہے' مشہود ہو کے سامنے آئیں گی۔

قرآن کریم نے حق کی نمود کی خاطر تنگ و تاز کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے

پھر وہی بات آ گئی۔ قرآن نے اس ساری تعلیم کا ماحصل یہ بتایا ہے' انسانی ذات کی نشوونما۔ اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے قَدۡ

اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا(91:9) تشبیہیں ملاحظہ فرماؤ اس کی' وہ عام طور پہ کھیتی کی تشبیہیں دیتا ہے' بڑی ہی برجستہ تشبیہ ہوتی ہے کھیتی کی۔ وہ دانہ بظاہر رکھے رکھئے' اس میں زندگی کی کوئی نمود ہی نہیں ہوتی' زندگی سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ' وہ خشخاش کے برابر دانے کے اندر اتنا بڑا درخت پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہر سال اتنا پھل دینا اور پتہ نہیں کب تک دیتے جانا اس دان کے اندر' لیکن رکھے رکھئے کچھ نہیں' ضائع ہی ہوجائے گا۔ اس کو اس طریقے کے مطابق جو قانون ہے اس کی نشو و نما کا' زمین تیار کیجئے' طریقے کے مطابق اس کو دبایئے' پانی دیجئے' حرارت دیجئے' یہ سب کچھ کیجئے' پہلی ننھی سی اس میں سے ایک سوئی نکلے گی قرآن کے الفاظ میں' بڑھے گی دن بہ دن' وہ پانی دینے والا کسان محسوس طور پہ دیکھے گا کہ اس کی محنت بار آور ہو رہی ہے۔ اگر جس وقت عام طور پہ اس بیج نے پھوٹنا ہے' وہ نہ پھوٹے' وہ کسان بے فائدہ پانی نہیں دیے چلے جاتا' "ایویں نئیں نماز اں پڑھی تریا جاندا ہیگا" وہ دیکھتا ہے کہ اس بیج میں سے کچھ پھوٹا ہے یا نہیں' نہیں پھوٹا تو وہ سمجھ لے گا کہ یا بیج ناقص تھا یا زمین ناقص ہے' وہ کھڑا ہو جائے گا وہیں۔ قرآن ایسی برجستہ مثال دیتا ہے اعمال اور اس کے نتائج کی کہ وہ محسوس شکل میں دیکھتا ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ روز دیکھتا ہے' بڑھتا ہے' روز خوش ہوتا ہے۔ اس پودے کی آج کی نمود وہ کہتا ہے کسان کو کل کے کام کے لیے تیار کر دیتی ہے۔ اور اگر یہ پتہ ہی نہ چلے کہ صاحب! کچھ پیدا ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا اس میں سے اور اس کے بعد؟ اس کے بعد تو یہ کہ

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

کئے چلے جایئے پھر اس کے بعد اس میں سے پھول لگتا ہے' پھل لگتے ہیں۔ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ (48:29) قرآن کہتا ہے اس قدر کسان خوش ہوتا ہے اس کے بعد۔

انسانی ذات کے بیج کو مادیت کے بوجھل ڈھیلے کے نیچے دبا دینے کا نتیجہ ذات کی چنگاری کو پامال کرنا ہے

اس کے مقابلے میں دوسری انسانی PRSONALITY یا ذات ہے اس میں بھی یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں جو ایک بیج کے اندر ہیں لیکن وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا (91:10) جس نے اس بیج کو بہت بڑے وزنی بوجھل مادے کے ڈھیلے کے نیچے دبا کے رکھ دیا' اتنا بوجھ دے دیا اس کے اوپر ایک ڈھیلے پتھر کا' اس کی کیفیت کیا ہوئی؟ عزیزانِ من! ایک لفظ ہے اور دیکھئے کہ وہ تکنیک کیا چیز ہے صاحب! کہتے ہیں قرآن شاعری تو نہیں کرتا لیکن پتہ نہیں کیا کرتا ہے' اما تو چیزے دیگری۔ اب تو ہمارے ہاں یہ ماچس ہے جس سے آگ پیدا ہوتی ہے اس زمانے میں چقماق ہوتا تھا۔ اب پتہ چلا کہ وہ FRICTION سے اصل میں چنگاری نکلتی تھی لیکن ان کا یقین یہ تھا کہ اس

کے اندر آگ ہوتی ہے اور اس میں سے جب وہ دوسری چیز کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے تو اس اندر کی آگ کا شعلہ باہر نکلتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ جس کی ذات کی نشو ونما نہیں ہوتی وہ اس چقماق کی طرح ہوتا ہے کہ جس سے آگ کی چنگاری باہر نہیں نکلتی۔ عزیزانِ من! قرآن کی کتنی عجیب تشبیہیں ہیں!! حرارت تو اس کے اندر ہوتی ہے لیکن وہ چنگاری باہر نہیں نکلتی وہ مشہود طور پہ MANIFEST ہو کے ACTUALIZE ہو کے اس کی POTENTIALITIES اس وقت جب ٹکراؤ ہوتا ہے' پوری انسانیت سے ہوتا ہے۔ وَ مَا نُؤَخِّرُہٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعۡدُوۡدٍ (11:104)

ظہورِ نتائج کی آخری حد سے پہلے مہلت کا وقفہ ایک نعمت ہے

تو اب یہ سوال ہوگا کہ یہ ٹکراؤ جو ہے ابھی کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ اب اس دور کی بات آئی۔ اس نے کہا کہ ایک وقفہ ہوتا ہے درمیان میں' ایک مدت ہوتی ہے' مہلت جسے تم کہتے ہو کسی قوم کے تباہ ہونے میں اور اس کی دوبارہ زندگی مل جانے کے امکان کے درمیان۔ ہم فوراً نہیں پکڑ لیا کرتے۔ وہی پلڑا جھکنے والی بات جو ہے' وہ آخری ایک پرچی جس سے کہ یہ پلڑا بالکل جھک جائے اس وقت تک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے کہ اب بھی باز آ جاؤ' اب بھی سدھر جاؤ' اب بھی اصلاح کر لو' بچ جاؤ گے۔ اور جب پھر اس سے بھی وہ قوم نہیں بچتی اور اس کے بعد اپنے اس پلڑے کے بوجھ سے پھر ڈوبتی ہے میں کہہ رہا ہوں کہ پوچھئے عیسائیت سے ایسے موقع کے اوپر کیا قرآن کہتا ہے وہ قوم ڈوبتی ہے خدا وہاں سے آواز دے رہا ہوتا ہے یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ (36:30) او میرے بندو کیا ہو گیا تم کو' 'اوئے ستیاناس کی کر لیا تسی اپنے آپ نوں'' خدا کہہ رہا ہے۔ وَلَا یَخَافُ عُقۡبٰہَا (91:15) بھی ہے عدل کا یہ تقاضا بھی ہے اور اس کے بعد یہ ہے یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ (36:30)۔ تو کہا کہ یہ یومِ مشہود ہوگا اور ہم ایک وقت تک کے لیے اس کو مہلت کا وقفہ دیے چلے جا رہے ہیں۔ یَوۡمَ یَاۡتِ لَا تَکَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ۚ(11:105) اور جب پھر وہ آ جاتا ہے ٹکراؤ کا وقت تو اس وقت تو سوائے اس کے کہ جو اس کے قانون کے مطابق بات کرے' کسی کی بات بھی سنی نہیں جا سکتی۔ بات کا یارا ہی کسی کو نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جو اس کے قانون کے مطابق بات کرے۔ اس دن فَمِنۡہُمۡ شَقِیٌّ وَّ سَعِیۡدٌ (11:105) پھر اس قوم کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ شقی وہ ہوتا ہے جو محنت اور مشقت کرتا رہے اور اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے۔ سعید وہ ہوتا ہے کہ جس کی محنتیں بھرپور نتائج دیتی چلی جائیں۔ ہمارے ہاں تو وہ یہی ہوتا ہے شقی القلب یہ چیز ہوتا ہے اور سعادت خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ تقریبِ سعید ہمارے ہاں ہوتی ہیں وہ یہ چیز ہوتی ہیں۔ شقی کہتے ہیں جگر پاش مشقتیں اٹھانے والا اور پھر محروم کا محروم رہنے والا۔ سعید ہوتا ہے کہ جس کی محنتیں بھرپور نتائج دیں۔ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ شَقُوۡا فَفِی النَّارِ لَہُمۡ فِیۡہَا زَفِیۡرٌ وَّ شَہِیۡقٌ (11:106) کہا ہے کہ جس کو ہم نے شقی کہا ہے' محروم رہ جانے والے جو ہیں' بدقسمت جسے تم کہتے ہو' یہ کیا ہے؟ وہی جو جہنم میں ہوتے ہیں اس کے اندر سوائے اس کے کہ چیخنا چلانا تو ہوتا رہے گا' حالت نہیں سدھر سکے گی۔ ''چیخنا

چلانا تو ہوتا رہے گا'' یہ ہے وہ چیز جسے دوسری جگہ ایسی DESCRIPTION ہے جس کی متحمل کوئی زبان بھی نہیں ہو سکتی۔ جہنم کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ جہنم وہ ہے کہ جس میں نہ موت ہوتی ہے نہ زندگی ہوتی ہے نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ کیا زندگی ہے؟ یہ ہے وہ چیز کہ جس میں چیخنا چلانا تو ہے لیکن پھر مرض کا علاج وہاں کوئی نہیں ہے۔ چیخنا چلانا اس قوم کی قسمت میں رہ جاتا ہے۔ **خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ** (11:107) اور وہ پھر ہمیشہ تک کے لیے یہ قومیں اسی کے اندر رہتی ہیں، چیختی چلاتی رہتی ہیں۔ وہ قومیں کہ جو کسی حادثے سے ختم ہو جائیں وہ پھر بھی ان سے اچھی رہتی ہیں، ورنہ عمر بھر کا چیخنا چلانا ان کے لیے ہوتا ہے۔ اور یہ چیز جو تم کہو کہ صاحب! یہ پھر اب چیخنا چلانا' خدا کے قوانین وہ ہیں جو تمہاری پیدائش' کائنات کی پیدائش سے بھی پہلے اس نے قائم کیے تھے کہ یہ یوں ہوگا۔ **وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ سُعِدُوۡا فَفِی الۡجَنَّةِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ ؕ عَطَآءً غَیۡرَ مَجۡذُوۡذٍ** (11:108) اور جنہیں تم اہلِ جنت کہتے ہو پھر وہ بھی ان خوشگواریوں میں ہمیشہ رہیں گے جب تک وہ اس باغ کی آبیاری کا کام کرتے چلے جائیں گے جب تک وہ نہریں پانی کی نیچے ان کے جاری رہیں گی وہ ہمیشہ کے لیے پھل دیتا ہوا چلا جائے گا۔ یہ تمہارے خدا کی وہ عطا کردہ نعمتیں ہیں کہ جو کبھی منقطع نہیں ہوں گی اعمالِ صالحہ ہمیشہ دائمی طور پہ اپنے نتائج دیے چلے جاتے ہیں۔

ہزار سال سے ملت اسلامیہ کی حالت زار مکافات عمل کا نتیجہ ہے

فَلَا تَکُ فِیۡ مِرۡیَةٍ مِّمَّا یَعۡبُدُ ھٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُھُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوۡھُمۡ نَصِیۡبَھُمۡ غَیۡرَ مَنۡقُوۡصٍ (11:109) کہا کہ تم ذرا شک وشبہ میں نہ رہو کہ اس وقت تو یہ قوم بڑی مرفع الحال نظر آتی ہے مخالفین کی' کیا ان کا انجام یہ ہوگا؟ اس کا انجام یہ ہوگا تم دیکھو گے کہ یہی انجام ہوگا اس لیے کہ یہ بھی انہی خود تراشیدہ خداؤں کی پرستش کر رہے ہیں جن کی پرستش ان کے اسلاف کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی حالت نہیں تم دیکھتے کہ کس ذلت میں زندگی گذاری انہوں نے۔ ہزار برس سے رونا ان کی قسمت میں لکھا ہوا ہے انہوں نے بھی تو خدائے حقیقی کی محکومیت اختیار نہیں کی تھی وہ بھی روتے روتے مر گئے' یہ بھی روتے روتے مر جائیں گے۔ اس لیے کہ ہم تو ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا حصہ دیے چلے جاتے ہیں ''اسیں ڈنڈی نئیں ماردے ہوندے'' **نَصِیۡبَھُمۡ غَیۡرَ مَنۡقُوۡصٍ** (11:109) پورا پورا حصہ دیے چلے جاتے ہیں ہر قوم کو۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ ھود کی آیت 109 تک آ گئے آگے بات پھر قومِ بنی اسرائیل کی شروع ہوگی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

پندرہواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 110 تا 114)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1974ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 110 سے ہو رہا ہے (11:110)۔

سورۃ ھود میں اہم قوموں کا تذکرہ اور ان کی بربادی کے اسباب اور اس تفصیلی ذکر کا اصل مقصد

آپ کو یاد ہوگا کہ سورۃ ھود میں سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا ہے کہ اقوامِ سابقہ میں سے نمایاں، اہم قوموں کا تذکرہ ہے اور تذکرے میں کہا یہ گیا ہے کہ ان کے نظام میں فلاں بنیادی خرابی تھی جس کی وجہ سے اس قوم کی تباہی ہوئی۔ وہ خرابی جب انتہا تک پہنچ رہی تھی تو خدا کا رسول آیا اس نے آ کے اس خرابی کی خاص طور پر نشاندہی کی۔ ویسے تو جتنے بھی جرائم اس قوم میں، اس معاشرے میں اس وقت عام ہو رہے تھے، انہوں نے ان سب کی اصلاح کے متعلق انہیں کہا لیکن جو بنیادی خرابی یا جرم تھا اسے نمایاں طور پر اس کی نشاندہی کی اور ان سے کہا کہ یاد رکھئے! اگر تم نے اس سے اجتناب نہ برتا تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔ تو ایک ایک قوم کے ان جرائم کو وہ گنا تا چلا آ رہا ہے اور بتا تا چلا آ رہا ہے کہ نظام، اس نظام کی حامل قوم یا معاشرہ، ان جرائم کی وجہ سے تباہ ہوا کرتا ہے۔ وہ گنا تا چلا آ رہا تھا اور اس کے بعد اس نے کہا یہ کہ یہ ہم اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ دنیا میں کسی زمانے میں کوئی قوم، کسی ملک میں ہو، وہ اپنے نظام کا جائزہ لے لے اگر اس نے ان خرابیوں میں سے کوئی گنا دی، پھر اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ یہ کوئی ہنگامی واقعات نہیں تھے کہ فلاں قوم کے ساتھ تو ہوا ہے، دوسری

قوم کے ساتھ نہیں ہوا' فلاں زمانے میں تو ہوا ہے' وہ دور لد گیا اب اور دور آ گئے۔

ابدی حقائق سے لاتعلقی کا نتیجہ ہمیشہ ذلت و رسوائی ہوتا ہے

اس نے کہا کہ یہ فطرت کے غیر متبدل قوانین ہیں نہ کسی خاص زمانے سے مختص ہیں' نہ کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص' یہ تو ابدی حقائق ہیں جن پر زمان اور مکان کا تغیر کوئی اثر ہی نہیں پیدا کرتا جب جہاں جس قوم میں یہ کیفیت پیدا ہوگی' وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ یہ ہے جو کچھ بیان ہوتا چلا آ رہا تھا آخر سلسلۂ کلام حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش تک پہنچا تھا۔ وہاں سے آگے بات شروع ہوتی ہے اور وہ جو پہلی باتیں ہوتی چلی آ رہی تھیں' جن کا ذکر ہوتا چلا آ رہا تھا' ان سے بھی زیادہ اہم بات ایک شروع ہوئی۔ پہلے ان قوموں کا ذکر تھا جن کی طرف یوں کہئے کہ پہلی دفعہ رسول آتا تھا تو اس رسول نے کوئی ہدایت تھی اس کا ذکر آ گیا' انہوں نے نہ مانا تباہ ہو گئے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت' قرآنی حکومت کا قیام اس کا عروج اور پھر کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے کچھ ہی عرصہ کے بعد امت کا زوال کیوں؟

بات اب یہاں سے آتی ہے کہ رسول آیا اس نے ایک امت متشکل کی' اس امت نے اس رسول کو مانا اس کے مطابق ایک نظام بھی قائم کیا تو ہر قسم کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں اس قوم کے حصے میں آ گئیں۔ پھر یہ کہ بعد میں اس قوم کو کیا ہو گیا' تو یہ بڑی اہم بات ہوئی کہ خود اس رسول کی امت کو پھر بعد میں کیا ہوا' ان میں یہ خرابیاں کیوں پیدا ہو گئیں؟ تو گویا خاص طور پہ ختم نبوت ﷺ کے بعد یہ چیز بڑی اہم ہو گئی کہ رسول آیا' وہ ایک پیغام دے کے گیا' اس پیغام پہ عمل کیا' اس عمل کا نتیجہ دیکھا اور اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قوم پھر بگڑ گئی۔ انبیائے سابقہؑ کی اقوام میں سے بھی بہت سی قومیں ابھی تک زندہ ہیں۔ بنی اسرائیل کے انبیا اس قوم کی طرف آتے تھے انہیں یہود یا بنی اسرائیل کہا جاتا ہے' وہ دنیا میں موجود ہیں' دنیا میں ذلیل ترین قوم۔ عیسائیت یا عیسائی قوم موجود ہے' حضرتِ عیسیٰؑ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والی' خدا کی ایک کتاب' اس کے متعلق یہ کہنے والی کہ یہ ہماری تعلیم کا مرکز ہے اور اس کے باوجود کیفیت اور حالت یہ۔ اسی طرح سے اور قومیں بھی ہیں جو دعویٰ کرتی ہیں کہ ہماری طرف فلاں رسول آئے تھے' وہ مدعی ہیں کہ ہمارے پاس آسمانی کتاب موجود ہے اور اس کے باوجود حالت ان کی وہی ہے جو ان قوموں کی حالت ہوئی تھی کہ جو تباہ اور برباد ہوئیں۔ تو اب ان قوموں کے متعلق انہیں کیا ہوا تھا جو یہ اس تباہی میں آ گئیں؟ یہ بات اب آتی ہے اور یہ جیسا میں نے عرض کیا ہے پہلے سے زیادہ اہم ہے۔ اور ہمارے حال پہ تو یہی منطبق ہو گی آ کر کہ ہماری طرف ایک رسول ﷺ آیا' اس نے آ کے ایک کتاب دی۔ رسول ﷺ وہ آیا کہ جس کے بعد رسول نہیں آنا' کتاب وہ دی جس کتاب کے متعلق کہا کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) خدا نے جو

ضابطہ قانون دینا تھا مکمل کر دیا صدق وعدل کے ساتھ اب اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔اور یہ کہہ دیا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔مکمل، غیر متبدل، محفوظ کتاب قوم کے پاس اور اس کے بعد قوم کی یہ حالت کہ جو کیفیات ان تباہ شدہ اقوام کی قرآن نے گنائی ہیں، وہ ساری اس قوم کے اندر موجود۔

قوموں کی تباہی و بربادی کی حقیقی پہچان

میں نے ایک درس میں یہ کہا تھا کہ قوم کی تباہی ایک تو یوں ہوتی ہے کہ پوری کی پوری قوم ہی کہیں غرق ہوگئی ان کی داستانیں تو باقی رہیں لیکن قوم کے افراد باقی نہیں رہے۔تاریخ کی یہ اور چیز ہے اس وقت اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ وہ افراد اس طرح سے اگر زندہ ہوتے ہیں تو کیسے ہوتے ہیں لیکن قومیں وہ بھی تو ہیں کہ وہ قومیں موجود ہیں قوم کا نام موجود ہے ان کا تشخص موجود ہے INDIVIDUALITY موجود ہے اس کے باوجود وہ قوم ذلیل وخوار ہے دنیا میں تو اسے بھی کہتے ہیں کہ قوم تباہ ہوگئی۔قوم کی تباہی کے معنی ہیں کہ اگر وہ قوم زندہ ہے تو وہ انتہا درجے کی ذلیل اور کمزور قوم ہو جائے تو وہ بھی قوم زندہ قوم نہیں شمار ہوتی، مردہ قوم ہوتی ہے۔اس کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم تباہ ہوگئی۔تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب ہماری حالت آتی ہے کہ رسول ﷺ آیا، آخری رسول ﷺ جس کے بعد رسول نہیں آنا، کتاب دی مکمل ترین کتاب، غیر متبدل کتاب، محفوظ کتاب اور حالت قوم کی وہ کہ جوانہی قوموں جیسی ہے کہ جن کے متعلق قرآن نے کہا کہ وہ تباہ ہوگئیں، اس قوم کی زندگی کے نظام میں وہ تمام جرائم موجود ہیں کہ جو جرائم پہلی قوموں کے اندر تھے جن کی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں، یہ کیا ہوا؟ گویا بڑی اہم بات ہے جواب شروع ہوئی ہے جس کا ہمارے ساتھ تعلق ہے۔قرآن نے ایک لفظ میں ساری بات سمجھا دی ایک لفظ میں، یہی تو اس کا اعجاز ہے۔بات وہ کرتا ہے آخری بات حضرتِ موسیٰؑ کی کہ وہ آئے۔فرعون اور حضرتِ موسیٰؑ کی کشمکش تو ختم ہوگئی جب فرعون تباہ ہوگیا۔اس کی قوم تباہ ہوگئی، بنی اسرائیل کو ادھر سرفرازیاں، خوشگواریاں نصیب ہوگئیں۔

قوم بنی اسرائیل کے عروج وزوال کا مختصر سا ذکر

اب بات چلی بنی اسرائیل سے کہ یہ اتنی بلندیوں پر پہنچی قوم کہ آج بھی دنیا میں سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی بطور ضرب المثل پیش کی جاتی ہے تاریخ میں۔یعنی ان کے دور میں یہ قوم جن سربلندیوں پہ پہنچی ہوئی تھی اس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔اور اس کے بعد اس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ اس پستی میں یہ قوم پہنچی تاریخ میں اس کی مثال بھی نہیں ملتی THE WANDERING JEWS اڑھائی تین ہزار سال سے ان کی یہ کیفیت ہو رہی ہے، کوئی گھر ہی نصیب میں نہیں، خانماں خراب پھر رہے ہیں خانہ بدوش، اپنے گھر کو کندھوں پہ اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہیں، دنیا میں ٹھکانہ کوئی نہیں ہے، یہاں سے مارے گئے، وہاں سے نکالے گئے، یہ کیفیت

ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج ایک مملکت ان کو نصیب ہوئی ہے اول تو اس ساری آبادی میں سے وہ اتنی آبادی ہے جن کو یہ مملکت ان کی ملی ہے۔ پھر مملکت بھی جس انداز سے ملی ہے وہ ظاہر ہے وہ کانٹوں کی مالا ہے جو گلے میں پڑ گئی اور اگلی بات یہ ہے کہ وہ مملکت بھی دوسری سلطنتوں کی رہینِ منت ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ قوموں کے بچنے کے دو طریقے ہوتے ہیں بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (3:112) یا تو خدا کے سہارے کو مضبوط تھامے کوئی قوم تو پھر تو وہ آزاد اور دنیا کے اندر سرفرازی اسے نصیب ہوتی ہے۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ دوسری قوموں کے سہارے پہ اپنے آپ کی زندگی کو قائم رکھے۔ کہا یہ بھی زندہ تو رہتی ہے یہ بھی قوم لیکن بڑی ذلیل حالت میں زندہ رہتی ہے۔ بنی اسرائیل کو اگر مملکت نصیب ہوئی ہے تو حبل من الناس کی وجہ سے ہوئی ہے۔ آج اگر دو دن کے لیے بھی یہ قومیں بند کر دیں اپنی امداد اس کے لیے تو اس قوم کا ٹھکانہ دنیا میں پھر کچھ نہیں ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہ قوم جن کو کتاب ملی' اتنی بڑی سطوت' اتنی سرفرازی حاصل ہوئی اس کے بعد اسی قوم کی یہ کیفیت ہوئی کہ ذلیل ترین قوم دنیا میں وہ شمار ہونے لگ گئی' ہوا کیا؟

قوم مسلم کی تباہی کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے کتاب اللہ کے بارے میں اختلاف پیدا کر دیا ہے

اور وہیں سے ہماری بات آ جائے گی۔ ایک رسول ﷺ آیا' ایک کتاب ملی اور اس کتاب کے اتباع سے اس قوم کی جو سطوت و شوکت ہے' بنی اسرائیل کی سطوت و شوکت اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ تاریخ میں دنیا کی کسی قوم کو اتنی بڑی بلندی نصیب نہیں ہوئی نہ رومن امپائر کو' نہ PERSIAN EMPIRE کو۔ یہی امپائر اس زمانے میں بڑی ہوتی تھیں ان دونوں کو تو مار مار کے بھر کس نکال دیا تھا ان کا۔ اتنی بڑی شوکت اور اس کے بعد پھر پستی کی بھی وہ کیفیت کہ بنی اسرائیل جیسی ذلیل قوم سے بھی پست کہ آج ان کے ہاتھوں سے ہم پٹ رہے ہیں' کیا ہوا تھا؟ ایک لفظ ہے (اعجاز ہے قرآن کا) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ (11:110) موسٰیؑ کو ہم نے کتاب دی۔ موسٰیؑ کو کتاب دی کے معنی ہوتے ہیں اس قوم کو کتاب دی اس نبی کی وساطت سے۔ اس قوم کو کتاب دی پھر کیا کیا؟ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (11:110) انہوں نے اس کتاب میں اختلاف پیدا کر لیا' بس اتنی سی بات ہے۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز۔ لکھتے چلے جایئے اس کے اوپر والیم کے والیم ''کتاب میں اختلاف پیدا کر دیا'' قصہ ختم۔ کتاب موجود ہے فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (11:110) اس میں اختلاف پیدا کر دیا۔ اب ذرا میں آگے چل کے بتاؤں گا کہ اختلاف کی شکلیں کیا ہوتی ہیں لیکن بات یہی کہی کہ کتاب موجود ہے' کتاب میں اختلاف پیدا کر دیا قوم وہاں سے یہاں آ گئی۔ کتاب کا معدوم ہو جانا نہیں کہ کتاب رہی نہیں' فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (11:110) وہ موجود ہے تو یہ کہا ہے فِيْهِ' ورنہ یہ ہوتا کہ کتاب ہی گم کر دی ان کے پاس کتاب رہی نہیں ہے' کتاب ہے اختلاف پیدا کر دیا اس کے اندر۔

مہلت کے وقفہ سے اگر استفادہ نہ کیا جائے تو یہی چیز اس کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے

عزیزانِ من! کیابات ہے قرآن کی!! اور کہا کہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیۡنَھُمۡ ط (11:110) اگر ہمارا قانون یہ نہ ہوتا کہ قوم کی بگڑی ہوئی حالت کے بعد مہلت کا ایک وقفہ دیا جاتا ہے اور بار بار کہا جاتا ہے کہ اسی میں وہ اپنے حالات کو ٹھیک کرلیں' اصلاح کرلیں جسے توبہ کہتے ہیں' اپنا نظام صحیح کرلیں تو پھر وہ بچ سکتے ہیں۔ یہ خدا کے قانونِ مکافات کی ایک اہم شق ہے کہ وہ فوراً گرفت نہیں کرتا بلکہ اس میں ایک مہلت کا وقفہ دیتا ہے' بازآفرینی کا ایک موقع بہم پہنچاتا ہے۔ تو اس لیے کہا کہ اگر یہ ہمارا قانون نہ ہوتا جو ابھی ہم نے بیان کیا ہے تو مدت ہوئی ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ یہ وہ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس میں سے قوم گذر رہی ہوتی ہے۔ وَ اِنَّھُمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ (11:110) اور یہی مہلت کا وقفہ جو ہے یہ قوم کو اور زیادہ تباہ اور گمراہ کرتا ہے یعنی وہ سمجھتے یہ ہیں کہ نہیں صاحب! کچھ نہیں کیا ہوا بالکل ٹھیک ہے۔ ہم تو اس کے محبوب کی چہیتی امت ہیں۔ اور پھر تاویلیں شروع ہو جاتی ہیں کہ ہاں صاحب! یہ دنیا تو ہے ہی ذلیل' یہ تو کفار کے لیے ہے' یہ تو ایک لاش ہے کتوں کے لیے' یہ تو ایک جیل خانہ ہے مومن کے لیے۔ اصل میں گھر تو وہ عاقبت کا گھر ہوتا ہے' آخرت کا گھر ہے' آخرت سنوارنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ ''الٰہی عاقبت بخیر کرنا'' بس دعا یہ مانگی چلی جارہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے' جوتے پڑ رہے ہیں' ذلت وخواریاں ہو رہی ہیں' وہ ایک نظریہ بدل دیا کہ صاحب! یہ دنیا ہے ہی ذلیل' معاملہ ختم۔

سہل انگیزی اور غلامی قوموں کو نفسیاتی طور پر پژمردہ کردیتی ہے

قرآن کہتا ہے کہ یہ جو مہلت کا وقفہ ہے بجائے اس کے کہ اس میں یہ کھڑے ہو کے یہ سمجھیں کہ صاحب! غنیمت ہے ہمیں یہ وقفہ مل گیا ہے' مہلت مل گئی ہے ہم اس میں دوبارہ زندگی پیدا کرسکتے ہیں' وہ اپنا نظریہ اس میں یہ ہے کہ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ اب جو گرفتار ہونے والا پرندہ یہ کہہ دے کہ

نہ تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تو وہ تو کبھی بھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں' پنجرے کے خوگر پرندے کو تو باہر نکال کے آپ آزادی کی فضا میں ڈال دیجیئے' وہ بھاگا ہوا پنجرے کے اوپر آتا ہے' چونچیں مار مار کے اس کا دروازہ کھولتا ہے۔ پھر اس قوم کا زندگی کا نظریہ بدل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ مہلت کا وقفہ بجائے اس کے کہ اس میں وہ اپنی اصلاح کرلیتے' وہ اس بارے میں ہی شک میں پڑ گئے کہ صاحب! یہ جو کہا تھا کہ

ان چیزوں کا انجام یہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے کیا یہ ٹھیک بھی ہے' یہ جو کہا جا رہا ہے کہ صاحب! زندگی اس دنیا کی سرفرازیوں اور سر بلندیوں کی ہونی چاہئے کیا یہ بات ٹھیک ہے' اب اس میں شبہ ہوا۔

زندگی کے نشیب وفراز کے سلسلہ میں خدا کا قانون تو بڑا باریک بین واقع ہوا ہے

انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! دنیا ہے ہی ذلیل لیکن حقیقت یہ ہے کہ وَ اِنَّ کُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّکَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (11:111) یہ اپنے آپ کو کتنی خوش فہمیوں میں مبتلا کیوں نہ رکھیں' خود فریبیوں میں کیوں نہ مبتلا رکھیں' خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل تو اٹل ہے' وہ قوم کو پورا پورا بدلا دیتا ہے' ہر عمل کا نتیجہ سامنے آ کر رہتا ہے۔ وہ خود دیکھتا ہے ان اعمال کو' یہ بھی نہیں کہ کسی کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں۔ رپورٹ کرنے والوں کی رپورٹیں غلط ہوں' اس کے اوپر مبنی وہ فیصلہ کرے' سوال ہی نہیں ہے۔ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (11:111) وہ براہِ راست واقف ہے کہ قومیں کیا کرتی ہیں۔ قانون یہ ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ پیدا ہو کر رہتا ہے۔ اتنی سی بات یہاں کہی۔

نبی اکرم کا ارشاد ہے کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ ایک حدیث میں آتا ہے اور صحیح حدیث چمکتی ہے ہیرے کی طرح۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔

اے خاندان نبوت کے آخری تاجدار' گوہر نایاب' زندگی کے ایک ایک لمحہ کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنے والی ہر دل عزیز ذاتِ اقدس' قدم قدم پر ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدھی ہوئی' خلق عظیم کے گوہر تابدار سے مزین زندگی' اے نوع انسانی کی تاریک راہوں کے روشن چراغ' اے انسانیت کے توازن بدوش امام' فہم وفراست کے میدان میں صراط مستقیم پر صبر و استقلال کی صفات کے کوہ پیما' تجھ پہ لاکھوں درود و لاکھوں سلام۔

واقعی ایک ذمہ دار لیڈر جو کسی قوم کا رہنما ہو ذمہ داریوں کا احساس اسے ہو اور یہ داستانیں دہرائی چلی جا رہی ہوں اس کے سامنے کہ اس قوم نے یہ کیا اور اس کے ساتھ وہ ہوا' اس قوم نے یہ کیا اور اس کے ساتھ وہ ہوا' اس رسول کی ذمہ داری یہ تھی اس کے ساتھ اتنی مخالفتیں اس کی ہوئیں' اس قدر کشمکش اس کے ساتھ ہوئی' گھر سے بے گھر کئے گئے' اس کی جان کے لاگو ہو گئے' جنگیں ہوئیں' لڑائیاں

ہوئیں، مصیبتیں جھیلیں، یہ تمام چیزیں ان رسولوں کے ساتھ پیش آئیں۔کوئی ایک آدھ رسول نہیں، تمام انبیائے سابقہؑ کی یہ داستانیں دہرائی جا رہی ہوں اور نبی اکرم ﷺ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو تو عزیزانِ من! بوڑھا تو آدمی ایک داستان کے بعد ہو جاتا ہے، چہ جائیکہ ساری تاریخ دہرائی جا رہی ہو اور کہا جا رہا ہو کہ یہ ذمہ داری تمہارے سر کے اوپر عائد ہو رہی ہے تو واقعی بوڑھا ہو جانے والی بات ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں حضور ﷺ کی ذات کو ارزانی فرمائی تھیں، ان میں یہ بات بڑی اہمیت سے کہی تھی کہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ (94:1-2-3) کیا یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان نہیں کہ وہ بوجھ کہ جس نے تیری کمر دہری کر دی تھی، توڑ دیا ہوا تھا تیری کمر کو، وہ بوجھ جو تھا تیرے سر سے اتار دیا۔تو یہ کیا بوجھ تھا کہ جس سے کمر ٹوٹ رہی تھی، وہ کیا احساس تھا کہ جس سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھے بوڑھا کر دیا ہے؟ یہی احساس کہ اتنی بڑی ذمہ داری لے رہے ہیں، اتنی بڑی سامنے قوی قوم ہے، جہالت میں ڈوبی ہوئی۔ذمہ داری یہ ہے کہ اس قوم کو اس تباہی سے بچانا ہے جو اس تباہی کو اپنی زندگی سمجھتی ہے، بچانے والے کو اپنا دشمن تصور کر رہی ہے۔اور پھر رسول ﷺ عالمگیر ہے کسی ایک خاص بستی کا رسول نہیں ہے۔کم از کم اپنے دور میں جہاں تک یہ چیز موجود تھی وہاں تک تو یہ اصلاح کرنی ناگزیر تھی حضور ﷺ کے لیے۔اتنی بڑی ذمہ داری تھی اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔اور یہ کچھ بیان کرنے کے بعد اب دیکھئے کہ کونسی ذمہ داری تھی جس سے وہ بڑھاپا آ گیا تھا۔فَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ وَ مَنۡ تَابَ مَعَکَ (11:112) کہا کہ جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے، تو بھی اور تیرے ساتھ یہ جو تمہارے رفیق ہیں، یہ بھی نہایت متوازن طریقے کے اوپر اس پر جم کے کھڑے ہو جاؤ۔وَاصۡبِرۡ ہی نہیں ہے کہ صرف جم کے کھڑے ہونا ہی نہیں ہے، وَاسۡتَقِمۡ ہے یہاں۔کھڑا تو وہ رہ سکتا ہے جس کا توازن صحیح ہو، یہ جو قدم لڑکھڑایا کرتے ہیں پھر اس کے بعد گر پڑتا ہے آدمی، کیا ہوتا ہے؟ یہ نہیں ہوتا کہ کھڑے رہنے کی توانائی اندر نہیں ہوتی وہ توازن قائم نہیں رہتا۔اچھا بھلا تندرست توانا تگڑا آدمی بھی ذرا سا توازن اس کے پاؤں کا بگڑے، آپ دیکھتے ہیں کس بری طرح سے گرتا ہے۔

طاقت کے علاوہ توازن بدوش زندگی کی اہمیت کس قدر ضروری ہے، یہ تاریخ سے پوچھیں، ہٹلر سے، ہلاکو سے چنگیز سے پوچھیں

یہ جو نظام ہے اس نظام پہ کھڑے ہو کے معنی صرف توانائی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ توازن بھی ضروری ہے ورنہ سیدھا راستہ جسے کہتے ہیں صراط تو خود سیدھے کے معنی میں آتا ہے، یہ ساتھ مستقیم کیا ہے؟ توازن نہ بگڑے اس کا، بڑی چیز یہ ہے۔اور دیکھیں گے آپ تاریخ کا فلسفہ بیان کرنے والوں سے آپ پوچھئے وہ بتائیں کہ تنہا طاقت ایسی چیز نہیں ہے جس سے قومیں بچتی ہیں بلکہ طاقت کے

اندر توازن کا قائم رکھنا' اس سے قوم بچتی ہے۔ بڑی بڑی قومیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ طاقت کے اعتبار سے دنیا لرزتی تھی ان کے نام سے' کل ہی ہمارے سامنے ابھی ہٹلر آیا ہے دیکھا تو ہم نے نہیں اس کی تقریریں تو ہم نے ریڈیو پہ سنیں' فضا میں تزلزل پیدا ہوجاتا تھا' کیفیت یہ تھی اور واقعی ایک دنیا کانپ رہی تھی ان سے۔ کیا وجہ ہوئی ناکامی کی؟ توازن قائم نہیں رکھا' اعتدال قائم نہیں رکھا۔ بڑی بڑی قومیں یہ جتنی بھی ہلاکو اور چنگیز' ان کی داستانیں آپ سنتے ہیں بڑی قوتوں کے مالک تھے توازن نہیں تھا۔ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (11:112) تو بھی اور اگلی چیز وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ (11:112) اور وہ بھی کہ جو اپنے غلط راستوں کو چھوڑ کے تیرے ساتھ ہولئے ہیں۔

قرآنی معاشرے کی تشکیل کے لیے عقل وشعور اور فہم و ادراک کے علاوہ اعتدال پسند رفقا کی اہمیت اشد ضروری ہوتی ہے

آپ کو یاد ہوگا میں نے کئی آیات پیش کی تھیں جس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کی اہمیت کو بتایا تھا۔ یہ کہا تھا کہ اے رسول! تیرے لیے خدا اور تیرے یہ ساتھی ہی کافی ہیں (8:64)۔ صرف خدا نہیں۔ اور بڑی اہمیت ہے۔ اور انقلاب تو آتا ہی ان ساتھیوں کی تقویت سے ہے۔ یہ شبہ نہیں کہ اس مرکز' اس امام کی بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن ساتھیوں کے بغیر تو یہ کچھ نہیں کرسکتا۔ تو یہاں بھی یہ کہا ہے کہ تو بھی اور تیرے ساتھ یہ لوگ جو غلط راستوں کو چھوڑ کے صحیح راہ پہ ہولئے ہیں' ان کے لیے ضروری ہے کہ فَاسْتَقِمْ (11:112) کھڑے ہوجاؤ اس نظام کے اوپر۔ پہلے فَاسْتَقِمْ (11:112) میں ہی یہ بات تھی اور وضاحت کردی وَ لَا تَطْغَوْا (11:112) کہہ کے کہ یہ دیکھنا کہیں کسی ایک چیز میں بڑھ نہ جانا آگے۔ قوت کا ہی اگر استعمال جو ہے اپنی حد سے ذرا آگے چلا جائے' وہ تباہی کا باعث ہوجاتی ہے۔ کمزوری تو ہوتی ہے تباہی کا باعث' طغیٰ تو قوت کا آگے بڑھنا ہے' یہ تو سیلاب آنے والی بات ہے۔ طغیانی یہاں سے آتی ہے۔ قوت کا بڑھ جانا اتنی بڑی ہے حالانکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ صاحب! قوت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنی چاہئے بس اسی کے اندر راز ہے۔ ٹھیک ہے قوت کا ہونا ضروری ہے اس کے استعمال میں توازن کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔

مردِ مومن کے سلسلہ میں واجب الاحترام بیگم شرف النساء نے زندگی بھر اپنی قمر میں تلوار اور ہاتھ میں قرآن رکھا

وہ جو میں نے پچھلی دفعہ اپنے خطاب میں کہا تھا ''یومِ اقبالؒ'' پہ مردِ مومن کے متعلق' بڑی اہم چیز جو تھی وہ واجب الاحترام شرف النساء بیگم کے قصے میں اقبالؒ نے جو لکھا تھا کہ وہ زندگی بھر اپنے ساتھ کمر میں تلوار باندھے رکھتی تھی (پنجاب کے گورنر کی بیٹی تھی) ہاتھ میں قرآن رکھتی تھی' کمر کے ساتھ تلوار باندھے رکھتی تھی۔ مرتے وقت ماں سے وصیت کی تھی کہ یہی تلوار اور یہ قرآن میری قبر کے اوپر رکھ دو۔

اور وہ یہیں ان کا مقبرہ تھا اس کے اوپر رکھی رہتی تھی تا آنکہ سکھوں نے آ کے پھر وہ قبر بھی اجاڑی تھی اور ان چیزوں کو بھی وہ لے گئے تھے۔ اقبالؒ نے اس کو زندۂ جاوید کر دیا ہے اپنے ''جاوید نامہ'' میں۔ جنت میں ملے ہیں شرف النساء بیگم سے' اس سے پوچھا یہ ہے کہ یہ کیا راز تھا اس باب میں کہ تلوار اور قرآن کو ساتھ رکھا اور کہا قبر کے اوپر بھی یہ دونوں چیزیں رکھیں۔ تو شرف النسا کی زبان سے انہوں نے یہ دہرایا ہے کہ آپ سمجھتے نہیں ہیں ان دو چیزوں کا آپس میں ساتھ کیا ہے؟

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

انہوں نے تو جو کہا ہو گا اقبالؒ کو بھی وہ انداز قدرت نے دیا تھا' دو لفظوں میں ساری داستان آ گئی ''ایں دو قوت'' دونوں قوتیں ہیں حافظ یک دیگرند ایک دوسرے کی محافظ اور

کائناتِ زندگی را محورند

زندگی کی ساری کائنات ان کے گرد گھومتی ہے۔

تلوار کا قرآن حکیم کے ساتھ رشتہ

بات یہ تھی ''ایں دو قوت حافظ یک دیگرند'' تلوار بڑی چیز ہے بشرطیکہ وہ قرآن کی حفاظت میں رہے' قرآن تلوار کی حفاظت کرتا ہے' بے باک نہ ہونے پائے' توازن نہ بگڑے قوت کا۔ اور تلوار قرآن کی محافظ ہو کہ ساتھ اگر قوت نہ رہے تو پھر یہ کتاب وعظ بن کے رہ جاتی ہے' قانون نہیں بنتی۔ قانون ہمیشہ قوت کے زور پہ چلتا ہے' قانون کے پیچھے ایک قوتِ نافذہ ہوتی ہے جو قانون کو قانون بناتی ہے ورنہ الفاظ ہوتے ہیں۔ اور جہاں بھی لاقانونیت پھیلی ہوئی ہوتی ہے آپ دیکھئے گا یہ نہیں کہ اس قوم کے ہاں قانون کی کتابیں نہیں ہوتیں' وہ تو الماریاں بھری ہوئی ہوتی ہیں' عدالتوں کی بھی' یہ وکلا ہیں ان کے ہاں لائبریریاں' پھر یہ لاقانونیت کیوں ہوتی ہے؟ اس قانون کو نافذ کرنے والی قوت نہیں ہوتی۔ تو تلوار اگر ساتھ نہ ہو تو قرآن محض وعظ و نصیحت کی ایک کتاب یا قانون کی ایسی کتاب بن جاتا ہے جس کے ساتھ قوتِ نافذہ نہیں' وہ مذہب ہو جاتا ہے' وہ وعظ ہو جاتا ہے۔ اور اگر تلوار کے ساتھ قانون نہ ہو' کتاب نہ ہو' قرآن نہ ہو جو اس کو محفوظ رکھے کہ یہاں اتنا چلنا ہے' اس سے آگے رکنا ہے پھر وہ ہلاکو' چنگیز اور ہٹلر ہو جاتی ہے۔

ایں دو قوت حافظ یک دیگرند

نبی اکرم ﷺ کی قوت نافذہ کے ساتھ عرب کے علاوہ ایران اور روما کی سلطنتوں کی طرف سے مخالفت کے مختلف طریق

اسی لیے یہ کہا کہ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا (11:112) دیکھنا! حد سے نہ بڑھ جانا۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (11:112) وہاں ان کے متعلق کہا تھا اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (11:111) ہم تمہارے حالات کو بھی جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو ان سے بھی کہا کہ تمہارے اعمال کے اوپر بھی ہماری نگاہ ہے۔ اب بات آئی تھی وہاں کتاب کی کہ کتاب میں اختلاف پیدا کر دیا۔ پہلی چیز تو اس کتاب کے اس زمانے کی بات کی جب یہ نبی اکرم ﷺ پر نازل ہو رہی تھی۔ کشمکش تھی سامنے کی قوموں کے ساتھ براہِ راست ان قریش اور باقی سارے عرب کے ساتھ اور ذرا بالواسطہ آپ دیکھیں تو ایران اور روما کی سلطنتوں کے ساتھ کہ حضور ﷺ نے انہیں بھی تو لکھ کے بھیج دیا تھا کہ جو ظلم تمہارے بے کس کسانوں اور رعایا پہ ہو رہا ہے اگر وہ ظلم تم نے نہ روکا تو اس کی پاداش تمہیں بھگتنی پڑے گی' میں تمہیں وارننگ بھیج رہا ہوں۔ تو گویا ٹکراؤ کی صورت تو ان کے ساتھ بھی پیدا کر لی تھی۔ ادھر براہِ راست تو یہ قوم موجود تھی انہوں نے پہلے انتہا درجے کی مخالفت کی' کشمکش ہوئی' تصادم ہوئے اس تصادم کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ مشکل ہے مقابلہ کر کے اس سے کامیابی حاصل کرنا مشکل ہے۔ اگلا قدم COMPROMISE تھا۔ ہوتا ہی ہمیشہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ COMPROMISE کیا جائے۔ COMPROMISE کے لیے شرطیں پیش ہو رہی تھیں اور ہم دیکھتے ہیں دنیا میں قدم قدم پہ پھر COMPROMISE ہوتا ہے۔ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ (10:15) جب ان کے سامنے ہمارے یہ واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا (10:15) یہ لوگ کہ جو مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں جو ہیں باہمی معاہدوں سے' باہمی COMPROMISE سے اس طرح سے قانون جو ہے' وہ ٹل جایا کرتا ہے۔

قرآنی ضابطہ حیات کی طرف سے پیش کردہ قوانین دو اور دو چار کی طرح اٹل ہوتے ہیں

کیا بات یہاں کہی ہے! کہ جو قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے۔ قانون میں تو COMPROMISE کی گنجائش ہی نہیں ہوتی وہ جیسا میں مثال میں کہا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر کے نسخے میں اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک دوائی کی جگہ بدل کے آپ کا جی چاہے تو دوسری آپ یونانی کی کوئی دوائی ڈال دیں' اس نے جتنے قطرے لکھے ہوئے ہیں ان قطروں میں کمی بیشی آپ کر دیجیے اتنی سی COMPROMISE سے بھی آپ دیکھئے کہ وہ تریاق' زہر بن جاتا ہے۔ سنکھیا زہر ہی تو ہے لیکن مرنے والے کو بچانے کے لیے یہ ایک چیز ہے اس کے پاس' بشرطیکہ وہ اس ترتیب سے اس PROPORTION سے دیا جائے کہ جس سے وہ ممدِ حیات بنتا ہے۔ وہ

کہتے کیا ہیں؟ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا(10:15) ایسی بات کہی ہے کہ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ جو ہمارے سامنے آنے کی امید نہیں رکھتے۔ تو قرآن نے جہاں بھی کہا ہے خدا کا لقآء' خدا کے سامنے جانا اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے اوپر جو یقین نہیں رکھتے اور سمجھتے یہ ہیں کہ یہ معاملے آپس میں' مصالحت سے' مفاہمت سے' COMPROMISE سے طے ہو جائیں گے۔ کہتے یہ ہیں ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط(10:15) وہ کہتے یہ ہیں کہ صاحب! تمہارے ساتھ ہماری دشمنی نہیں ہے' ٹھیک ہے ہم تیار ہیں COMPROMISE کرنے کے لیے۔

خدا تعالیٰ کی اس تصنیف میں تبدیلی کرنے کا میں مجاز ہی نہیں یہ تو خدا کے ہاں بہت بڑا جرم ہوگا

بات ساری یہ ہے کہ اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ' اس کے ساتھ COMPROMISE نہیں ہے ہم نہیں مانتے۔ اور اگر یہ تمہارے لیے دشوار ہو گیا ہے شاید تم نے اپنی قوم کو کچھ یوں دکھانا ہو' وہاں جا کے میں کیا کہوں گا' بَدِّلْهُ(10:15) کچھ تبدیلی کر دو اس کے اندر تھوڑی بہت جیسی ہم چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں شرط کیا پیش ہو رہی ہے؟ تبدیلی کر دو۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ج (10:15) کہا اگر یہ میری تصنیف ہوتا' میری فکر کی تخلیق ہوتا' میں نے بنایا ہوا ہوتا تو میں تمہاری بات سمجھ کے اور یہ ضرورت محسوس کر کے اس کی' میں اس میں تبدیلی پیدا کر دیتا۔ او! یہ تو میرا ہے ہی نہیں' میں اس میں مجاز ہی نہیں' میرا ہو تو میں اس میں کچھ کر بھی سکوں' سوچ بھی سکوں کہ مجھے کر دینا چاہیے یا نہیں کر دینا چاہیے۔ یہ تو میرا ہے ہی نہیں تو اس لیے میں اپنی طرف سے اس میں تبدیلی کیسے کر دوں۔ میری پوزیشن تم پوچھتے ہو؟ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ج (10:15) میں تو خود جو میری طرف یہ وحی کیا جاتا ہے' اس کا اتباع کرنے والا ہوں' یہ قرآن بنانے والا نہیں ہوں' یہ تو میری طرف وحی ہوتا ہے اور میں خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ یہ جو تم کہتے ہو کہ کچھ تبدیلی کر دو اس کے اندر' مفاہمت کر لیں اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (10:15) اور یہ اس خدا کا کلام ہے' اس خدا کا قانون ہے کہ اگر میں بھی اس میں کسی طرح سے کوئی تبدیلی کروں تو اس کے عذابِ عظیم سے میں بھی نہیں بچ سکتا۔ دیکھ رہے ہیں قرآن میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی جو ہے یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں بھی اس میں یہ کچھ کروں تو میں بھی خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ کسی COMPROMISE کی گنجائش نہیں ہوگی' کر ہی نہیں سکتا۔

مشرکین کی یہ کوشش ہے کہ تو اس راستے سے ذرا پھسل جائے

دوسری جگہ قرآنِ کریم نے اسی چیز کو اور الفاظ میں بیان کیا ہے' مختصر لیکن زیادہ جامع فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ(68:8) اے رسول! یہ بات یاد رکھو یہ جو قرآن کے حقائق کو جھٹلانے والے لوگ ہیں' تمہارے پاس آ رہے ہیں COMPROMISE کرنے

کے لیئے ایسا نہ کرنا۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (68:9) بڑا عجیب لفظ ہے! دھن ہوتا ہے یہ چربی کی قسم کی جو چیز' تیل کی قسم کی چیز' پھسلنی چیز جو ہوتی ہے۔ کسی فرش کے اوپر اگر اس قسم کی چیز مل دی جائے ٹائلوں کا فرش ہو اور اس کے اوپر کہیں تھوڑا سا بھی آپ یہ VASELINE وغیرہ یا چکنی کوئی چیز مل دیں تو آپ اس چلنے والے کو دیکھیں پھر ہوتا کیا ہے۔ یہ اس سے ہوتا ہے دھن سے کہ کوئی پھسلنے والی چیز جو ہو۔ کہا یہ تھا کہ تم توازن بدوش کھڑے رہنا' پاؤں میں لغزش نہ آنے پائے۔ کہا یہ ان کی یہ کوششیں مفاہمت کی پتہ کیا ہے؟ یہ اس قسم کی چربی مل رہے ہیں فرش کے اوپر اور اس میں پھر یہ ٹھیک ہے کہ تو چلے تو بھی لڑکھڑائے' یہ کہہ دیں گے کہ ہم چلیں گے ہم بھی لڑکھڑائیں گے۔ کہا کہ ان کے لڑکھڑانے سے ہوتا کیا ہے جو پہلے ہی باطل پہ ہے وہ اور ذرا تھوڑا سا بدل گیا' بگڑ گیا' گر گیا تو اس کا اس میں کیا بگڑتا ہے۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک شخص تو کہتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں' حق پہ ہے' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں صاحب! دو اور دو تین ہوتے ہیں۔ اب اس میں آپس میں جھگڑا ہوا' آجاتے ہیں درمیان میں ایک مصالحت کرانے والے کہ دیکھئے صاحب! اب یہ تو غلط بات ہے کہ آپ اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہیں' وہ اپنی بات پہ اڑا ہوا ہے کوئی بیچوں بیچ راہ نکال لینی چاہیئے۔ ٹھیک ہے بھئی! نہ تمہارا چار نہ تمہارا تین' ساڑے تین' دو اور دو ساڑھے تین۔ یہ جو تین کہہ رہا تھا اگر وہ ساڑھے تین مان رہا ہے تو اس کا تو کچھ نہیں بگڑتا' کچھ کمایا ہی' یہ جو چار کہہ رہا تھا وہ پونے چار پہ بھی آجائے تو اس کا کچھ نہیں رہا۔ اس لیے باطل میں تو ہر قسم کی آمیزش ہوسکتی ہے' اس میں مفاہمت ہوسکتی ہے جو حق پر ہے وہ مفاہمت کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو اپنے اس چار سے ذرا نیچے اترا تو باطل ہوا' معاملہ ختم۔ یعنی پھر یہ نہیں کہ یہ ایک اور فریق ہے وہ اور دوسرا فریق ہوگیا' دو فریقوں میں مفاہمت' یہ ذرا وہاں سے نیچے اترا تو اسی فریق میں شامل ہوگیا یعنی باطل پرستوں میں شامل ہوگیا۔ جس نے دو اور دو پونے چار کہہ لیا' وہ بھی باطل پرست' جس نے تین کہا تھا وہ بھی باطل پرست۔ کہا کہ یہ چاہتے یہ ہیں کہ یہ جو تو کھڑا ہوا ہے توازن سے۔ چلنے میں بھی اپنے پاؤں چل رہا ہے' گر نہیں رہا تو تھوڑا سا فرش کے اوپر یہ چربی ور بی مل رہے ہیں تو اگر تو کہے گا کہ صاحب! آدمی پھسل جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں ہم بھی تو اسی پہ چل رہے ہیں لیکن ان سے پوچھئے کہ ان سے پھسلنے سے بگڑتا کیا ہے' تمہارے پھسلنے سے رہتا کیا ہے؟

پھسل جانے کے سلسلہ میں امام اعظم کے حوالے سے ایک سبق آموز مثال

وہ بچپن میں پڑھایا کرتے تھے مشہور قصہ تھا کہ امام اعظم ایک دن باہر سڑک پہ چلے جارہے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی تھی' سڑک پہ کیچڑ ہو رہی تھی۔ آگے ایک چھوٹا سا لڑکا' جیسے لڑکوں کی عادت ہوتی ہے' کودتا پھاندتا جارہا تھا انہوں نے پیچھے سے آواز دی کہ بیٹا! اس طرح سے نہ چلو' پھسل جاؤ گے' گر جاؤ گے' ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ تو اس لڑکے نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو آپ مشہور ہستی تھے' پہچان لیا تو

بچے نے یہ کہا (میں نے عرض کیا کہ بچپن کے ہمارے نصاب میں یہ چیزیں ہوتی تھیں اور دیکھئے اس زمانے کا نصاب کیا ہوتا تھا!!) کہ یا حضرت میں اگر گروں گا تو تنہا میری ٹانگ ٹوٹے گی' اپنے آپ کو بچا کے چلئے گا آپ گر گئے تو امت ساری کی ساری گر جائے گی۔ عزیزانِ من! حق پہ چلنے والے کا گرنا یہ ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اس کے لیے مشکل ہوتی ہے۔ ساری دنیا اسے ضدی کہتی ہے' کوئی اس کا ساتھ ہی نہیں دیتا کہ صاحب! مانتا ہی نہیں کسی کی' اڑا ہوا ہے اپنی بات پہ' ارے! پونے چار پہ بھی نہیں آ رہا۔ عزیزانِ من! جو میں کہا کرتا ہوں صحیح جواب تو ایک ہی ہوتا ہے' غلط جواب سینکڑوں ہوتے ہیں۔ کوئی ایک پہ آ کے اڑ جائے آپ کہئے چلو دوسرا سہی' دوسرا غلط وہ غلط ہی ہے اور صحیح جواب سے تو آپ ایک انچ ادھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے۔ صحیح نشانہ ایک ہی ہوتا ہے غلط نشانے ہزاروں لگائے جا سکتے ہیں۔ حق صحیح نشانے کو کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ چاہتے یہ ہیں وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (68:9) کچھ اس قسم کی پالش کرنا چاہتے ہیں یہ (بڑی خوبصورت تشبیہیں ہوتی ہیں قرآن کی!!) وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے ہم تمہارے ساتھ ہی اس سڑک پہ چل رہے ہیں لیکن سوچو تو سہی کہ ان کے پھسلنے سے کیا بگڑتا ہے جو پہلے ہی پھسلے ہوئے ہیں تم سوچو کہ اگر تمہارا پاؤں پھسل گیا تو دنیا میں حق باقی نہیں رہے گا۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآن جس میں اتنی بھی گنجائش نہیں۔ اور پھر قرآن نے CERTIFICATE دیدیا اس چیز کا' اللہ تعالیٰ نے سند دیدی نبی اکرم ﷺ کی استقامت کی۔

مستشرقین کے علاوہ خود ہمارے اپنے ہاں قرآن حکیم کے خلاف تراجم میں بہت کچھ موجود ہے

ان آیات سے تو یہ ہو سکتا تھا کہ یہ مستشرقین یا اور زیادہ مخالفین یہ کہتے کہ صاحب! وہ یہ کرتے تھے' ٹھیک ہے حضور ﷺ نے کچھ COMPROMISE کر لیا ہوگا۔ اور میں یہ کہہ رہا ہوں آج یہ کیا بات کہ یہ کہتے ہونگے مستشرقین یا ORIENTALIST یا مخالفین یہ کہتے ہونگے' خود آپ کے ہاں کتابیں بھری ہوئی ہیں اس پہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ کیا روایت آپ کے ہاں یہ آئی ہوئی ہے؟ کہ یہ آئے تھے COMPROMISE کرنے کے لئے' یہ کہتے تھے کہ جہاں تم خدا کا نام لیتے ہو اس کے ساتھ ہمارے ہاں یہ دو ہی تو ہیں یہ ہمارے بڑے دیوتا دیویاں ان کے بھی ساتھ نام لے لیا کرو یہ مطالبہ تھا کا عتبہ کا اور یہ تو رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ میں سوچتا ہوں۔ یہ آپ کے ہاں یہ موجود ہے روایت۔ اور اس کے بعد آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے اللہ کا نام لیا اور ساتھ ان دونوں دیوتاؤں کا بھی نام لے لیا ساتھ اور یہ پیچھے جتنے تھے مشرکین انہوں نے جشن منایا اور صاحب! خوشیاں کیں۔ اور یہ لکھا ہے یہاں تک یہ چیز مشہور ہوگئی کہ وہ جو مکے سے ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھی جماعت مسلمانوں کی ان کی اذیتوں سے ڈر کے' وہاں بات پہنچ گئی تو انہوں نے یہ کہا کہ صلح ہوگئی ہے رسول اللہ ﷺ کی وہ حبشہ سے واپس آ گئے۔ یہ آپ کے ہاں لکھا ہوا ہے۔ سن رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا

کہ اگر یہاں قرآن چھوڑ دیتا تو یہ مخالفین اس کے لیے کچھ گنجائش نکال لیتے کہ صاحب! دیکھئے قرآن میں ہے یہ کوششیں کرتے تھے کہیں DENY تو قرآن نے کیا نہیں ہے۔تو میں نے عرض کیا تھا کہ ان کا کہنے کا کیا ہے یہ تو آپ کے ہاں خود موجود ہے۔اور جتنے بھی یہ مترجم وغیرہ جنہوں نے قرآن کے یہ لکھے ہیں ترجمے' اپنی کمنٹری کے اندر آپ کی اس روایت کو انہوں نے نقل کیا ہے کہ رسول نے COMPROMISE کرلیا تھا خدا کی توحید کے اوپر کہ اللہ کے نام کے ساتھ ان کے دو بتوں کا نام نماز میں آپ ﷺ لیتے تھے۔ لیکن بہرحال میں نے عرض کیا ہے کہ رسول ﷺ کا تو وہ اعلان تھا کہ اگر میں یہ کروں تو میں بھی خدا کے عذاب سے نہیں بچتا اور خدا کا یہ CERTIFICATE وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡہِمۡ شَیۡئًا قَلِیۡلًا (17:64) اگر ہم تمہیں استقامت نہ دیتے جو خدا نے دی ہوئی تھی (رسول کے لیے ضروری تھی) تو ہوسکتا تھا کہ تم ان کی طرف ذرا سے جھک جاتے لیکن تم نہیں جھکے۔تو گویا یہ CERTIFICATE موجود ہے۔کوششیں اتنی ہوئیں لیکن قرآن کے بارے میں ذرا سا بھی یہ نہیں ہوا' سوال ہی نہیں ہے۔اور دلیل وہ بڑی محکم تھی کہ میرا اپنا قرآن ہوتا تو اس میں میں سوچ بھی لیتا کہ یوں نہیں سہی' یوں کر دیتے ہیں بھئی! یہ تو میرا اپنا ہے' ہی نہیں اس لیے میں اس میں نہیں کرسکتا۔قرآن کے متعلق ہمارے پاس یہ سند موجود ہے۔بات تھی وہ کہ ہم نے کتاب دی فَاخۡتُلِفَ فِیۡہِ ؕ (11:110) پھر اس میں اختلاف کرنے لگ گئے۔قرآن آپ کے پاس وہ مکمل' غیر متبدل' محفوظ' قرآن کے CERTIFICATE اللہ کے دیئے ہوئے اس کتاب کے متعلق۔اختلاف

قرآن حکیم کے حکم کے برعکس ہر مسجد کے ماتھے پر پتھر میں کندہ فرقہ بندی کا نشان کیوں؟

قرآنِ کریم نے بار بار یہ کہا ہے کہ اگر اختلاف کیا تو یاد رکھو! عذابِ الیم میں مبتلا ہو جاؤ گے۔تفرقے کے متعلق کہا کہ یہ شرک ہے وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ . مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ (30:31-32) فرقہ بندی شرک ہے اختلاف خدا کا عذاب ہے۔رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اگر یہ لوگ اختلاف باہمی کرلیں یا فرقہ بندی کرلیں لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (6:159) اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔اتنی تاکیدیں اس کے اندر موجود ہیں ''باز بخویشتن نگر'' دور جا کے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے' آیئے امت موجود یہ حاملِ قرآن' ہر مسجد میں نہیں ہر گھر میں قرآن' جتنا یہ پڑھا جاتا ہے' دنیا میں کوئی دوسری کتاب اتنی نہیں پڑھی جاتی لیکن جن مساجد میں یہ پڑھا جاتا ہے' ان مساجد کی فرقہ بندی کی یہ کیفیت کہ وہاں ایک TABLET لگی ہوئی ہوتی ہے کہ اس مسجد میں فلاں فرقے والا قدم نہیں رکھ سکتا۔وہ نماز پڑھ رہا ہو تو وہی نماز کہ جس کو قرآن نے کہا تھا کہ یہ تمہاری وحدت کا مظاہرہ ہے' آج بھی بڑے فخر سے ہم کہتے ہیں' ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز لیکن یہ بھول جاتے ہیں ہم کہ محمود و ایاز اگر ایک فرقے کے لوگ ہوں گے پھر تو ایک صف

میں کھڑے ہونگے' اگر ایک ہوا اہلحدیث دوسرا اہلِ فقہ تو وہ تو ایک مسجد میں نہیں جاسکیں گے۔محمود ایک مسجد میں جائے گا' ایاز دوسری میں جائے گا۔جن میں قرآن دہرایا جاتا ہے ان مساجد کی یہ کیفیت ہے' ان اماموں کی یہ صورت' ان سننے والوں کی یہ کیفیت' اتنا بڑا اختلاف۔قرآن نے تو کہا ہی یہ تھا کہ کتاب دی اور اس کے بعد انہوں نے اس میں اختلاف کیا' خدا کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔اب یہاں یہ بات وہ آگئی کہ کتاب محفوظ بھی ہے آپ کے پاس' پھر اختلاف ہے۔عزیزانِ من! اس سے تو معاف رکھئے گا بات ذرا کھل کے کرنے کی ہے۔کتاب موجود ہو اور سب کا ایمان ہو اس کتاب پہ اور اس میں آپس میں ہوا تنا اختلاف تو معاف رکھئے گا وہ کہنے والے تو یہی کہیں گے کہ کتاب کا نقص ہے۔پہلی قوموں کے متعلق اتنی گنجائش ان کے ہاں تھی کہ کتاب ہی اصلی موجود نہیں رہی' کتاب نہیں تحریف ہوگئی ان کے ہاں جو مختلف لوگوں کے ہاں فرقوں میں نسخے ہیں اور نسخوں کے اندر ویسے ہی اس کے اندر متن میں فرق ہے تو اختلاف کی وجہ تو نظر آگئی۔اس میں کتاب کے اوپر حرف نہیں آتا کہ کتاب میں تحریف کر دی گئی' محرف ہے' متن ہی انہوں نے بدل دیا اس کتاب کا۔لیکن اگر کتاب کے متن کے متعلق یہ ایمان ہو اور تحقیق بھی ہو کہ اس پہ ایک نقطہ ادھر اُدھر نہیں ہوا' ساری امت میں وہ موجود ہے ہر ایک اسی نسخے کے اوپر ایمان رکھ رہا ہے اور اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک فرقہ دوسرے سے نہیں ملتا' اختلافات اتنے ہیں' اکٹھی نماز تک یہ نہیں پڑھ سکتے تو پھر یہ بات آئے گی بڑی اہم چیز ہے یہ سوچنے کی بات کہ پھر یہ اختلاف کیوں ہے۔بڑی ڈھٹائی سے کہا جاتا ہے اور اپنی طرف سے سمجھتے یہ ہیں کہ ہم نے پوچھو نہیں کتنی بڑی دلیل دی کہ یہ ٹھیک ہے' قرآن تو یہ ٹھیک ہے تاویل کا فرق ہے۔توبہ توبہ۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن حکیم کی تعلیم واضح نہیں؟ لاریب نہیں؟ کیا اس میں جگہ جگہ تضاد ہے؟

کوئی کتاب اگر ایسی ہو کہ کتاب کے الفاظ تو سب کے سامنے وہی' وہ اسے اور مفہوم دے' اسے اور مفہوم دے' اسے اور مفہوم دے اور ان مفاہیم میں باہمدگر فرق اتنا ہو کہ ایک دوسرے کے اوپر کفر کے فتوے لگ رہے ہوں اسی اختلافِ مفہوم کے اوپر۔ہر ایک اپنے اپنے عقیدے کی سند پہلے قرآن سے پیش کرتا تھا اور کفر کا فتویٰ لگ رہا ہے۔کہا یہ جا رہا ہے کہ صاحب! تاویل کا فرق ہے۔عزیزانِ من! معاف رکھئے یہ تو خدا کی کتاب ہے اس میں تحدی کی ہے کہ اس کی مثل' اس کی نظیر کتاب پوری نہیں' اس کی کسی ایک سورۃ جیسی سورۃ سارے انسان مل کے نہیں بنا سکتے۔اور اس میں تو نئے نئے معنی نکل رہے ہیں' نئے نئے مفہوم پیدا ہو رہے ہیں' اختلاف پیدا ہو رہا ہے میں کتاب کو اٹھا کے پھینک دوں گا' بڑا نقص ہوتا ہے کتاب کا۔اور بڑے خوش ہیں یہ کہ صاحب! تاویل ہے۔فرقہ بندی کو قرآن نے شرک قرار دیا آج تک ان کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔عزیزانِ من! یہ دور چلا جانے دیجئے' بعد کا مؤرخ بتائے گا اس دور میں قرآن کے

متعلق کتنی خدمت ہو چکی ہے۔ میں کبھی بات نہیں کیا کرتا کہ اس میں اپنی بات آ جاتی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ یہ بات کہ فرقہ بندی کو شرک قرار دیا' قرآن نے ہی قرار دیا تھا آپ کے دور میں یہ چیز سامنے آئی ہے۔ اس سے پیشتر سامنے نہیں آئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے اب ان کو مختلف فرقے نہیں' مکاتبِ فکر کہنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی رام داس کا نام عبداللہ رکھ دیا خوش ہو گئے۔ SCHOOL OF THOUGHT۔

ہمارے ہاں فرقہ بندی کی انتہا یہ ہے کہ ایک فرقے والا دوسرے فرقے کی مسجد میں جانا پسند نہیں کرتا

یعنی SCHOOLS OF THOUGHT کی کیفیت یہ کہ کفر کے فتوے لگا رہے ہیں۔ ایک فکر کا حامل اگر ان کی مسجد میں نماز پڑھ لیتا ہے تو اول تو یہ ہے کہ وہ ان کا حکم یہ ہے ان کی فقہ کا ان کے SCHOOL OF THOUGHT کا کہ اس مسجد کا اتنا فرش اکھیڑ دیجئے۔ یہ مشرک نہیں کوئی اندر آیا' یہ ان کی آواز پہ آمین کہنے والا اندر آ گیا' یہ چھاتی پہ ہاتھ باندھنے والا اندر آ گیا' اس نے آ کے وہاں ہنومان کی مورتی رکھ کے ڈنڈوت نہیں کیا' اللہ کی وہی نماز پڑھی جو یہ پڑھ رہا لیکن حکم یہ ہے کہ فرش اکھیڑ دیا جائے۔ اگر بہت زیادہ سخت ہو گیا ہے تو کم از کم اس کے اوپر سترہ مشکیں ڈال کے یا لوٹے ڈال کے فرش دھو تو لیا جائے۔ مکاتبِ فکر نام رکھ لیا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ کیفیت ہوتی ہے جو قوم اپنے آپ کو غلط فہمیوں میں رکھتی ہے SELF DECEPTION جسے کہتے ہیں' مغالطے میں رکھتی ہے۔ فریب میں رکھتی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ الفاظ بدل لیتی ہے اور خوش ہو جاتی ہے' اصطلاح بدل لیتی ہے' خوش ہو جاتی ہے۔

قرآنی فکر کے متعلق قرآن حکیم کا اپنا دعویٰ

میں کہتا ہوں کہ اتنا بڑا اختلاف جتنا پایا جا رہا ہے' مسلمانوں میں کوئی دلیل اس کو ڈھانپ سکتی ہے' اس سے انکار کر سکتی ہے کہ یہ اختلاف ان میں نہیں' تفرقہ ان میں نہیں ہے یہ جتنا بھی ہے۔ کتاب کے الفاظ تو وہی' تاویل میں فرق ہے گویا اختلاف ہی نہیں۔ لیکن عزیزانِ من! بات یہ نہیں۔ یہ تاویل میں فرق اس کتاب کا نقص نہیں' اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا (4:82) تو اس میں کئی اختلاف پاتا۔ اختلاف متن میں تو سوال نہیں تھا۔ متن کا اختلاف تو یونہی دوسری جماعت کا طالبعلم بھی سمجھ سکتا ہے کہ صاحب! یہ تو متن میں اختلاف ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تو اس میں بہت اختلاف پاتے تو مفہوم اور معنی اور تاویل کا ہی اختلاف ہو سکتا ہے۔

وحی کی تعلیم میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے وحی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا

آپ کو پتہ ہے کہ اس میں اختلاف کیسے کیا؟ اس ''کیسے'' سے پہلے سنئے کہ بنی اسرائیل نے اختلاف کیسے کیا اس کا ذکر کیا ہے

قرآن نے۔انہوں نے دیکھا ان کے ہاں جب تک نبی موجود تھے یا اس کے کچھ عرصے بعد تک تو ان کے ہاں کی کتابیں بہرحال محفوظ ہونگی۔اختلاف کی گنجائش کیسے نکالی گئی؟ کہا کہ صاحب! اصل میں وحی دو قسم کی ہوتی ہے (یہ یہودیوں کا عقیدہ ہے) ایک وحی تو وہ کہ جو تورات کے اندر آ گئی لکھی گئی وحی شب کتب اور وحی شبعلفہ ایک وہ جو اس کتاب کے اندر آئی اور ایک وحی اس کی مثل اس کی جیسی جو اس کے باہر ہے۔اب دونوں وحییں خدا کی طرف سے ہیں اب جب یہ ادھر والی ٹکرا رہی ہے اس کے ساتھ تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ کسی انسان نے تو اس کے اندر اختلاف پیدا کیا' وہ بھی خدا کی طرف سے ہے یہ بھی خدا کی طرف سے ہے' خدا نے اپنے ایک حکم کو دوسرے حکم سے منسوخ کر دیا۔

پہلی وحی کے مقابلے میں اس دوسری وحی کی اہمیت کی بنیاد پر کئی ایک فرقوں کا وجود اور پھر قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کا عمل

عزیزانِ من! انہوں نے یہاں سے ابتدا کی۔اور جب اس جیسی وحی اور مان لی گئی کہ کتاب تو وہ تھی نہیں جو دوسری وحی تھی اور وہ دوسری وحی پھر بنی شروع ہوئی۔ان کے ہاں کی تاریخ میں دیکھئے ابتدا میں وہ چھوٹی سی SNOWBALL ہوتا ہے برف کا گولا' لڑھکتا جاتا ہے بڑھتا چلا جاتا ہے۔اور اس کے بعد پھر وہ جو ان کے ہاں یہ دوسری وحی تھی وہ اس سے دس گنا زیادہ بڑھ گئی۔کتاب کے برابر کتاب کی مثل۔سارے اختلاف پہلے یہاں سے پیدا ہوئے۔اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بعینہٖ یہی عقیدہ ہے کہ ایک وحی قرآن کے اندر ہے ایک وحی قرآن کے باہر ہے' روایات کے اندر ہے۔یہ اتنی سی کتاب اور وہ پوچھو نہیں شمار کتنا بڑا ہے۔ان میں سے چن چنا کے بھی جو انہوں نے ایک فرقے نے نکالی۔یہ جو سنی ہیں چھ اتنی اتنی موٹی کتابیں تو انہوں نے نکال لیں اپنی' ابھی چودہ لاکھ باقی ہیں۔خود وہ کتابیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں وہ جو صحیح ترین ہیں۔ایک کتاب بخاری کے اندر حدیثیں یا روایتیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور وہ ساری ایسی ہیں ان میں سے بیشتر وہ جو قرآن سے ٹکراتی ہیں۔تو سمجھ لیا آپ نے کہ اختلاف کہاں سے شروع ہوا آپ کے ہاں۔آپ کے ہاں ہر اختلاف کی سند موجود ہے۔انہی کی بنیادوں پہ تفسیریں لکھی گئیں' انہی کی بنیادوں پہ آپ کی فقہ بنی۔یہ جو آپس میں آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی فقہ حنبلی اور' مالکی اور' شافعی اور' حنفی اور' اہلِ حدیث کی اور' اور یہ اہلِ فقہ کی اور' جا کے آپ دیکھیں گے تو یہ چیزیں ان لوگوں کے دماغوں کی نہیں تھیں اس کی ساری سندیں ان کے ہاں سے لی ہوئی ہیں انہوں نے یہ جو دوسری وحی آئی ہوئی ہے۔چلئے صاحب! قرآن بچ گیا کوئی تو یہ آئے اس کی طرف آئے' اس کے متعلق عقیدہ یہ کہ قرآن کی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو قرآن کی آیتوں سے منسوخ ہیں۔بھئی! قرآن بھیجنے والے نے کہیں لکھ دیا ہے کہ صاحب! یہ آیت ناقص ہے فلاں آیت اس سے منسوخ ہے؟

اس نے تو نہیں لکھا پھر؟ یعنی یہ کیسے طے کیا جائے۔عزیزانِ من! یہ بڑا BOLD STEP ہے بڑا جرأت آمیز STEP ہے یہ کہنا کہ قرآن کی یہ آیت تو موجود ہے پڑھنے میں، اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہوا ہے۔ بھئی! کیسے کہتے ہو؟ فلاں آیت نے کر دیا جی یعنی اس کی سمجھ کے مطابق فلاں آیت نے اس کو منسوخ کر دیا۔ پانچ سو آیتیں قرآن کی جس کا حکم منسوخ ہے۔ پوچھو باقی رہ کیا گیا اس کے اندر۔

شاہ ولی اللہ نے 500 منسوخ آیات کو کم کر کے 5 تک محدود کر دیا اور پھر مولانا سندھی کا تبصرہ

اب وہ پانچ سو بدلتی چلی جارہی ہیں، سمٹتی چلی جارہی ہیں، کم ہوتی چلی جارہی ہیں، جوں جوں اعتراض پڑتے چلے جاتے ہیں وہ فہرست سمٹتی چلی جارہی ہے تا آنکہ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے کہا کہ پانچ آیتیں اور ان کے شاگرد تھے مولانا سندھی وہ ہمارے دور کے چونکہ تھے، ان کو پتہ تھا کہ یہ کیا عقیدہ ہے انہوں نے کہا کہ شاہ صاحب نے اپنے دور کی مخالفت سے بچنے کے لیے اتنی سی بات رکھ لی تھی یعنی کوئی اگر یہ مانتا تھا کہ قرآن میں ناسخ منسوخ نہیں ہے تو اس کو مار دیتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ شاہ صاحب نے اس سے بچنے کے لیے کہ کہیں کہہ نہ دیا جائے کہ یہ مانتا ہی نہیں ہے ناسخ ومنسوخ کو، وہ پانچ آیتیں رکھ دیں ایسی اور انہوں نے کہا کہ وہ ایسی آیتیں رکھی ہیں کہ جو آسانی سے ان میں تطبیق ہو سکتی ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہیں تو شاہ صاحب نے اپنے دور کے ملا سے بچنے کے لیے یہ کیا تھا ان سے بچنے کے لیے جو سارے ان کے نام کے ساتھ علیہ الرحمۃ آج لکھتے ہیں۔

قانونِ وصیت کے سلسلہ میں قرآن حکیم سے ٹکراؤ پیدا کرنے کی جرأت

قرآن کی آیتیں منسوخ قرآن سے، قرآن کی آیتیں حدیثوں سے منسوخ۔ میں نے لکھا کہ قرآن میں مومن کو حکم دیا ہے وصیت کرنے کا، پہلے کُتِبَ کہا ہے کہ مومن کے اوپر یہ فرض ہے حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (2:180) آیت کے بعد کہا ہے ہر شخص اپنا جو ترکہ ہے اس کے لیے خود وصیت کرے۔ ایک روایت ہے جس کے اندر یہ ہے کہ نہیں صاحب! ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت نہیں کر سکتا اور وہ بھی اپنے وارثوں کے حق میں نہیں کر سکتا کسی دوسرے میں کر سکتا ہے۔ میں نے یہ لکھا کہ بابا! بتایئے تو سہی کہ قرآن کی اتنی صریح آیت اس کا بھی کوئی دوسرا معنی، ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اتنی سی تو آیت ہے تو یہ کہاں سے یہ آ گئی چیز یہ ایسی۔ اتنا بڑا پمفلٹ شائع ہو گیا، مرحوم ہو گئے وہ مولانا لیکن ان کا کیا ہے، یہ ان کے ہاں کا عقیدہ ہے کہ اس روایت نے یہ حکم دیا تو انہوں نے یہ لکھا تھا کہ اس روایت نے قرآن کی اس آیت کو منسوخ کر دیا اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ صاحب! روایت قرآن کو کیسے منسوخ کرتی ہے تو روایت بھی تو خدا کی وحی ہے ایک وحی نے دوسری وحی کو منسوخ کر دیا، پرویز صاحب چاچا لگتے ہیں بیچ میں۔ چلیئے کہاں جاتے ہیں۔

طباعت کی غلطیوں کی احتیاط کا معاملہ

اس قرآنِ کریم کے الفاظ کی حفاظت میں تو جتنی بھی تحقیق ہو رہی ہے امت میں' آپ کو معلوم ہے پہلے بھی ہوتی چلی آئی ہے اور اب تو یہ بڑا معرکہ آرا کارنامہ ہمارے ہاں یہ کیا جا رہا ہے کہ طباعت کی غلطیاں اس کے اندر آتی ہیں۔ٹھیک ہے طباعت کی غلطی بھی نہیں ہونی چاہیئے۔اس میں اتنی احتیاط برتی ہے ہمارے ہاں کے اسلاف نے اس کے الفاظ کے محفوظ رکھنے میں کہ جس اسلوب سے پہلا قرآن کوئی لکھا گیا تھا یعنی جہاں ان پہلے لکھنے والے نے کہیں ایک الف لکھ دیا تھا زائد' کسی جگہ انہوں نے وہ نشانی دیدی تھی ایک قسم کی یعنی جسے آپ انبا کہتے ہیں SEMI COLON کہتے ہیں جس طرح سے وہ لکھا ہوا تھا اسی طرح سے آج تک اسے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم جانتے ہیں کہ بعض چیزیں عربی زبان کے رسم الخط سے ذرا اختلاف ہے ان کے اندر لیکن اسی طرح سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہے ایسا ہی رکھنا چاہیئے۔انہوں نے بھی اتنی احتیاط برتی آج بھی ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے طباعت میں غلطیاں ہیں' طباعتِ قرآنِ کریم کو صحیح چھاپنے کے متعلق قانون بھی ہمارے ہاں بن گئے ہیں۔ٹھیک ہے بڑی مستحسن کوششیں ہیں۔میں پوچھتا یہ ہوں کہ ان الفاظ کے اتنی احتیاط کے ساتھ بالکل غیر مختلف رکھنے سے حاصل کیا ہوا آپ کو؟ سارے فرقے اسی طرح' سارے اختلافات اسی طرح سے۔

مذہبی فرقہ بندی کے اختلافات کے سلسلہ میں کتاب وسنت کی بنیاد پر عملی اختلافات کی نوعیت

فرقہ کہنے کی بجائے مکتبِ فکر کہہ لیجئے' اختلاف کی بجائے تاویل کہہ لیجیے اس کو۔سارے فرقے اسی طرح سے ہیں' ہر ایک نے اپنا عقیدہ وہی رکھا' اپنا مسلک وہی رکھا' اپنے ہاں کی فقہ وہ رکھی' اپنے ہاں کا قانون وہ رکھا۔یہ جو آپ کے ہاں پچیس چھبیس برس سے اس کے باوجود کہ ہر آئین میں شق رکھی جاتی ہے کہ کوئی قانون ہمارا کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بن رہا۔یہ ہو کیا رہا ہے؟ یہ نہیں ہے کہ کہہ دینے کو تو بڑا آسان ہے کہ صاحب! یہ ہیں ہی ایسے' چاہتے ہی نہیں ہیں' وہ دوسرے ہیں ایسے' چاہتے نہیں ہیں کہ ملک کے لیے کوئی ایسا قانون بن جائے متفق علیہ جو قرآن وسنت پہ مبنی ہو۔سارے ملک کے لیے آپ قانون بنائیں گے تو ایک قانون بنے گا' یہ جو الزام دینے والے بیٹھے ہوئے ہیں ان سے کہئے کہ سرکاران کو چھوڑ دیجئے آپ مل بیٹھئے اور مل بیٹھ کے نماز کی ایک شکل تجویز کر دیجیے سارے' قانون تو بہت بڑی چیز ہے۔ بڑا آسان ہے عوام کو بھڑکا دینا کہ جی نیت ہی ان کی خراب ہے۔ بہت اچھا صاحب! آپ کی تو نیت بڑی مخلص ہے آپ سمجھتے ہیں کتاب وسنت کو لے لیجئے ان کو' ملک کا ضابطۂ قانون بہت بڑی چیز ہے چھوڑ دیجئے' نماز تو وہ چیز ہے کہ ہر مسجد پہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسشِ نماز بود

اللہ کی مسجد کہنے کی بجائے فرقے کی مسجد کا نام تجویز کرنے کا نتیجہ گلی گلی میں انتشار' امت واحدہ کے لفظ کی پامالی ہے

پہلی پرسش نماز کی ہوگی اس میں تو اختلاف نہیں ہونا چاہیے کتاب وسنت کی رو سے تو۔ یہ تاویل کا نہیں' یہ تو عمل کا اختلاف ہے۔ نظر آجاتا ہے نماز پڑھتا ہوا کہ کس فرقے کو BELONGE کرتا ہے نماز نہ پڑھے تو پتہ نہیں چلتا مسلمان ہی نظر آتا ہے وہ۔ اول تو وہ مسجد میں جاتے وقت پتہ چل جاتا ہے کہ'' کیناں دی مسیت ہے'' کن کی مسجد ہے۔ قرآن نے کہا تھا ان المسٰجد لله مسجد صرف اللہ کے لیے ہونی چاہئے۔ یہاں مسجد کے باہر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ فلاں کی مسجد ہے اور یہ فلاں کی۔ پھر اندر جاتا ہے کہ یہاں سے تفریق شروع ہوئی کہ کونسی پکچر دیکھنی ہے (معاف رکھئے گا مثال کے طور پر میں عرض کر رہا ہوں)۔ اندر جانے سے پہلے وضو کرنے سے پتہ چل جاتا ہے اس سے بھی اگر وہ کسی طرح سے کسمسا کے بچ جائے تو پھر جو وہ نماز میں کھڑا ہوتا ہے' وہاں سے تو بچ ہی نہیں سکتا' سوال ہی نہیں ہے۔ ہر نمازی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کس فرقے کا نمازی ہے۔ چلئے میں نے کہا یہی کر لیجیے۔ کر کیسے لیں۔

قرآن حکیم کے حکم کے برعکس روایات کو قرآن حکیم پر قاضی بنانا ہے

عزیزانِ من! آپ نے سن لیا قرآن' اس قرآن کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے یہ تاکید کہ دیکھنا! ان کی کسی بات میں آ کے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہٹ جانا NO COMPROMISE (کوئی مفاہمت نہیں) اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ CERTIFICATE دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے قطعاً ایسا نہیں کیا' خدا نے کہا ہم نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' کتاب اسی طرح سے متن کے اعتبار سے موجود۔ کہا یہ تھا فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ط (11:110) کہ انہوں نے اس کے اندر اختلاف پیدا کر لیا۔ تو اختلاف متن کا نہیں ہے' اس کے اندر اختلاف ہے۔ اور یہ ہیں بنیادیں اس اختلاف کی: قرآن جیسی دوسری وحی' وہ ناقص ہے' یہ منسوخ ہے' وہ اس پہ قاضی ہے یہ عقیدہ ہے ان کا یعنی اس کا جو فیصلہ ہے عدالت میں بیٹھی ہوئی ہیں روایات' قرآن پر حدیث قاضی ہے یہ عقیدہ ہے۔ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ط (11:110)۔

قرآن حکیم میں اختلافات پیدا کرنے کی سزا جہنم ہے

قرآن نے اتنا ہی کہا تھا کہ وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (11:113) یاد رکھنا! اس قرآن میں ان لوگوں کی خاطر ذرا سا بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹنا' کوئی اختلاف نہ پیدا کر لینا۔ اگر ایسا کیا

تو یاد رکھو! جہنم میں چلے جاؤ گے خدا کے علاوہ تمہارا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں اور دنیا میں کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ یہ یہاں لکھا ہوا ہے۔ کتاب میں اختلاف پیدا کرنے کے متعلق آپ نے دیکھ لیا۔ بنی اسرائیل کی بات شروع کی اور یہاں آ گیا۔

درسِ قرآن کے دوران علامہ پرویزؒ کی سامعین کے لیے ایک حقیقت کا بیان

عزیزانِ من! یہ ہے یاد رکھئے! میں عمر کے اس حصے میں پہنچ رہا ہوں' یہ چیز جو ہے پتہ نہیں دوبارہ دہرائی جائیں یا نہ دہرائی جائیں۔ عزیزانِ من! سنی سنائی بات نہیں کر رہا میں نے اپنی پوری عمر اس کتابِ عظیم کے اوپر غور وفکر میں' تدبر میں گذاری ہے۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات' میں خود دعوے سے یہ بات آپ کے سامنے کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کو اگر خالص قرآنِ کریم سے سمجھا جائے تو سوال ہی نہیں کہ کوئی اختلاف آپ کے ذہن میں آ سکے اور وہ حل نہ کرے اس کو۔ عزیزانِ من! خدا کی کتاب نہ ہوئی مذاق ہو گیا۔ اور اس کے متعلق جب وہ دھڑلے سے کہتا ہے کہ اس کے خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے اندر اختلاف نہیں ہے' پھر اختلاف ہو اس کے اندر!! ۔ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہیں دعویٰ کرنے والا کون ہے۔ اگر ہمارا ایمان ہے کہ خدا دعویٰ کرتا ہے اس کتاب کے متعلق دعویٰ کرتا ہے پھر یہ بات ہو کہ اس کے اندر اختلافی باتیں نظر آ جائیں آپ کو!! لیکن شرط یہی ہے قرآنِ خالص' توحید اسی کو کہتے ہیں' یہی وحی ہے' یہی ضابطۂ قانون ہے' یہی خدا کا بھیجا ہوا ہے' یہی رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا' اسی کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ کوئی COMPROMISE نہ کرنا' اس میں کوئی اختلاف نہ پیدا کر دینا' اس میں کوئی تبدیلی نہ کرنا اسی کے متعلق۔ ورنہ اگر اتنا بڑا ڈھیروں وحی اور دوسرا ایسا دینا تھا کہ جو اس سے اور اُس سے مختلف ہوتا وہ اس کو منسوب کرتا سارا کچھ کرتا کتنی بڑی گنجائش تھی اس کے اندر اختلاف کی۔

اگر آج ملتِ اسلامیہ نے اُمت واحدہ بننا ہے تو اسے دین خداوندی میں قرآن حکیم کو آخری حجت تسلیم کرنا ہوگا

عزیزانِ من! اس قرآن کی کیفیت یہ ہے۔ اس امت نے اگر بچنا ہے اس کی بھی ایک ہی شکل یہ ہے کہ دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب' جو کچھ باقی آپ کے پاس آ رہا ہے اس کے اوپر پرکھ کے دیکھا جائے جو اس کے مطابق ہے' اسے صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جو اس کے خلاف ہے وہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کر دی جائے۔ اس پہ اگر یہ امت آ گئی تو یہ کتاب اختلافات ان کے مٹائے گی اور ساٹھ ستر کروڑ افرادِ امت کے اگر اختلافات مٹ جائیں تو پوچھئے یہ زمین چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں' دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ کر سکتی ہے!! صرف ایک اختلاف مٹ جانے سے۔ لیکن جس قوم کی کیفیت یہ کہ اپنی مسجد میں نماز نہیں وہ ایک قسم کی

پڑھ سکتے' وہ ایک قسم کی آمین نہیں کہہ سکتے ساٹھ ستر کروڑ وہ زندگی کے مسائل طے کرنے میں آپس میں متحد ہو سکتے ہیں!! آپ نے دیکھا فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ط (11:110) کی تفسیر کیا آئی۔قرآن نے کہا کہ اب ان قوموں کی طرف آؤ کہ جن کے نبی ان کو کتاب دے گئے اور پھر ان کی یہ حالت ہوئی' وہ حالت کیوں ہوئی؟ انہوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا۔عزیزانِ من! ایک لفظ تھا ''کتاب میں اختلاف کیا''۔

نظامِ صلوٰۃ امت میں وحدت پیدا کرنے کا ایک موثر طریق ہے

اور پھر اگلی چیز جو قرآن نے بتائی وحدت امت کی پیدا کرنے کے لیے' عجیب بات ہے کہ جو چیز میں گنا تا چلا آ رہا ہوں اور محسوس و مشہود طریقے پہ جو امت میں اختلاف کی علامت ہے یعنی نماز' صلوٰۃ اسی کو وحدت کا ذریعہ بنایا قرآن نے۔

نظام صلوٰۃ کے سلسلہ میں شہد کی مکھی کو استعارے کے طور پر پیش کرنا بڑی خوبصورت تشبیہ ہے

وہ آیت نکال لیجیے بڑی اہم آیت ہے سورۃ روم کی۔مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ (30:31) میں نے اگلے دن بھی یہ کہا تھا کہ یہ بڑی خوبصورت تشبیہ ہے استعارے کے طور پہ بات کہی ہے جیسے شہد کی مکھی ہزاروں میل کا سفر فضا میں کرتی رہتی ہے جب بھی جہاں اس کو وہ پھول کا منہ چوم کے اس میں سے ایک ذرا سا قطرہ لیتی ہے وہاں سے اس کے بعد وہ سیدھی اپنے چھتے میں آتی ہے اس کو انابت کہتے ہیں۔خدا نے یہ کہا ہے اس امت کو کہ یاد رکھو! اس طرح سے خدا کے اس قانون کی طرف آؤ جیسے یہ شہد کے چھتے کی مکھیاں آیا کرتی ہیں ایک مرکز کے تابع' ایک نظام کے تابع۔

شہد کی مکھی کو پھول سے ایک قطرہ شہد لانے کے لیے ستائیس ہزار میل کا سفر کرنا پڑتا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ وہ اتنی محنت سے لاتی ہیں کسی دوسرے وقت سورۃ النحل پہ آؤں گا تو بتاؤں گا کہ ایک شہد کی مکھی کو ایک قطرہ پھول سے لانے کے لیے ستائیس ہزار میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔وہ لا کے اس میں DEPOSIT کر دیتی ہیں جا کے وہاں باہر بیٹھ جاتی ہیں۔راستے میں کوئی خیانت اس میں سے نہیں کرتی کتنی بھوک کیوں نہ ہو۔آنے کے بعد یہ نہیں کہتی کہ میرا قطرہ مجھے دو' باہر بیٹھ جاتی ہے۔اندر نظام ہے صاحب! ایک کوئین اندر بیٹھی ہوئی ہے وہ ان سب چیزوں کو لے لیتی ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ ان میں سے جو چیز کشید کی ہوئی بہترین ہوتی ہے وہ پہلے ان بچوں کو دیتی ہے' پھر ان کے گرد ایک حلقہ ہوتا ہے یہ GUARDS کا فوج کا وہ ان کو دیتی ہے اور آپ یہ سن کے حیران ہونگے کہ یہ جو باہر سے سارے محنت کر کے لانے والے ہیں ان کے حصے میں موم آتی ہے۔اس چھتے میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا' اس چھتے میں کوئی لڑائی نہیں ہوتی' تقسیمِ عمل ہے اس کے مطابق ہو رہا ہے۔میں کہہ رہا تھا مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ (30:31)

یادرکھو! اس کے قانون کی نگہداشت کرو۔

فرقہ بندی کی بنیاد اپنوں سے چاہت اور دوسروں سے مخالفت

اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (30:31) صلوٰۃ کے نظام پہ قائم رہو۔ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (30:31) اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ گویا صلوٰۃ کا نظام یہ تھا کہ اس پہ قائم رہو گے تو مشرکین میں سے نہیں ہو سکو گے۔ مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ یعنی مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ (30:32) ان میں سے نہ ہو جاؤ کہ جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر لئے وَ کَانُوۡا شِیَعًا ؕ (30:32) پھر خود ایک پارٹی بن کے بیٹھ گئے اور پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ (30:32) ہر فرقہ مگن ہو کے بیٹھ گیا کہ میں حق پہ ہوں باقی سارے باطل کے اوپر ہوں۔ نہ اس کو ضرورت پیش آئی یہ دیکھنے کی کہ میں واقعی حق پہ ہوں یا نہیں' نہ یہ کہ وہ باطل پہ کیوں ہیں۔ عزیزانِ من! فرقے کی تو بنیاد اس پہ ہوتی ہے یعنی جو آپ کے ساتھی ہیں' پارٹی کے اندر ہیں' ان کے ساتھ مل کے رہنا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جو باہر ہیں ان کے ساتھ نفرت کرنا۔ یہ اندر کا ؟؟؟ جو ہے وہ دوسروں سے محبت کر کے قائم نہیں ہوتا ان سے نفرت کر کے قائم ہوتا ہے۔ ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرو' ان کی خرابیاں گناؤ' سب چیزیں ان کے اندر۔ وہ کہا یہ کہ پھر یہ ہر فرقہ مگن ہو کے بیٹھ جاتا ہے کہ میں حق پہ ہوں' باقی باطل پہ ہیں۔

آج ہماری نماز فرقہ بندی کا سب سے بڑا اور واضح نشان ہے

میں کہہ رہا تھا وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ (11:114)' صلوٰۃ کے نظام کو قائم رکھو' اس سے تم مشرک نہیں ہو گے یعنی فرقوں میں نہیں بٹو گے۔ اور میں نے کہا ہے کہ آج ہماری علامت ہی فرقے کی نمازیں ہیں۔ صلوٰۃ بدلی نماز میں اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ قرآن نے یہاں یہ کہہ کے یہ جو میں نے ابھی کہا ہے کہ یاد رکھو! قرآن سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہٹنا وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ (11:114) صلوٰۃ کو قائم رکھو۔ یہاں کہا ہے صلوٰۃ کو قائم رکھو' یہاں ٹھیک ہے وہ اجتماعات صلوٰۃ کے جو ہیں وہ بھی صلوٰۃ ہیں ہمارے ہاں۔

صلوٰۃ جب تفرقوں کا شکار ہو جائے تو پھر وہ قرآنی صلوٰۃ باقی کہاں رہتی ہے

یہ نہ سمجھ لینا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ نماز جس طرح سے اجتماع میں پڑھی جاتی ہے یہ کوئی شے نہیں ہے' قرآن نے بڑی اہمیت اس کی دی ہے یہیں سے تو آپ کی اجتماعیت شروع ہوتی ہے' یہیں سے تو وحدت شروع ہوتی ہے۔ وہ تو صلوٰۃ' صلوٰۃ نہیں رہتی تو تفرقے کا موجب بنتی ہے ورنہ وحدت اور اجتماعیت تو اسی صلوٰۃ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہا گیا اسے قائم رکھو ان اجتماعات کو۔ یہاں نماز کے اوقات کے متعلق بہت شور مچتا ہے کہ صاحب! وہ پانچ وقت جو ہیں نماز کے' بہر حال میں یہ عرض کر دوں کہ میں نے جہاں تک غور کیا ہے

قرآن میں متعین طور پر یہ پانچ وقت جو ہیں یہ اس طرح سے نہیں آئے۔ دوسرے وقت میں میں آؤں گا ان آیتوں پہ تو پھر میں عرض کروں گا کہ ایک یہ چیز جو ہے اس طرح سے فجر اور ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا ان طرح سے قرآنِ کریم کے اندر متعین طور پر، حکم کے طور پر یہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے ہاں جو ہیں، سیدھی سی بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے دور میں یہی نظر آتا ہے کہ اس طرح سے ان کی شبہات کو انہوں نے قائم کیا ہے تو وہ بہرحال اجتماعات تھے موقت۔ کم از کم ہمارے ہاں چلے آ رہے ہیں اگر چہ اس میں بھی فرق ہے کوئی وہ سایہ یوں ڈھلنے کے وقت میں پڑھتا ہے وہ دیکھا ہے آپ نے کہ ''اوروزے کی اذان ہوندی ہوندی اے تے او کہندے نیں کھول لے، او کہندے نیں نہ کھولیں وہابیاں دی بانگ ہیگی اے''، لیکن بہرحال وہ تھوڑا بہت سا فرق اس میں ہوتا ہے ان کے ہاں، یہ اوقات چلے آ رہے ہیں۔

صلوٰۃ کے اوقات کے متعلق علامہ پرویزؒ کا مسلک اور ان کے متعلق غلط پروپیگنڈے کی نوعیت کا جواب

میں کم از کم اپنا مسلک بتا دوں اور اس لئے بتا دوں کہ ہر جگہ آپ یہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ پرویز صاحبؒ کون جی؟ ''او جی جیہڑے تین نمازاں کہندے نیں پڑھنیاں چاہیدیاں''۔ اور یہ پرویز صاحب جس نے سب سے پہلے ان اہلِ قرآن کی مخالفت کی تھی جو کہتے تھے کہ تین نمازیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ایک نیا فرقہ بنا ہے ابھی ابھی یعنی تھوڑا ہی وقت ہوا ہے مولانا عبداللہ چکڑالوی کا، ان کو اہلِ قرآن کہتے ہیں۔ میں نے ان کی مخالفت کی تھی کہ بابا! جو چیز قرآن کے اندر بالتصریح نہیں ہے اسے تم قرآن سے یوں کھینچا تانی کر کے نکالتے ہو، غلط چیز ہے۔ کوئی ایک چیز تو ایسی ہے جس میں اس طرح سے امت چلی آ رہی ہے رسول اللہ ﷺ کے وقت سے آج تک، پانچ وقت ہی سہی کوئی بات تو ابھی وحدت کی اس میں ہے، نشانی ہی سہی، کم بختو! اس کو بھی کیوں تم تباہ کرتے ہو۔ اس لیے میں نے یہ کہا ہوا ہے کہ نماز کے اوقات، اس کی تفصیل، اس میں جو کچھ کیا جاتا ہے، پڑھا جاتا ہے جس جس طریق سے بھی کوئی فرقہ کر رہا ہے، اس میں نہ کوئی تم تبدیلی پیدا کرو نہ کوئی نئی بات اس میں پیدا کرو، ہمیں قطعاً حق نہیں ہے۔ اس سے تفرقہ بڑھ جائے گا اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں نے یہ مخالفت کی ہوئی ہے۔ میرے ہی متعلق یہ ہر جگہ کہا جا رہا ہے۔ جھوٹ جب منظم طریقے پہ بولا جائے تو بڑا ہی خطرناک ہو جاتا ہے۔ کسی سے آپ پوچھئے وہ کہے گا کہ اچھا! وہ تین نمازوں والے اور وہ جو کہتے ہیں کہ اردو میں نماز پڑھو۔ تو سب سے پہلے میں نے مخالفت کی تھی اردو میں نماز پڑھنے والے کی۔ ہر شخص کہے گا۔ اس سے پوچھو کہ بھئی! پرویز کے متعلق سند، تم اس سے ملے ہو؟ کہ جی! نہیں ملا، بھئی! اس کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا؟ جی میں نے تو نہیں دیکھا، تو پھر تم کیسے کہتے ہو؟ کہ جی! ''ساری دنیا کہندی ہیگی اے سیدھی جی گل اے''۔

تین نمازوں کے متعلق اہل قرآن کا مسلک اور پھران ناہمواریوں کوختم کرنے کا طریق

وہ تین نمازوں والے جواہلِ قرآن ہیں وہ عام طور پہ اس آیت سے لیتے ہیں صلوٰۃ قائم کرو طَرَفَيِ النَّهَارِ (11:114) دن کے دونوں کناروں کے اوپر وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ (11:114) اور رات کے قریب میں۔ بہرحال جیسا میں نے عرض کیا ہے متعین طور پر یوں قرآن میں یہ پانچ اوقات نہیں ہیں۔ میں تفصیل سے اس کے متعلق آگے چل کے یہ بیان کروں گا' یہ ضمناً بات آ گئی ہے اس لیے ضمناً میں کہہ رہا ہوں کہ بات قرآن کچھ اور کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ امت میں اختلاف پیدا ہوگیا' کمزوریاں آ گئیں' ناہمواریاں پیدا ہوگئیں یہ امت اگر یہ چاہے جس کے ہاں قرآن کم از کم متن کے لحاظ سے محفوظ ہے تو وہ کیا کرے؟ وہ کرے یہ کہ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (11:114) وہ جو میں بار بار دہرایا کرتا ہوں بڑی عظیم آیت ہے کہ یاد رکھو! ناہمواریاں دور کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ دوسروں کی زیادہ ناہمواریاں گناتے جاؤ کہ کیا ہوگیا۔ اگر میں نے اپنے ہاں الاٹ کرالیا میں نے تو اتنی سی فیکٹری الاٹ کرائی ہے انہوں نے چار ملیں الاٹ کرائی ہوئی ہیں' اپنی فیکٹری کی JUSTIFICATION اس کی چار ملز' غلط ہے۔

خرابیوں کوختم کرنے کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا فرمان

بے مہابا ذہن میں حضرتِ عمرؓ کا وہ قول آ گیا وہ کیا بات ہے حضرتِ عمرؓ کے قول کی! کمانڈر کو لکھتے ہیں حضرت سعد بن وقاصؓ کو کہ میں نے یہاں کچھ سپاہیوں کو یہاں کے کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایرانی سپاہیوں میں ہم نے دیکھا کہ ان میں یہ خرابی ہے' یہ برائی ہے ان کے ہاں' انہیں لکھا کہ یہ لوگ غالباً اپنے آپ کو اطمینان میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان میں بڑی زیادہ خرابیاں ہیں' ہم میں کم خرابیاں ہیں' اپنی فوج کو سمجھا لو کہ دوسروں کی زیادہ خرابیاں جو ہیں وہ تمہاری فتح کا باعث نہیں ہوں گی۔ تمہاری اپنی خوبیوں کی زیادتی تمہاری فتح کا باعث ہوگی اور اس کے بعد یہ ہے کہ خرابی ایک بھی' خرابی ہوتی ہے۔ خرابیوں کی تعداد نہیں گنا کرتے۔ کیا بات تھی ان لوگوں کی! وہ کیا تھا؟ قرآن پہ نگاہ تھی۔ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (11:114) ناہمواریاں اور خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں تو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تعمیری کام زیادہ پیدا کرو' اچھائیاں زیادہ پیدا کرو' خوبیاں زیادہ پیدا کرو' اپنے اخلاق کو زیادہ سنوارو' یہ طریقہ ہے اس کا' دوسروں کی برائیاں نہ گناؤ۔ حسنات' سیات کو لے جاتی ہیں یہ ہے اس کا طریقہ۔ اور یہ چیز جو پیدا ہوگی وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ (11:114) یہ نظامِ صلوٰۃ سے یہ بات پیدا ہوجائے گی کہ سیات مٹ جائیں گی' حسنات تمہاری بڑھتی چلی جائیں گی۔

وحدت پیدا کرنے کا بہترین طریق نظام صلوٰۃ ہے۔ امام کا سہو ساری امت کا سہو ہوتا ہے

عزیزانِ من! صلوٰۃ کا نظام تو یہ بتایا ہے قرآن نے' وحدت کی پہلی نشانی ہے الصلوٰۃ کا نظام' اجتماعیت کی نشانی صلوٰۃ کا نظام'

ایک امام، دو لیڈر نہیں ایک وقت میں، ایک جماعت، دو جماعتیں ہو ہی نہیں سکتیں ایک وقت میں ایک مسجد میں، اس ایک کی آواز پہ جھکنا ہے اس ایک کی آواز پہ اٹھنا ہے، امت میں تفرقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی نماز ہی نہیں ہوتی کہ امام رکوع میں جائے اور یہ سجدے میں چلا جائے۔ باہمی اتحادِ عمل یہاں تک کہ اگر امام کسی وقت غلطی کرتا ہے تو یہ ٹھیک ہے کہ تم کھنگار کے ذرا یہ کہہ دو آواز سے بھی نہیں اور اس کے باوجود اگر وہ غلطی کرتا ہے تو تم بھی ویسا ہی غلط کر جاؤ اور اس کے احساس کے بعد جب وہ سجدۂ سہو نکالے تو تم نے اگرچہ وہ غلطی تمہاری نہیں تھی اس کی تھی تم بھی سجدۂ سہو نکالو کہ امام کا سہو ساری امت کا سہو ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے اقامتِ صلوٰۃ، یہ ہے اجتماعیت، یہ ہے وحدتِ امت، اس سے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114) یہ جو تمہارے ہاں اختلاف کی وجہ سے یہ چیزیں پیدا ہو گئی ہیں اس کے دور کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

لفظ ذکر کا لغوی مفہوم احکامات کو سامنے رکھنے کے ہیں

اس کے بعد کہا ذٰلِکَ ذِکْرٰی (11:114) کہا کہ یہ بہت ہی بڑی نصیحت کی چیز ہے جو ہم کہہ گئے ہیں تمہیں، بہت بڑے سامنے رکھنے کی چیز۔ ذکر کے معنی ہوتا ہے وہ شے جسے ہر وقت سامنے رکھو۔ بہت بڑی چیز ہے جو ہم کہہ گئے ہیں تمہارے لیے بچنے کی۔ ذٰلِکَ ذِکْرٰی (11:114) لیکن کن کے لیے؟ لِلذّٰکِرِیْنَ (11:114) جو اس قرآن کو سامنے رکھنا چاہیں۔ جو اسے سامنے ہی نہ رکھنا چاہیں اس کے لیے ہم ہزار کہتے رہیں کیا فائدہ ہوگا۔ عزیزانِ من! وقت ہو گیا سورۃ ھود کی آیت 114 تک ہم آ گئے 115 سے آگے ہم شروع کریں گے۔ اگلے درس میں سورۃ ھود ختم ہو جائے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

سولہواں باب: **سورۃ ھود** (آیات 115 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1974ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ ھود کی آیت 115 سے ہو رہا ہے (11:115)۔

ہر سورۃ کی آخری آیت کی اہمیت کے علاوہ ہر آیت کے آخری میں خدا تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کا اظہار اپنے اندر ایک عظیم حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے

جیسا کہ پہلے بھی کئی بار یہ ذکر آ چکا ہے قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ عام طور پر وہ آیتوں کے آخر میں خدا کی کوئی نہ کوئی صفت لاتا ہے ایک آیت کے آخر میں خدا کی کوئی صفت خبیر' علیم' غفور' رحیم' وغیرہ۔ تو یہ چیز یونہی ردیف کے طور پہ نہیں آ جاتی' یہ بڑی اہم چیز ہوتی ہے۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اس آیت میں جو بات کہی گئی تھی اس کی تائید' شہادت' صداقت سمٹ کر خدا کی اس

صفت میں آتی ہے جو وہ اس آیت کے آخر میں لاتا ہے۔اوراسی طرح جب وہ کسی سورۃ کے آخر میں پہنچتا ہے تو اس کی آخری آیات میں وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کی تفصیل' اس کے شواہد' اس کے دلائل وہ تو لئے چلا آ رہا ہوتا ہے اوراس کی تعلیم کا ملخص پھر وہ اس سورۃ کی آخری آیات میں بیان کرتا ہے۔تو اس اعتبار سے آیت کے آخری الفاظ جو عام طور پر خدا کی صفات پر مکتفی ہوتے ہیں اور سورتوں کی آخری آیات اور زیادہ غور طلب ہو جاتی ہیں۔سورۃ ھود کے متعلق آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں شروع سے حضرات انبیائے کرامؑ اور امم گذشتہ کے احوال وکوائف بیان ہوتے چلے آ رہے ہیں۔کوئی تاریخی داستانیں تو بیان نہیں ہوتیں اس میں کہا یہ گیا ہے ہر قوم کی زندگی کے واقعات اس قوم کے معاشرے اور نظام کے حالات اوراس کے ساتھ ہی ان کی جرائم کی فہرست میں سے وہ سب سے بڑا جرم کہ جس کو ان کی آخری تباہی کا موجب قرار دیا گیا ہے' وہ خرابی وہ جرم نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔اوراس کی اصلاح کے لیے پھر خدا کی طرف سے ایک انقلابی پیغمبر آتا ہے وہ اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔اور یہ سلسلہ چلا آتا ہے حضرت نوحؑ سے چلا ہوا حضرت موسیٰؑ تک ہم پہنچ گئے تھے۔یہ کشمکش حق و باطل ہے جس کی داستان سورۃ ھود میں اس تسلسل کے ساتھ بیان ہوئی ہے' وہی چراغ مصطفویؐ کے ساتھ شرار بولہبی کی آویزش۔

سورۃ ھود کی اس آخری آیات کی اہمیت اور حضرت صالحؑ کی پکار اوراس کا حل

یہ سارا کچھ بیان کرنے کے بعد اب جیسا میں نے عرض کیا ہے آخر میں آ کے تو وہ اس کا ملخص بیان کرتا ہے'' تت کڈ کے رکھ دیندا ہے''۔وہ کہتا یہ ہے کہ معاشرے میں برائیاں' خرابیاں عام ہو جائیں ایک مصلح کے لئے بظاہر یہ مرحلہ بڑا دشوار اور بڑا صعوبت انگیز اور صبر آزما ہوتا ہے کہ سینہ تمام داغدار پنبہ کجا کجا نہم' وہ چیچک کے چھالوں کو دیکھتا ہے کہ کس کس پر مرہم رکھوں' میں کس کس کا علاج کروں یہاں تو ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (30:41) خشکی اور تری ہر جگہ فساد ہی فساد ہے۔قرآنِ کریم نے نظام کے انداز میں تو حضرتِ صالحؑ کو یہ کہا تھا' جب انہوںؑ نے کہا تھا کہ میں کیا کروں سارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے تو انؑ سے کہا گیا تھا کہ نہیں! کوئی بات نہیں یہ معاشرے کا بگاڑ جو ہے اس کی اصلی جڑ (ROOT) ہم تمہیں بتاتے ہیں: یہ جو مملکت کا دارالخلافہ (CAPITAL CITY) ہے اس میں نو مجرم بیٹھے ہوئے ہیں سب سے بڑے اکابر مجرمین۔آپ سوچ سکتے ہیں دارالخلافہ کے اندر جو مجرم بیٹھے ہوتے ہیں اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟

قوموں کی اصلاح کا دارومدار حکمرانوں کی سوچ اوران کے کردار کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے

مملکت کا اقتدار جن کے ہاتھوں میں ہوتا ہے وہ وہاں بیٹھے ہوتے ہیں۔کہا کہ یہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں' ان کی اصلاح ہوتی ہے تو

اصلاح ہوجائے گی' تباہ ہوتے ہیں تو تباہ ہوجائیں گے' ان کی اصلاح سے سارا معاشرہ صحیح ہوجائے گا۔ کہا کہ بگاڑ ہی اوپر کے اکابر جو ہیں ان سے بات شروع ہوتی ہے اور پھر یہ متعدی طور پہ آگے معاشرے میں چلتی ہے۔ انہیں ذہن میں رکھو۔ اب آگے ان کے متعلق یہ آیا کہ اگر اصلاح کرنا چاہیں' اس کا طریقہ کیا ہے؟

قرآن حکیم کی روشنی میں برائی کو ختم کرنے کا ایک ابدی اصول اور وہ یہ کہ برائی کو حسن کارانہ کام سے ختم کرنا ہوگا

عام طور پر تو انسانی معاشرے میں ہوتا یہ ہے کہ ایک طبقہ برسرِ اقتدار آیا' اس نے کچھ ظلم وتعدی سے کام لیا۔ پھر دوسرا آیا اور اس نے آ کے کہا کہ ''اتر اتون میں چڑھاں'' اور پھر وہ برسرِ اقتدار آیا تو اس نے آ کر پہلے نے جو کچھ کیا ہوتا تھا' اس سے زیادہ ظلم وتعدی اس نے شروع کردی اور زیادہ اس نے خرابیاں پیدا کیں۔ یہ سلسلہ چلا آتا ہے وہ پہلے سے زیادہ خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ عام طور پہ دنیا نے یہ طریقہ سیکھا ہوا ہے۔ اس کو آپ خرابیوں کا بدلہ لینا کہہ لیجیے۔ قرآنِ کریم ایک اصول دیتا ہے اور اصول وہ اتنا اہم ہے' اگلے لفظ جو آپ سنیں گے تو اس سے اس کی اہمیت آپ کے سامنے آجائے گی کہ ایک ابدی حقیقت ہے جسے وہ بیان کرگیا ہے۔ یہ جو 114 آیت کے آخری الفاظ تھے جنہیں میں دہرانا چاہتا ہوں کہ یہاں سے بات آگے چلے گی۔ کہا یاد رکھو! یہ سب غلط ہے ان کا خرابیاں مٹانے کا جو تصور ہے۔ خرابیاں مٹانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط (11:114) خرابی' برائی' ناہمواری پیدا ہوجائے' اس کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ اس سے زیادہ تعمیری کام کرو' اس سے زیادہ حسن کارانہ کام کرو' اس سے زیادہ اچھائی تم کرو۔ اس برائی سے زیادہ برائی نہ کرو' ظلم کا بدلہ ظلم سے مت لو' ناانصافی کا بدلہ زیادہ ناانصافی کرکے نہ لو' تعدی کا بدلہ زیادہ تعدی کرکے نہ لو۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط(11:114)

عملِ صالح کا عملی مفہوم کاشتکار کے سہاگا پھیرنے کے نتیجے سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے

عزیزانِ من! چار لفظ ہیں ایک ابدی حقیقت بیان کرگیا ہے۔ ناہمواریاں پیدا ہوئی ہیں' یہ کسان سے پوچھئے کہ وہ زمین کو کس طرح کاشت کے قابل بناتا ہے' اس میں بڑی خرابی کی جڑیں ہوتی ہیں یعنی پہلی فصل جو وہ کاٹتا ہے تو اس کی جڑیں اس زمین کے اندر رہ جاتی ہیں' وہ نئی فصل کو اگنے ہی نہیں دیتیں۔ پہلی بات تو یہ ہوتی ہے کہ ان کو وہ اکھیڑتا ہے ہل چلا کے' کسی کھیت میں ہل چلا ہوا ہو تو جا کے دیکھئے اس کی ناہمواریاں کس قدر رہوتی ہیں' سارا کھیت ناہموار ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ کرتے کیا ہیں؟ ہمارے ہاں کی زمینداری کی اصطلاح میں سہاگہ کہتے ہیں ''اوہدے اُتے فیر سہاگہ پھیر دتا جاندا اے'' وہ اتنے بڑے بڑے ڈھیلے ہوتے ہیں وہ پس کے وہ جتنے خلا

ہوتے ہیں زمین کے' اس میں وہ پڑے اس میں ہمواری پیدا ہوتی ہے۔ یہ عملِ صالح جسے کہتے ہیں وہ یہی چیز ہوتی ہے جسے سہاگہ پھیرنا کہتے ہیں' ہمواریاں پیدا کرنا جسے کہتے ہیں۔ وہ یہ کرتا ہے وہ اور مزید ناہمواریاں پیدا نہیں کرتا اس کے اندر' وہ اس ان ناہمواریوں کو ہمواریوں میں بدلتا ہے۔ قرآن نے حسنات اور سیأت کہا ہے۔ حسنات جو ہیں وہ تو PROPORTION کا قائم رکھنا ہے' توازن کا قائم رکھنا ہے کہا کہ جتنا توازن بگڑا ہوا ہو اس کے مقابلے میں اتنا ہی زیادہ شدت سے توازن قائم کرو۔ حسنات جو ہیں وہ برائیوں کو سیأت کو دور کریں گی ان کے ازالے کی صورت یہ ہے۔ اور زیادہ خرابیاں اور زیادہ ظلم و تعدی اور زیادہ بے انصافیاں اس سے نہیں معاشرے کی اصلاح ہو سکے گی' برائیاں اس سے دور نہیں ہو سکیں گی اور زیادہ پھیلتی چلی جائیں گی۔ اور یہ سلسلہ تو پھر لامتناہی ہو گا ایک کے بعد دوسرا آیا' اس نے اس سے زیادہ وہ کچھ کر کے دکھایا۔

زندگی کا سب سے بڑا سلوک ناہمواریاں کے مقابلے میں حسنات زیادہ پیدا کرنی ہوں گی

اس کے بعد پھر یہ چیز کہ جی ہاں! یہ تھے ایسے ان کا علاج ہی یہی تھا۔ ٹھیک ہے مجرم کا تو علاج کیجئے لیکن آپ بتائیے کہ آپ کے نامۂ اعمال کے اندر تعمیری کام کتنے ہیں' حسنات آپ کے ہاں کتنے ہیں۔ کیا آپ بھی یہ سیأت کا پشتارہ لے کے چلے جائیں گے وہاں۔ حسنات کہاں ہیں آپ کے ہاں۔ کہا کہ یاد رکھو! یہ ہے طریقہ انہیں سمجھانے کا۔ بڑی سیأت' بڑی ناہمواریاں پیدا کر چکے ہیں اب اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ حسنات پیدا کریں۔ بیماری کا علاج وہ تو ازالہ ہوا' علاج ہوا دوائیوں سے ہوا' اس کے بعد وہ جو توانائی کم ہوتی ہے آپ کو پتہ ہے کہ بیماری کے بعد مریض کو عام حالات سے بھی زیادہ تقویت بخش غذائیں دی جاتی ہیں' اس لیے کہ ایک تو وہ جو بیماری نے اس کی توانائی کو ضائع کیا ہے اس کی RECOUPMENT ہو جائے اور پھر اس کے بعد مزید اتنی توانائی ہو جائے کہ اگر وہ جراثیم دوبارہ حملہ کریں تو وہ ان کی مدافعت کے قابل ہو جائے یہ حسنات ہیں۔ بیماری کی پیدا کردہ جو کمزوری ہے اس کو بحال کرنے کا طریقہ تو حسنات ہیں۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) اصول ہے زندگی کا۔

ہمارے ہاں لفظ ذکر کا وہ عملی مفہوم جس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں

اتنا اہم اصول کہ کہا کہ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (11:114) اور اب اگر ذکر کے معنی آپ لے لیں گے جو مسجدوں میں آپ کے ہاں یا خانقاہوں میں ہیں تو وہ تو کہیں گے کہ یہ آیہ ایسی ہے کہ اس کا ذکر اگر کیا جائے یعنی سوا لاکھ مرتبہ اس کو اگر پڑھا جائے تو بس اس سے سیأت چلی جاتی ہیں یا ذکر قلب کے اوپر جو وہ عشا کی نماز کے بعد اب آپ کو مسجدوں میں عام سنائی دے رہا ہے۔ پہلے تو یہ کہیں کہیں ہوتا تھا تو اب تو پھر وہ ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب قریباً قریباً ہر مسجد میں یہ کچھ شروع ہو گیا ہے اس کا نام ذکر ہوتا ہے۔

لفظ ذکر یعنی قرآن حکیم کی روشنی میں انسان کا ہر عمل جو تخریبی کاموں کا ازالہ کر سکے

قرآن کی رو سے ذکر وہ چیز ہے کہ جس کو انسان ہر وقت سامنے رکھے اس کے معنی یہ ہیں۔ کہا کہ یہ وہ اصول ہے کہ جس کو ہمیشہ سامنے رکھو، کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو کسی صورت میں بھی، طیش میں بھی اور غضب میں بھی اور ناامیدی میں بھی اور غصے میں بھی، انتقام میں بھی، کوئی کیفیات طاری ہوں لیکن اسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ کیا بات ہے صاحب! ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ (11:114) جو بھی چاہتا ہے کہ وہ یہ کیفیت پیدا کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس چیز کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھے، کس چیز کو؟ کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114) ''تعمیری کام ہی تخریبی کاموں کا ازالہ کر سکتے ہیں'' اسے نگاہوں کے سامنے رکھو۔ میں نے کہا تھا کہ جسے وہ ابدی حقیقت کہتا ہے، ناقابلِ تبدل اصول بیان کرتا ہے، اس کے متعلق کہتا ہے کہ اسے نگاہوں کے سامنے رکھو، ہمیشہ ہر حال میں اسے نگاہوں کے سامنے رکھو۔ یہ ایک ایسی شے ہے نگاہوں کے سامنے رکھنے کی کہ جو چاہتا ہے کہ میری نگاہوں کے سامنے کوئی ایسی بات رہے کہ میں اسے دیکھتا رہوں، مرکوزِ توجہ وہ بنے اور میں بے راہ نہ ہوں تو اسے چاہیئے کہ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے۔

عزم واستقلال کی قوت کے زیور سے آراستہ توازن بدوش ہستی نبی اکرم ﷺ کا فرمان کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے

آپ نے دیکھا کہ سورۃ کے آخر میں باتیں کیا ہوگئیں۔ میں نے بتایا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ آپ سوچیے تو سہی کہ جس سورۃ کے تقاضے، حضورِ نبی اکرم ﷺ کو بھی بوڑھا کر دیں، کیا کیفیت اس کی ہوگی۔ بات ہی یہ ہے، یہ کہانیاں نہیں بیان کی گئی تھیں۔ جیسا میں نے اس دن بھی آپ کو کہا تھا، یہ شام کو وہ نانی اماں بچوں کو سلانے کے لیے وہ باتیں نہیں سنا رہی، یہ سامری کی داستانیں نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کے ابدی حقائق ہیں اور یہ ایک پیغامبرِ حقیقت، یہ پیغامبرِ انقلاب جو آیا تھا، اب اسے جو شروع سے آخر تک سنایا گیا ہے کہ کس کس قسم کی قومیں آئیں، کس قسم کے پیغامبر آئے، انہوں نے کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں، کس قدر مشقتیں برداشت کیں، کتنی مخالفتیں ہوئیں، کتنے تصادمات ان کے ساتھ ہوئے۔

خدائے علیم کی طرف سے نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کو حصول منزل کے لیے جم کر کھڑے رہنے کی تاکید

قرآن دوسری جگہ کہتا ہے کہ ایسے وقت آ جاتے تھے کہ رسول اور ان کے ساتھی چیخ اٹھتے تھے کہ یا اللہ! کہاں ہے وہ تیرا وعدہ' کب آئے گا۔ یعنی یہ کیفیت تھی ایسی مشکلات کا سامنا آ جاتا تھا۔ وہ سارے گنانے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے پہلے تو یہ کہا گیا تھا کہ اب سن لیا جو کچھ ہم نے کہا ہے۔ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا(11:112) جو کچھ ہم نے تمہیں کہا ہے تم اور تمہارے ساتھی (اللہ اکبر! یہ ساتھیوں کا مرتبہ کتنا بڑا تھا) توازن برقرار رکھتے ہوئے جم کے کھڑے ہو جاؤ اس بات کے اوپر۔ فَاسْتَقِمْ(11:112) کہا ہے یہاں' قام ہے یہ' کھڑا وہی رہ سکتا ہے کہ جس کا توازن صحیح ہو' ذرا توازن بگڑے پاؤں کا تو اس کے بعد تو کوئی کھڑا ہی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس چیز کو پہلے کہا فَاسْتَقِمْ(11:112) کہ یہ تو مثبت چیز ہے حکم دیا ہے' آگے دیا ہے وَ لَا تَطْغَوْا اس کی وضاحت کر دی ہے کہ دیکھنا کہیں اس میں تمہارا توازن نہ بگڑ جائے' حد سے آگے نہ بڑھ جانا۔ فَاسْتَقِمْ جم کے کھڑے ہو جاؤ توازن بدوش راستے پہ۔

فکرِ قرآنی کا ایسا راستہ جو سیدھا بھی ہے اور پھر توازن بدوش بھی

''صراطِ مستقیم'' اسی لیے اُسے کہا جاتا ہے' سیدھا راستہ نہیں' سیدھے کے لیے تو صراط ہی لفظ کافی تھا' صراط کہتے ہی سیدھے راستے کو ہیں' وہ مستقیم ساتھ کیوں ہے؟ سیدھے کے ساتھ توازن بدوش ہونا۔ حقیقت میں توازن ہے' جسے حسنات کہتے ہیں' حسن تو نام ہی توازن کا ہے۔ اسی لیے خدا کی صفات کو اسماء الحسنٰی کہا گیا ہے۔ صفات تو بہت ہیں' ان میں صحیح صحیح توازن قائم رکھتے ہوئے۔ نسخے کے ہر جز میں شفا ہوتی ہے لیکن مریض کے لیے شفا اس وقت ہوتی ہے جب اس کے نسخے کے اجزا میں توازن صحیح ہو۔ اجزا سارے رکھ لیجئے توازن بگاڑ دیجئے وہی تریاق' زہر ہو جاتا ہے۔ تو یہ توازن نہایت ضروری چیز ہے اسی لیے السمآء الحسنٰی ہیں خدا کی صفات میں توازن۔ الحسنات' سیأت کے مقابل۔ فَاسْتَقِمْ(11:112) کہا ہے وَ لَا تَطْغَوْا(11:112) اس کے ساتھ کہا ہے توازن رکھتے ہوئے۔

مشکل سے مشکل زندگی کو زیرِ دام لانے کا قرآنی نسخہ حسنات کے پروگرام کو پیش نظر رکھا ہوگا

آپ سوچیے کہ تیرہ سال تک ان مکے والوں نے ان کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا۔ مدینے میں آئے تو ان کو کچھ قوت حاصل ہوئی۔ وہاں کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! حسنات سے سیأت جو ہیں ان کا ازالہ ہوتا ہے اب یہ بات کہ قوت اور اختیار تمہارے ہاتھ میں آ گیا ہے اور تم یہ کہو کہ انہوں نے ہمارے ساتھ یہ کیا تھا ہم اس سے زیادہ یہ کچھ کریں گے ان کے ساتھ' یہ بات نہیں ہے۔ اور پھر اس کے لیے

وَاصْبِرْ (11:115) پھروہی بات آ گئی صبر کے معنی۔ ہمارے ہاں تو صبر کے معنی صبر شکر ہوتا ہے''اچھا بہن صبر کرا ے اللہ ولوں آ گیا' اوہنوں حوصلے دیندیاں نیں آن کے فیر کہ کوئی گل نئیں بھیناں صبر کر'' مرنے پہ صبر' ناکامی پہ صبر۔ خود اس صبر کے اندر یہ ہے جسے کہتے ہیں کسی چیز کا پھروہی توازن برقرار رکھنا جسے آپ کہتے ہیں ایسے جم کے کھڑے ہو جانا۔ میں نے بتایا تھا کہ عرب کشتیاں چلاتے تھے تو کشتیاں اس زمانے کی ہمارے جہازوں کی طرح اتنی PERFECT تو نہیں ہوتی تھیں بادبانوں سے چلاتے تھے دریاؤں میں سمندروں میں جاتے تھے' طغیانیاں آتی تھیں' تلاطم آتے تھے تو کشتیاں ڈولنے لگتی تھیں بری طرح سے تو اس کے لیے ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طرف اگر سواریوں کی کمی کی وجہ سے وزن کم ہو گیا ہے تو ایک بہت بڑا پتھر وہ ساتھ رکھتے تھے وہ جدھر وزن کم ہوتا تھا' اُدھر وہ پتھر رکھ دیتے تھے تاکہ اس کشتی کا توازن صحیح قائم رہے اور کشتی صحیح چلتی رہے۔ کشتی تو ہم نے نہیں دیکھی اور اب تو اگلی نسل شاید ٹانگے بھی نہیں دیکھے ورنہ ہمارے ہاں جو وہ پرانے لاہوری فیشن کے تانگے ہوتے تھے وہ پچھلی دو سواریاں جو تھیں ان سے پوچھئے کہ وہ کیسے سفر کرتی تھیں۔ تو اس میں بھی وہ ہوتا تھا کہ''پاسدا جانداسی ٹانگہ جیہڑا سی''تو انہوں نے بھی ایک پتھر رکھا ہوا ہوتا تھا تو وہ کبھی پتھر کو آگے کبھی پتھر کو پیچھے وہ اس پہ رکھتے تھے۔ یہ جو تھا کہ عدمِ توازن سے کوئی چیز ڈولنے لگ جائے تو اس کو جو برقرار رکھا جاتا تھا اس کو صابورہ یا وہ صبر کہتے ہیں۔ صبر اس پتھر کا نام ہے کہ ایسا ذریعہ جس سے لغزش نہ آنے پائے۔ لغزش آنے سے روکنے والی چیز جو ہے وہ ہوتا تھا صبر۔ کیا بات ہے صاحب!! کہا وَ اصْبِرْ (11:115) یاد رکھو! چلنا ہے چلتے جاؤ راستے میں ناہمواریاں آئیں گی' لغزشوں کے مقامات آئیں گے لیکن دل میں اتنا ثبات ہونا چاہئے کہ وہ تمہیں صابورہ کا کام دیدے وَ اصْبِرْ ۔ اب یہ بات کہ منزل اتنی لمبی' وہی جو وہ کہتا ہے کہ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک' بڑی صبر آزما یہ چیز ہوتی ہے۔ اب میں یہ صبر کا لفظ اپنی زبان کے اعتبار سے بول رہا ہوں کہ صبر آزما ہے' یہ بات ہمت طلب ہوتی ہے۔ وہ چیز کہ غالب نے ایک شعر میں جو کہا ہے کہ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب۔

انسانی زندگی کا ایک اہم پہلو نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ایک حسین معصوم سی خواہش پر خدائے علیم کا جواب

یہ بے تابیِ تمنا جو ہے یہ بھی انسان کی ایک خواہش ہوتی ہے' ساری عمر محنت کرتا چلا جائے' کرتا چلا جائے اور اس کے بعد یہ ایک معصوم سی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے کہ یا اللہ! میری ساری عمر اسی تگ و تاز میں ہی گذر جائے گی یا میں اپنی آنکھوں سے بھی ان کامرانیوں' کامیابیوں کو دیکھ سکوں گا جس کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ بڑا ہمت طلب مرحلہ ہوتا ہے' مخالفتیں ہی مخالفتیں' تصادم ہی تصادم' وہ منزل سامنے نہیں آتی' وہ پک کے کھیتی سامنے نہیں آتی۔ چلا جا رہا ہے اور روز یہ کہا جا رہا ہے کہ چل اٹھ کھیت کی طرف' چل پھر وہی کلہاڑی لے کے' پھر وہی رسہ لے' سارا دن کام کر' شام کو خالی ہاتھ واپس آ جا' دوسرے دن پھر جا۔ یہ تھی وہ چیز جو سورۃ الرعد میں

آئی ہے نبی اکرمﷺ نے پھر اپنی زندگی کے غالباً آخری ایام میں یہ ایک معصوم سی آرزو تھی جو دعا بن کے لب پہ آئی کہ یا اللہ! میری زندگی اسی طرح گذر جائے گی یا میں اپنی آنکھوں کے سامنے بھی اس عروسِ حقیقت کو دیکھ لوں گا جس کے لیے ساری زندگی تیئس سال محنت ومشقت میں گذر گئی؟ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں، کتنی معصوم سی تمنا یہ، کتنی حسین تھی یہ آرزو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بھی جی میں یہ آتا ہے کہ بس میں ہوتا تو اللہ میاں سے کہتے کہ ہاں! مان بھی لیا لیکن تُو تو خدا ہے۔ خدا ہو ہی وہ سکتا ہے جو قانون پہ چلنے والا ہو۔ جواب دیا گیا کہ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (13:40) یہ کوئی بات نہیں ہے کہ اس کے نتائج تمہاری زندگی میں سامنے آئیں یا بعد میں سامنے آئیں، کھیتی نے اپنے وقت پہ پکنا ہے، موت نے اپنے قاعدے کے مطابق آ جانا ہے، تمہارا کام اسے پہنچاتے چلے جانا ہے۔ یہ حساب ہمارے ذمے ہے کہ یہ کب کھیتی پک کے دانے گھر آئیں گے۔ اتنی بھی رعایت نہیں برتی گئی۔ تو آپ نے دیکھا کہ یہ وَاصۡبِرۡ (11:115) کتنی بڑی چیز ہے۔

کسان کی تو ساری عملی زندگی سراپا 'واصبر' کی ترجمان ہے اس ایمان کے ساتھ کہ خدا محسنین کے ساتھ ہے

یہ وَاصۡبِرۡ (11:115) جو ہے روز وہ رسی لے کے اور ایک کدال لے کے اس کسان کا روز کھیت میں چلے جانا، روز محنت مشقت کر کے خالی ہاتھوں واپس آ جانا، کونسی چیز ہے جو اس پہ اسے آمادہ کرتی ہے؟ یہ ایمان کہ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (11:115) یہ ایمان کہ خدا محسنین کی محنت کو ضائع نہیں کیا کرتا۔ یہ پھر دیکھا آپ نے کہ کس کی محنت کو ضائع نہیں کرتا؟ پھر محسنین آیا، وہی حسنات والے۔ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (11:115)۔ اور یہ جو صاحبِ حسنات ہیں ان کو محسنین کہا۔ ہمارے ہاں تو محسن اور احسان اور یہ تو پھر پوچھو ہی نہیں یہ باتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (11:115) حسنات کی رو سے جو سیأت کو دور کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، ہم ان کی محنت کو ضائع نہیں کیا کرتے۔

نبی اکرمؐ کی زندگی کا تو ایک ایک لمحہ کسان کی زندگی کی طرح پر عزم اور امید سے روشن تھا

یہ ہے کسان کا وہ ایمان جو ہر روز اسے آمادہ کر دیتا ہے باہر جانے کے لیے کہ یہ کھیتی اگ کے رہے گی، یہ کھیتی پک کے رہے گی، دانے میرے گھر میں آئیں گے چھ مہینے کے بعد ہی کیوں نہ آئیں اس لیے کہ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (11:115)۔ یہ جو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہاں ہاں! ہم نے دیکھ لیا نیکی کر کے بھی دیکھ لیا اور دیانت کر کے بھی دیکھ لیا اور اس کے باوجود دیکھئے کہ یہ ناکامیاں اور یہ چیز ہے۔ غور کر کے دیکھنا چاہئے کہ محسنین کے صف میں بھی آپ آتے تھے، توازن بھی اس کے اندر صحیح تھا جو آپ کر رہے تھے، صبر بھی تھا، استقامت بھی تھی، پہلی چیز فَاسۡتَقِمۡ (11:112) ہے استقامت تھی، پھر اور اتنی تھی کہ کوئی نتیجہ سامنے نہ آئے اور اس کے باوجود تم ہمت ہار کے نہ بیٹھ جاؤ، ہر روز پھر کسان کی طرح جاؤ کھیت کی طرف، کیا یہ سارا کچھ آپ نے؟ پھر حسنِ توازن کو برقرار رکھا کہ

جب پانی دینا تھا' پانی دیا ہے۔ جب خشک کرنا تھا' خشک کیا ہے اس کو' جب گڈائی کرنی تھی یہ کچھ کیا' یہ کچھ کیا ہوا ہے؟ یہ کچھ کیا ہوا ہے تو پھر یاد رکھو! فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (11:115) عزیزانِ من! یہ ایمان ہے جو آمادہ کرتا ہے انسان کو کہ زندگی بھر صعوبات کو برداشت کرتا رہے لیکن پاؤں میں لغزش نہ آنے دے نہ ہی مایوس ہو کے بیٹھے۔

بات چلی آ رہی تھی کہ ایک قوم میں بگاڑ پیدا ہوا اس کی طرف ایک پیغامبرِ انقلاب آیا۔ قوم کے ایک حصے نے اس سے سرکشی برتی' تباہ ہوگئی اپنے جرائم کے بدلے میں۔ ایک حصہ وہ بھی تو تھا کہ جو ان کے ساتھ آیا' جو ایمان لے آیا جس نے اصلاح اپنے اندر پیدا کی۔ دوسرا نبی جب آتا ہے تو وہ نظر آتا ہے کہ ساری قوم ہی بگڑی ہوئی تھی۔

سابقہ انبیاء کے زیرِ سایہ تربیت پانے والی اصلاح یافتہ زندگیوں کے متعلق ایک اہم سوال کا بصیرت افروز جواب

سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ جو اس پہلے نبی کے ہاتھوں سنورے ہوئے تھے انہیں کیا ہوگیا؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔ کہا یہ ہوگیا ان کو کہ کچھ عرصے کے بعد فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ج (11:116) کہا ہوا یہ کہ جنہیں ہم نے تباہی سے بچا لیا تھا ان انبیا کے ساتھ' وہ ایک نئی امت بن گئی تھی۔ یقیناً صالحین کی امت تھی۔ حسنات کے پیدا کرنے والے یہ لوگ تھے۔ کہا پھر اس کے بعد؟ کہا اس کے بعد پھر یہ کہ یہی کیفیت کیوں نہ رہی ان میں کہ جہاں کہیں فساد رونما ہوتا یہ اس فساد کو دور کرتے؟ یہ کیفیت ان میں کیوں نہ رہی؟ تو گویا ہوا یہ کہ کچھ عرصے کے بعد پھر یہ اصلاح یافتہ امت جو تھی یہ لوگ پھر کیوں نہ ایسے رہے' کیوں نہ انہوں نے یہ کیا يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ (11:116)۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ یہ فساد سے رکتے' خود فساد سے رکتے' نہیں! يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ (11:116) انہوں نے دوسروں کو فساد کرنے سے روکا کیوں نہیں۔

تمدن' تصوف' شریعت' اور کلام کی پیدا کردہ سوچ کا نتیجہ صبح نور سے محرومی

عزیزانِ من! یہاں تو سوال خود تیر کر پار چلے جانے کا نہیں ہے یہاں تو ڈوبتے کو بچانے کا سوال ہے۔ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ (11:116) اب یہاں سے وہ چیز آپ کے ہاں کے تصوف کی' رہبانیت کی یا مذہب کی ساری سامنے آ گئی۔ مذہب کا فلسفہ اپنی ذاتی نجات ہے۔ یہ سارا تصوف اور ساری رہبانیت آپ کی یہ ہے کہ میں مقربِ بارگاہِ الٰہی بن جاؤں' جہنم میں جائے یہ سارا معاشرہ جو کچھ بھی ہے' میری نجات ہو جائے کسی طرح سے۔ یہاں یہ تو نہیں کہا کہ انہوں نے یہ نہیں کیا تھا کہ میری نجات نہ ہو جائے' وہ کہتا ہے کہ سوال یہ نہیں ہے اس جماعت کے باقی رہنے کا جواز یہ ہے کہ یہ یہاں فساد پیدا نہ ہونے دیں۔ یہ اپنے اس فریضہ سے غافل ہوگئے' یہ کیوں نہ کیا انہوں

نے؟ یہاں یہ لفظ آیا ہے۔جی! اُولُـوْا بَـقِیَّۃٍ(11:116) عجیب وغریب TERMS ہیں قرآن کی' پہلے بھی یہ لفظ آیا تھا اسی سورۃ میں۔ یہ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ''یہ نیک لوگ جو ہیں' نیک اعمال والے لوگ'' تو یہ نیکی اور بدی کے تو تصور ہی پھر اور کچھ ہو گئے ہیں ''وہ بڑا نیک آدمی ہے''آپ سوچ لیجئے اس کے کیا معنی ہوتے ہیں اور جب اس کو پرہیزگار کہہ دیا جائے' متقی کہہ دیا جائے تو پھر تو بیڑہ ہی غرق ہو جاتا ہے' زندگی کی کوئی توانائی باقی نہیں رہتی پھر۔

اگر الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے تو زندگی کا تصور ہی بدل جاتا ہے

قرآن نے اُولُـوْا بَـقِیَّۃٍ(11:116) کہا ہے۔میں نے اس دن بتایا تھا کہ یہ فنا اور بقا ہمارے ہاں تو لفظ فنا استعمال ہوتا ہے معدوم ہو جانے کو' ختم ہو جانے کو' رہے ہی نہ' بقا اس کو کہتے ہیں وہ جو ہمیشہ رہے۔عربی زبان میں یہ ان معنوں میں نہیں آتا اگرچہ آخر میں ماحصل یہی ہو جاتا ہے۔فنا: جو چیز ہر آن بدلتی رہے' تغیر پذیر چیز جو ہے اس کو فنا کہتے ہیں عربی میں۔بقا کہتے ہیں عدمِ تغیر کو جس میں تغیر واقع نہ ہو۔خدا کے متعلق جو کہا ہے وَیَبْـقٰـی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ(55:27) اس کے معنی ہمیشہ رہنے والا نہیں' وہ ہے کہ جس میں کبھی تغیر نہ آئے۔اور یہ مادی چیزیں جتنی بھی دنیا کی یہ ساری طبعی چیزیں (PHYSICAL) ہیں یہ نہیں کہ یہ ایک دن ختم ہو جائیں گی اس لیے ان کو فانی کہا جاتا ہے' دنیا فانی ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ کسی ایک دن جا کے اس نے نہیں رہنا بلکہ یہ کہ یہاں ہر آن ہر شے میں ایک تغیر واقع ہوتا ہے۔

انسان کا ہر سانس انسانی جسم کو ایک نئی زندگی کی نوید دیتا ہے

انسان کی زندگی کے تغیر کو تو پوچھو نہیں' یہ اناٹومی والے ڈاکٹروں سے پوچھو وہ تو کہتے ہیں ہر سانس میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں اس کے جسم کے یہ CELLS مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے CELLS جو ہیں وہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔چنانچہ اب تحقیق یہ ہے پہلے تو کہتے تھے سات سال میں' اب یہ کہتے ہیں کہ تین سال میں انسان کا سارا جسم نیا ہو جاتا ہے۔اس کا پرانا ایک سیل بھی باقی نہیں رہتا۔یعنی جسے آپ پرویز صاحب کہتے ہیں' یہ اگر نام ہے اس کے طبعی جسم کا تو تین سال پہلے والا' تو آج نہیں ہے۔اور اگر آپ اس سے کہیں کہ صاحب! دیکھئے آپ نے مجھ سے قرضہ لیا تھا اور اس کے دینے کا یہ وعدہ کیا تھا' وہ پوچھے گا جی! کب کی بات ہے؟ بھئی! تاریخ لکھی ہوئی ہے پانچ سال کی' اس نے کہا جی! وہ پانچ سال والا جو تھا جی' وہ تو مدت ہوئی ختم ہو گیا۔ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیجئے جا کے اس کا تو ایک ذرہ بھی باقی نہیں ہے' مانگتے کس سے ہیں۔اور اس پہ بھی وہی غالب ہرچند کہے کہ ہے' نہیں ہے۔طبعی جسم کی تو کیفیت یہ ہے اور ہر وہ شے جس کا تعلق طبعی زندگی سے ہے اس کی بھی کیفیت یہ ہے' ہر آن تغیر ہے اس کے اندر۔فَـانٍ تو خود اسمِ فاعل کا صیغہ ہے

عربی جاننے والے جانتے ہیں جس میں تغیر آتے رہیں' ایک دن جا کے فانی نہیں ہے' تغیر ہونے والا جتنا ہوتا چلا جا رہا ہے تغیر' تغیر ہوتا چلا جا رہا ہے کوئی شے اس کے اندر اس میں بقا ہے نہیں ہے۔

جسم انسانی کے ساتھ میں کا وہ رشتہ جو نا قابل فراموش ہے

لیکن اس کے باوجود جو آپ اپنے آپ کو''میں'' کہتے ہیں کہ ہاں! ٹھیک ہے بھئی میں نے یہ آپ سے وعدہ کیا تھا دس سال پہلے وعدہ کیا تھا میں نے' میرے جسم نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا' میری زبان بھی جسم کا حصہ ہے اس نے وعدہ نہیں کیا تھا وہ تو ان کی تحقیق کے مطابق کچھ ہے ہی نہیں اس میں' یہ کیا چیز ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا' وہ آپ کیا ہے؟ جسم تو نہیں ہے۔ اب آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ آپ سے کہا تھا' یہ میں کیا ہے؟ دو سال کی آپ کی تصویر بچپن کی جو ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ صاحب! میری تصویر ہے تو آپ اگر ساٹھ سال کے ہیں وہ دو سال والا تو بیس دفعہ ختم ہو چکا۔ عزیزانِ من! یہ پھر یہ میں کیا ہے؟ بات ساری اتنی ہے قرآن کہتا یہ ہے کہ یہ تمہارے ہاں کا یہ مادی جسم یہ طبعی زندگی' ہر آن تغیر پذیر ہے۔ اس کے اندر تو ایک سیکنڈ میں اتنا بڑا تغیر واقع ہوتا ہے لیکن تمہارے اندر ایک چیز ایسی بھی ہے کہ جو تغیر نا آشنا ہے۔ ہم لوگوں نے اس کو کہا تھا' برگسان کا اگرچہ وہ فقرہ ہے لیکن استعمال اس نے یہ کیا ہے کہ جسے 'میں' کہا جاتا ہے CHANGELESSNESS IN CHANGE اس تغیرات کی دنیا میں ایک نا قابلِ تغیر شے جسے میں کہا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق کے مطابق انسانی زندگی کی کامیابی کا راز انسانی ذات یعنی''میں'' کی نشوونما میں پنہاں ہے

عزیزانِ من! قرآن نے یہی چیز کہی ہے جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی (6:94) جسے کہا ہے کہ جتنی چیزیں جنہیں تم میری کہتے ہو یہاں' وہ ساری کی ساری یہاں رہ جاتی ہیں اور تمہاری میں جو ہے وہ ہمارے پاس تنہا آئے گی۔ یاد رکھئے گا بات اُولُوۡا بَقِیَّۃٍ (11:116) سے آئی تھی۔ تو باقی تو چیز وہ ہے کہ جس میں تغیر نہیں آتا۔ یہ جس قدر بھی آپ تگ و تاز کرتے ہیں' کوششیں کرتے ہیں' سعی و کاوش کرتے ہیں اس کے بدلے میں کوئی چیزیں آپ کو ملتی ہیں' مادی چیزیں بدلے میں ملتی ہیں' روپیہ ملتا ہے' مکان ملتا ہے' آسائشیں ملتی ہیں' یہ سارا کچھ ملتا ہے۔ یہ سارا کچھ تو وہ ہے کہ جو فَانٍ (55:24) ہے' وہ تو بدلتا رہتا ہے لیکن جو حسنات آپ کے ہاں کی ہیں جو اقدار کے مطابق آپ کے اعمال ہیں ان کا ایک اثر مرتب ہوتا ہے آپ کی''میں'' کے اوپر' یہ نا قابلِ تغیر ہے۔ عزیزانِ من! غور کیجئے جھوم جایئے قرآنِ کریم نے ان حسنِ اعمال کو' ان اعمالِ صالح کو جن کا اثر مادی زندگی کے اندر چیزیں نہیں' جن کا اثر جا کے اس شے پہ پڑتا ہے کہ جو نا قابلِ

تغیر ہے ان لوگوں کو اُولُــوْا بَــقِيَّةٍ (11:116) کہا ہے وہ لوگ جو نا قابلِ تغیر نتائج کے حامل ہیں۔اللہ اکبر اللہ اکبر! اُولُــوْا بَقِيَّةٍ (11:116) اس ہر آن تغیر پذیر کائنات کے اندر اُولُوْا بَقِيَّةٍ (11:116)۔

قرآن کی عظمت کے پیشِ نظر یہ کتاب تو سبقاً سبقاً ' درساً درساً سمجھے اور سمجھانے والی کتاب ہے

عزیزانِ من! قرآن نصاب کی کتاب ہے یہ تو نصاب میں سبقاً سبقاً ' درساً درساً پڑھنے اور پڑھانے کی کتاب ہے۔ایک ایک لفظ کے اوپر آپ دیکھئے۔اور یہی وہ چیزیں ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ ان اعمال کے بدلے میں اس دنیا کی یہ نعما اور آسائشیں اور برکات اور ضروریات جو ہیں ان کو نظر انداز کر دیتا ہے' بالکل نہیں! وہ کہتا ہے کہ یہ بھی ملیں گی اٰتِنَـا فِـي الـدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201) اس کے بعد ہے فِـي الْاٰخِـرَـةِ حَسَنَةً (2:201) یہاں بھی سب چیزیں وہ دیتا ہے' یہ نہایت ضروری ہیں لیکن یہ قابلِ تغیر و تبدل ہیں' ان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں' بدلتی رہتی ہیں یہ ساری چیزیں بدلتی رہتی ہیں اس لیے منتہا اور مقصود بالذات یہ چیزیں نہیں ہیں' یہ ملتی ہیں' یہ ذریعہ ہوتا ہے آپ کے جسم کی پرورش کا اس لیے کہ آپ کی ذات کی نشو ونما اس سطحِ زندگی پہ جسم کے ذریعے سے ہوتی ہے اس لیے اس ذریعے کا قائم رکھنا اور توانا رکھنا اور اچھا رکھنا ضروری ہے۔گھوڑے کا تنومند توانا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ آپ اس پہ سواری کر کے منزل پہ پہنچتے ہیں اور اگر کوتل گھوڑا ہی آپ باندھ رکھیں اصطبل میں' کھلاتے جائیں موٹا ہو رہا ہو اور سفر کے قابل وہ ہو ہی نہ۔

جسمِ انسانی اور انسانی ذات کی نشو ونما کے باہمی رشتے کی وضاحت

قرآن ان چیزوں کو ذرائع قرار دیتا ہے ذرائع بھی ضروری ہیں لیکن اصل جو ان کا ماحصل ہے آپ کے اعمالِ حسنہ کا وہ ہے بَـقِيَّةٍ (11:16) نا قابلِ تغیر۔تو ایک چیزیں تو یہ ہیں جو مادی طور پہ آپ کو ملتی ہیں۔قرآن میں بڑے لطیف پیرائے میں نتائج کو بتایا گیا ہے کہیں تو وہ کہتا ہے جَـزَآءً بِـمَـا كَـانُوْا يَعْمَلُوْنَ (56:24) صلہ ہے' معاوضہ ہے اس کا جو کچھ تم کرتے ہو۔یہاں بِـمَـا كَانُوْا يَعْمَلُوْن (56:24) کے ساتھ آیا ہے اور بعض مقامات ہیں سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (7:180) تمہارا عمل خود اس کی جزا ہوتا ہے۔ترجمہ تو کیا کیا جائے۔ایک جگہ اعمال کی جزا ہے یا اس کا بدلہ اور دوسری جگہ خود وہ عمل اس کا بدلہ۔جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی قلی سے یہاں یہ کہا جائے کہ یہ دیکھنا یہ میری چٹھی لے جانا' دو میل کے فاصلے پہ وہ ہمارے ہاں کچھ دوست ہیں' وہاں چھوڑ آنا۔ٹھیک ہے جی! کیا ملے گا؟ اس نے کہا کہ ایک روپیہ ملے گا تمہیں۔وہ دو میل سفر کر کے چھوڑ آتا ہے اس نے محنت کی دو میل چلا اس کو ایک روپیہ ملا یہ جَزَآءً بِـمَـا كَـانُـوْا يَعْمَلُوْن (56:24) جو اس نے کیا تھا یہ اس کا یہ بدلہ ہے۔اور آپ جو صبح سیر کے لئے گئے دو میل تو واپس جب آتے ہیں تو آپ کو تو اس سے روپیہ پیسہ کچھ نہیں ملتا لیکن ملتا ہے کچھ' کیا ملتا ہے سَيُـجْـزَوْنَ مَـا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (7:180) یہ جو کیا

ہے آپ نے وہی اس کا بدلہ مل گیا۔حسنات کے وہ نتائج جو انسانی ذات پر مرتب ہوتے ہیں وہ غیر متبدل ہوتے ہیں۔

ظلم کا ماحصل یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو بھی اپنی جگہ نہیں رہنے دیتا

قرآن نے نیک عمل یا حسنِ عمل کی جگہ یہاں اُولُوْا بَقِيَّةٍ (11:116) کہا ہے کہ یہ جنہیں ایسا بنایا تھا ان کے نبی نے۔یہ ایک پروگرام دیا تھا۔کہا کچھ عرصے کے بعد پھر فَلَوْ لَا كَانَ (11:116) ان کو کیا ہو گیا ''اوانہاں نوں کی ماروج گئی ستیاناس'' کہ آہستہ آہستہ پہلے یہ اس مقام پہ پہنچے کہ ٹھیک ہے صاحب! ہماری اپنی اصلاح جو ہے بس وہ ہے مطلوب ''باقیاں نال کی غرض ہے'' اور اس کے بعد پھر یہ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ (11:116) ان کی آنکھوں کے سامنے یہ خرابیاں پیدا ہوتی رہیں' انہوں نے اسے نہیں روکا' کیا ہوا ان کو؟ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (11:116) بڑی آسائشیں ان کو ملی تھیں اس صحیح نظام کے بدلے میں' حسنات کے بدلے میں انہوں نے ان آسائشوں میں یہ ظلم کا اتباع شروع کر دیا۔اور ظلم کے معنی تو آپ کو پتہ ہے ''جس جگہ کسی چیز کو ہونا ہو وہ وہاں نہ ہو' ہو تو سہی وہ چیز''۔فساد میں ہوتا یہی ہے یہ سب کچھ موجود ہوتا ہے اپنی جگہ پہ وہ نہیں ہوتا' فسد ہوتا ہی یہ کہ اس کو وہاں سے ہلا دیا جائے۔اور ہلا دیجئے کسی مشینری کے پرزوں کو اپنی اپنی جگہ سے' پرزے سارے ویسے ہی رکھئے اپنی اپنی جگہ سے ہلا دیجئے پھر دیکھئے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

خوشحالی جیسی نعمت کو احسن طریق سے بروئے کار لانے کا نتیجہ

کیا بات ہے قرآن کی!! چیزیں یہ ان کے پاس تھیں' ساری آسائش کے سامان موجود تھے' اپنی اپنی جگہ نہیں رکھا ہوا تھا۔پہلی چیز تو یہ تھی۔اور اس کے بعد اب جو کچھ تھا اس کو جب اپنی اپنی جگہ نہیں رکھا' فساد CREATE ہوا تو وہ جو اطمینان تھا وہ جو آسائشیں تھیں وہ تو کم ہونی شروع ہو گئیں' مٹنی شروع ہو گئیں پھر اس کا طریقہ کیا سوچا؟ یہ سارا کچھ تو ملا تھا ان کو حسنِ عمل سے' اس میں جب یوں کمی ہو گئی اس ظلم کی وجہ سے تو سوچا کیا وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (11:116) پہلا تو یہ کہا ہے ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ (11:116) جو کچھ ان کے پاس تھا پہلے تو اس میں یہ کیا اس کا بیڑہ غرق' اب جو اس کے بعد اس میں آئی کمی تو پھر اس کا علاج کیا سوچا؟

نعمائے خداوندی کی قدر نہ کرنے پر تنگ دستی کے عذاب کے باعث دوسروں کی کمائی پر ہاتھ صاف کرنے کا عمل

میں نے آپ سے کہا تھا کہ عربی زبان میں یہ جرم کا لفظ یہ استعمال کرتے تھے کسی کے درخت کا پھل کاٹ کے اپنے گھر لے آنا۔کہتا ہے پہلا تو یہ تھا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ (11:116) جو کچھ ان کو ملا تھا فطرت کی طرف سے اس کو تو انہوں نے ظلم کی بنا پر یوں اجاڑا' اب جو کمی

آئی تو پھر دوسرے کے درختوں کے پھل کاٹ کے گھر لانے شروع کردئے۔ کہا پوچھتے ہیں آپ کہ یہ لوگ جو تھے انہیں پھر کیا ہوگیا جو یہ بھی پھر بعد میں آ کے اسی قسم کے ہوگئے؟ کہا ان کو یہ ہوگیا تھا پہلے تو یہی صورت تھی کہ جوان میں سے بزعم خوش کوٹڈ میں کہتا ہوں دین دار مذہب پرست تھے انہوں نے سمجھا کہ ہمیں دوسروں سے کیا واسطہ ہے اپنی اپنی نجات کی میاں فکر ہونی چاہئے یَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ (11:116) پہلی چیز تو یہ ہوئی پھر آگے یہ جو صاحبِ آسائش تھے جن کے پاس یہ فراوانیوں سے یہ تمام چیزیں تھیں انہوں نے ظلم میں رکھنا شروع کیا کوئی چیز اپنی جگہ رہنے ہی نہیں دی اس کے بعد جو کمیاں آنی شروع ہوگئیں تو بجائے اس کے کہ پھر حسنات کی طرف آتے' پھر اس کے بعد حسنِ عمل کی طرف آتے اس کا بدلہ کچھ لیتے مُجْرِمِيْنَ (11:116) نیت یہ ہوگئی کہ کسی کے پاس جو نظر آئے وہاں سے لے آؤ کسی طرح سے' کہا اس کے بعد یہ ہوا۔ عزیزانِ من! یہ کہنے کے بعد' کیا بات ہے!! کہا یہ باتیں تو تم سنتے ہو فلاں قوم تباہ ہوگئی' فلاں بستی برباد کردی گئی۔ تم یہ سوچتے نہیں کہ ہوا کیوں؟ ذہنوں میں یہی آتا ہے کہ صاحب! وہ قادرِ مطلق ہے خدا جس کو جی چاہے جو کردے ''لکھوں لکھ کردے' لکھوں لکھ کردے ذلت وی او ہدے ہتھ اچ عزت وی او ہدے ہتھ اچ'' تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (3:26) بس پڑھنا شروع کردیا۔

خدائے رحیم کسی کو تباہ نہیں کرتا بلکہ حسنِ عمل کے فقدان سے انسان نفسیاتی طور پر خود تباہ ہوتا ہے

کہا سن رکھو! وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (11:117) کبھی ایسا نہیں ہوا نہ کبھی ایسا ہوگا کہ کسی بستی کے رہنے والے کوئی قوم جو ہو' ان میں ہمواریاں پیدا ہوئی ہوئی ہوں' اصلاح والی صورت ہو اور خدا محض ظلم و تعدی سے اس کو ہلاک کردے کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ ہم نے داستانیں بیان کی ہیں ان قوموں کی تباہیوں کی' بربادیوں کی ممکن ہے ذہن میں یہ بات تمہارے آجائے کہ ہاں صاحب! مالک الملک ہے' قادرِ مطلق ہے جو جی میں آئے چاہے کرے بندہ وہاں پَر مار نہیں سکتا۔ وہ کہنے لگا یہ باتیں نہ تمہارے ذہن میں کہیں آجائے کہ ہم یونہی اٹھ کے قوموں کو ہلاک کردیا کرتے ہیں' یونہی ہم ان کو عزتیں دے دیا کرتے ہیں وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (11:117)۔ اگر وہ معاشرہ حسنِ عمل پہ رہتا ہے' اس میں صالحیت ہوتی ہے' ہم کبھی اس کو تباہ نہیں کرتے' یہ تو ظلم ہوگا۔ ہم کبھی ایسا نہیں کرتے کہ اس معاشرے کو تباہ کردیا جائے۔ اب آگے بات یہ ہوئی کہ صاحب! یہ بات تو ہم نے سمجھ لی کہ صاحب! ظلم سے تباہ نہیں کیا کرتے۔

قوموں کی موت وحیات انسانی اختیار وارادہ کے صحیح یا غلط استعمال کی بنیاد پر ہے

اب آگے بات یہ رہی کہ ٹھیک ہے یہ انسانوں کی ایک جماعت بنی' یہ قوم بنی' یہ امت بنی۔ امت میں نبی نے اصلاح پیدا کردی

مصلحین کی بھی ایک قوم بنی' پھر اس میں یہ اختلاف کی صورت کیوں پیدا ہوگئی' یہ کیوں ہوا؟ خدا نے اگر یہ کیا تھا تو پھر ایسا کیوں نہ کر دیا کہ پھر یہ نیک ہی رہتے' پھر یہ کچھ نہ کرتے' یہ اگلا اعتراض ہے۔ پہلا اعتراض کہ کیوں تباہ کیوں کر دیا۔ جیسا پتھر پچاس ہزار سال پہلے تھا' آج بھی دیکھو تو ویسا ہی ہے' جیسی بکری دو ہزار سال قبل مسیح پیدا ہوتی تھی آج بھی ویسی ہی ہوتی ہے' شیر کی جبلت کروڑ سال پہلے تھی آج بھی وہی' جبلت اس کی ہے۔ ہر اس کا بچہ پیدا ہونے والا اسی قسم کا پیدا ہوتا ہے' ان میں اختلاف ہوتا ہی نہیں ہے۔

اختیار وارادہ ہی انسانی زندگی کا اصل زیور ہے

اگر ہماری مشیت ہوتی تو کہتے ہیں بتاؤ کیا مشکل تھی ہمارے لئے کہ ہم بھی انہیں انہی جیسا پتھروں جیسا' حیوانوں جیسا یہ پیدا کر دیتے' صاحبِ اختیار وارادہ تو نہ رہتا پھر یہ' ہم نے اسے صاحبِ اختیار وارادہ بنایا ہے۔ اور جسے پھر اس کی نیکی' حسنِ عمل اور کاریگری کہتے ہیں وہ تو اسی لیے ہے کہ یہ اپنے اختیار وارادے سے ایسا کرتا ہے۔ بکری اگر کسی کو کاٹ کے نہیں کھاتی تو یہ اس کی نیکی نہیں ہے جیسے اگر شیر کسی کو پھاڑ کے کھا جاتا ہے تو وہ اس کا جرم اور ظلم نہیں ہے۔ مجبور کی تو نہ نیکی نیکی ہوتی ہے نہ اس کا جرم جرم ہوتا ہے۔ کہا فرمائیے صاحب! اعتراض تو آپ نے کر دیا' کیا خیال ہے حضور کا! چاہتے ہیں ایسا بنا دیا جائے کہ اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہ سکو' کوئی شخص بھی تیار ہے اس کے لیے۔ اعتراض تو کر دیتے ہیں کہ صاحب! ایسا کیوں نہ کر دیا' کہتے ہیں کر سکتے تھے ہم' کیا خیال ہے آپ کا! کوئی بھی اس کے لیے تیار ہے۔ کہتا ہے ہم کر سکتے تھے ایسا کہ کوئی بھی اختلاف نہ کرتا' ہم نے صاحبِ اختیار وارادہ بنایا ہے لذتیں اور لطف تو زندگی کا اسی کے اندر ہے۔ عزیزانِ من! ایسی بے کیف زندگی جس میں اختیار وارادہ ہی نہ ہو انسان کا۔

جرم کے نقصان سے بچنے کے لیے قرآنی ضابطۂ حیات سے آگہی کا عمل بڑا ضروری ہے

اب باقی بات رہی کہ صاحب! پھر یہ اختلاف والی بات جو ہے پھر اس مٹنے کی کیا صورت ہے؟ وہ کہتا ہے وہ ٹھیک ہے اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ(11:119) جہاں ہم نے یہ چیز بتائی تھی کہ بھڑ کے کاٹنے سے درد ہوتا ہے' ورم ہوتا ہے' سوج بھی جاتا ہے۔ ٹھیک ہے تم صرف ایک بھڑ کو لیتے ہو تمہیں پتہ نہیں کہ کائنات کے پورے نقشے میں اس کے فائدے کتنے ہیں لیکن بہر حال تمہیں یہ اتنا نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ ہوتا ہے' ہم نے اس کے ساتھ ہی ایک بوٹی پیدا کر دی ہے کہ اس کا پتا لے کے اس پہ مل دیا جائے تو اسے آرام ہو جاتا ہے' اسے رحمت کہتے ہیں۔ کہتا ہے جہاں یہ صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا کہ یہ اختلاف بھی کر سکتا ہے' ظلم بھی کر سکتا ہے' جرم بھی کر سکتا ہے اس کے ساتھ ہی ہم نے اس قسم کا ضابطۂ قانون بھی دیا کہ اگر اس کی اطاعت کرتا رہے' اس کے مطابق چلتا رہے' اس کی محکومیت کرتا رہے تو پھر یہ اختلاف پیدا ہی نہیں ہوگا اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّکَ (11:119)۔ یہ جتنی چیزیں خدا نے اس اختلاف کو مٹانے کے لیے بطور رحمت

خداوندی دی تھیں اوراس کی رحمت تو تمام اشیا کو محیط ہے' کوئی شے بھی اس سے باہر نہیں ہے۔ کسی قسم کا کوئی جرم' کوئی کمی' کوئی خرابی واقع ہوجائے اس کے ازالے کے لیے اس قرآن کے اندر نسخہ موجود ہے۔ کہتا ہے وہ اگر ہم نے کیا تھا تو یہ بھی ساتھ کیا ہم نے۔ اور آگے ہے وَ لِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ ؕ(11:119)

مجبور کی زندگی غلامی' افسردگی اور بدمزگی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی

ہم نے اس انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا اس میں یہ چیز بھی تھی کہ یہ حسنات کی طرف بھی آ سکتا ہے اور اپنی تباہیوں کے سامان بھی پیدا کر سکتا ہے۔ تباہیوں کا علاج جو تھا وہ بھی ساتھ میں ہم نے پیدا کر دیا کہ اگر ایسا ہوجائے تو پھر یہ علاج کر لیا کرو اگر تم بیمار ہوجاؤ۔ ہم نے اس طرح اس کو پیدا کیا ہے' مجبور نہیں پیدا کیا کہ مجبور کے کسی عمل میں کوئی لذت ہی نہیں ہوتی' کوئی کشش نہیں ہوتی اس کی۔ نہ نیکی نیکی ہوتی ہے' نہ گناہ گناہ ہوتا ہے۔ صاحبِ اختیار پیدا کیا تو اس میں امکان تھا کہ یہ خرابیاں اپنے لئے پیدا کرے گا خرابیوں کے ازالے کے لیے ساتھ ہی ہم نے وہ دوا دیدی' وہ قانون دیدیا وہ شفا کا نسخہ دے دیا کہ اس کو استعمال کرے گا' اختلاف جو ہیں پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ پیدا ہوں گے تو وہ مٹ جائیں گے۔ کہتا ہے یوں پیدا کیا ہم نے اس کو۔

مذکورہ آیات قرآنی کے مروجہ ترجمے کا مفہوم

آپ کو معلوم ہے یہی آیتیں جو ہیں پھر کیا ان کے ترجمے اور کیا مفہوم ہوجاتے ہیں ہمارے ہاں؟ ان سے کہا جائے کہ صاحب! یہ اتنی فرقہ بندی یہ بہتر بہتر فرقے آپ نے بنا رکھے ہیں قدم قدم کے اوپر' قرآن تو ان کو بہ نص صریح شرک قرار دیتا ہے فرقہ بندی کو' شرک قرار دیتا ہے۔ اختلاف کو خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ قرآن میں بار بار یہ چیزیں آئی ہیں تو یہ پھر کیوں ہے یہ سارا کچھ جو ہے؟ کہنے لگے واہ! ہم تھوڑا یہ کرتے ہیں وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ (11:118) کہ خدا خود کہتا ہے ہم چاہتے تو ایسا پیدا کرتے کہ اختلاف پیدا ہی نہ کرتے' اختلاف تو یہ کرتے رہیں گے اور اس کے بعد وَ لِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ (11:119) ہم نے پیدا ہی ان کو اس کے لیے کیا کہ اختلاف کرتے رہیں۔ وہی الفاظ ہیں۔ اب اختلاف نہ کرنا جو ہے یہ خدا کا جو منشا تھا خلقتِ آدمی کا' اس کے خلاف چلا جائے گا' وہ کہتا ہے کہ ہم نے تو پیدا ہی اس لیے کیا تھا۔ ارے پھر بھئی! کوئی شکل؟ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ (11:119) صاحب! یہ میرے تمہارے بس کی بات تھوڑی ہے اللہ جس پہ رحم کرے' دعا کیا کرو کہ اللہ رحم کرے صاحب۔ یوں ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ کہا کہ یہ ہے اندازِ تخلیقِ آدم کا کہ صاحبِ اختیار و ارادہ' امتِ واحدہ ہم نے خود اس کو جامد نہیں پیدا کیا کہ اختیار سلب کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہے کہ اختلاف بھی کریں گے' اختلاف کے مٹانے کے لیے طریقہ بھی ہم نے بتایا ہے

کہ ہماری رحمت بچھی ہوئی ہے' اس کے مطابق یہ کرو۔ اس مقصد کے لیے ان کو پیدا کیا ہے۔ اختیار وارادہ اگر تمہیں اختلاف کی طرف' ظلم کی طرف لے بھی جائے یہ ایک چیز ہے اس کے اوپر اگر آ ؤ' اس کی اگر تم اطاعت کرتے رہو تو اس کے بعد یہ چیز کبھی پیدا نہیں ہوگی' نہ اختلاف پیدا ہوگا' نہ فساد پیدا ہوگا اور یہ ساری چیزیں تمہارے اختیار وارادے کے ساتھ ہوں گی۔ یہ جو ہے وَ لِـــــــذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (11:119) یہ نہیں کہ اختلاف کے لیے پیدا کیا' اس کا علاج یہ ہے۔

عبادت کا لفظ جو قانون خداوندی کی اطاعت یا پیروی کرنے کے لیے تھا وہ صرف نماز تک محدود ہو کر رہ گیا

وہ جو دوسری جگہ آتا ہے اس کا بھی مفہوم عجیب وغریب پیدا کر دیا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56) کہ ہم نے جن وانس کو پیدا اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔ یہ عام آیت بتائی جاتی ہے کہ وہ پیدا اس لیے کیا ہے صاحب! جنوں کو بھی انسانوں کو بھی تا کہ ہماری عبادت کرتے رہیں۔ پھر ''عبادت کرتے رہیں'' بڑا عابد ہے' عبادت گذار ہے' اب وہ تو سمٹ کے نماز تک آ جاتی ہے۔ پھر کہا گیا کہ صاحب! یہ تو آپ کہتے ہیں کہ وہ تو پیدا اس لیے کیا کہ وہ عبادت کرتے رہیں۔ صبح کی نماز پڑھی پھر ظہر کی نماز پڑھی۔ درمیان میں اتنا عرصہ جو GAP آ گیا تو اس میں تو وہ عبادت نہیں کرتے اور اگر عبادت ہی کرتے رہیں تو پھر یہ اور کاروبار کس طرح سے ہو۔ یہ چیزیں ہوتی ہیں پیدا۔ پہلے ایک اینٹ غلط رکھی بنیاد کے اوپر پھر دیوار جو ٹیڑھی اٹھنی شروع ہوئی تو اس کے لئے تاویلیں شروع ہوئیں۔ کہنے لگے نہیں! بات اصل میں یہ ہے کہ صبح کی نماز پڑھ لی جائے' کاروبار میں لگ گئے' پھر ظہر کی اذان ہو پھر آ کے نماز پڑھ لیجئے' تو ان دونوں کے درمیان کا وقفہ سارا عبادت میں شمار ہو جاتا ہے۔ یوں وہ جو کہا گیا کہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ ہماری عبادت کرو اس طرح سے وہ سارا وقت جو ہے وہ شمار کیا جاتا ہے۔ کہ صاحب! وہ عشا کے بعد تو وہ سو ہی جاتا ہے؟ کہنے لگے کہ نمازی کی نیند بھی اس کی نیکیوں میں شمار ہو جاتی ہے۔ شمار کر کے چوبیس گھنٹے۔

انسانی پیدائش کا مقصد عظیم زندگی بھر انسانی اقدار کی صداقت پر یقین محکم کے ساتھ اطاعت کرنے کا ہے

کہا اس نے یہ تھا وہاں بھی یہ ذکر ہے مجھے یاد آ گیا وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (51:55) ان کے سامنے اس حقیقت کو رکھ یعنی ہر وقت اس کو سامنے رکھو اس کو جو اس کی صداقت کے اوپر یقین رکھے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تمہاری پیدائش سے مقصد یہ تھا کہ تم ہمارے قوانین کی اطاعت کرو کسی اور کے قوانین کی اطاعت نہ کرو تنفع المؤمنین اس سے تمہیں بہت فائدے کی بات ہوگی۔ باقی یہ ساری چیزیں تمہاری کہ یہ صدقہ اور زکوۃ اور خیرات مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (51:57) ہم تم سے کسی رزق کے متمنی نہیں ہیں ہم قطعاً نہیں چاہتے ہیں کہ ہمیں اللہ واسطے کی روٹیاں دیا کرو اور یہ کچھ دیا کرو مقصد یہ تھا کہ تم ہمارے

قوانین کی اطاعت کرو۔عزیزانِ من! اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ وَ لِذٰلِکَ خَلَقَهُمۡ (11:119) یہ ہے تخلیق کا مقصد۔

آیت نمبر 11:119 کا مروجہ ترجمہ جو حقیقت سے بعید ہے اس کے علاوہ اس کا حقیقی قرآنی مفہوم

وَ تَمَّتۡ کَلِمَةُ رَبِّکَ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ (11:119) چل بھئی! آ گے اور بات آ گئی۔ترجمہ عام مفہوم بیان کیا جاتا ہے ''اور پھر خدا کی یہ بات پوری ہوگئی اور پوری ہو کے رہے گی کہ ہم نے جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھرنا ہے''۔ اب پتہ چل گیا پیدا کیوں کیا گیا تھا۔''جہنم تے بنا دیتا ہُن آ کے کہیا جی! بالن کتھوں آئے گا؟ اے چیزاں تے پہلاں پیدا ہو گیاں سن'' اب پھر جن اور انس پیدا کر دیتے ہیں پھر ان کو لا کے تو وہ جہنم میں ڈالیں گے بھریں، یہ جہنم کا ایندھن ہو جائیں گے ''ایس کم لئی پیدا کیتا اے ساہنوں تہانوں''۔عزیزانِ من! کیا کہیے۔کہا کہ یہ سارا کچھ ہے یہ بھی نظر آ گئی بات کہ اختیار و ارادہ دیا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی چیز ہے کہ پھر اس قسم کا ضابطۂ ہدایت بھی دے دیا، یہ رحمت کا سامان بھی دے دیا۔اس کے باوجود ہم دیکھتے یہ ہیں کہ اکثریت انسانوں کی پھر بھی اختلاف ہی کرتی رہتی ہے، پھر بھی ظلم ہی کرتی رہتی ہے، پھر بھی یہ معصیت ہی کرتی رہتی ہے۔تو یہ تو سارے جتنے بھی ہیں اس قسم کے لوگ یہ تو نظر آتا ہے کہ یہ تو جہنم کی زندگی گذار رہے ہیں یہاں بھی جہنم کی زندگی گذار رہے ہیں آگے چل کے بھی جہنم ہی کی زندگی گذاریں گے۔کہا یہ ٹھیک بات ہے۔آ و تمہیں بتائیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ کہا وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ (7:179) وہاں یہ تھا تَمَّتۡ کَلِمَةُ رَبِّکَ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ (11:119) یہاں ہے لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیۡرًا (7:179)۔میں نے جن وانس تو آپ کو بتایا ہوا ہے یہ متمدن مہذب شہری آبادیاں اور یہ بدوی آبادیاں جو ہوتی تھیں عربی زبان میں ان کو جن وانس کہا جاتا ہے۔وہ نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں باہر رہتے تھے، بدو یہ خانہ بدوش جس کو آپ کہتے ہیں ''ٹپری واس ہوندے سن ہن تے او وی جن نئیں انس ہو گئے نیں یا اسی وی سارے جن ہو گئے آں'' وہاں عربوں کے ہاں اب بھی آبادیوں کی یہی کیفیت ہے۔تو خیر یہ انسان جو ہیں کہا کہ یہ گروہ انسانوں کا تم دیکھو گے ان کی حقیقتِ حال، صورت سے یہ بات عیاں ہو گی کہ یہ جہنم والے ہیں ایسا نظر آئے گا کہ ان کو تو پیدا ہی جہنم کے لیے کیا گیا ہے۔دیکھو انداز ہے یہ بات کرنے کا۔

قندیل آسمانی سے لاتعلق جن وانس کی حالتِ زار

یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰهُمۡ (55:41) کہا مشکل کچھ نہیں ہوتی مجرم کو اس کی پیشانی سے پہچانا جاتا ہے۔تم ان کی پیشانیوں کو دیکھ کے ان کی رفتار، گفتار، چلن، معیشت، سب کچھ دیکھ کے کہہ دو گے کہ یہ ہیں ہی جہنم والے۔کہا کس طرح سے تم کہہ دو گے، کیا بات ہے وہ ان کے اندر جو پکار پکار کے کہہ دے گی کہ یہ تو جہنم والے ہیں؟ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ بِهَا (7:179) سینوں کے اندر

دل رکھتے ہیں، سوچنے سمجھنے کا کام اس سے نہیں لیتے وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) آنکھیں ماتھے کے اوپر ہیں، دیکھنے کا کام نہیں ان سے لیتے وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) کان رکھتے ہیں، سننے کا کام نہیں لیتے اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ (7:179) یہ انسان ہیں؟ یہ تو حیوانوں کی طرح ہیں، کہا نہیں! بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) ان سے بھی گئے گذرے ہیں کم بخت۔

سوچنے سمجھنے کے ذرائع سے استفادہ نہ کرنے کا نتیجہ جہنم کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) یہ سب کچھ یہ ذرائع رکھتے ہوئے اپنے آپ کو پردے کے اندر رکھتے ہیں یعنی جو عقل وفکر و ہوش وحواس و گوش وچشم سے کام نہیں لیتا دنیا کے اندر وہ ہیں، ان کی تو صورتِ حال بتا دیتی ہے کہ جہنم والے ہیں۔ کہا یہ جو اتنا اختلاف کرتے ہیں، یہ سب کچھ یہ سوچنے سمجھنے کے ان کو ذرائع دئے گئے ہیں کہتا ہے کیفیت یہ ہے کہ ان سے کام ہی نہیں لیتے۔ جذبات کی رو میں اتنا بہہ جاتے ہیں اور قرآن نے کہا ہے کہ جب بھی جذبات انسان پہ غالب آجاتے ہیں پھر اس کی یہ عقل وفکر کے جتنے ذرائع ہیں، سب ماؤف ہو جاتے ہیں۔ اور جب یہ ماؤف ہو جائیں تو اس کے بعد تو پھر جو کچھ یہ کرتا ہے، جہنم کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ کہا اس کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا تھا، اختیار وارادے کے برتنے کے لیے پہلے انسان کے پاس انفرمیشن چاہئے۔ اندر بیٹھے بندوق کے چلنے کی آواز باہر سے آئی، گولی کی آواز کان نے سنی، دل نے کہا بندوق ہے، گولی چلی ہے۔ چیخ کی آواز آئی، کان نے آواز سنی، دل نے یہ بات کہی کہ کسی انسان کے گولی لگی ہے، چیخنے کے بعد ایک اور آواز آئی یا بچے کی آواز آئی یا ماں نے پکارا، مانوس آواز ذہن کے اندر آئی، بھاگے ہوئے گئے، جاکے دیکھا تو وہ اپنا ایک دوست تھا۔ واقعہ سارا آنکھوں کے سامنے آگیا کہ میرا ایک دوست کسی نے اس کو گولی ماری، وہ تڑپ رہا ہے۔ اور اگر یہاں شرابی کھڑا ہوا ہو آواز آئی ''اوشبرات ہے اج' پٹاخہ چلن ڈیا ہیگا اے' اوکہن لگا اوتے کسے دی چیخن دی آواز کتھوں اون ڈئی ہوئی ہیگی اے' اچھا! او میرے وی کیڑی لڑگئی ہیگی' اے ایس طراں ای ہون ڈیا ہیگا اے''، وہی آوازیں آ رہی ہیں چونکہ یہ سارے ذرائع ماؤف ہو گئے ہیں، آدمی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ شراب کا نشہ تو بڑی چیز ہے قوت کے نشے میں آپ دیکھتے ہیں کس طرح سے ہوش وحواس کب ماؤف ہوتے ہیں۔ جن کو وہ میسر نہیں ہوتی شراب، وہ بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ صاحب! ''ایناں نوں آ گلاں نئیں نظر اوندیاں پیاں''۔ اسی لیے اہلِ جہنم سے دوسری جگہ کہا ہوا تھا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (67:10)

اہلِ جہنم سے جہنم کے داروغے کا ایک اہم سوال اور پھر وہاں کے مکینوں کا جواب

جہنم کا داروغہ ان سے پوچھے گا اوئے سلام علیکم، وعلیکم السلام، اوئے تم جہنم میں کیسے آگئے؟ کہنے لگے کیا بتائیں صاحب! اگر

ہم سنتے اور عقل سے کام لیتے تو کیوں جہنم میں آتے۔عزیزانِ من! یہ ہے۔تو کہا کہ یہ اختیار وارادہ اس لئے دیا گیا تھا کہ ذرائع علم سے فیصلے پہ پہنچتے پھر اپنے اختیار وارادے سے عمل کے اوپر آمادہ ہوتے اور صحیح اعمال یہ کرتے تو اہلِ جنت میں ہوتے' یہ کچھ نہیں کیا گیا اہلِ جہنم ہیں۔اب آخری دو آیتیں آ گئیں۔اے رسول وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الرُّسُلِ (11:120) یہ انبیائے سابقہؑ کی یہ داستانیں ہم نے تمہیں سنائی ہیں' کاہے کے لیے؟ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ‌ ۚ(11:120) تا کہ تیرے دل میں ثبات پیدا ہو۔اللہ اکبر۔عزیزانِ من! کتنا بڑا مرحلہ سامنے درپیش ہے۔ ہر نبی کے داستان میں کہا کہ یہ مشکلات حائل ہوئیں۔ ہر نبی کی داستان کے بعد کہا کہ اسے کامیابی ہوئی۔ہم نے لکھ رکھا ہوا ہے کہ ہم اور ہمارے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے (58:21)۔اس لئے یہ جو مشکلات آ رہی ہیں تم پہ یہ ٹھیک ہے ہمیں احساس ہے ان کا' ہم نے یہ ساری داستانیں اس لئے سنائی ہیں کہ تیرے دل میں ان سے ثبات پیدا ہو۔

قرآن حکیم میں تاریخی حقائق کو بیان کرنے کا مقصد انسانوں کی راہنمائی ہے' انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو واضح کرنا ہے

عزیزانِ من! یہ ہے تاریخ کا مقصد کہ اس سے دلوں میں ثبات پیدا ہو۔وَ جَآءَكَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَـقُّ(11:120) ان داستانوں میں حق تیرے سامنے آ گیا ہے۔وَ مَوۡعِظَةٌ(11:120) بچنے کی نصیحت کی چیزیں بڑی ہیں اس کے اندر' صحیح راستے پہ چلنے کی بڑی چیزیں ہیں۔اور پھر وہی بات وَّ ذِكۡرٰى(11:120) اور آنکھوں کے سامنے رکھنے کی چیز ہے' کن کے لئے؟ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ (11:120) صرف ان کے لیے جو ان کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ورنہ عزیزانِ من! آج تو کس کس کو حفظ نہیں یہ قرآنِ مجید۔یہ رسول کے متعلق ہوا' تیری ذات کے متعلق لیکن یہ صرف تیری ذات کے لئے یہ بات نہیں ہے وَ قُلْ لِّلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (11:121) اب وہ لوگ رہ گئے کہ جو ان صداقتوں پہ ایمان نہیں لاتے' بظاہر پنپتے چلے جاتے ہیں' پھلتے پھولتے چلے جاتے ہیں۔ادھر تم محنت و مشقت میں زندگی بسر کر رہے ہو' کامیابیاں بظاہر نظر نہیں آتیں' وہ لوگ روز تمہیں ٹھٹھول مارتے ہیں کہ آں ہاں! دیکھا کر کے دیکھا اس کا نتیجہ۔کہتا ہے قل ان سے کہہ دو اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ ؕ اِنَّا عٰمِلُوۡنَ(11:121) تم اپنے پروگرام کے مطابق کرتے چلے جاؤ یہ بددیانتیاں' یہ بےایمانیاں' یہ ظلم اور یہ جرم ٹھیک ہے کرتے چلے جاؤ۔میں نہیں دخل دیتا اِنَّا عٰمِلُوۡنَ (11:121) مجھے میرے پروگرام کے اوپر عمل کرنے دو۔وَانۡتَظِرُوۡا (11:122) نتیجے کا انتظار کرو اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ(11:122) ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

انسانی عمل کا نتیجہ اس کی کامیابی اور ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہاں ایک عجیب چیز سامنے آتی ہے۔یہ بہت بڑا ایک بظاہر آپ دیکھیں گے تو یہ بڑی مصالحت آمیز چیز ہے کہ ہم

نہیں دخل دیتے تمہارے معاملے میں' دلائل و براہان کی رو سے تمہیں سمجھایا' عقل وفکر میں تمہارے بات نہ آئی' تاریخی شواہد تمہارے سامنے پیش کئے کہ یہ اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات دیکھ لیجئے کہ کیا تمہیں بتاتے ہیں۔ یہ بات بھی تمہارے ذہن میں نہ آئی اب اس کے بعد آگے PRAGMATIC TEST ہے کہ نتائج بتائیں گے میں جس پروگرام پہ چل رہا ہوں اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں' تم جس پہ چل رہے ہو اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ وہاں تو تم مانو گے یہ بات یہ ہے۔ یہاں آپ دیکھئے یہ جو حق پہ ہوتا ہے وہ تو اس چیز پہ بھی آجاتا کہ بہت اچھا صاحب! آپ اپنے پروگرام پہ عمل کیجئے میں دخل نہیں دوں گا۔ یہ جو باطل والا ہوتا ہے وہ اس کی اجازت کبھی نہیں دیتا کہ بہت اچھا صاحب! آپ اپنے پروگرام پہ عمل کیجئے ہم دخل نہیں دیتے' قطعاً نہیں وہ کرتا' اس کی تو موت ہوتی ہے اس میں۔ اور یہی ہے وہ تصادم کی بات۔ تصادم یہ نہیں ہے کہ یہ اسے نہیں اپنے پروگرام پہ چلنے دیتے' ایک تصادم تو یہ ہے کہ یہ اسے نہ چلنے دیں وہ اسے نہ چلنے دیں' یہ نہیں۔ یہ جو حق والا ہوتا ہے آپ دیکھئے کس قدر اطمینان اور یقین ہے اس کو اپنے پروگرام کے صحیح ہونے پہ' صداقت پر' اسے کہتا ہے کہ ٹھیک ہے تم کام کرو اپنے پروگرام کے مطابق' میں دخل نہیں دیتا۔ وہ کبھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔ جس معاشرے میں دوکانداروں کے اندر کوئی دیانت دار' ایماندار بیٹھے صحیح وہاں دوکان کرنے اور وہ کہے ان سے کہ بابا! میں تمہیں کچھ نہیں کہتا تم جیسے جی چاہے بیچو چیزیں' مجھے اپنے اصول کے مطابق بیچنے دو۔ بیچنے دیں گے اس کو؟

ہمارے ہاں صدیوں سے نیکی کا ایک عجیب وغریب تصور

یاد رکھئے! غلط معاشرے کے اندر جو لوگ ان کے ساتھ ہوتے ہیں ان کو تو چھوڑ دیجئے' جو شخص INDIFFERENT ہو جاتا ہے وہ کہ صاحب! مجھے میری نجات کی فکر ہے' کسی میں دخل نہیں دیتا اس کے لئے بھی کوئی مشکل نہیں' یہ اسے کچھ نہیں کہیں گے' نمازیں پڑھو' روزے رکھو' حج پہ جاؤ' اور زیادہ انتظامات کرتے ہیں اس کے لئے' یہ INDIFFERENT ہوتے ہیں۔ جو شخص یہ کہنے کے لئے اٹھتا ہے کہ تم اس غلط نظام پہ چلتے ہو' میں صحیح دیانتداری کے نظام پہ چل کے تمہیں بتادوں گا کہ اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں' اسے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ ہے کشمکش۔ یہیں نہیں مختلف انبیائے کرامؑ کے قصے میں یہ بات آئی ہے' وہ یہ کہتے تھے کہ تم اپنے طریقے پہ کام کرو' مجھے میرے طریقے پہ کام کرنے دو' نتائج خود بتادیں گے۔ وہ کبھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔ نتائج بتادیں گے' کیسے نتائج ان کے یہ مرتب ہو جائیں گے یہ تو کمزور ہیں' ناتواں ہیں' ان کے مقابلے میں اتنے زیادہ اسباب و وسائل بھی نہیں رکھتے' پھر؟ پھر یہ کہ

انسانی اعمال کے تمام نتائج ساتھ کے ساتھ محسوس یا غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے رہتے ہیں

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (11:123) یاد رکھو! یہ جو نتائج اس وقت تمہاری آنکھوں کے

سامنے نہیں آ رہے' مشہود نہیں ہو رہے' یہ غیب ہیں پنہاں ہیں ابھی وہ' وہ فصل جو تمہیں دکھائی نہیں دے رہی' بیج کے اندر پنہاں ہے اور خدا کی نگاہوں کے سامنے ہے یہ بیج اور اس کے اندر کی مضمرات ساری کہ یہ کیا کیا پیدا کر سکتا ہے تمہیں ابھی نظر نہیں آتی' کوئی بات نہیں اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (11:123) نتائج تو اس کے قانون کے مطابق ملیں گے۔ انہیں تخمِ ببول بونے دیجئے' تم انگور کا دانہ بولو' بظاہر شکل و شباہت شاید ایک جیسی نظر آ جائیں یہ نظر نہ آئے کہ دونوں بیجوں کے اندر کیا ہے' ہمیں پتہ ہے کیا ہے۔ ان بیجوں کے نتائج اور ان کے پھل ہمارے قانون کے مطابق مرتب ہونے ہیں' بونے والے کے قانون کے مطابق نہیں ہونے' وہاں یہ بے بس ہیں۔ اس لئے تم دھڑلے سے کہہ دو کہ میری اس بیل میں تو انگور لگیں گے تم جو کچھ بو رہے ہو ببول ہے' کانٹے ہوں گے اس کے اندر' اس لیے کہ یہ سب کچھ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (11:123) ہر عمل کا نتیجہ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

ذات انسانی کی نشوونما کے بغیر یہ آدم خاکی سوائے اس کے کہ وہ اپنے کندھوں پر اپنی مردہ لاش کو اُٹھائے پھرے' اور کچھ نہیں

يُرْجَعُ جس کو رجوع کرنا کہتے ہیں۔ وہ جو آپ کے ہاں پڑھتے ہیں اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ایسی عجیب انقلابی آیت ہے صاحب! پتہ ہے وہ کہاں آئی ہے وہ آیت؟ وہ کہ جو ہماری راہ میں جان دینے والے ہیں انہیں مردہ کہو بھی نہیں' انہیں مردہ سمجھو بھی نہیں' زندہ تو وہ ہے تم نہیں جو اپنی لاشوں کو کندھوں پہ لئے پھرتے ہو اور زندہ اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ (2:155) ان تصادمات کے اندر ایسے مواقع آئیں گے تمہیں ہر قسم کے نقصان اٹھانے پڑیں گے' مال کا نقصان' کھیتیوں کا نقصان' کاروبار کا نقصان' جانوں کا نقصان وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (2:155) ان حالات کے اندر وہ کہ جن کے پاؤں کے اندر لغزش نہ آئے' ان کو خوشگوار نتائج کی خوشخبری دے دو۔ الذین (2:156) دیکھا آپ نے کون لوگ؟ جم کے کھڑے ہوں جو ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑے ہوں' بشارت دے دو ان کو الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ (2:156) وہ لوگ کہ جب بھی بڑی سے بڑی مصیبت بھی ان کے سامنے آئے' مصیبت سامنے آئے تو وہ کیا کہتے ہیں ان کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ یہ تو بہت بڑی مصیبت ہے اور اس کے بعد بھاگ جاتے ہیں وہ اس راستے کو چھوڑ کے' کہیں اور پناہیں لیتے ہیں؟ بڑی سے بڑی مخالفین کا ہجوم ان کے سامنے آئے اور وہ ان سے یہ کہتے ہیں کہ قَالُوْٓا وہ جواب دیتے ہیں کہ کیا کہتے ہو تم کہ تمہاری اس مخالفت سے' تصادم تمہاری ان مشکلات سے' ہم کہیں دوسری طرف رخ موڑ لیں گے اپنا' کبھی نہیں اِنَّا لِلّٰهِ (2:156) ہم نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہوا ہے اس کے پروگرام کے لیے وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھے گا کر لو کیا

کرتے ہو۔ اُولٓـئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ (2:157) یہ ہیں وہ لوگ کہ جن پر خدا اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اُولٓـئِکَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ (2:157) دیکھنا چاہتے ہو کہ سیدھے راستے پہ کون ہیں؟ یہ لوگ ہیں سیدھے راستے کے اوپر۔ دیکھا آپ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ کہاں کہا جا رہا ہے۔

کس قدر محاکاتی انداز میں بات کی گئی ہے۔ یورش کر کے وہ آ رہے ہیں، کسی طرح سے بھی اپنا راستہ چھوڑ دیں، کوئی قدم ڈگمگا جائے۔ پیارے تو نہیں کہوں گا بہر حال اس نے کہا یہی ہے اپنے انداز میں

ادھر آ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

کرلو کیا کرتے ہو۔ تم چاہتے یہ ہو کہ ان یورشوں سے ہمارا پاؤں دوسری طرف پڑ جائے کہیں، یہ راستہ چھوڑ دیں، رخ بدل دیں اِنَّا لِلّٰهِ پہلی چیز اعلان یہ ہے ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

جو قطرہ یہ کہہ دے کہ میں تو بحر کا ہوں اور بحر ہوں ہر قطرے کا دل جو ہے وہ ایک سمندر کا ساز ہو جاتا ہے۔ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ وہ ان کے کہتے ہیں مقابلے میں اِنَّا لِلّٰهِ (2:156) ہم اس کے ہیں وَاِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) لو چلے ہم اس کی طرف، کرو کیا کر لیتے ہو۔ اُولٓـئِکَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ (2:156)۔ یہاں یہ کہا ہے وَ اِلَیۡهِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّهٗ (11:123) عزیزانِ من! سورۃ کے آخری الفاظ آ رہے ہیں۔ فَاعۡبُدۡهُ (11:123) بس صرف اس کی محکومیت اختیار کرو۔ اس میں بڑی مشکلات سامنے آئیں گی، بڑے تصادمات ہوں گے۔ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡهِ (11:123) بھروسہ رکھو کہ یہ رسی کبھی دغا نہیں مجھے دے گی، یہ بیچ میں نہیں ٹوٹ جائے گی، یہ چھتری ہے جہاز سے کودنے والے کی کہ اس بھروسے پہ وہ جہاز سے کود جاتا ہے دس ہزار فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا کے۔ اسے عربی میں توکل کہتے ہیں۔ بھروسہ رکھو اس کے اوپر۔ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (11:123) یہ بھی ہو سکتا ہے تم کہو کہ ہاں صاحب! قانون بھی صحیح ہے اس کے نتائج بھی صحیح ہوں گے، پتہ نہیں کہ وہ جس نے نتیجہ مرتب کرنا ہے، اس کو یہ معلوم بھی ہے یا نہیں،

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

سورۃ ھود میں مقام نبوت کی وہ وضاحت کہ جس نے آپ ﷺ پر بڑھاپا طاری کر دیا تھا

وہ کہتا ہے ہم خبیر ہیں، ہمارے ہاں یہ بات نہیں ہے کہ ہم کو خبر ہونے تک تم راکھ ہو جاؤ، ہمیں معلوم ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور یہ کیا کرتے ہیں۔ قانون اتنا محکم ہے قانون کے نتائج پیدا کرنے والا وہ کہ جسے نیند تو ایک طرف اونگھ بھی نہ آئے۔ ہر ایک کے عمل پہ نگاہ رکھنے والا تو پھر نتیجہ مرتب کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہا کہ اے رسول! یہ ہے وہ پروگرام جس پہ چل نکلو۔ عزیزانِ من! اب سوچیے جو حضور ﷺ نے کہا تھا کہ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ سورۃ ھود ختم ہوگئی آگے سورۃ یوسف آتی ہے اسے ہم اگلے درس سے شروع کریں گے۔ اور ویسے بھی قرآنِ کریم کی تمام سورتوں میں سورۃ یوسف ایک ایسی ہے جس میں ایک ہی شخصیت کے حسنِ عمل کو، پاکیزگیِ کردار کو ایک مسلسل داستانِ نورِ؟؟؟ کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اسے ہم مسلسل ہی بیان کریں گے اگلے درس میں ہم سورۃ یوسف لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)